بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
مدیر اعلیٰ محمود ریاض
مدیرہ رضیہ جمیل
امت الصبور
شاہین رشید
اشتہارات خالد جیلانی
خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ شعاع
37 اردو بازار کراچی

پہلی شعاع، رضیہ جمیل ۱۰
حمد، تنویر پھول ۱۱
نعت، ریحانہ رضوی ۱۱
نبیؐ کی باتیں، ادارہ ۱۲

انٹرویوز

شعاع کے ساتھ ساتھ، ادارہ ۲۹۸
فوزیہ تبسم، آغا شاہد، شہلا نرگس ۲۲
ایک دن ہمارے ساتھ، سائرہ غلام نبی ۲۸
مشاعری، نوشین طاہر ۳۱۵
بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا، سائرہ غلام نبی ۱۷

ناولٹ

ریگ زارِ تمنا، ماہا ملک ۳۶
زندگی اِک روشنی، رخسانہ نگار ۲۳۴

مکمل ناول

ہم بھی کتنے سادہ، راحت جبیں ۵۶
گھر آنگن، فائزہ افتخار ۱۹۰
تقدیر نگوں، کرن شاہ ۱۴۰

ناول

یہ دانہ و دام، نگہت سیما ۱۰۲
انا کا بانکپن، زہرہ ممتاز ۲۵۴

افسانے

پیمانۂ نیت شوق، افشاں آفریدی ۹۸
آئینہ شوق، سعدیہ دتیس ۱۸۶
سامنے ہے منزل، ماریہ حجاب ۱۳۵

نظمیں غزلیں

غزل، شبانہ یوسف ۲۸۶
غزل، ثوبیہ رفیق ۲۸۶
غزل، یاسمین سحر ۲۸۷
غزل، نقش ۲۸۷

*

اگست 2004
جلد 18 شمارہ 12
قیمت 35 روپے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
500 روپے

مستقل سلسلے

خط آپ کے، رضیہ جمیل ۳۰۸
مسکراہٹیں، سائرہ غلام نبی ۲۸۸
کھلتا کسی پہ، خالدہ جیلانی ۳۱۷
آئینہ خانے میں، عینی عمران ۲۹۵
موسم کے پکوان، خالدہ جیلانی ۳۰۷
تاریخ کے جھروکے، امت الصبور ۳۱۹
باتوں سے خوشبو آئے، شگفتہ جاہ ۲۹۲
خوبصورت بنیے، ادارہ ۳۲۱

شعاع کا اگست کا شمارہ سالگرہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
14 اگست 1947ء وہ تاریخ جب ایک طویل جدوجہد اور لاکھوں انسانوں کی جان و مال کی قربانیوں کے بعد برصغیر کے مسلمانوں نے ایک علیحدہ وطن حاصل کیا۔
قارئین کو جشن آزادی مبارک۔
صد شکر اللہ تعالیٰ کا، اگست کے شمارے کے ساتھ شعاع اپنی عمر عزیز کے ۱۹ سال پورے کر کے بیسویں سال میں قدم رکھ رہا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کرم خاص ہے کہ اس نے ہماری محنت اور جستجو کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔
کامیابی کے اس طویل سفر میں ہمیں بہت سے مخلص ساتھیوں کا تعاون حاصل رہا۔ شعاع کا معیار اور مزاج بنانے میں ہماری قلمی معاونین اور مصنفین کا بھی بڑا حصہ ہے۔ ہم اپنی مصنفین کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی بہترین تخلیقات سے شعاع کو نوازا۔ اگرچہ شکریہ کا مختصر لفظ ہمارے جذبات کی ترجمانی کرنے سے قاصر ہے۔
شعاع کی کامیابی کے لیے ہمارے قارئین بھی مبارک باد کے مستحق ہیں جنہوں نے ہماری محنت کو سراہا۔ ہماری پذیرائی کی اور اپنے بہترین مشوروں سے ہماری رہنمائی کرتے رہے۔
محمود ریاض صاحب نے شعاع کی بنیاد رکھی تھی۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی روشن کی ہوئی شمعیں ایک جہاں میں اجالا کر رہی ہیں۔
محمود ریاض، محمود بابر فیصل، محمود خاور، بہن عذرا جبیل، خالدہ اسد، عظمت عزیٰ، نسیم سحر قریشی، عطیہ بانو اور شازیہ چودھری ہمیں داغ مفارقت دے گئے ہیں لیکن ہمارے دلوں میں ان کا مقام ہمیشہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے۔ آمین۔
سالگرہ نمبر کو ہر لحاظ سے مثالی اور خوبصورت بنانے کے لیے ہم نے پوری محنت کی ہے۔ اپنی محنت میں ہم کس حد تک کامیاب ٹھہرے؟ اس کا جواب آپ کے خط دیں گے۔ ہمیں خط ضرور لکھیے گا۔ آپ کی رائے کے منتظر ہیں۔

قارئین سے سروے

پچھلے ماہ ہم نے سالگرہ نمبر کے سروے کے لیے قارئین سے کچھ سوالات کیے تھے۔ قارئین نے اس سروے میں بڑی گرم جوشی سے حصہ لیا۔ ہمیں بے شمار قارئین کے جوابات موصول ہوئے۔ کچھ قارئین کے جوابات اس ماہ شامل کیے جا رہے ہیں۔ یہ مستقل سلسلہ ہے۔ باقی قارئین کے جوابات باری آنے پر شائع کیے جائیں گے۔

حمد باری تعالیٰ

اے خدا! اے خالقِ کون و مکاں!
تُو ہے بے شک بادشاہِ دو جہاں!

کس نے ہیں تیرے سوا پیدا کیے؟
چاند، سورج اور زمین و آسماں

در پہ آئے ہیں ترے، کہتے ہیں اب
رحم کر ہم پر خدائے مہرباں!

سیدھے رستے پر چلا ہادی ہے تُو
ہم کو دکھلائے تُو منزل کا نشاں!

بحر و بر کو تُو نے ہی پیدا کیا!
پھول بوٹوں سے سجایا گلستاں!

ہے زباں عاجز تری تعریف سے
پھول کو بھی اب نہیں تابِ بیاں!

تنویر مقبول

نعت رسول مقبول

مبارک ہو مسلمانو! نبیا میں ختم المرسلیں آئے
نکھار آیا ہے عالم پر شہِ دنیا و دیں آئے

خدا نے رحمت اللعالمین کہہ کر جنہیں بھیجا
وہ پیغمبر مجسم مژدۂ فتح مبیں آئے

جو گہوارے میں رہ کر صاحبِ شق القمر ٹھہرے
وہی معجز نما آقا شفیع المذنبیں آئے

یہ عیدِ اولیں ہے ہر طرف اک نور چھایا ہے
مجسم نور بن کر دینِ حق کے وہ امیں آئے

ستاروں کو جلا بخشی شبِ معراج آقا نے
جو نورِ اولیں تھے بن کے ختم المرسلیں آئے

ہزاروں زخم سب کے گل بنے جس کے تبسم سے
مسیحائے جہاں، رحمت سراپا شانِ دیں آئے

ریحانہ رضوی تبسم

سخاوت

ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا۔
"اے ابوذرؓ! مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے پاس کوہِ احد کے برابر سونا ہو، اور تیسرے دن تک اس میں سے میرے پاس ایک اشرفی بھی بچ رہے سوائے اس کے جو ادائے قرض کے لیے ہو۔ تو اے ابوذرؓ! میں اس مال کو دونوں ہاتھوں سے خدا کی مخلوق میں تقسیم کر کے اٹھوں گا۔"

(صحیح بخاری کتاب الاستقراض ص ۲۲۱)

ایک دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چھ اشرفیاں تھیں۔ چار تو آپ نے خرچ کر دیں اور دو آپ کے پاس بچ رہیں۔ ان کی وجہ سے آپ کو تمام رات نیند نہ آئی۔
اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا۔
"معمولی بات ہے صبح ان کو خیرات کر دیجئے گا۔"
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اے حمیرا! (حضرت عائشہؓ کا لقب ہے) کیا خبر ہے میں صبح تک زندہ رہوں یا نہیں۔"

(مشکوٰۃ)

قناعت و توکل

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے دن کے واسطے کسی چیز کا ذخیرہ بنا کر نہیں رکھتے تھے۔

(شمائل ترمذی)

یعنی جو چیز ہوتی کھلا پلا کر ختم فرما دیتے۔ اس خیال سے کہ کل پھر ضرورت ہوگی، اس کو محفوظ نہ رکھتے تھے۔
یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غایت درجہ توکل تھا کہ جس مالک نے آج دیا ہے، وہ کل بھی عطا فرمائے گا۔ یہ صرف اپنی ذات کے لیے تھا، ورنہ ازواج کا نفقہ ان کے حوالے کر دیا جاتا تھا کہ وہ جس طرح چاہیں تصرف میں لائیں، چاہیں رکھیں یا تقسیم کر دیں، مگر وہ بھی تو حضورؐ کی ازواج تھیں۔
حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں

ایک بار دو گونیں درہموں کی نذرانہ کے طور پر پیش کی گئیں، جن میں ایک لاکھ درہم سے زیادہ تھے۔ انہوں نے طباق منگوایا اور بھر بھر کر تقسیم فرما دیا۔ خود روزہ دار تھیں۔ افطار کے وقت ایک روٹی اور زیتون کا تیل تھا جس سے افطار فرمایا۔
باندی نے عرض کیا "ایک درہم کا اگر آج گوشت منگا لیتیں تو آج ہم اسی سے افطار کر لیتے؟"
ارشاد فرمایا "اب طعن دینے سے کیا ہو سکتا ہے اسی وقت یاد دلا دیتی تو میں منگا دیتی۔"

(خصائل نبویؐ)

حضورؐ نے فرمایا ہے "مجھ کو یہ بات خوش نہیں آتی کہ میرے لیے کوہِ احد سونا بن جائے اور پھر رات کو اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس رہ جائے۔ بجز ایسے دینار کے جس کو کسی واجب مطالبہ کے لیے تھام لوں اور۔"
یہ بات آپ کے کمال سخاوت و جود و عطا کی دلیل ہے۔ چنانچہ اسی کمال سخاوت کے سبب آپ مقروض رہتے تھے۔ حتیٰ کہ آپ نے جس وقت وفات پائی ہے تو آپ کی زرہ ابھی عیال کے اخراجات میں رہن رکھی ہوئی تھی۔

(نشر الطیب)

انکسار طبعی

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ آپ طبعاً برے عادات سخت گو نہ تھے اور نہ بہ تکلف سخت گو بنتے تھے اور نہ بازاروں میں خلاف وقار باتیں کرنے والے تھے اور برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیتے تھے بلکہ معاف فرما دیتے تھے۔ غایت حیا سے آپ کی نگاہ کسی شخص کے چہرے پر نہ ٹھہرتی تھی۔ اور کسی نامناسب بات کا اگر کسی ضرورت سے ذکر کرنا ہی پڑتا تو کنایہ میں فرماتے۔
اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، کہ آپ سب سے بڑھ کر دل کے کشادہ تھے۔ بات کے سچے تھے، طبیعت کے نرم تھے، معاشرت میں نہایت کریم تھے اور جو شخص آپ کی دعوت کرتا اس کی دعوت منظور فرماتے اور ہدیہ قبول فرماتے اگرچہ (وہ ہدیہ یا طعام دعوت کا) گائے یا بکری کا پایہ ہی ہوتا اور ہدیہ کا بدلہ بھی دیتے تھے اور دعوت غلام کی اور آزاد کی اور لونڈی کی اور غریب کی سب کی قبول فرما لیتے اور مدینہ کی انتہائے آبادی پر بھی اگر مریض ہوتا۔ اس کی عیادت فرماتے اور معذرت کرنے والے کا عذر قبول فرماتے اور اپنے اصحاب سے ابتدا مصافحہ کیا کرتے اور کبھی اپنے اصحاب میں پاؤں پھیلائے ہوئے نہیں دیکھے گئے جس سے اوروں پر جگہ تنگ ہو جائے اور جو آپ کے پاس آتا اس کی خاطر کرتے اور بعض اوقات اپنا کپڑا اس کے بیٹھنے کے لیے بچھا دیتے اور گدا تکیہ خود چھوڑ کر اس کو دے دیتے اور کسی شخص کی بات بیچ میں نہ کاٹتے اور تبسم فرمانے میں اور خوش مزاجی میں سب سے بڑھ کر تھے، جب تک کہ حالت نزول وحی یا وعظ یا خطبہ کی نہ ہوتی کیونکہ ان حالتوں میں آپ کو ایک جوش ہوتا تھا جس میں تبسم اور خوش مزاجی ظاہر نہ ہوتی تھی۔

(نشر الطیب)

دیانت و امانت

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت حق کا آغاز فرمایا تو ساری قوم آپ کی دشمن بن گئی اور آپ کو ستانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، لیکن اس حالت میں بھی کوئی مشرک ایسا نہ تھا جو آپ کی دیانت و امانت پر شک کرتا ہو بلکہ یہ لوگ اپنا روپیہ پیسہ وغیرہ لا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے پاس امانت رکھاتے تھے اور مکہ میں کسی دوسرے کو آپ سے بڑھ کر امین نہیں سمجھتے تھے۔
ہجرت کے موقع پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو پیچھے چھوڑنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ تمام لوگوں کی امانتیں واپس کر کے مدینہ آئیں۔

(مدارج النبوۃ)

تواضع

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
"مسلمانو! میری تعریف حد سے زیادہ نہ کرو جس طرح عیسائیوں نے ابن مریمؑ کی تعریف کی ہے کیونکہ میں خدا کا بندہ ہوں۔ پس تم میری نسبت اتنا ہی کہہ سکتے ہو کہ محمدؐ خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔"

(مدارج النبوۃ۔ زاد المعاد۔ شمائل ترمذی)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عصا پر ٹیک لگائے ہوئے ہمارے پاس تشریف لائے تو ہم آپ کے لیے کھڑے ہو گئے۔ آپ نے فرمایا۔
"جس طرح عجمی لوگ ایک دوسرے کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، اس طرح تم نہ کھڑے ہوا کرو۔ اور فرمایا، میں خدا کا بندہ ہوں، اسی طرح کھاتا ہوں جس طرح بندے کھاتے ہیں اور اسی طرح بیٹھتا ہوں جس طرح بندے بیٹھتے ہیں۔"
آپ کا یہ فرمانا آپ کی بردباری اور متواضعانہ عادت کریمہ کی وجہ سے تھا۔

(مدارج النبوۃ)

حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ ایک سفر میں چند صحابہؓ نے ایک بکری ذبح کرنے کا ارادہ فرمایا اور اس کا کام تقسیم فرما لیا۔ ایک نے اپنے ذمہ ذبح کرنا لیا۔ دوسرے نے کھال اتارنا۔ کسی نے پکانا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "پکانے کے لیے لکڑی اکٹھا کرنا میرے ذمہ ہے۔"
صحابہؓ نے عرض کیا "حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ کام ہم خود کر لیں گے۔"
"آپ نے فرمایا "یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ تم لوگ اس کو خوشی کر لو گے لیکن مجھے یہ بات پسند نہیں کہ میں مجمع میں ممتاز رہوں اور اللہ تعالیٰ بھی اس کو ناپسند فرماتے ہیں۔"

(خصائل نبویؐ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بازار آیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سراویل (پاجامہ) کو چار درہم میں خریدا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وزن کرنے والے سے فرمایا۔

"قیمت میں مال کو خوب کھینچ کر تولو (یعنی وزن میں کم یا برابر نہ تولو بلکہ زیادہ تولو)۔"

وہ شخص وزن کرنے والا حیرت زدہ ہو کر بولا "میں نے کبھی بھی کسی کو قیمت کی ادائیگی میں ایسا کہتے نہیں سنا۔"

اس پر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔

"افسوس ہے تجھ پر کہ تو اپنے نبی کو نہیں پہچانتا۔"

پھر تو وہ شخص ترازو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کو بوسہ دیا۔

آپ نے اپنا دست مبارک کھینچ کر فرمایا۔ "یہ عجمیوں کا دستور ہے کہ وہ اپنے بادشاہوں اور سربراہوں کے ساتھ ایسا کرتے ہیں۔ میں بادشاہ نہیں ہوں، میں تو تم ہی میں سے ایک شخص ہوں۔"

(یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ازراہ تواضع فرمایا۔ جیسا کہ آپ کی عادت کریمہ تھی) اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سراویل کو اٹھا لیا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آگے بڑھ کر ارادہ کیا کہ آپ سے سراویل کو لے لوں مگر آپ نے فرمایا۔

"سامان کے مالک کا ہی حق ہے کہ وہ اپنے سامان کو اٹھائے۔ مگر وہ شخص جو کمزور ہے اور اٹھا نہ سکے تو اپنے اس بھائی کی مدد کرنا چاہیے۔"

(مدارج النبوۃ)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پرانے پالان پر حج کیا۔ اس پر ایک کپڑا پڑا ہوا تھا۔ جو چار درہم کا بھی نہ ہوگا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا مانگ رہے تھے یا اللہ اس حج کو ایسا حج فرمائیو۔ جس میں ریا اور شہرت نہ ہو۔

(شمائل ترمذی)

جب مکہ فتح ہوا اور آپ مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ اس میں داخل ہوئے تو آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں عاجزی اور تواضع سے سر کو پالان پر جھکا دیا تھا۔ یہاں تک کہ قریب تھا کہ اس کے اگلے لکڑی کے سرے پر آپ کا سر لگ جائے۔

(کتاب الشفاء)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہؓ کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب کوئی شخص دنیا میں نہیں تھا۔ اس کے باوجود پھر بھی وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر اس لیے کھڑے نہیں ہوتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پسند نہ تھی۔

(شمائل ترمذی)

ایک مرتبہ نجاشی بادشاہ حبشہ کے کچھ ایلچی آئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی خاطر مدارت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تو صحابہؓ عرض کرنے لگے۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی خدمت کی سعادت ہمیں عنایت فرمائیے۔"

فرمایا "انہوں نے ہمارے صحابہ کی بڑی خدمت اور تکریم کی ہے۔ میں پسند کرتا ہوں کہ ان کا بدلہ ادا کر دوں۔"

(مدارج النبوۃ)

صاف دل ہونا

ابن مسعودؓ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تاکید فرمائی "تم میرے صحابہ میں سے مجھ سے کوئی شخص کسی کی کوئی بات نہ پہنچایا کرے کیونکہ میرا دل چاہتا ہے کہ جب میں تمہارے پاس آؤں تو میرا دل تم سب کی طرف سے صاف ہو۔"

(ابوداؤد و ترجمان السنہ کتاب الشفاء)

نرمی اور شفقت

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے خوش اخلاق تھے۔ ایک روز مجھے کسی ضرورت کے لیے بھیجا۔

میں نے کہا "خدا کی قسم میں نہ جاؤں گا اور میرے دل میں یہ تھا کہ جو حکم مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے اس کے لیے ضرور جاؤں گا۔"

پھر میں نکلا اور میرا گزر کچھ بچوں پر ہوا جو بازار میں کھیل رہے تھے۔ اتنے میں ناگاہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سر کے بال پیچھے سے پکڑ لیے۔ جب میں نے آپ کی طرف دیکھا تو آپ کو ہنستا پایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "انیس! تم وہاں

گئے تھے جہاں میں نے تم کو بھیجا تھا؟"

میں نے کہا "ہاں جاؤں گا یا رسول اللہ۔"

(مشکوٰۃ۔ حیاۃ المسلمین)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت۔ اس وقت سے کی جب کہ میں آٹھ برس کا تھا۔ میں نے آپ کی خدمت دس برس تک کی۔ آپ نے کسی بات پر جو میرے ہاتھ سے ہوئی مجھے ملامت نہیں کی۔ اگر اہل بیت میں سے کسی نے بھی ملامت کی تو آپ نے فرمایا۔

"اس کو چھوڑ دو اگر تقدیر میں کوئی بات ہوتی ہے تو ہو کر رہتی ہے۔"

(مشکوٰۃ)

ایثار و تحمل

ایک روایت ہے کہ زید بن شعنہ پہلے یہودی تھے۔ ایک مرتبہ کہنے لگے۔

"نبوت کی علامتوں میں سے کوئی بھی ایسی نہیں رہی جس کو میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں نہ دیکھ لیا ہو بجز دو علامتوں کے جن کے تجربے کی اب تک نوبت نہیں آئی تھی۔ ایک یہ کہ آپ کا حلم آپ کے غصہ پر غالب ہوگا۔ دوسرے یہ کہ آپ کے ساتھ کوئی جتنا بھی جہالت کا برتاؤ کرے گا۔ اسی قدر آپ کا تحمل زیادہ ہوگا۔ میں ان دونوں کے امتحان کا موقع تلاش کرتا رہا اور آمد و رفت بڑھاتا رہا۔ ایک دن آپ حجرے سے باہر تشریف لائے۔ حضرت علیؓ آپ کے ساتھ تھے۔ ایک بدوی جیسا شخص آیا اور عرض کیا۔

"یا رسول اللہ! میری قوم مسلمان ہو چکی ہے اور میں نے ان سے یہ کہا تھا کہ مسلمان ہو جاؤ گے تو بھرپور رزق تم کو ملے گا۔ اور اب حالت یہ ہے کہ قحط پڑ گیا۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ اسلام سے نہ نکل جائیں۔ اگر رائے مبارک ہو تو آپ کچھ اعانت ان کی فرمائیں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کی طرف جو غالباً حضرت علیؓ تھے، دیکھا تو انہوں نے عرض کیا۔

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم موجود تو کچھ نہیں رہا۔"

زید (جو اس وقت تک یہودی تھے) اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ کہنے لگے۔

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ ایسا کر سکیں کہ فلاں شخص کے باغ کی اتنی کھجوریں وقت معین پر مجھے دے دیں تو میں قیمت پیشگی دے دوں اور وقت معین پر کھجوریں لے لوں گا۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یہ تو نہیں ہو سکتا۔ البتہ اگر باغ کی تعیین نہ کرو تو میں معاملہ کر سکتا ہوں۔"

میں نے اس کو قبول کر لیا اور کھجوروں کی قیمت اسی مثقال سونا (ایک مثقال مشہور قول کے موافق ساڑھے چار ماشے کا ہوتا ہے) دے دیا۔

آپ نے وہ سونا اس بدوی کے حوالے کر دیا اور فرمایا "انصاف کی رعایت رکھنا اور اس سے ان کی ضرورت پوری کر دو۔"

زید کہتے ہیں "جب کھجوروں کی ادائیگی کے وقت میں دو تین دن باقی رہ گئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کے ساتھ جن میں ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی تھے، کسی کے جنازے کی نماز سے فارغ ہو کر ایک دیوار کے قریب تشریف فرما تھے۔ میں آیا اور آپ کے کرتے اور چادر کے پلو کو پکڑ کر نہایت ترش روئی سے کہا۔

"اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ میرا قرضہ ادا نہیں کرتے۔ خدا کی قسم میں تم سب اولاد عبدالمطلب کو خوب جانتا ہوں کہ بڑے نادہند ہو۔"

حضرت عمرؓ نے غصے سے مجھے گھورا اور کہا۔

"اے خدا کے دشمن! یہ کیا بک رہا ہے۔ خدا کی قسم! اگر مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ڈر نہ ہوتا تو تیری گردن اڑا دیتا۔"

لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہایت سکون سے مجھے دیکھ رہے تھے اور تبسم کے لہجے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔

"عمر! میں اور یہ ایک اور چیز کے زیادہ محتاج تھے، وہ یہ کہ مجھے حق ادا کرنے میں خوبی برتنے کو کہتے اور اس کو مطالبہ کرنے میں بہتر طریقے کی نصیحت کرتے۔ جاؤ اس کو لے جاؤ۔ اس کا حق ادا کر دو۔ اور تم نے جو اسے ڈانٹا ہے اس کے بدلے بیس صاع (تقریباً دو من کھجوریں) زیادہ دے دینا۔"

حضرت عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ مجھے لے گئے اور پورا مطالبہ اور بیس صاع کھجوریں زیادہ دیں۔ میں نے پوچھا "یہ بیس صاع کیسے؟"

حضرت عمرؓ نے کہا۔
"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی حکم ہے۔"
زید نے کہا "عمر! تم مجھ کو پہچانتے ہو؟"
انہوں نے فرمایا "نہیں۔"
میں نے کہا "میں زید بن شعنہ ہوں۔"
انہوں نے فرمایا "جو یہود کا بڑا علامہ ہے۔"
"میں نے کہا "ہاں وہی ہوں۔"
انہوں نے فرمایا "اتنا بڑا آدمی ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تم نے یہ کیا برتاؤ کیا؟"

میں نے کہا "علامات نبوت میں سے دو علامتیں ایسی رہ گئی تھیں، جن کا مجھ کو تجربہ کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ایک یہ کہ آپ کا علم آپ کے غصے پر غالب ہوگا اور دوسرے یہ کہ ان کے ساتھ سخت جہالت کا برتاؤ ان کے حلم کو بڑھا دے گا۔ اب ان دونوں کا بھی امتحان کر لیا۔ اب میں تم کو اپنے اسلام کا گواہ بناتا ہوں، اور میرا آدھا مال امت محمدیہ پر صدقہ ہے۔"

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس آئے اور اسلام لے آئے۔

اس کے بعد بہت سے غزوات میں شریک ہوئے اور تبوک کی لڑائی میں شہید ہو گئے۔

(جمع الفوائد، خصائل نبوی)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالٰی عنہ سے روایت کی ہے کہ ایک مرتبہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہا تھا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن مبارک میں نجرانی سخت حاشیہ دار چادر تھی۔ ایک اعرابی نے قریب آکر چادر کو پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کھینچا اور چادر کو سخت کھینچنے لگا۔

حضرت انس رضی اللہ تعالٰی عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن مبارک کی طرف دیکھا تو سخت حاشیہ دار لپیٹ نے آپ کی گردن مبارک کو چھیل دیا تھا۔

اس کے بعد اعرابی کہنے لگا۔

"اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالٰی کے اس مال میں سے جو آپ کے پاس ہے، مجھے دینے کا حکم فرماویں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف دیکھ کر تبسم فرمایا اور مجھے اس کو دینے کا حکم فرمایا۔

(مدارج النبوۃ)

ایک دفعہ مکہ میں قحط پڑا۔ لوگوں نے ہڈیاں اور مردار بھی کھانے شروع کر دیے۔

ابو سفیان جو ان دنوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمن تھے۔ آپ کی خدمت میں آئے اور کہا۔

"محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) تم لوگوں کو صلہ رحمی کی تعلیم دیتے ہو۔ تمہاری قوم ہلاک ہو رہی ہے، اپنے خدا سے دعا کیوں نہیں کرتے؟"

گو قریش کی ایذا رسانی اور شرارتیں انسانیت کی حدود کو بھی پھلانگ گئی تھیں، لیکن ابو سفیان کی بات سن کر فوراً آپ کے دست مبارک دعا کے لیے اٹھ گئے۔

اللہ تعالٰی نے اس قدر مینہ برسایا کہ جل تھل ہو گیا اور قحط دور ہو گیا۔

(صحیح بخاری، تفسیر سورہ دخان)

زہد و تقویٰ

حضرت انس رضی اللہ تعالٰی عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالٰی سے دعا کرتے تھے۔

"اے اللہ! مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھ اور مسکینی کی حالت میں دنیا سے اٹھا اور مسکینوں کے گروہ میں میرا حشر فرما۔"

(جامع ترمذی، بیہقی، ابن ماجہ، معارف الحدیث)

آپ سے کیا پردہ

مصنف: ابن انشاء جی

تبصرہ: ثمانزہ غلام نبی

پھر بہار آئی ہے پھر کلیوں نے مہکائے ہیں بن
لیکن اے یارو! خزاں اچھی کہ سینے کی جلن
چاند کن پیڑوں کی شاخوں میں الجھ کر رہ گیا
اس اندھیرے میں قیامت ہو چلی جی کی زکھن
اپنی راتوں کی فغاں تیری صدائے پی کہاں
اے پپیہے! اپنی قسمت میں کہاں پی کا ملن

اداس فضاؤں میں رکھتے ہوئے دل کو پہلو میں لیے چاند کی اور تکتے تکتے انشا جی نے گیت "کبت کی بنسی" بن ورد بھری مان لگائی۔ سننے والوں نے اس کو تمام "شام نیا" اور ان کی آنکھوں میں اداسی بھر بھر دینے تلی لو رکی لو اسی جب درد بن کر دل میں اتر گئی اور اس کی شدتیں حدوں کو چھونے لگیں تو انشا جی کے یہاں ایک نئے زاویہ فکر نے جنم لیا۔ انہوں نے دکھتے ہوئے دل کو ہنسی ہنسی میں تھپکنا شروع کر دیا کہ ایک زمانہ ان کے تراشے ہوئے فقروں میں زندگی کی المناک بے ترتیبی کو مزاح کے پیراہن میں نہ صرف دیکھنے لگا۔ بلکہ بڑی درد مندی اور توجہ سے اسے ترتیب دینے کے بارے میں سوچنے بھی لگا اور یہی خصوصیت ہے کہ ابن انشاء بطور مزاح نگار آج بھی بہت دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔

ابن انشاء ایسے مزاح نگار کے طور پر نمایاں ہوئے کہ جو "بذات خود" کو ایک کردار فرض کرتے ہوئے اپنی ہنسی اڑا سکتے ہیں۔ اور یہ بڑے حوصلے اور ہنرمندی کا کام تھا۔

"آپ سے کیا پردہ" کے عنوان سے۔ ایک عرصے تک کالم نگاری کی اور اپنے دور کے اہم اور غیر اہم واقعہ کو تاریخ اور دستاویز کی شکل میں محفوظ کر دیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ وقت بدل گیا، حالات بدل گئے مگر واقعات اسی طرح اسی انداز میں جنم لے رہے ہیں۔ ان کالموں کی فضا میں "آج" کو اسی طرح دیکھا جا سکتا ہے۔ "آپ سے کیا پردہ" اب کتاب کی صورت میں شائع ہو چکی ہے۔ آج اسی کتاب سے کچھ اقتباسات آپ کے لیے پیش خدمت ہیں۔

75ء میں لکھا گیا کالم کا یہ اقتباس: دیکھیے کہ امریکہ آل نب آج بھی کچھ نہیں بدلا۔ ابن انشاء نے مخصوص انداز میں یہ سیاسی صورت حال واضح کی ہے۔ جبکہ آج بھی ان کی خارجہ پالیسی اسی انداز میں چل رہی ہے۔

"میاں کسنجر! کیسا رہا تمہارا دورہ؟"

"بہت اچھا رہا مسٹر پریذیڈنٹ!" کسنجر نے کہا۔ "میں جہاں گیا لوگوں کو اپنے ڈھب پر لے آیا۔ اپنی بات منوا کر اٹھا۔ مثلاً "میں نے اندرا گاندھی کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اپنے تیل کی قیمت دس ڈالر فی بیرل کم کر دیں۔"

"لیکن ہنری! ہندوستان تو تیل برآمد کرتا ہی نہیں۔"

اچھا؟ یہ بات ہے، تب ہی میں کہوں کہ مسز گاندھی نے اتنی جلدی کیسے میری درخواست پر صاد کر دیا۔"

"اچھا تو روس میں بات چیت کیسی رہی؟"

"بہت اچھی رہی ہم مسٹر بریژنیف کو ایک اٹامک انرجی پلانٹ دے رہے ہیں۔"

"ہیں؟ روس کو ایک انرجی پلانٹ؟ آپ کو تو ان سے کہنا تھا کہ اپنے جوہری ہتھیاروں میں کمی کر دیں۔"

"لیکن یہ بات تو میں نے بنگلہ دیش سے منوا لی ہے۔ مسٹر پریذیڈنٹ! کہ جوہری ہتھیار بنانا کم کر دیں۔ انہوں نے وعدہ بھی کر لیا ہے کہ وہ امریکہ کی خواہش کے احترام میں اس سال ایٹم بموں کی تیاری روک دیں گے۔"

"اصل میں غلطی میری ہے ہنری! مجھے تم کو ایک ساتھ اتنے سارے ملکوں میں نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔ آدمی واقعی بوکھلا جاتا ہے۔ تم پاپائے روم سے بھی ملے۔"

"جی ہاں ملا۔ انہوں نے مجھے شرف باریابی بخشا۔ میں نے انہیں آپ کا پیغام دے دیا۔"

"کون سا پیغام بھلا۔"

"یہی کہ وہ امریکہ سے نئے لڑاکا ہوائی جہازوں کے اسکواڈرن خرید یں۔"

"خوب اچھا میں تم سے آخری سوال کرتا ہوں۔ اگر تم نے یورپ سے لڑاکا جہازوں کے اسکواڈرن خریدنے کی فرمائش کی ہے تو ہمارے لیے دعا کرنے کو کس سے کہا۔"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ شاہ فیصل سے۔"

☼ ☼ ☼

ابن انشاء سیاسی صورت حال کو نظر میں رکھتے ہیں۔ اور

یہی سیاسی بالغ نظری ان کے کالموں میں بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ بھارت اور چین کے تعلقات کو کس شگفتگی سے بیان کرتے ہیں۔ ذرا دیکھیے۔

"بھارت کی افواج قاہرہ ادھر سے مار کھانے کے بعد دانت تیز کر رہی تھیں کہ مشرقی پاکستان کا رخ کیا جائے لیکن کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ چین نے الٹی میٹم دیا کہ "تم نے جو چھپن ناجائز چوکیاں ہماری سرحد کے اندر بنا رکھی ہیں، اٹھاؤ ان کو ورنہ" بھارت کی چیں بول گئی۔

پہلے تو بھارت نے کہا: "ہماری کوئی چوکیاں وہاں نہیں۔"

چین والے کھنکارے تو کہا۔

"اگر ہیں تو بہت چھوٹی ہیں۔"

چین نے پھر آنکھیں دکھائیں تو بولے: "اگر چھوٹی نہیں بھی تو ان میں سپاہی تھوڑا ہی ہیں۔"

جب یہ ثابت ہو گیا کہ سپاہی ہیں تو کہا: "بالفرض ہیں بھی تو کیا ہوا۔ چین ہم سے پہلے کہتا ہم پہلے چوکیاں خالی کر دیتے۔ اتنی ابے تبے کی کیا ضرورت تھی۔ آخر ہم بھی عزت دار ہیں۔"

❁ ❁ ❁

ایک "کتاب میلے" کی روداد سنیے۔ ابن انشاء نے کس قدر ہلکے پھلکے انداز میں ہماری "بڑی محرومی" کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"کتاب میلے کے ہفتے میں ہمیں ہر طرف بچے ہی بچے اور کتابیں ہی کتابیں نظر آئیں۔ بچے آخر بچے ہیں۔ کتابوں پر پلے پڑ رہے تھے۔ جوں جوں بڑے ہوتے جائیں گے سر حقیقت ان کے ہاتھ آتا جائے گا اور ان میں سے چند ایک یقیناً "اس رتبۂ اعلا کو پہنچیں گے جو ہمارے ایک مشہور ماہر تعلیم نے حاصل کیا تھا۔ ان کے جاننے والوں کا بیان ہے کہ وہ فخریہ کہتے تھے "میرے گھر میں کوئی کتاب نہیں سوائے ٹیلی فون ڈائریکٹری کے۔ آخری کتاب انہوں نے 1925ء میں پڑھی تھی، جب لندن میں زیر تعلیم تھے۔" یہ بات ان کی ترقی درجات میں بہت ممد ہوئی۔ آج کچھ ہیں مکمل ترقی کر کے ریٹائر ہو گئے۔ پھر تو ان کی اس میدان میں عظمت کا ایسا شہرہ ہوا کہ تعلیم اور کتابوں کے متعلق کوئی کام ان کے مشورت کے بغیر نہ ہوپاتا تھا۔

کراچی کے ایک مشہور سیٹھ سے ہماری ایک بار گفتگو ہو رہی تھی۔ ہم ان سے یہ سن کر خوش ہوئے کہ جب تک وہ رات کو اپنے دفتر کی تمام کتابیں نہ پڑھ لیں ان کو نیند نہیں آتی ہم نے ان کے نام پوچھے تو پتا چلا کہ ان کا مطلب اکاؤنٹ بکس سے ہے۔ یعنی کھاتے کی کتابیں۔ ان ہی کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ اتنی دلچسپ ہوتی ہیں کہ بار بار پڑھ کر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔"

☼ ☼ ☼

سادگی و بھولپن سے بات سے بات نکالنا بھی انشا کا خاصا ہے۔ بے معنی سی باتوں کی تہوں سے شگفتگی کی لہریں، طبیعت کو گدگدا کر رکھ دیتی ہیں۔ یہ پیراگراف دیکھیے۔

"ریڈیو کے اسی اشتہار سے معلوم ہوا کہ یہ سیمنٹ کوئی آج کی ایجاد نہیں بلکہ تیس سال سے استعمال ہو رہا ہے۔ اشتہار میں یہ دعوا بھی کیا گیا ہے کہ کراچی کے سب ہی آثار قدیمہ اسی سیمنٹ سے بنے ہیں۔

ہم نے کمپنی والے کے منیجر سے پوچھا کہ فریئر ہال کی تعمیر میں کتنا سیمنٹ لگا ہو گا۔ بولے وہ تو معمولی چونے پتھر کا ہے۔ دیکھ لیجیے گا وہ تین سو سال میں گر جائے گا۔"

ہم نے پوچھا کہ پھر کراچی کے کن آثار قدیمہ کی طرف اشارہ ہے۔ بولے "وہ جو پچھلے تیس سال میں بنے ہیں۔"

ادھر سے مطمئن ہو کر ہم نے مصر کے اہرام کی بات چھیڑی تو منیجر صاحب نے کہا "آپ اور میں زندہ ہیں تو ان شاء اللہ میں دکھا دوں گا کہ یہ اہرام دس بارہ ہزار سال اور کھنچیں گے۔ اس کے بعد ان میں کہیں نہ کہیں دراڑیں پڑیں گی یا پتھر کھسکنے شروع ہوں گے۔ ہم اپنے سیمنٹ کے ساتھ گارنٹی دیتے ہیں کہ فلاں مدت کے اندر عمارت میں نقص ہو جائے تو اس کی مرمت کے لیے سیمنٹ دس فی صدی رعایت پر دیں گے۔ کیا آپ تاج محل، اہرام مصر، لندن ٹاور وغیرہ کے متعلق اس قسم کی گارنٹی پیش کر سکتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

بڑے شہروں کے بڑے مسائل تو ہیں ہی۔ چھوٹے چھوٹے مسائل بھی کچھ کم نہیں۔ اخبارات پڑھو تو پتہ چلے گا ہم کسی "مسائلستان" میں رہ رہے ہیں۔" اس کے علاوہ جو خبریں اخبارات میں شائع ہو رہی ہیں وہ تقریب رونمائیوں کی ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک سے بڑھ کر ایک عظیم ادیب پیدا ہو رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ادب کے بارے میں ہم کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ ایسی ہی ایک تقریب کے بارے میں ابن انشاء نے بھی کالم لکھا۔

"مجنوں گورکھپوری ہمارے ادب کی مایۂ ناز ہستی ہیں۔ جیسا کہ مجنوں یعنی قیس عامری سلسلہ بھی دیکھیے تو رشک کرتے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے نہ ہاتھ میں طاقت ہے نہ آنکھوں میں دم ہے اور بولتے ہیں تو لوگ حیران ہوتے ہیں کہ از کجای آید ایں آواز دوست۔ لیکن اخلاق ایسا ہے کہ ہر جلسے میں پہنچنے میں انکار نہیں کرتے۔ تقریر بھی کرتے ہیں۔ علم کا دریا ہیں۔ لیکن یہ دریا بعض اوقات تقریر کے کوزے میں پوری طرح بند نہیں ہو پاتا۔ بہت سا پانی ادھر ادھر بہہ جاتا ہے۔ ہم نے کتابوں کے افتتاح کے کئی جلسوں میں انہیں سنا ہے۔ ان کا پہلا فقرہ عموماً "یہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب میں نے نہیں پڑھی یا پوری نہیں پڑھی۔ یہاں سے جا کر پڑھوں گا۔ اس کے بعد ادب کی ابدی صداقتوں پر آجاتے ہیں۔ یہاں بھی ان کی تقریر کی یہی شان تھی۔ خدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ۔ بولنے کو کھڑے ہوئے تو اسٹیج پر زلزلہ سا آگیا۔ کچھ لوگ سمجھے مائیکروفون گر رہا ہے۔ کچھ سمجھے مجنوں صاحب گر رہے ہیں۔ آخر انہوں نے وضاحت کی کہ "میں نہیں گر رہا۔ مائیکروفون کو کوئی آکر سنبھالے۔"

❁ ❁ ❁

شگفتگی کا یہ انداز اور مسئلے کا یہ بیان، ابن انشاء کا ہی خاصا ہے۔

"بہت دن ہم ٹیکس تو کے ڈی اے کو دیتے رہے اور پانی باہر سے بالٹیوں میں منگاتے رہے کیونکہ وہ دن حب الوطنی کے تھے۔ جس چیز کی قلت اور گرانی کی شکایت ہم کرتے، جواب ملتا کہ اسے بیرون ملک برآمد کر کے زر مبادلہ کمایا جا رہا ہے۔ چاول کے ساتھ یہ ہوا تھا ہم نے یہ سمجھ لیا کہ پانی بھی برآمد کر کے زر مبادلہ کمایا جا رہا ہے۔ لہٰذا شکایت کرنا ٹھیک نہیں۔ ٹھیک کے علاوہ شکایت کرنا قرین مصلحت بھی نہ تھا۔ کیونکہ یک بارگی جو بھی نظام حکومت بدلا، اور لوگوں نے نئے سرے سے پانی مانگا۔ تو حکومت نے لوگوں کے گھروں کے باغیچے کٹوا دیے۔ انعام درانی کچھ دن خوب لڑے انتظامیہ کے کالموں اور نظموں کی فرولیاں بھونکتے رہے۔ آخر ہار کر بیٹھ گئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کوئی آکے مکان بھی ڈھا دے کہ اس کی وجہ سے پانی کی قلت ہے۔ یہ وہ زریں دور تھا جب دودھ، دہی کی دکانوں پر جالیاں لگائی جا رہی تھیں، اور جمعداروں کی فوج ظفر موج سڑکوں پر نمودار ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ ہمیں اپنے اور پڑوسی کے کل وقتی جمعدار گھسیٹا مسیح کے متعلق پہلی بار معلوم ہوا کہ دراصل کارپوریشن کا تنخواہ دار ہے۔ لیکن یہ چار دن کی چاندنی تھی، اس کے بعد وہی ہوا، جو چار دن کی چاندنی کے بعد ہوتا ہے۔"

❁ ❁ ❁

ابن انشاء کے یہاں مزاح کے ساتھ ساتھ "طنزِ ملیح" بھی اکثر جگہوں پر ملتا ہے۔ کاٹ اور تیکھا پن ایسا نہیں کہ پڑھنے والے کا جگر چھلنی ہو جائے۔ وہ ہلکی ہلکی ضرب، شگفتگی سے لگاتے ہیں کہ بات بوجھل نہیں ہوتی۔

طالب علموں کی "لیاقت" کے بارے میں ان کا بیان سنیے۔

"ہمیں معلوم نہیں کراچی یونیورسٹی میں وسعت معلومات کے لیے کیا نسخہ استعمال کیا جاتا ہے۔ جب بھی کبھی انعامی معلومات کا مقابلہ ہوا، کراچی یونیورسٹی کے طلباء نے شہر کے کالج کے طالب علموں کے مقابلے میں ممتاز حیثیت حاصل کی۔ ایک مقابلہ تو ہم نے بھی سنا جس میں اسے تیسرا درجہ حاصل ہوا، جبکہ دوسرے کالج پہلے اور دوسرے نمبر پر رہے "آگے نہ بڑھ سکے۔ اس مقابلے کو سن کر ہمیں پہلے پہل ڈھاکے کی بندرگاہ کا پتا چلا۔ یہ بھی یونیورسٹی ہی کے ایک فرزند نے بتایا کہ ایٹم بم آبدوزوں کو ڈبونے کے کام آتا ہے اور اسی جامعہ کے ایک ہونہار طالب علم نے بتایا کہ سکندر اعظم نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے تھے۔ اس مسئلے پر بعد میں تھوڑا اختلاف بھی ہوا۔ کیونکہ ایک طالبہ کو اصرار تھا کہ سترہ حملے سکندر اعظم نے نہیں بابر نے کیے تھے۔ ایک اور صاحب نے جہانگیر کا نام بھی لیا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ کسی نہ کسی بادشاہ نے ہندوستان پر سترہ حملے ضرور کیے تھے۔ سولہ یا اٹھارہ نہیں۔ اس قطعی اور درست جواب کے بعد یہ مسئلہ محض ضمنی اور فروعی حیثیت اختیار کر لیتا ہے کہ وہ بادشاہ کون تھا۔ یہ اتنی پرانی بات ہے کہ اس بحث میں جانا محض گڑے مردے اکھاڑنا ہے۔

* * *

آج تک اربابِ اقتدار کی طرف سے یہی بیان آتے رہے ہیں کہ شہر کے امن کو تباہ کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ابن انشاء نے ایک عرضی لکھی ہے شرپسندوں کی طرف سے۔ ان کا موقف دیکھیے۔

حضور والا!

ہم شہر بڑا کے شرپسند، شہر کا امن تباہ کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ جو ہمیں امید ہے ضرور عطا کی جائے گی۔

جناب والا! حکیم الامت نے فرمایا ہے کہ۔

پلٹ کر جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا
لہو گرم کرنے کا ہے اک بہانہ

آپ تسلیم کریں گے کہ جس قوم کے لوگ آپس میں نہیں لڑ سکتے۔ وہ باہر والوں سے کیا لڑیں گے۔

جناب والا! امن کو درہم برہم کرنا ہمارا کاروبار ہے اور روز افزوں گرانی نے ہماری کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ چاقو اور خنجر مہنگے ہو گئے ہیں اور لاٹھیاں تک، کیونکہ بانس مشرقی پاکستان سے آتا تھا۔ اگر سرکار ہمیں زنٹے، چاقو اور ناجائز اسلحہ رعایتی نرخوں پر مہیا کرے تو غریب نوازی یعنی شر نوازی ہو گی۔

* * *

ابن انشاء نے بے ڈھب، بوالعجب کرداروں سے کہیں بھی مزاح پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ عموماً وہ واحد متکلم میں ہی واقعات بیان کرتے ہیں۔ ان کے یہاں کردار آتے بھی ہیں تو وہ زندگی سے بہت قریب عام سے لوگ ہوتے ہیں۔ جن سے ہمارا واسطہ ہمہ وقت پڑتا ہے۔ وہ انسانی نفسیات کو بہت حقیقت پسندی سے دیکھتے ہیں۔ شیخ سدو سے بات چیت دیکھیے۔

"شیخ سدو ہمارے پرانے دوست ہیں۔ یہ وہ شیخ سدو نہیں جن کا ذکر عملیات اور جادو ٹونے کی کتابوں میں پایا جاتا ہے اور غالباً" ان کے مورثِ اعلا تھے۔ اس وقت ہماری مراد شیخ صدر الدین سے ہے جن کی صدر میں صدریوں کی دکان ہے۔ عرصہ تین سال کا ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک دو دن کی واپسی کے وعدے پر ہم سے پچاس روپے لیے تھے۔ وجۂ قرض اب ہمیں یاد ہے نہ انہیں۔ انہیں تو خیر کئی بار یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ انہوں نے کبھی ہم سے یہ رقم لی تھی۔ کاروبار کے ہجوم میں ایسا ہونا قدرتی ہے۔ لیکن ہم اس کو کسی طرح نہیں بھولے اور یہ قرض کا رشتہ ہی اب بہت دنوں سے ہماری دوستی اور ملاقات کی وجہ ہے۔ اس واقعے سے پہلے ہماری ان سے سر راہے یا کسی بیاہ شادی میں ملاقات ہو جاتی تھی ورنہ نہیں، کیونکہ وہ رسالہ نہیں

نکالتے جس کے لیے مضمون لینا پڑے اور ہم صدریاں نہیں خریدتے پہنتے کہ نئی روشنی کے آدمی ہیں۔ لیکن اب تو یہ عالم ہے کہ دل ان میں لگا رہتا ہے۔ کسی کام سے ادھر جائیں تو ان کی دکان کا پھیرا کیے بغیر نہیں آ سکتے۔ دل ہی نہیں مانتا۔ بڑے پاک سے مزاج شریف ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے کئی بار تو ہمیں اپنے سے بھی شرمندگی ہوتی ہے کہ اتنے خلوص کے آدمی سے پچاس روپے کی حقیر رقم کا ذکر چھیڑ بیٹھتے ہیں۔ لیکن بندہ بشر ہے۔ بعض اوقات حرف مطلب زبان پر آ ہی جاتا ہے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ براہ راست نہ کہنا پڑے بلکہ گفتگو میں پچاس کا لفظ بار بار آئے جس سے ان کی یادداشت عود کر آئے "مثلاً" اس قسم کے فقرے ان سے گفتگو میں ہم سے اکثر سرزد ہوتے ہیں۔

"آج سیلون کی ٹیم نے پچاس رن کیے ہیں۔"

"روس کے انقلاب کو پچاس سال ہونے والے ہیں۔"

"صدر کے علاقے میں تو پچاس گداگر ہیں بھئی۔"

"اب ہمارا گھٹنے کا درد پچاس فیصدی رہ گیا ہے۔"

ان فقروں کا کچھ اثر نہ دیکھ کر ہم از راہ کمینگی نیم براہ راست بات بھی کہہ جاتے ہیں کہ "حکومت نے پچاس روپے والے نئے نوٹ جاری کیے ہیں۔ بڑے خوبصورت ہیں۔ تم نے دیکھے۔" نتیجہ اس کا بھی کچھ نہ نکلا۔

* * *

ابن انشاء کے یہاں بے ساختگی بلا کی ہے۔ وہ بھاری بھر کم الفاظ کے الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرنے کے بجائے یونہی سے انداز میں بات کرتے چلے جاتے ہیں کہ عجب صورت حال کی تصویر سی بن جاتی ہے۔ ریڈیو پاکستان کے ایک پروگرام کا احوال سنیے۔

"پچھلے دنوں ریڈیو پاکستان کے ہفتہ خواتین میں بھی پکے پکے گانوں کا اہتمام ہوا، لیکن ریڈیو والوں نے افراط و تفریط سے کام لیا۔ کچے گانے بہت ہی کچے رہ گئے تھے اور بے زیادہ پک گئے تھے، بلکہ جل گئے تھے۔ پھر بھی کچے گانوں کی حد تک خیریت رہی، البتہ پکے گانوں پر ویڈیو نے تو بمرانا اودھم مچانا شروع کیا۔ جو بچے چپ تھے رونے لگے اور جو رو رہے تھے یکایک چپ ہو گئے۔ ایک بزرگ دوڑے آئے کہ کیا ہو رہا ہے۔

ہم نے کہا "کچھ نہیں ہو رہا، بس بھاگیشری کا خیال ہو رہا ہے۔" بولے "یہ بی بھاگیشری کون ہیں اور اظہار خیال کا یہ کون سا طریقہ ہے۔"

ابھی ہم جواب سوچ ہی رہے تھے کہ ایک اور بزرگ راگ خیال کے آ گئے اور دو منٹ تک کمرے بغور سنتے رہے اس کے بعد یہ فرما کر چل دیے کہ۔

آج سمجھ میں آیا اسلام نے موسیقی کو کیوں حرام قرار دیا۔

* * *

ابن انشاء ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ مگر ان کی پُر لطف پُر مزاح باتیں "آپ سے کیا پردہ" کے عنوان سے اس کتاب میں محفوظ ہیں۔ کسی بھی صفحے سے کوئی بھی فقرہ پڑھ کر محظوظ ہوا جا سکتا ہے۔ یہ اس کتاب کی عطا ہے۔

فوزیہ تبسم اور آغا شاہد سے باتیں

مشہلا نرگس

فوزیہ تبسم اور ان کے شوہر آغا شاہد دونوں ہی فنکار کمپیئر اور ہدایت کار ہیں۔ فوزیہ کالج میں پڑھاتی ہیں۔ شاعری کرتی ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ مشہور شاعر صوفی تبسم کی پوتی ہیں۔ آج کل دونوں پی ٹی وی کے لیے ڈرامہ سیریل "ٹوٹ بٹوٹ" کی ریکارڈنگ میں مصروف ہیں

ایم 100 سے پیش کیا جاتا ہے انہوں اپنے شوہر کے ساتھ پی ٹی وی کے مختلف ڈرامے بھی کیے وہ افسانہ نگار بھی ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ چھپ چکا ہے اس کے علاوہ ان کی پینٹنگز کی نمائشیں بھی ہوتی رہتی ہیں اس حوالے سے وہ نیشنل لیول کا ایوارڈ بھی حاصل کر چکی ہیں۔

وہ الحمرا آرٹس کونسل میں ٹوٹ بٹوٹ فیسٹیول ترتیب دیتے ہیں جس میں مختلف اسکولوں کے بچوں کے علاوہ اسپیشل بچے بھی حصہ لیتے ہیں۔ اور اس کا میوزک اور کمپوزنگ آغا شاہد ترتیب دیتے ہیں۔

وہ دونوں مختلف ڈراموں کی ہدایت کاری کے فرائض بھی سرانجام دے چکے ہیں۔ فوزیہ آج کل پنجاب یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر کے طور پر کام کر رہی ہیں اور علامہ اقبال یونیورسٹی کے بھی سبجیکٹس پڑھاتی ہیں۔ وہ وحدت روڈ کالج میں استاد بھی ہیں اسکرپٹ رائٹر ہیں اور الحمرا کے علاوہ ریڈیو کے لیے لکھتی ہیں اور ایف ایم کے ایک پروگرام "شب غزل" کی کمپیئرنگ کرتی ہیں جو ایف

وہ صوفی تبسم اکیڈمی کی چیئرپرسن بھی ہیں اور صوفی تبسم پر لکھے گئے تمام مضامین کو اپنے والد کے مشوروں سے ترتیب دے رہی ہیں۔ "ٹوٹ بٹوٹ" کیسٹ انہوں نے اپنے شوہر کے ساتھ مل کر ترتیب دی ہے جس میں ان کی آواز میں بعض نظمیں ریکارڈ کی گئیں۔

باقاعدہ بات چیت ہوئی تو ہم نے فوزیہ سے پوچھا۔

س: بچوں کے پروگرامز کی تشہیر کے لیے کیا دعوت نامے بھجواتی ہیں یا اخبارات میں اشتہار دیتی ہیں؟

ج: اشتہارات کے لیے ہمارا بجٹ نہیں ہوتا۔ بچوں کے والدین خود یا پھر مختلف اسکولوں کی انتظامیہ رابطے میں رہتی ہے کہ اگلا پروگرام کب شروع ہو رہا ہے۔ خصوصی

پروگرامز کے لیے دعوت نامے بھی بھجوائے جاتے ہیں۔

س: پروگرامز اسپانسر کرواتی ہیں یا اپنی جیب سے ترتیب دیتی ہیں۔ ایک پروگرام میں کتنے بچوں کے پرفارم کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔؟

ج: دکھ اس بات کا ہے کہ بچوں کے پروگرام کے لیے کوئی اسپانسر نہیں ملتا جبکہ ناچ گانے والے پروگرام کے لیے اسپانسر مل جاتے ہیں۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں تعیش معقول پروگرامز کے لیے لاکھوں تک خرچ کر دیتی ہیں مگر فلاحی کاموں کے حوالے سے سخت مایوسی ہوتی ہے۔ پروگرامز

س: آپ صرف بچوں کے لیے ہی ڈرامے ترتیب دیتی ہیں؟

ج: نہیں ہم ٹوٹ بٹوٹ کے علاوہ بھی مختلف موضوعات پر ڈرامے تیار کرتے ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ہم نے اپنے چچا کا لکھا ہوا ملے ترج اکھاں وارث شاہ نوں بھی پیش کیا تھا ہماری کاوش کو سراہتے ہوئے گورنر پنجاب خالد مقبول صاحب نے ہمیں ایوارڈز سے بھی نوازا تھا۔ ۶ ستمبر کے موقع پر پاک فوج کو سلام پیش کیا۔ الحمرا نسرا میں ایک پروگرام "اے پتر ہٹاں تے نئیں وکدے" ملی

میں بچوں کے کھانے پینے اور تحائف دینے کے لیے ہمیں اپنی مدد آپ کے تحت انتظامات کرنا پڑتے ہیں۔ پچھلے سال چیئرمین پولٹری ایسوسی ایشن جناب رضا محمود خورشید نے ایوارڈز اور میڈلز عطا کر دیے تھے۔ ایک پروگرام میں لگ بھگ ایک سو پچاس بچے پرفارم کرتے ہیں ان پروگرامز کی آغا شاہد اور سحر عباس ہدایات دیتے ہیں۔ میں اسکرپٹ لکھتی ہوں اور میزبانی کے فرائض سرانجام دیتی ہوں۔ میرے ساتھ پی ٹی وی اسٹار شائستہ جبیں اور نگہت راشد معاون ہوتی ہیں۔ اس پروگرام میں جو ایک سو پچاس بچے پرفارم کرتے ہیں (صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی نظموں پر) ان میں تحائف اور میڈلز بھی تقسیم کیے جاتے ہیں۔"

نغموں کا پروگرام ترتیب دیا آغا شاہد اس کے ہدایت کار تھے۔ تو ہم مختلف مواقع پر کھیل پیش کرتے رہتے ہیں۔

س: صوفی تبسم اکیڈمی کا اجراء کب ہوا تھا کون لوگ آپ کے ساتھ کام کر رہے ہیں؟

ج: صوفی تبسم اکیڈمی کا اجراء دادا کی وفات کے فوری بعد والد نے کیا تھا۔ مگر جب ان کی بینائی متاثر ہوئی تو یہ ذمہ داری مجھے سونپ دی گئی۔ میں نے ان کی نظموں اور مضامین پر کام کرنا شروع کیا تاکہ نئی نسل ان کے افکار سے آگاہ ہو سکے۔ ہم مختلف پروگرامز کرتے رہتے ہیں بچوں کے لیے بھی اور بڑوں کے لیے بھی۔ مشاعروں کا اہتمام بھی کرتے ہیں اور اب تک کئی نامور شعراء ادیبوں گلوکاروں

اور برونو برووں کو صوفی تبسم ایوارڈز سے نواز چکے ہیں۔ میں اور ریڈیو کے پی ایم فقیر حسین ساحر اسکرپٹ لکھتے ہیں

علاوہ ازیں ایف سی کالج کے سابق پرنسپل مظفر عباس گورنمنٹ کالج کے پرنسپل جناب خالد آفتاب کامران لاشاری تیمور عظمت انتظار حسین صاحب ڈاکٹر اجمل نیازی بریگیڈئر حامد سعید اختر رضا محمود خرسند اور فنکار دشائستہ جبیں ہمارے معاون ہیں۔

س: فی الوقت کی مصروفیات کیا ہیں؟

ج: پرائیویٹ پروڈکشن کا "قربانی" جو محمد نفیس بنا رہے ہیں ہم دونوں اس میں اہم کردار کر رہے ہیں۔ پی ٹی وی کے لیے "کھوٹ بھوٹ" کی ریکارڈنگ کر رہی ہوں۔ یہ ڈرامہ سیریل ہم خود بنا رہے ہیں۔

س: کیا اس سے پہلے بھی آپ نے ڈرامے کیے تھے؟

ج: جی ہاں ہم نے اسٹیج کے لیے مختلف کھیل کیے تھے۔ علاوہ ازیں چند سیریلز کیے جن میں "بیٹی دل سے دل تک" اور "آسمان سے آگے" قابل ذکر ہیں۔

س: آپ پنجاب یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر ہیں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں استاد ہونے کے علاوہ شاعری بھی کرتی ہیں۔ اتنا سب کیسے مینیج کرتی ہیں کیا گھر متاثر نہیں ہوتا؟

ج: ہم دونوں ایک ہی فیلڈ میں کام کرتے ہیں اور کام کرنے کی لگن رکھتے ہیں۔ اس لیے دونوں مل جل کر گھر اور باہر کے امور مینیج کرتے ہیں کہ دشواری نہیں ہوتی۔ یوں سمجھیں کہ کام کام اور صرف کام میں ہی پورا دن اور آدھی رات گزر جاتی ہے اور تھکن بھی نہیں ہوتی۔ کام ہماری روٹین لائف کا اہم حصہ ہے بے کار رہنے سے تھکن ہونے لگتی ہے عادت سی ہو گئی ہے یہ سب کرنے کی۔۔۔

س: کچھ اپنے بارے میں بتائیں کہ اس مقام تک پہنچنے کے لیے آپ نے کن مشکل حالات کا سامنا کیا خاندانی پس منظر بھی ضرور بتائیے گا؟

ج: 12 اکتوبر کو لاہور میں پیدا ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر سے ہی شروع کی جونیئر گورنمنٹ ماڈل اسکول وحدت روڈ سے میٹرک کیا۔ ایم ایس سی نفسیات میں پنجاب یونیورسٹی سے کیا اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایک سال تک یونیورسٹی میں ہی ایک پراجیکٹ پر کام کیا۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تو گھر میں ہر طرف کتابوں سے بھی الماریاں تھیں ماحول علمی وادبی تھا کیونکہ میرے دادا شاعر ادیب اور دانشور تھے۔ ہمارے ہاں ادیبوں دانشوروں اور اساتذہ کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ جس میں فیض احمد فیض، سید عابد علی، تجمل حسین، اعجاز بٹالوی، حفیظ جالندھری، استاد امن، استاد دانش، حکیم چشتی، فریدہ خانم، نور جہاں اور بہت سے دوسرے جن میں ہر طبقہ فکر کے لوگ شامل تھے۔ میں نے بچپن میں ہی بڑی بڑی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ میں نے کم سنی میں ہی سعادت حسن منٹو، علامہ اقبال، مستنصر تارڑ، جوش، پروین شاکر، مصطفیٰ زیدی کو بہت پڑھ لیا تھا۔

ڈائری لکھنے کی عادت مجھے بچپن سے تھی یہی وجہ ہے کہ آہستہ آہستہ میرا شوق لکھنے کی طرف مائل ہو گیا اور میں نے ابتدا افسانہ لکھنے سے کی، میرے والد ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے تم میں لکھنے کی صلاحیت ہے اس لیے لکھتی رہا کرو۔ مجھے اسکول کے زمانے سے ہی ڈرائنگ اور اسکیچنگ کا شوق تھا اس شوق کے پیش نظر میرے لیے ایک استاد کا انتظام کیا گیا جناب اللہ بخش میرے استاد تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے اور پوتے کی بھی میں شاگرد رہی اور پینٹنگ کی مختلف نمائشوں میں حصہ لے کر قومی سطح کے ایوارڈ حاصل کیے۔ پہلا شعر میں نے اٹھارہ سال کی عمر میں کہا۔

س: لگتا ہے آپ کے شوہر آپ کے مزاج شناس ہیں کیا یہ پسند کی شادی ہے۔؟

ج: ہمارا کوئی خاص افئیر نہیں چلا تھا۔ ارینج میرج تھی لیکن یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ شادی سے پہلے میں انہیں جانتی نہیں تھی۔ وہ بھی صوفی صاحب کے ساتھ کام کرتے تھے اور اکثر ملاقات رہتی تھی۔"

س: کیوں شاہد صاحب! آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟ ہم نے ان کے شوہر کو متوجہ کیا جو ہماری گفتگو سن رہے تھے؟"

ج: میں نے فوزیہ کو پہلی بار صوفی صاحب کی برسی پر دیکھا تھا مجھے بہت اچھی لگیں گھر جا کر والدہ سے ذکر کیا والدہ کو بھلا میری پسند پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا وہ باقاعدہ پرپوزل لے کر گئیں کامیاب لوٹیں۔ یوں یہ رشتہ طے پا گیا۔

س: فوزیہ کی کس خوبی نے آپ کو ان کے ساتھ زندگی

گزارنے پر اکسایا؟

ج: میں نے انہیں کام کرتے دیکھا تھا۔ میں ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہوا تھا۔ بیک وقت اتنے شعبوں میں کامیابی حاصل کرنا عام انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ مصوری کرنا شاعری کرنا افسانے اور مضامین لکھنا اسکرپٹ رائٹر ہونا ڈراموں میں حصہ لینا اور تین تین جگہ پڑھانے کے علاوہ صوفی تبسم اکیڈمی کی چیئرپرسن کے فرائض سرانجام دینا (مسکراہٹ) مجھے تو ان کی خوبیوں نے ان کے قریب کیا تھا۔ س: اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں بتائیے؟

ج: میں 10 دسمبر کو لاہور میں پیدا ہوا۔ سینٹرل ماڈل اسکول سے میٹرک کیا۔ مجھے بچپن سے ہی ڈراموں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ ہم اسکول کے زمانے میں ہی دوست مل کر ڈرامے لکھتے اور پھر ایکٹ کیا کرتے تھے۔ 1973ء میں صوفی صاحب کے لکھے ہوئے ایک ڈرامہ میں حصہ لیا اس میں صوفی صاحب کے پوتے صوفی جاوید نے بھی حصہ لیا۔ ہمارے اسکول کے ڈرامہ نے پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اور مجھے انعام کے طور پر شیلڈ ملی۔ اس شیلڈ نے میرے اندر مزید کام کرنے اور آگے بڑھنے کے شوق کو تقویت دی۔ 1978ء میں صوفی تبسم کی وفات کے بعد ہم دوستوں نے مل کر صوفی تبسم ڈرامیٹک کلب بنایا جس کے تحت 1979ء میں پنجاب آرٹس کونسل کے زیر اہتمام صوفی نثار احمد نے ڈرامہ "الٹی سیدھی" لکھا۔ جس میں میرا رول دادا کا تھا اس کے علاوہ بھی ہم نے صوفی تبسم کے لکھے کئی ڈرامے کیے۔ بی اے کے بعد والد کی وفات کی وجہ سے میں اپنا شوق جاری نہ رکھ سکا اور ان کا کاروبار سنبھال لیا یوں کچھ عرصہ تک اس شوق سے لاتعلق رہا۔ مگر کام کرنے کا شوق دبا نہ سکا۔ فوزیہ چونکہ اس فیلڈ کی تھیں اس لیے شادی کے بعد میں نے فوزیہ کے ساتھ دوبارہ کام کرنا شروع کر دیا۔

س: آپ نے کمرشلز بھی کیے چینلوں پر پرفارم کیا ڈراموں میں باقاعدہ کام کرنے کا موقع کیسے ملا؟

ج: پنجاب فیسٹیول میں ہم نے ایک کھیل "آج آکھاں وارث شاہ" کی ہدایات دیں۔ اس میں فلمستار اور وی اسٹار محسن خان نے بھی کام کیا تھا۔ وہ پی ٹی وی کے اچھے اسکرپٹ رائٹر ہیں۔ انہوں نے "بیٹی" سیریل لکھا تو ہمیں بھی اس

میں کام کرنے کی آفر دی۔ میرا رول شگفتہ اعجاز کے پرسنل فیملی ڈاکٹر کا تھا۔ اس کے بعد "آسمان کے آگے" میں آلیس بی کا رول کیا۔ "دل سے دل تک" میں ایک بار پھر ڈاکٹر بنا پھر "قربانی" میں آفریدی ہوں ہم نے کئی سیریلز میں کام کیا۔

س: دونوں مصروف ہیں ایک ساتھ فیلڈ میں بھی کام کر رہے تو گھر اور بچے یقیناً متاثر ہوتے ہوں گے؟

ج: نہیں متاثر ہوتے۔ فوزیہ اچھی منتظم ہیں اور گھر اور باہر کے امور کو احسن طریقے سے دیکھ لیتی ہیں بچوں کی تعلیم و تربیت اور گھر کی ذمہ داریوں میں کبھی کوتاہی نہیں کرتیں۔

س: کوئی آئندہ کے لئے پلاننگ جس کے تحت آپ کام کرنا چاہتے ہیں؟

ج: پلاننگ یہی ہے کہ ہم بچوں کے لیے یونہی کام کرتے رہیں گے۔ خاص طور پر اسپیشل بچے ہمارے پروگرامز میں شریک ہو کر بہت خوش ہوتے ہیں تو ہم ان میں خوشیاں بانٹتے رہنا چاہتے ہیں۔ یہی ہمارا مشن بھی ہے وہ تم ہم صوفی تبسم اکیڈمی کے مشن کو مزید آگے بڑھانا چاہتے ہیں فوزیہ کا بھی یہی خواب ہے اور میں بھی اس کے مشن میں شامل ہوں۔

س: شادی کے بعد صوفی تبسم اکیڈمی کے لیے پہلا کام آپ نے کیا کیا؟

ج: ہم دونوں نے "ٹوٹ بٹوٹ" کے نام سے نظموں کی ریکارڈنگ کی کیسٹ بچوں میں تقسیم کی جس سے وہ بہت خوش ہوئے۔ چلڈرن فیسٹیول کے لیے کامران لاشاری سے ذکر کیا وہ اس وقت سیکریٹری انفارمیشن تھے انہوں نے نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ہمارا ساتھ بھی دیا جس کی ہدایات کی ذمہ داری پچھلے تین سال سے میں پوری کر رہا ہوں۔

س: بچے کتنے ہیں اور کون سی کلاسز میں زیر تعلیم ہیں؟ ہم نے فوزیہ سے سوال کیا۔

ج: ہماری دو بیٹیاں ہیں۔ بڑی بیٹی سکس میں اور چھوٹی تھرڈ میں پڑھتی ہے دونوں نے ڈرامہ سیریل "جی اور ڈرامہ سیریل دل سے دل تک" میں اہم رول کیے ہیں۔

س: بچوں کے ڈراموں میں کام کرنے کا شوق کیا جاری رکھیں گی؟

ج: فی الحال ان کی پڑھائی ہماری اول ترجیح ہوگی اگر فراغت میں کام کرنا چاہیں گی تو ہمیں اعتراض نہیں ہوگا ہم دونوں کو اعلا تعلیم دلوانا چاہتے ہیں اس کے بعد وہ اپنے لیے جو بھی لائن منتخب کریں گی ہمیں اعتراض نہیں ہوگا۔

س: آپ مشاعروں کا اہتمام کرتی ہیں اور خود بھی شاعری کرتی ہیں مشاعروں کا اہتمام کیا خاص مواقع پر کرتی ہیں؟

ج: میں صوفی صاحب کی سالگرہ اور برسی کے موقع پر مشاعرے کرواتی ہوں جن میں ہمیشہ نامور شعراء کرام حصہ لیتے ہیں۔ مثلاً منیر نیازی' ناصر زیدی' احمد فراز' شہزاد احمد' خالد احمد' ڈاکٹر اجمل نیازی' نیاز اے صوفی اور بریگیڈیر سجاد سعید کے علاوہ بھی بے شمار ان مشاعروں میں میزبانی کے فرائض سرانجام دینے کے علاوہ میں خود بھی اپنا کلام پڑھ کر سناتی ہوں۔

س: مستقبل میں اور کیا کرنے کا ارادہ ہے؟

ج: ارادہ تو بہت کچھ کرنے کا ہے مثلاً یہ کہ میں ڈاکومنٹری فلمیں بنانا چاہتی ہوں اور پسماندہ علاقوں کے لیے کام کرنا چاہتی ہوں۔ جہاں پر معاشرتی اور اقتصادی مسائل ہیں۔ ان مسائل کو سامنے لانا چاہتی ہوں ایسے فلاحی کام کرنا چاہتی ہوں جہاں کام کرنے میں صحیح معنوں میں دوسروں کے کام آسکوں۔ یہی میرا مشن بھی ہے اور سوچ بھی۔ مختلف مسائل پر غور و فکر کرنا تو ہر آزاد شہری کا فرض ہے میں بھی روزانہ کے اخبارات پڑھ کر اور خبریں سن کر باشعور شہری کی طرح جلتی ہوں کڑھتی ہوں اور ان مسائل کے حل کے لیے سوچتی بھی ہوں اور ان مسائل کو دور کرنے کے لیے منصوبہ بندی بھی کرتی ہوں میں نے پرفارمنگ گروپ تشکیل دیا ہے تو اس کے ذریعے ان مسائل کی نشاندہی کا ارادہ رکھتی ہوں آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ہمت دے۔

آمین ثم آمین۔

ماڈل ..... شگفتہ کی
میک اپ ..... روز بیوٹی پارلر
جیولری ..... قاسمیہ جیولرز
فرانسپورٹسی ..... موسیٰ رضا

قارئین کرام! آپ نے یہ ہمارے پورے دن کی روداد پڑھی جس میں سائرہ غلام نبی کام کا ذکر غالباً "بھول" گئی ہیں۔ آپ کے ذہن میں یقیناً یہ سوال اٹھا ہوگا کہ ہم لوگ کام کس وقت کرتے ہیں تو ہم آپ کو یقین دلا دیں کہ ہم کام "بھی" کرتے ہیں تب ہی تو ہر ماہ بڑی باقاعدگی سے پرچا وقت پر آپ کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔
ایک اور بات کہ یہ روداد پڑھ کر آپ نے سوچا ہوگا کہ سائرہ بہت سنجیدگی سے سر جھکائے کام کرتی رہتی ہیں تو ایسا ہرگز نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے قلم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی "کار کردگی" کو حذف کر دیا ہے۔ ان کے کرتوت آپ اس وقت پڑھیں گی جب آئندہ سالگرہ نمبر میں یہ روداد رابعہ کاشمیری یا فاطمہ شائی لکھیں گی۔

(امت الصبور)

ایک دن ہمارے ساتھ

سائرہ غلام نبی

دن خاصا نکل چکا ہے' دھوپ میں حدت سما رہی ہے۔ دھواں' ہجوم' ٹریفک کا اژدحام اور بے معنی شور' بند و روڈ پر زندگی کی ہلچل کچھ اسی طرح مچی رہتی ہے۔ سڑک در سڑک الانگتے پھلانگتے W-11 کو اوور ٹیک کرتے' دوسری منزل تک سیڑھیاں نا پتے بمشکل تمام کمرے میں داخل ہوئے۔ آنکھیں کھولیں' میز پر بیگ پھینکا اور خود کو کرسی پر اور کاغذوں کے ڈھیر کے درمیان جم کر بیٹھ گئے۔ ٹھنڈے پانی کا گلاس حلق میں انڈیلا' رفتہ رفتہ حواس بحال ہونا شروع ہوئے۔ اب کمرے کا منظر واضح ہو رہا ہے۔ لمبائی کے رخ پر بنے اس کمرے میں عدم ترتیبی یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔ ربط اور توازن اگر ڈھونڈنا چاہیں تو۔۔۔ بہت مایوسی ہوگی۔ چار میزیں' چھ کرسیاں' دو کتابوں کی الماریاں' ڈھیروں ڈھیر رسائل' جرائد' مسودے' کمپوزنگ کا میٹر' فائنل ٹریسنگ اور ناقابل اشاعت مسودوں کا ایک ڈھیر۔ وزنی۔ اور ردی۔۔۔ اس کمرے میں ایک عدد ٹیلی فون بھی ہے جس کا کام بجنا ہے۔۔۔ لگاتار بجنا۔۔۔ ٹرن ٹرن۔۔۔ ٹرن ٹرن۔۔۔

"دیکھا صبح ہی صبح اس نے بجنا شروع کر دیا۔" (جب خوب بہاں بارہ بج ہی ٹرن بج جاتے ہیں۔)

"ہیلو۔"

"ذرا بلند زور سے بولیں' آواز نہیں آ رہی۔" (اس ٹیلی فون کو گونگے پن کی شکایت اکثر ہو جاتی ہے۔)

"ہیلو۔۔۔ جی بولیے۔۔۔ تین صفحات پر مشتمل ناول بھیجا تھا۔"

"وہ تو شائع نہیں ہو سکتا۔"

"اس لیے کہ ہم اتنے طویل ناول شائع نہیں کرتے۔"

"دیکھیے پلیز' پانچ تاریخ کے بعد فون کر لیجئے گا۔ اس وقت شعاع کی آخری کاپی کی تیاری ہو رہی ہے۔ ہم لوگ بے حد مصروف ہیں۔"

فون کھٹاک سے رکھنے کے بعد فاطمہ کی جھنجلاہٹ دیکھنے کے لائق ہے۔ "توبہ ہے لوگوں کا کانفیڈنس دیکھیے۔ تین صفحوں پر مشتمل ناول لکھ بھی ڈالا اور اس پر اصرار ہے کہ سالگرہ نمبر میں چھاپا جائے اور اوانسنگ بھی کی جائے۔ ہم تو جھک مار رہے ہیں۔" "اب فاطمہ کو چپ کرانا آسان نہیں۔"

"چلیں آج پیٹیز کھاتے ہیں۔" کہتے کہتے فاطمہ نے بیل بجا دی۔

"دیکھیں مقبول صاحب (ہاتھ کے اشارے سے تکون بناتے ہوئے) وہ والے پیٹیز لائیے گا۔" مقبول صاحب مسکراتے ہوئے رابعہ سے پوچھنا نہیں بھولتے۔

"اور آپ کے لیے نانخطائی (یہ روز نانخطائی کھا جاتی ہے۔ جب ہی اتنی "شیر دل" ہے۔)

"جی ہاں! حسب معمول نانخطائی" رابعہ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔

ٹرن ٹرن۔۔۔ ٹرن ٹرن۔۔۔

"لو سائرہ! تمہارا فون ہے۔ ویڈیو پاکستان سے۔" امثل نے فون کا چونگا پکڑایا۔

"ہاں سیما! کہو کیا افتاد آئی۔" میں نے سیما کی عجلت بھری آواز سن کر کہا۔

"سائرہ! تمہیں آن لائن لے رہی ہوں۔ تمہیں یہ بتانا ہے کہ پسند کی شادی کرنا چاہیے کہ نہیں۔"

"سیما! یہ تم روز کیا نئی مصیبت لے کر کھڑی ہو جاتی ہو۔ میرا تو خیال ہے شادی ہی نہیں کرنا چاہیے۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"بکواس نہیں کرو' تم لائیو آن ایئر ہونے والی ہو۔ تمیز سے اپنا نام بتانا پھر رائے دینا۔" سیما نے تنبیہہ کی۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ حمایت میں بولنا ہے کہ مخالفت میں؟" میں نے پوچھا۔

"بس بولنا ہے' ویڈی۔" سیما نے اطمینان سے کہا۔

کچھ باتیں حمایت میں کہیں' کچھ حماقت میں کہیں۔ جلدی جلدی کہہ سن کر سیما کو فارغ کیا۔

پانچ منٹ کے اندر اندر چائے' بسکٹ' پیٹیز آ گئے۔ شبیر صاحب ہر ایک کی میز پر چائے دھرتے دھرتے رابعہ سے مخاطب ہوئے۔

"کبھی تو کچھ کھلا دیا کرو۔ دو دو تنخواہ گھر میں آ رہی ہے پھر بھی کنجوسی۔" (رابعہ کی شادی کے بعد یہ طعنہ دینا وہ کسی دن نہیں بھولتے۔) مگر وہ رابعہ ہی کیا جو سن لیں۔

"جی میں کیوں کھلاؤں۔ آپ کھلائیں' آپ بڑے ہیں۔"

"اللہ سمجھے گا تم لوگوں سے۔" (معاملہ اللہ کے سپرد کرنے کے بعد شبیر صاحب دوسرے دن پھر یہی سوال کریں گے۔)

گرم گرم چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے امثل نے ہر روز والا سوال دہرایا۔

"کل رات حسب معمول تم لوگوں نے ڈاکٹر شاہد مسعود کا پروگرام "ویوز آن نیوز" تو نہیں دیکھا ہوگا؟" "کیپٹل ٹاک" "حامد میر کا پروگرام بھی نہیں دیکھا؟" پھر وہ اس پروگرام کی تفصیلات' اخبار کی اہم خبریں' کالم' دائے' ہرے' ڈراموں کی تفصیلات بتا کر ہمیں اپ ڈیٹ کرنا نہیں بھولتیں۔ اب ہم حالات حاضرہ سے باخبر ہو کر کام کی طرف توجہ دینے کا ارادہ کریں گے۔ کام۔۔۔ جی ہاں کام۔۔۔

لمحہ بھر تو سمجھ میں ہی نہیں آئے گا کیا کام کریں۔ آج شعاع کی آخری کاپی جانا ہے۔ رخسانہ نگار کے ناول کا فائنل پڑھنا ہے۔ وسنگ کی تصویریں نکالنا ہیں۔

تصویروں کے نام پر رابعہ کی بڑبڑاہٹ شروع ہو گئی۔ "اب بھلا بتاؤ یہ کنول ولی محمد کون ہے۔" (اب تم ملکی چینل نہیں دیکھو گی تو بھلا کیسے جانو گی۔)

"وہی ہے نا جس کی تصویریں شاہین نے بھیجی تھیں۔ نازک سے نقوش والی' سبز کلر کی شرٹ جس نے پہنی ہوئی ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"وہ تو فنکار بٹ ہے۔" رابعہ نے بے بسی سے کہا۔

"ارے بے وقوف! فنکار بٹ تو وہ ہے جس نے اسٹگروں والا چشمہ لگایا ہوا ہے۔" فاطمہ نے فوراً تصحیح کی۔

(کیبل کے اس دور میں شاہین رشید کے بعد فاطمہ ہے جو نئی آرٹسٹوں کی پہچان رکھتی ہے۔)

"پچھلے مہینے تو اس کا انٹرویو لگا تھا۔"

"وہ تو شہزاد علی خان تھا۔" امثل نے فائنٹ یاد دلایا۔

"یہ سارے کے سارے ایک جیسے کیوں ہیں۔" رابعہ نے اکتا کر کہا۔ (جب سے اس کی شادی ہوئی ہے یہ صرف "ساجد" کو پہچانتی ہے) رابعہ روٹھے روٹھے انداز میں تصویروں کے ڈھیر میں ہاتھ مار مار کر آرٹسٹوں کو نکال باہر کرنے لگیں۔

ٹرن۔۔۔ ٹرن۔۔۔

"جی میں امثل بات کر رہی ہوں۔"

"کب بھیجا تھا افسانہ؟"

"کس نام سے بھیجا تھا؟"

"جی۔۔۔ افلاطون تھری ذیرو تھری۔"

"جی میں آپ کا نام پوچھ رہی ہوں افسانے کا نہیں۔"

"ایسا ہے کہ ہم نسیم جوئی کی کہانیاں شائع نہیں کر سکتے۔"

"دیکھیے پلیز پانچ تاریخ کے بعد فون کیجیے گا جن صاحب کے پاس افسانوں کا ریکارڈ رہتا ہے۔ وہ سیٹ پر نہیں ہیں۔" (جی ہاں رابعہ تو ریک کے پاس کھڑی گم نام آرٹسٹوں میں سر کھپا رہی ہے۔)

"یہ دیکھیے' ہماری ہیروئنوں کا میک اپ اور ڈریس دیکھیے۔" رابعہ نے ایک صحت مند ہیروئن کی تصویر

امنل کو دکھاتے ہوئے دانت کچکچائے۔

"اف میرے خدا۔ یہ ریڈ لپ اسٹک' خون ٹپک رہا ہے۔"

امنل نے تصویر دیکھتے ہوئے کہا۔

"واہ! اسی مناسبت سے ایک شعر عرض ہے۔ لیجئے امنل ملاحظہ فرمایئے۔ حال ہی میں ایک رسالے کے پیچھے پڑھا ہے۔ غالباً "محترمہ کے جسد مبارک کو دیکھ کر کہا گیا ہے۔"

"ارشاد۔" امنل نے دلجمعی سے کہا۔

ادا قاتل' نگاہ قاتل' زباں قاتل' بیاں قاتل
تمہارا سلسلہ شاید کسی قاتل سے ملتا ہے

"واہ کیا شعر ہے۔ یہ لوگ تو خاصے صاحب ذوق ہوتے جا رہے ہیں۔" امنل نے دل کھول کر رسالے والے کو داد دی۔

ٹرن۔۔۔ ٹرن۔۔۔ ٹرن۔۔۔

"جی میں امنل بول رہی ہوں۔" امنل نے بشاش لہجے میں کہا۔

"دیکھیے ہمارے پاس شاعری کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے کہ آئندہ دس سال تک آپ کی باری نہیں آسکتی۔" امنل نے اطمینان دلایا اور فون رکھ دیا۔

"دیکھو سائرہ! صرف یہ ہم تم ہیں جو شاعری نہیں کر رہے۔" امنل نے ہماری مشترکہ ایک بڑی "محرومی" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بالکل! اب رابعہ کو ہمارا ممنون ہونا چاہیے۔" فاطمہ اس ڈائیلاگ پر ندیدہ نظروں سے ہم دونوں کو گھورنے لگیں۔

"رابعہ! تم ایک رومانٹک سا افسانہ کیوں نہیں لکھتیں؟" امنل نے مشورہ وہ بھی مفت رابعہ کو دیا۔

"میں اور وہ بھی رومانٹک۔۔۔ چھوڑیں' آپ لوگ مذاق اڑائیں گے۔"

(رابعہ کسی سے نہیں ڈرتیں' سوائے ہمارے نمبروں کے اسی ڈر سے اپنے افسانے چھپا چھپا کر رکھتی ہیں۔)

"نہیں' وعدہ۔۔۔ تمہارے سامنے نہیں اڑائیں گے۔" امنل نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

"گویا کہ اڑائیں گے ضرور۔" رابعہ مزید ڈر گئیں۔

"نہیں رابعہ! تمہارے افسانے کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گی بلکہ ہیرو ہیروئن کے ملوانے کے کئی طریقے بھی بتاؤں گی۔ میں تو ایک عرصے سے یہ نیک کام کر رہی ہوں۔ آج تک کسی ہیرو سے ہیروئن کو جدا نہیں کیا۔"

ٹرن۔۔۔ ٹرن۔۔۔ ٹرن۔۔۔

"ہاں حمیرا! ابھی میں آپ کو فون کرنے ہی والی تھی۔" امنل نے فون کو کان سے لگائے لگائے ڈھیروں ڈھیر ڈاک کو کھولنا شروع کر دیا۔

"اللہ کرے آج کوئی مہمان نہ آئے' آج بہت کام ہے۔"

"اور لائٹ بھی نہ جائے' یہ بھی دعا کرو۔"

"وضو کر لیں۔" عمران کی آواز پر سب ہڑبڑا کر اٹھ گئے۔

نماز کے پڑھنے کے دوران دھاڑ کی آواز سنائی دی۔ یقیناً یہ پلیٹیں ٹوٹنے جانے کی آواز تھی۔

"شبیر صاحب! کھانے میں کیا ہے؟"

"قورمہ ہے' بریانی ہے' زردہ ہے اور مرغ مسلم ہے۔" شبیر صاحب کو اماں جان کی طرح طنز فرمانے کا بہت شوق ہے۔ انگلیوں پر گنتے ہوئے بتایا۔

"اور تو میں کسی ہوٹل کا مینیو نہیں پوچھ رہی۔"

"ہاں دال تو تم لوگوں کے حلق سے نہیں اترے گی۔" ایک اور طنز فرمایا گیا۔

"کرن کی لڑکیوں کو بھیج دیں۔" شبیر صاحب کے مزاج پر ایک اور تازیانہ لگایا۔

"لڑکیاں خود آگئیں۔" ریحانہ کی شوخ آواز پر ہر روز کی طرح نقاہت طاری تھی۔

"بھوک سے دم نکلا جا رہا ہے۔" معمول کا فقرہ حسب معمول ارشاد ہوا۔

"لو یہ کڑھی کھاؤ' اس سے زیادہ مزیدار کڑھی تم لوگوں نے آج تک نہیں کھائی ہو گی۔ میں نے اپنے دست مبارک سے بنائی ہے۔" امنل نے کھانا نکالتے ہوئے کہا۔

"امنل! آپ تو اپنی بہت ہی قدردان ہیں۔"

"دوسرے قدر نہیں کرتے تو کیا ہم خود بھی اپنی قدر نہ کریں۔" امنل نے اطمینان سے کہا۔

ریحانہ کی پرجوش داد بطور خاص امنل کے لیے ابھری۔ نفاست پسند روبی نے کھانے کے دوران مسلسل رابعہ

کو گھور گھور کر دیکھنے کا پروگرام جاری رکھا۔
"اب اس چمچے کو اپنی پلیٹ میں رکھنا' سالن میں نہیں ڈالنا۔"
"روبی شادی کے بعد بھی نہیں بدلی۔" میں نے سب کو اطلاع دی۔
"حالانکہ میں نے "پھوہڑ شوہر" کی کتنی "بددعا" کی تھی۔" میں نے روبی کو یاد دلایا۔
"خدا کا شکر ہے شعیب خاصے "سگھڑ" ہیں۔ تمہاری بددعا قبول نہیں ہوئی۔ کھانے کے دوران میں اپنی ڈائننگ ٹیبل بن جانے والی میز پر رکھے مسودوں کو سالن کے دھبوں' روٹی کے بھوروں اور پانی کے گلاسوں سے بچانے کی کوشش میں ہلکان ہی رہی۔
"پانی۔" پانی کے جواب میں میز پر بھاپ اڑاتی چائے آگئی۔
"پہلے پانی۔" فاطمہ کا لہجہ شدید احتجاجی ہو گیا۔
"ایک تو تم لوگوں کو صبر نہیں ہے۔" شبیر صاحب نے کہہ کر آم کی قاشوں سے سجی پلیٹ بھی میز پر رکھ دی جو آذر صاحب کا تحفہ تھا۔ وہ یہ مہربانی اکثر کرتے ہیں۔
"شبیر صاحب! کچھ تو رحم کریں' ایک ساتھ مختلف النوع چیزیں پیٹ میں جا کر کس قدر "ہنگامہ" کریں گی۔" سب کی ملی جلی آوازیں ابھریں۔
"مجھے آپ لوگوں کی طرح ایک ہی کام تو نہیں ہے۔" شبیر صاحب نے یاد دلایا۔
اب چائے' آم' پانی کسی نہ کسی طرح حلق میں انڈیلنا شروع کر دیا کہ "کام بہت ہے۔"

"اللہ کرے آج کوئی مہمان نہ آئے' کام بہت ہے۔"
ایک بار پھر با آوازِ بلند دعا کی گئی۔
"ارے نگہت عبداللہ! میں فون ملا ملا کر تھک گئی۔ شکر ہے آپ آ گئیں۔" امثل نے خوشگوار لہجے میں نگہت کو خوش آمدید کہا۔ سب نے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسودے میں غرق ہونے کی کوشش کی۔
"میں ناول لائی ہوں' لیکن اختتام میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تم بے شک کمپوز کروا کے پرنٹ سے بھجوا دوں گی۔" نگہت نے تسلی دیتے ہوئے امثل سے کہا۔
"مگر نگہت! یہ بھی تو سوچیں' آج کون سی تاریخ ہے۔" امثل نے دہائی دی۔
"ارے جاؤ جاؤ... تاریخ سے کیا ہوتا ہے۔ تم ایک دن لیٹ کر دینا پرچہ۔" نگہت عبداللہ اپنی اطمینان سے بولیں۔
"مگر نگہت..." امثل نگہت کے ناول میں الجھ گئیں۔ اب یہ بحث شام تک چلے گی۔
ٹرن... ٹرن... ٹرن...
"اور لائٹ بھی چلی گئی۔"
"یا اللہ! آخری کاپی اور یہ افتاد۔"
"امثل! تم کب تک اٹھو گی۔۔؟" خالدہ کی آمد اس سوال کے ساتھ ہوئی۔
"خالدہ! ابھی تو بہت کام ہے' دیر تو یقیناً ہو گی۔" امثل کی آواز میں "فراغت ہی فراغت" کا اعلان تھا۔
"مس امثل! آپ کو آذر صاحب بلا رہے ہیں۔" اس اطلاع پر امثل اٹھ کر آذر صاحب کے کمرے کی طرف چل دیں۔ دیگر معاملات ہنوز توجہ طلب تھے۔
"ساڑھے چھ بج رہے ہیں۔" فاطمہ کی اطلاع ابھری۔
"آخر یہ اتنی جلدی روز چھ کیوں بج جاتے ہیں۔" میں نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"آج ہی میں نے تازہ تازہ شعر پڑھا ہے جو بالکل حسبِ حال ہے۔" فاطمہ کی طبیعت میں جولانی آئی۔
"ارشاد۔ ارشاد۔"

دیکھیے میری تقدیر نے بدلا ہے میرا کیا نقشہ
چھین لیں میری کتابیں' عطا کیا ہے رکشہ

واہ۔۔۔ واہ۔۔۔

*

میرا بچپن، میرے جگنو، میری گڑیا

حنیف خان

شاہین رشید

ہم پاکستان ہجرت کر کے انڈیا کے شہر ناگ پور سے آئے تھے۔ یعنی ہمارے والدین ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ وہاں ہمارے والد صاحب پولیس میں تھے اور پولیس کی طرف سے ہاکی کھیلا کرتے تھے۔ ان کا نام عبدالحمید خان تھا۔ جب پاک و ہند کی تقسیم ہوئی تو والد صاحب پاکستان آ گئے اور لیاقت آباد میں آ کر بس گئے۔ کافی سال وہیں گزرے۔ وہیں سے اللہ تعالیٰ نے ترقی دی۔ وہیں پر رہ کر تعلیم حاصل کی اور ہاکی کھیلی اور 1985 میں ریٹائرمنٹ کے بعد میں گلشن اقبال میں شفٹ ہو گیا اور ابھی تک گلشن اقبال میں ہی ہوں۔

میں یکم جنوری 1957ء میں کراچی میں پیدا ہوا۔ میرا اسٹار کیپری کورن ہے۔ امی بتاتی تھیں کہ میرا نام حنیف میرے نانا نے رکھا تھا اور سب مجھے پیار سے "ببلی" کہتے تھے یا جب بہت پیار آتا تھا تو "ننو" کہتے تھے۔ ہم آٹھ بھائی تھے۔ تین کا انتقال ہو گیا ہے اب ہم پانچ ہیں میرا نمبر چھٹا تھا۔ بہن اللہ نے دی نہیں۔

ہمارا تعلق متوسط طبقے سے تھا اس لیے بچپن بہت شاہانہ نہیں گزرا بس نارمل ہی گزرا۔ نہ بہت زیادہ شرارتی تھا اور نہ ہی بہت زیادہ سیدھا۔ اسکول بڑی پابندی سے جاتا تھا۔ ابتدائی تعلیم گلبرگ اسکول سے حاصل کی اور اس کے بعد جہانگیر روڈ کے ایک اسکول سے میٹرک کیا۔ پڑھائی میں میں اوسط درجے کا طالب علم تھا کیونکہ ہمارے گھر کا ماحول تعلیمی تو تھا لیکن کھیل کی باتیں زیادہ ہوا کرتی تھیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ والد صاحب بھی تقسیم سے پہلے ہاکی کھیلا کرتے تھے۔ تقسیم کے بعد بڑے بھائی بھی ہاکی کھیلتے تھے۔ ان کو دیکھ کر مجھے بھی شوق ہو گیا ہاکی کھیلنے کا اور میں بھی اس فیلڈ میں آ گیا۔ میں نے زندگی میں ایک ہی مرتبہ شرارت کی۔ اب آپ اسے شرارت کہیں یا غصہ۔ ہوا یہ کہ ہمارے محلے میں ایک لڑکا تھا اسے اس کی والدہ بلا رہی تھیں اور وہ آ نہیں رہا تھا۔ اس کی والدہ نے مجھ سے کہا کہ جاؤ اسے پکڑ کر لے آؤ۔ میں اس لڑکے کے پاس گیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا چلو تمہاری امی بلا رہی ہیں۔ جونہی میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اس نے مجھے تھپڑ مار دیا۔ میں نے بھی پلٹ کر اسے مارا تو اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ یہ بات جب والد صاحب کو پتا چلی تو انہوں نے میری خوب پٹائی کی۔ بس زندگی کی پہلی اور آخری مار تھی جو میں نے کھائی تھی۔

بچپن کی باتیں جب آپ صحافی لوگ پوچھتے ہیں تو یہ بھی پوچھتے ہیں کہ جیب خرچ کتنا ملا کرتا تھا تو میں کہتا ہوں کہ بچپن میں تین وقت کا کھانا مل جاتا تھا یہی بہت بڑی بات تھی۔ متوسط گھرانہ تھا۔ عزت کی روٹی کھا رہے تھے۔ والد صاحب اور بڑے بھائی کماتے تھے اور اس طرح گھر چل رہا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ کسی سے مانگنا نہیں پڑا اور نہ ہی کسی کے محتاج ہوئے۔ یہ بڑی بات تھی۔

میٹرک میں نے سیکنڈ ڈویژن سے کیا۔ میٹرک کے بعد میں نے نیشنل کالج میں داخلہ لیا۔ لڑکے جب کالج میں آتے ہیں تو اپنے آپ کو بہت بڑی شے سمجھنے لگتے ہیں لیکن میں ان لڑکوں میں سے نہیں تھا بلکہ بہت ہی سیدھا سادا تھا۔ طبیعت میں ہمیشہ سادگی رہی ہم لیاقت آباد میں آ کر آباد ہوئے تھے تو جب میں نے کالج میں داخلہ لیا تو لیاقت آباد سے پیدل کالج جایا کرتا تھا اور پیدل ہی واپس آیا کرتا تھا۔

پی آئی بی کالونی کے راستے سے کالج پہنچ جاتا تھا۔

خیر۔ کالج میں آ کر لڑکوں میں بہت تبدیلیاں آتی ہیں بری عادتوں میں لڑکے مبتلا ہو جاتے ہیں مگر اللہ کا شکر ہے کہ میں کسی بری علت میں مبتلا نہیں ہوا' سگریٹ کے دھوئیں سے مجھے نفرت ہے۔ چائے اور پان میں بچپن سے آج تک کھاتا چلا آ رہا ہوں۔ میں کبھی لڑکیوں کے چکر میں نہیں پڑا۔ ہمارے گھر کے ماحول میں بھی کبھی اس قسم کی باتیں نہیں ہوئیں۔ بس ہمارا اوڑھنا بچھونا ہاکی ہی تھی انٹر تک تعلیم حاصل کی پھر بی اے پارٹ ون کیا' پارٹ ٹو نہیں کیا کیونکہ پھر میں مکمل طور پر ہاکی میں آ گیا تھا اور 1976ء میں پاکستانی ٹیم میں بھی شامل ہو گیا۔ پہلا میچ میں نے مانٹریال میں نیوزی لینڈ کے خلاف کھیلا تھا پہلی مرتبہ ملک سے باہر گیا تھا باہر جا کر لوگ بہت متاثر ہوتے ہیں مگر مجھے تو کبھی کسی ملک نے اتنا متاثر نہیں کیا۔ میں تو کہتا ہوں کہ اپنا ملک اپنا ہی ہوتا ہے۔

1976ء میں جب ہاکی ٹیم میں آیا تو پھر کی کھیل

جس کی وجہ سے مجھے ملازمت ملی میرا ذریعہ معاش بن گیا۔ جب پاکستانی ٹیم میں آیا تو اس وقت میں حبیب بینک میں ملازمت کرتا تھا۔ 1978 سے لے کر 1985 یا 1986 تک مسلسل پاکستان کی نمائندگی کی۔ اس کے بعد کسٹم میں ملازمت کرلی اور آج تک کسٹم میں ہی ہوں۔ کسٹم کے بارے میں بہت مشہور ہے کہ یہاں سے لوگ پیسہ بہت کماتے ہیں لیکن وہ کماتے ہوں گے جو ایمانداری سے کام نہیں کرتے جبکہ میں نے اپنی ساری زندگی ایمانداری کا دامن نہیں چھوڑا۔ کیونکہ مجھے ہاکی نے وہ کچھ دیا ہے جس کے بارے میں میں نے کبھی اپنی زندگی میں سوچا بھی نہیں تھا اور دنیا میں پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ بس اللہ تعالیٰ عزت کی دو روٹی کھانے کے لیے دے دے یہی بہت بڑی بات ہے۔

جوانی میں انسان کے مزاج میں تبدیلیاں آئی ہیں پہلے میرا غصہ بہت تیز تھا۔ لیکن جب میں پریکٹیکل لائف میں آیا۔ میری شادی ہوئی میری اولاد ہوئی تو پھر غصہ بتدریج کم ہوتا گیا۔ کیونکہ انسان کو برداشت کا مادہ بھی پیدا کرنا پڑتا ہے۔

محبت کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے اور محبت کسی سے بھی ہوسکتی ہے اور محبت کے بغیر آدمی رہ نہیں سکتا۔ اس طرح انسان زندگی میں کرائسس سے بھی گزرتا ہے مجھے یاد ہے کہ کسی نے کہا تھا کہ آپ ہاکی نہیں کھیل سکتے کیونکہ آپ کی باڈی ایسی نہیں ہے۔ تو میں اس وقت بہت پریشان ہوا کہ میں تو اتنی محنت کرتا ہوں اور انہوں نے میرے لیے کیسی بات کردی پھر ہاکی میں آنے کے بعد ہاکی کے حوالے سے کچھ بدمزگیاں ہوگئیں۔ جہاں حالات بہتر ہوئے تو والد صاحب انتقال فرماگئے والد صاحب کی وفات میرے لیے بہت بڑا دھچکا تھا۔

اور جب تک انسان شادی نہ کرے تب تک بھی اس کی زندگی مکمل نہیں ہوتی۔ میں نے بھی زندگی کو مکمل کرنے کے لیے شادی کی' میری شادی کو آپ "لو ارینج" کہہ سکتے ہیں۔ میرے سسر انکم ٹیکس میں کام کرتے تھے۔ علیگڑھ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے ہاکی کے کھلاڑی رہ چکے تھے ہمارے بزرگ بھی تھے تو اس طرح ہمارا اور ہمارے بھائیوں کا ان کے یہاں آنا جانا تھا تو ہم نے بزرگوار کی صاحبزادی کو دیکھا۔ اب آپ اسے پسند کہیں یا محبت کہیں یا کچھ کہہ لیں۔ بات آگے چلی اور دونوں گھرانوں کی رضامندی سے ہماری شادی ہوگئی۔

دلچسپ بات آپ کو بتاؤں کہ ان کے یہاں بھی بہنوں کی ایک پوری ٹیم ہے ہم آٹھ بھائی تھے تو یہ آٹھ بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ دونوں طرف برابر کی ٹیم تھی۔ اس لحاظ سے ہم نے کہا کہ یہیں شادی بہتر رہے گی۔ بیگم کا نام مسرت ہے پیار سے "نجو" کہتے ہیں۔ سب لوگ پڑھے لکھے ہیں۔ میری بیگم بھی سلیقہ شعار ہیں پورا گھر سنبھالا ہوا ہے انہوں نے۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے جس کا نام "علی اذلان خان" ہے۔

جب سے شادی ہوئی تب سے اب تک جوائنٹ فیملی میں ہی رہ رہا ہوں۔ سب مل جل کر پیار محبت سے رہتے ہیں۔ ایک ہی جگہ پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ سب بھائی ماشاءاللہ صاحب اولاد ہیں۔ سب کی اولادیں آپس میں گہری دوستی رکھتی ہیں اور کبھی بچوں میں آپس میں کوئی بات کبھی ہوجائے تو ہم بڑے نہیں بولتے بلکہ بچوں سے یہی کہتے ہیں کہ آپ لوگوں کا آپس کا معاملہ ہے اسے خود ہی نبٹائیں۔

میں ایک دین دار آدمی ہوں۔ بہت لگاؤ ہے مجھے اور یہ میرا ایمان ہے کہ جس کا اللہ تعالیٰ پر یقین ہے اور جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں کبھی مایوس نہیں کرتا اور اسے اپنی نعمتوں سے نوازتا رہتا ہے میں ایک خوشحال زندگی گزار رہا ہوں۔ مجھے ٹیک اولاد دی۔ میرا بیٹا ماشاءاللہ پندرہ سال کا ہے اور اولیول کررہا ہے یہ جس فیلڈ میں جانا چاہے گا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

اکثر لوگ مجھ سے یہ سوال پوچھتے ہیں کہ آپ نے زندگی میں کیا کھویا کیا پایا۔

میں ان سے یہی کہتا ہوں کہ میں نے وہ کچھ پایا ہے کہ مجھے کھونے والی چیز کا احساس ہی نہیں ہے۔ مجھے اللہ نے ہر چیز سے نوازا ہے اور میں جتنا اس کا شکر ادا کروں کم ہے۔

اور میں قارئین سے یہی کہوں گا کہ شکر کا دامن ہرگز نہ چھوڑیں۔ اللہ پر بھروسہ کرکے محنت کیے جائیں اللہ خود ہی آپ کو اس کا اجر دے گا۔

❋

اس بھری دنیا میں ربیعہ صرف ایک رشتہ جانتی تھی۔ دادی کے سوا اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ دادی کے انتقال کے بعد پڑوسی اس کا خیال رکھتے تھے۔ خصوصاً نفیسہ خالہ اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ انہوں نے اسے اپنے گھر لے جانا چاہا لیکن ربیعہ نے انکار کر دیا۔ دادی کے انتقال کے بعد ربیعہ تواتر سے ایک خواب دیکھتی ہے کہ دادی کسی صحرا میں ہیں اور شدید پیاس کے عالم میں اس سے پانی طلب کرتی ہیں۔ ربیعہ کی آنکھ کھل جاتی تو وہ یہ سوچ کر پریشان ہو جاتی کہ دادی سے کیا غلطی سرزد ہوئی ہے جس کی بنا پر وہ پریشان ہیں۔
شفیقہ حیات اپنی بہو عذرا بیگم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کی بیٹی بیوہ ہو چکی ہیں۔ ان کی تین بیٹیاں ہیں۔ ایقان کے شوہر عاشر باہر نوکری کرتے ہیں۔ ایقان کو عاشر کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔

ایقان میکے آئی ہوئی تھی۔ وہ اپنی بھانجیوں کے ساتھ بیٹھی تھی، تب ہی وہاں اختر میاں آ گئے۔ اختر اس کی بھاوج فردوس بیگم کے بھائی تھے اور ایقان کو بہت چاہتے تھے لیکن آٹھویں پاس بے روزگار نوجوان کو لڑکی کون دیتا۔ ماہین ایقان کی بھتیجی ہے اور رائمہ اس کی بھانجی ہے۔ ایقان اپنے بھانجوں، بھتیجوں کے ساتھ بیٹھی ہوتی ہے، اختر وہاں آ جاتے ہیں اور اس کو فضول اشعار سناتے ہیں۔

تیسری قسط

عاشر کی آواز سن کر نجانے کیوں اس کا جی بھر آیا تھا۔ چند لمحوں میں موٹے موٹے آنسو اس کے چہرے پر پھیلنے لگے۔ دوسری جانب سے وہ اسے پکار رہا تھا۔

"ایقان۔۔۔ ایقان۔۔۔ کہاں گم ہو گئی ہو یار!"

"عاشر!" اس کے گلے میں پھندے سے پڑنے لگے۔

"اف۔۔۔ بولو تو سہی۔" وہ جھنجلا گیا۔

"تم آتے کیوں نہیں ہو؟" وہ بھی جھلا کر بولی۔ "کب تک تمہاری آواز اور تمہارے بھیجے ہوئے نوٹوں سے خود کو تسلیاں دیتی رہوں۔ میرے اندر آگ سی بھڑکنے لگی ہے اب۔"

"اوہ۔" وہ ہنس دیا۔ "کتنا اچھا لگتا ہے یہ سب کچھ سننا۔"

"میں جل رہی ہوں، تمہیں مزہ آ رہا ہے۔" وہ چڑ کر بولی۔

"ارے جانم! ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سخت سردی میں آتش دان کے قریب بیٹھا ہوں اور تمہارا یہ غصہ اوہو ہو۔۔۔ غضب ڈھاتا ہے۔ گویا ساتھ میں بلیک کافی بھی ہے۔ تلخ تر پُر لطف ذائقہ۔" وہ خاموش ہو گئی۔ جانتی تھی جتنا اپنے غصے کا اظہار کرتی، اسے اتنا ہی مزہ آتا۔

"بولو، خاموش کیوں ہو گئیں؟"

"نہیں بولتی بس۔"

"اچھا میرے بچے کیا کر رہے ہیں؟"

"سو رہے ہیں۔"

"اور بیوی؟" وہ پھر خاموش ہوئی۔ آج وہ کچھ زیادہ ہی شرارت کے موڈ میں تھا۔ اس کے غصے کو خاطر میں ہی نہ لا رہا تھا۔

"بہت خوش ہو، کیا بات ہے؟" وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"ارے واہ بیوی ہو تو ایسی۔ دل کے سمندر میں بلا خوف و خطر ڈبکی لگا دیتی ہے، اندر کی بات ڈھونڈ لاتی ہے۔ میں واقعی بہت خوش ہوں۔"

"کیوں، کسی جاپانی لڑکی نے رشتہ بھیجا ہے؟" وہ طنزیہ بولی۔

"ہاہاہا۔۔۔" وہ ہنس دیا۔ "جی ہم 'غزالی مے' کے رسیا ہیں، جام پر جام چڑھانے کے قائل۔ چھوٹے چھوٹے 'گھونٹوں' سے ہمارا کام نہیں بنتا۔" ایقان اس کی بات سمجھ کر بے ساختہ ہنس دی تھی۔

"بس آ گئی مسکان لبوں پر۔" وہ اسے چھیڑنے لگا۔ "یار! یہ تم خواتین بھی کیا چیز ہوتی ہو۔ ذرا سی تعریف کیلئے کا چھلکا ثابت ہوتی ہے۔ لحہ بھر میں پھسل کر چاروں شانے چت۔"

"جی نہیں، ایسی بھی بات نہیں۔ روٹھنے پر آ جائیں تو جان لے کر بھی نہ مانیں۔" وہ بے نیازی سے گویا ہوئی۔

"ارے باپ رے۔۔۔ تم تو جاپانی عورتوں سے زیادہ ظالم ہو بھئی۔ یہ تو وفا کی مشہور ہیں۔"

"اچھا۔" وہ تعجب سے بولی۔ "کیوں مشہور ہیں، کیا ظلم کرتی ہیں؟"

"خود رشتہ ہی نہیں بھیجتیں۔ 'مھائی کیکون' کا انتظار کرتی ہیں۔" وہ مزے سے بولا۔

"ہائیں، یہ 'مھائی کیکون' کیا بلا ہے؟"

"ارینجڈ میرج۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"اچھا۔ تو چلئے ارینجڈ ہی سہی۔ آپ پہل کیجئے نا۔ کیا خبر کہیں سے مثبت جواب آ جائے۔" وہ جل ہی گئی۔

"نہیں یار! تمہیں تو پتا ہے نا، ہم دولت لو میرج کے قائل ہیں۔ پتا ہے نا؟" اسے پھر ہنسی آ گئی تھی۔

"عاشر۔۔۔ قسم سے بہت فضول باتیں کرتے ہو تم۔ اتنا بل تم ان فضول باتوں کے لیے ہی بھرتے ہو۔"

"اچھا۔ چلو پھر کام کی بات کرتے ہیں۔ آج کیا تاریخ ہے؟"

"آج۔۔۔" اس نے لمحہ بھر کو سوچا۔ "بارہ۔"

"ہوں۔۔۔ بارہ۔۔۔ اور چار دن بعد کیا تاریخ ہو گی؟"

"سولہ۔" وہ الجھ گئی۔

"سولہ نہیں جانِ من سترہ۔ تمہارا دماغ تو میری جدائی میں بہت کمزور ہو گیا ہے۔ میں سترہ کو پہنچ کر ٹھیک کرتا ہوں۔" وہ شوخی سے بولا تھا۔ ایقان کا اوپر کا سانس اوپر، نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ کچھ دیر کے لیے اس سے کچھ بولا ہی نہ جا سکا۔

"ارے۔۔۔ یہ سانپ کیوں سونگھ گیا؟"

"عاشر۔۔۔ عاشر۔۔۔ سچ کہہ رہے ہو، تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو۔"

"تمہاری قسم۔"

"میں۔۔۔ میں۔۔۔ اف عاشر۔ میں کتنی خوشی محسوس کر رہی ہوں، کیسے کہوں۔"

"تم نہ بھی کہو تو کیا ہے۔" وہ سنجیدہ سا ہو گیا۔ "تمہاری سانسیں کہہ رہی ہیں، تمہاری آنکھیں کہیں گی اور میں ان آنکھوں سے چھلکتی ساری خوشی اپنے اندر اتار لوں گا۔ میرے فون کا انتظار کرنا، میں تمہیں فلائٹ کنفرم کر کے ٹائم بتاؤں گا، ٹھیک۔"

"ہوں۔" وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

"پھر ملتے ہیں چار دن بعد۔" وہ پھر شوخ ہوا تھا۔ "خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" اس کے لب آہستہ سے ہلے تھے۔

دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

ایقان ریسیور ہاتھ میں لیے کھڑی رہی۔ وہ جیسے کسی خواب کے عالم میں تھی، خوش کن، سرور سے بھرا خواب۔ حرکت کر کے اپنے خواب کو ختم کرنے کا خطرہ مول لینا نہ چاہتی تھی۔ وہ یونہی بت بن کر اس طلسم میں بے حس و حرکت کھڑی مسکراتی رہی۔ یہاں تک کہ ایمان کے رونے کی آواز آنے لگی۔ ایقان نے چونک کر ریسیور رکھا اور بھلا تکیں مارتی ہوئی بھاگی۔ ایمان کو بازوؤں میں بھر کر اس نے چٹاچٹ اس کے کئی بوسے لے ڈالے۔

"میری گڑیا کے بابا آئیں گے، میری شہزادی کے بابا آئیں گے، میری لاڈلی اپنے بابا کو دیکھے گی، ان سے باتیں کرے گی، ان سے لاڈ کرے گی۔۔۔ میری گڑیا کے بابا۔"

❁ ❁ ❁

الماری بند کر کے وہ کسی سوچ میں گم کھڑی رہی۔ دادی کے بٹوے میں کل دو سو روپے باقی تھے۔ اسے بھی علم نہ تھا کہ اس رقم کے علاوہ بھی دادی اپنے پیسے کہیں اور چھوڑ کر گئی تھیں یا نہیں۔ دادی کی چیزیں اب تک اپنی اپنی جگہ پر اسی حالت میں پڑی تھیں جیسا کہ وہ انہیں چھوڑ کر گئی تھیں۔

وجیہہ نے اب تک ان کی کسی شے کو نہ چھوا تھا۔ ان کا لکڑی کا چھوٹا صندوق جو کمرے کے ایک کونے میں پڑا تھا، دادی کا ضروری سامان اس میں رکھا ہوا تھا۔

صندوق میں پڑے تالے کی چابی دادی اپنے ازار بند میں باندھ کر رکھا کرتی تھیں۔ وہ چابی وجیہہ نے ان کی تکفین کے موقع پر نجانے کہاں رکھی تھی۔ اسے اب یاد نہ آتا تھا۔ الماری میں بھی دادی کا

کچھ سامان تھا۔ ان کے چند ایک جوڑے' ان کی کچھ دینی کتابیں' ان کا چشمہ' کنگھا' دنداسہ وغیرہ۔ الماری میں ان کا بٹوہ بھی تھا جس میں دادی روزمرہ استعمال کی رقم رکھا کرتی تھیں۔ اب اس بٹوے میں فقط دو سو روپے باقی تھے۔

ربیعہ' دادی کی وفات کے بعد سے اسی بٹوے سے رقم نکال کر گھر کا خرچ چلا رہی تھی لیکن آج بجلی کا بل آیا تھا۔ بٹوے میں پڑے پیسوں سے بل بھرنا ممکن نہ تھا۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے اپنا دوپٹہ پھیلا کر اوڑھا اور کمرے کا دروازہ بند کر کے صحن میں چلی آئی۔ باہر گلی میں آ کر اس نے دروازے میں کنڈا ڈال دیا اور آہستہ روی سے چلتی سمیعہ' ثوبیہ کے گھر تک چلی آئی۔ دستک کے جواب میں ثوبیہ دروازے تک آئی تھی۔

"ارے ربیعہ باجی آپ! آئیں نا اندر۔"

"حاکم چچا ہیں گھر پر؟" ربیعہ نے سوال کیا۔

"ہاں ہاں ابا گھر پر ہی ہیں۔ آئیں نا اندر۔"

ربیعہ اس کی معیت میں حاکم چچا کے کمرے تک چلی آئی۔

"السلام علیکم چچا۔" اس نے دھیرے سے انہیں مخاطب کیا۔

"ارے!" وہ کھل اٹھے۔ "ربیعہ آئی ہے' تو بھئی آؤ۔ بہت مبارک گھڑی ہے بھئی ہماری ربیعہ نے کتنے دنوں بعد گھر سے قدم نکالا ہے۔ ہمارے آنگن کی قسمت جاگ اٹھی۔ ثوبیہ! ربیعہ کے لیے دودھ میں شربت ڈال کر لاؤ۔"

"رہنے دیں چچا بس۔ میں جاؤں گی۔ ذرا کام سے آئی تھی۔" وہ شرمندہ ہو گئی۔

"کام بھی ہوتے رہیں گے' کاموں کے لیے عمر پڑی ہے۔ تم اب تک یہیں کھڑی ہو؟" انہوں نے ثوبیہ کو گھورا۔ وہ فٹافٹ باورچی خانے کی سمت چل دی۔

"بیٹھو ربیعہ! ادھر بیٹھو۔" انہوں نے اپنے برابر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ جھجکتے ہوئے ان کے پاس آ بیٹھی۔

"چچا جان۔ وہ۔ کچھ کام تھا۔"

"ارے بھئی' اب کہہ بھی دو۔ یہ ہم سے کیا تکلف برت رہی ہو۔ اس کا مطلب ہے تم ہمیں اپنا ہی نہیں سمجھتیں۔"

"یہ بات نہیں ہے چچا جان!" وہ گھبرا کر بولی۔ "آپ کو اپنا نہ سمجھوں تو دنیا میں اور کون ہے میرا۔"

"اچھا تو پھر کہو کیا بات ہے؟"

"آپ کو پتا ہی ہے' پچھلی گلی کے سرے پر جو دو دکانیں ہیں' وہ ہماری ملکیت ہیں۔ ہر ماہ دادی یا تو خود جا کر ان کا کرایہ لے آتی تھیں یا پھر وہ لوگ خود ہی دے جاتے تھے۔"

"ہاں ہاں' یہ کون سی راز کی بات ہے۔ سارا محلہ جانتا ہے۔"

"میں چاہ رہی تھی چچا جان! کہ آپ وہاں جا کر دکانوں کا کرایہ لا دیا کریں۔ ڈیڑھ ماہ سے کرایہ نہیں آیا ہے۔ کل بجلی کا بل بھی آ گیا ہے۔ میرے پاس اسے جمع کروانے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔"

وہ چند لمحے اس کی صورت دیکھتے رہے پھر مسکرا دیے۔

"تو بھئی' اب تم بل جمع کرانے کی فکر بھی کیا کرو گی۔ واہ بھئی۔" وہ ہنسنے لگے۔ "خیر' بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ کرایہ بھی لا دوں گا اور بل بھی جمع کروا دوں گا۔ میں تمہارے گھر کو اپنے گھر سے جدا نہیں سمجھتا۔ یوں سمجھو یہ بھی میرا ہی گھر ہے۔"

"شکریہ چچا جان!"

ثوبیہ ٹھنڈے دودھ میں شربت گھول کر لے آئی تھی۔ ربیعہ اس سے سمیعہ کے متعلق استفسار کرنے لگی۔

"باجی حنا کے گھر گئی ہیں۔ ان کے ہاں درس ہوتا ہے ہر جمعرات کو۔"

ربیعہ نے چونک کر ثوبیہ کو دیکھا پھر سر جھکا کر گلاس خالی کرنے لگی۔ حنا کے گھر جانے کا مطلب وہ بخوبی جانتی تھی۔

❁ ❁ ❁

چابی اسے الماری کے سب سے اوپری خانے میں بچھے اخبار کے ٹکڑے کے نیچے سے مل گئی تھی۔ اسے یاد نہ آ رہا تھا کہ اس نے کس وقت وہ چابی وہاں رکھی تھی۔ اس وقت تو وہ اپنے ہوش و حواس میں ہی نہ تھی۔ بھلا یہ بے تکی بات اسے کیسے یاد رہتی۔ صندوق کھولتے ہوئے اس کے جذبات و احساسات عجیب سے ہو رہے تھے۔ دادی جان کی زندگی میں اس نے کبھی اس صندوق میں جھانک کر بھی نہ دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی کسی قسم کا تجسس اس کے اندر جاگا تھا۔

دادی کی تربیت نے عجب بھولپن اور معصومیت اس کے اندر سمو دی تھی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والی بہت ہی سادی سی لڑکی تھی۔ بے وجہ کے تجسس اور تفکرات اسے نہ گھیرتے تھے۔

پھر دادی نے کبھی اس کے سامنے اس صندوق کو کھولا بھی نہ تھا۔ وہ اگر کبھی اسے کسی مقصد کے تحت کھولتی بھی تھیں تو ربیعہ کی غیر موجودگی میں۔

صندوق کا بھاری ڈھکن اٹھا کر اس نے دیوار سے ٹکا دیا اور اندر جھانکنے لگی۔ پہلی نگاہ میں اسے سب چیزیں پرانی اور بے مقصد نظر آئیں۔

ایک کونے میں سفید ململ کے کپڑے کی پوٹلی تھی۔ دوسرے کونے میں کچھ کاغذات تھے۔ تانبے اور پیتل کے چھوٹے چھوٹے برتن اور استعمال کی دیگر اشیاء تھیں' ایک پرانی البم تھی۔

ربیعہ نے سب سے پہلے البم نکالی۔ یہ واحد شے تھی جس نے اس کی توجہ فوری طور پر اپنی جانب مبذول کروائی تھی۔

البم کھول کر وہ تصویریں دیکھنے لگی۔ بلیک اینڈ وائٹ تصویریں تھیں' سب کی سب بے حد پرانی۔ کسی کسی تصویر میں اسے فقط دادی کی پہچان ہو سکی تھی۔ باقی لوگ کون تھے' وہ نہ جانتی تھی۔

بڑی حیرانی سے وہ تصویریں دیکھتی رہی۔ ایک تصویر پر اس کے ہاتھ رک گئے اور نگاہیں ٹھہر گئیں۔ وہ نوعمر لڑکی ربیعہ سے مشابہہ تھی۔ سر پر بھاری کام کا دوپٹہ اوڑھے' ہونٹوں پر شرمگیں مسکراہٹ لیے وہ نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ گلے میں کندن کے کام کا بھاری گلوبند تھا۔

نظریں چونکہ نیچی تھیں' اس لیے تصویر کا تاثر مبہم تھا' بہت واضح نہ تھا۔

اس چہرے میں کشش تھی' بے پناہ کشش۔ ربیعہ اپنی نگاہیں نہ ہٹا سکی۔ دیر تک وہ تصویر کو دیکھتی رہی پھر اپنی انگلی سے اس نے تصویر کو چھوا۔ اس کے رخسار' اس کی پلکیں' اس کی پیشانی' اس کے ہونٹ' وہ انگلیوں سے اس کے ہر ہر نقش کو محسوس کرتی رہی۔

اچانک اسے کچھ احساس ہوا۔ اس نے اپنا چہرہ چھو کر دیکھا۔ اس کا وہم درست تھا' اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ رو رہی تھی' وہ بے خبری میں رو رہی تھی۔ وہ اس تصویر کو دیکھ کر کیوں رو رہی تھی' اس کی سمجھ میں نہ آیا۔

البم بند کر کے اس نے واپس صندوق میں رکھ دی پھر اس نے کاغذات نکالے۔ ان میں مختلف چیزیں تھیں' بینک کے کچھ کاغذات تھے' کچھ پرانے خطوط تھے۔ ایک فائل تھی' نجانے کس چیز کی۔ ربیعہ کو کاغذات سے دلچسپی محسوس نہ ہوئی۔ وہ تو بڑی فراغت کے ساتھ توجہ کے ساتھ دیکھے جانے والی چیزیں تھیں۔ اس نے کاغذات بھی واپس رکھ دیے۔

وہ پیتل کے برتن اٹھا اٹھا کر دیکھتی رہی۔ سرمہ دانی' دودھ پینے کا پیالہ' ہاون دستہ' لوٹا' چراغ' چند ایک گلاس اور پلیٹیں۔ نجانے دادی نے یہ برتن کیوں رکھے ہوئے تھے۔

وہ کچھ دیر بیٹھی خالی الذہنی کے عالم میں صندوق کے اندر دیکھتی رہی پھر اس نے ململ کی پوٹلی اٹھا کر باہر نکالی۔ اس کے اندر کسی بھاری سی چیز کا احساس ہوا تھا۔

ربیعہ نے پوٹلی کھولی' اندر ایک چھوٹا سا ڈبہ اور ایک سرخ جوڑا رکھا تھا۔ اسے قدرے حیرانی ہوئی۔ وہ سرخ جوڑا کام سے مزین تھا جو اب تک کالا نہ پڑا تھا۔ اس کی چمک ضرور مدھم پڑ گئی تھی پھر ربیعہ نے وہ ڈبا کھولا' اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس ڈبے میں طلائی زیورات تھے۔

ربیعہ نے کندن کے کام کا بھاری گلوبند اور جھمکے استعجاب سے دیکھے۔ کنگنوں کو ہاتھ میں لے کر ان کے بھاری پن اور مالیت کا اندازہ کرنے کی کوشش کرتی رہی پھر بڑے اشتیاق سے اس نے وہ کنگن پہن لیے' گلوبند گلے میں ڈال کر کسا' جھمکے کانوں میں پہنے۔ اس کے بعد اس نے سرخ دوپٹہ کھولا اور سر پر ڈال کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

اچانک اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ ابھی ابھی اس نے یہی روپ دیکھا تھا' بالکل یہی۔ اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

کچھ دیر قبل وہ جس تصویر کو دیکھ کر بے اختیاری کے عالم میں رو رہی تھی' وہ بالکل ایسی ہی تو تھی جیسی ربیعہ آئینے میں نظر آ رہی تھی' بالکل ایسی ہی۔

ربیعہ ماورا اپنا عکس دیکھتی رہی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ سب چیزیں اس کی اپنی تھیں' بالکل اپنی۔ وہ چیزیں ربیعہ کے کسی بہت "اپنے" کی تھیں۔ آنسو ایک مرتبہ پھر بڑی روانی سے اس کے چہرے پر پھسلنے لگے۔ وہ ان چیزوں کو چھو چھو کر محسوس کرتی رہی اور روتی رہی۔

"ماں!" یکایک اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

"ماں!" پھر اس نے چیخ ماری تھی۔

"ماں۔۔۔ ماں۔۔۔ ماں۔۔۔" وہ دھاڑیں مار مار کر رو دی۔

زندگی میں پہلی بار' پہلی بار اسے "ماں" کے وجود کا احساس ہوا تھا۔ اسے اپنی ماں یاد آئی تھی۔ دادی کی شفقت کا دبیز بادل غائب ہوا تھا تو ماں کی محبت کا چمکتا ماہتاب طلوع ہو گیا تھا۔

آج اسے دادی کی نہیں' اپنی ماں کی یاد آئی تھی۔ آج پہلی مرتبہ وہ اپنی دادی کے لیے نہیں' اپنی ماں کے لیے رہی تھی۔

ماں۔۔۔ جسے اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

ماں۔۔۔ جسے اس نے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔

ماں۔۔۔ جس کی اسے کبھی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی تھی۔

جس ذائقہ کو چکھا نہ ہو' جس خوشبو کو محسوس ہی نہ کیا ہو' جس شے کو کبھی دیکھا ہی نہ ہو بھلا اس کی طلب کب ہوتی ہے۔

پر اسے اپنی ماں کی طلب ہو رہی تھی۔ اس کا دل ماں کے بازوؤں میں مچلنے کو بے قرار ہو رہا تھا۔ وہ ماں کی گود میں سر رکھ کر پرسکون کی نیند سونا چاہتی تھی۔

ماں۔۔۔ جو اسے جنم دیتے ہی ہمیشہ کی نیند سو گئی تھی۔

* * *

"میں کل تمہارے گھر آئی تھی۔" رات کو اس نے سمیعہ کو بتایا۔ "تو یہ بتا رہی تھی' تم حنا کے گھر گئی ہو۔" سمیعہ کے لب مسکرانے لگے۔

"پھر تم کیا سمجھیں۔"

"میں۔۔۔ میں سمجھ گئی تھی کہ تم "اس" کے ساتھ کہیں گئی ہو گی۔ کہاں گئی تھیں؟"

"یونہی ذرا سا چکر لگا کر آ گئے تھے۔ اس نے مجھے چنے کی چاٹ کھلائی اور بوتل پلائی۔ بُندے بھی خرید کر دیے۔ تم آؤ گی تو دکھاؤں گی تمہیں۔"

"تمہیں ڈر نہیں لگتا سمیعہ!" ربیعہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ سمیعہ نے اسے اس طرح دیکھا جیسے وہ احمق اعظم ہو۔

"ڈر؟" پھر وہ ہنس دی تھی۔ "ڈر کاہے کا' کس سے ڈروں۔ مجھے تو صرف اس کی جدائی کے خیال سے ڈر لگتا ہے۔"

"تمہیں حاکم چاچا سے ڈر نہیں لگتا۔ اگر ان کو پتا چل جائے یا اگر نفیسہ خالہ کو پتہ چل جائے تو؟"

"تو کیا ہو گا۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ سب کو پتا چل جائے۔ سب مل کر ہمارا نکاح پڑھوا دیں گے۔" وہ بے فکری سے ٹانگیں ہلاتے ہوئے بولی۔

ربیعہ بے ہوش ہونے کے قریب ہو گئی۔ منہ کھولے ہونقوں کی مانند وہ اس کی بے فکری اور بے نیازی کو دیکھتی رہی۔

"تمہیں۔۔۔ تمہیں اس بات سے کچھ فرق نہیں پڑتا سمیعہ! تمہارے ابا کو پتہ چل جائے کہ تم دوسرے ملتی ہو' اس کے ساتھ گھومتی پھرتی ہو۔ تمہارے ابا کیا سوچیں گے سمیعہ! ساری زندگی وہ جب بھی تمہارا چہرہ دیکھیں گے' انہیں یہی بات یاد آئے گی۔"

"اُفوہ۔" سمیعہ اس کی تنقید سے پریشان ہو کر بولی۔ "کیا قیامت ٹوٹ پڑے گی بھئی اور ابا کون سا حج' عمرے کیے بیٹھے ہیں۔ ساری عمر میری اماں جلتی کڑھتی رہی' اسے روگ لگا دیے' مر گئی بے چاری۔ میں نے تو سچے دل سے محبت ہی کی ہے' کوئی گناہ تو نہیں کیا۔ جس کے ساتھ گھومتی پھرتی ہوں' اسی کے ساتھ شادی کروں گی' اسی کے گھر میری ڈولی جائے گی' اسی کی سیج سجاؤں گی۔"

ربیعہ کے گال تپ گئے' نگاہیں جھک گئیں۔

"چائے بناؤں تمہارے لیے؟" اس نے آہستگی سے پوچھا۔

"ایک تو ربیعہ۔۔۔ تم بھی نا۔" سمیعہ نے اس کی حالت دیکھ کر اس کی کم عقلی پر تأسف سے سر ہلایا۔

"پتا ہے تمہیں' ابا کیا کہہ رہے تھے؟"

"کیا؟"

"وہ تمہاری شادی کروانا چاہتے ہیں۔ کہہ رہے تھے' اکیلی لڑکی یوں بھلا کب تک خالی گھر میں رہ سکتی ہے' اسے کسی مرد کے سہارے کی ضرورت ہے۔ مجھے تو لگتا ہے' ان کی نظر میں کوئی رشتہ ہے تب ہی وہ اتنے وثوق سے کہہ

رہے تھے کہ ایک ماہ کے اندر اندر تمہاری شادی ہو جائے گی۔"

ربیعہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

"لیکن کیوں؟" وہ ہراساں ہو کر بولی تھی۔

"میں ایسے ہی خوش ہوں سمیعہ! مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ مجھے اکیلے ڈر نہیں لگتا۔"

"ہونچ۔" سمیعہ نے سر ہلایا۔ "ربیعہ بی بی! یہ تو دنیا کا دستور ہے۔ کوئی ایسی خوفناک بات بھی نہیں کی کہ تم خوف کے مارے جان دے دو اور پھر اگر تمہیں اکیلے گھر میں ڈر نہیں لگتا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ساری عمر تم یونہی گزار دو۔ شادی کر کے مزے سے رہو، بچے پیدا کرو۔" ربیعہ خاموش بیٹھی اس کی گفتگو سنتی رہی۔

"دیکھو نا! ابھی تمہاری ذمہ داری سارے محلے پر عائد ہے' اخلاقی ہی سہی۔ تمہاری شادی کسی بھلے مانس سے ہو جائے تو سب لوگ اطمینان کا سانس لیں گے۔ سب ہی کو یہ بوجھ ہلکا محسوس ہوگا۔" اس نے بغور ربیعہ کے تاثرات کا مشاہدہ کیا۔

"آخر تم اکیلی رہ کر کیا کرو گی تمہارے پاس کرنے کو ہے کیا؟" وہ اکتا کر بولی تھی۔

ربیعہ افسردہ سی ہو گئی۔

"میں تو پڑھنا چاہتی ہوں سمیعہ! ابھی تو عمر پڑی ہے شادی کرنے اور بچے پیدا کرنے کے لیے۔ میرے ذہن میں یہ سب کچھ نہیں ہے' میں نے کبھی اس طرح سے نہیں سوچا' اس لیے میرا دماغ ان باتوں کو قبول نہیں کرتا۔ مجھے اپنا ذہن بنانے میں کچھ وقت لگے گا۔ تب تک میں سکون سے اپنی پڑھائی مکمل کرنا چاہتی ہوں۔"

اونہہ۔" اس نے سر جھٹکا۔ "تمہارے سر میں خشکی نہیں ہوتی موٹی موٹی کتابیں پڑھ کر؟ تمہاری دادی نے تو تمہیں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق بنا دیا ہے۔ نہ تمہیں کبھی کوئی ڈھنگ کا کپڑا پہنے دیکھا' نہ کبھی کوئی بناؤ سنگھار کا شوق ہی دیکھا۔ ہمیشہ یہی سادی سی چٹیا باندھے کوئی ہلکے سے رنگ کا سوٹ پہنے رہتی ہو۔ اسکول پڑھ لیا' کالج پڑھ لیا۔ اب اور کیا رہ گیا ہے پڑھنے کے لیے؟"

ربیعہ مسکرا دی۔ سمیعہ ہمیشہ اسی طرح اسے لتاڑا کرتی تھی۔ وہ دونوں بچپن کی سنگی ساتھی تھیں' اس لیے اس نے کبھی سمیعہ کی باتوں کا برا نہ مانا تھا پھر وہ اس کی ذہنی سطح سے بھی آگاہ تھی۔ اسے پڑھائی لکھائی سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ ایسے مواقع پر وہ چولہے چوکے کی مثال دیا کرتی تھی۔ جتنا کچھ بھی وہ پڑھ سکی تھی' ڈانٹ ڈپٹ اور سختی سے پڑھ سکی تھی' ورنہ اسے خود محض خط لکھ لینے کا شوق تھا۔ اس سے آگے اس کی سوچ کے پر جلتے تھے۔ ربیعہ اس کی ذہنی دلچسپی اور میلان سے واقف تھی' سو سمیعہ کی ایسی باتوں کو مسکرا کر نظر انداز کر دیا کرتی تھی۔

"ابا نے مجھ سے کہا تھا کہ میں شادی کے متعلق تمہاری رائے معلوم کروں۔" اب کے اس نے صاف گوئی سے کہا۔ "بلکہ وہ چاہ رہے تھے کہ تم بس ہاں کر دو۔ اب تم بتا دو کہ میں انہیں کیا جواب دوں۔" ربیعہ پریشان ہو گئی۔

"سمیعہ! تم انہیں منع کر دو' میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ چند ماہ بعد یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوں گے تو میں وہاں داخلہ لے لوں گی۔"

"پھر تم ہمارے ساتھ رہنا شروع کر دو' اپنا گھر بند کر دیا کرائے پر چڑھا دو۔ یوں اکیلی تو تم نہیں رہ سکتیں۔"

ربیعہ بے چارگی کے عالم میں سر جھکا کر کچھ سوچنے لگی تھی۔

❁ ❁ ❁

"دیکھیں نا خالہ جانی! آپ ہار کر ہمیشہ یہی کرتی ہیں۔" وہ اسے منہ بسور کر دیکھنے لگا۔

انیقہ نے محبت سے اس کا گلابی نرم چہرہ دیکھا اور شرارت سے اس کے بال بگاڑ دیے۔

"میں نہیں بات کرتا آپ سے۔" وہ روٹھ چکا تھا۔ "اب میں جیتنے ہی والا تھا' آپ نے سب گوٹیں بکھرا دیں۔"

"جانو! میرا ہاتھ غلطی سے لگ گیا نا۔ میں نے جان بوجھ کر تو نہیں گوٹیں بکھیری ہیں۔" اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔ "اور آپ کو ہمیشہ یہ غلط فہمی کیوں رہتی ہے کہ آپ جیتنے والے تھے۔ کیا پتا آخر میں' میں ہی جیت جاتی۔"

منیزہ بیگم نے مسکراتے ہوئے خالہ بھانجے کی باتیں سنیں۔

"کیوں تنگ کرتی ہو انیقہ میرے بچے کو۔" انہوں نے عمر کو بانہوں میں بھر لیا۔

"دیکھیں نا نانو! ہمیشہ میرے ساتھ بے ایمانی کرتی ہیں۔" اس نے جھٹ شکایت لگائی۔

"امی! اب تک اپنا مغز کھپاؤں' اس کو تو صرف چھکا پھینکنا آتا ہے۔ باقی اس کی گوٹیں بھی میں چلاؤں اور اپنی بھی۔ اور آخر میں جیتیں بھی لازماً یہ حضرت اور ایک مرتبہ جیت کر تو موصوف کا جی ہی نہیں بھرتا۔ آٹھ' دس بازیاں ہی کھیلی جائیں۔" اس نے ڈکشا کر پیر پھیلائے۔ منیزہ بیگم ہنس دیں۔

"تم میرے ساتھ کھیلا کرو۔ میرا بچہ جتنی مرتبہ کہے گا' میں اتنی ہی مرتبہ کھیلوں گی۔"

"نہیں نانو! آپ کے ساتھ صرف سونے میں مزہ آتا ہے' کھیلنے میں تو عباد ماموں اور انیقہ خالہ جانی کے ساتھ مزہ آتا ہے۔" اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ منیزہ بیگم مسکرا دیں۔ انیقہ ہنسنے لگی۔

"وہ کیوں بھئی؟" اس نے ہنستے ہنستے پوچھا۔

"نانو کو ہرا کر کوئی اچھا لگتا ہے' مما کو ہرا کر بھی اچھا نہیں لگتا۔ صرف آپ کو اور ماموں کو ہرا کر مزہ آتا ہے۔"

انیقہ کی ہنسی رک گئی۔ وہ ہونٹ بھینچ کر مصنوعی غصے سے اسے دیکھنے لگی۔ منیزہ بیگم نے اسے سینے سے لگا لیا تھا۔

"نانو! مما کب آئیں گی؟" وہ پوچھنے لگا۔

"بس بیٹا! آنے والی ہیں تمہاری مما' پھر سب مل کر کھانا کھائیں گے۔"

"مما کو اپنا ہاسپٹل اچھا لگتا ہے' گھر اچھا نہیں لگتا۔ انہیں اپنے مریض اچھے لگتے ہیں' ہم اچھے نہیں لگتے۔"

"ایسی بات نہیں ہے جانو! آپ کی مما ڈاکٹر ہیں اور ڈاکٹر کا تو کام ہی بیماروں کی خدمت کرنا ہے۔ تم یہ بھی تو سوچو' جب تمہاری مما کسی بیمار کو ٹھیک کرتی ہوں گی تو وہ کتنی دعائیں دیتا ہوگا' اس کے گھر والے کتنا خوش ہوتے ہوں گے۔ ہے نا۔"

انیقہ نے اسے خود سے قریب کر کے سمجھایا۔

"خالہ جانی! آپ بھی ڈاکٹر بن جائیں گی' پھر آپ بھی ہاسپٹل میں رہا کریں گی۔" اس نے منہ بسورا۔ "عباد ماموں تو ویسے بھی کبھی کبھی آتے ہیں۔ جب ان کے کالج کی چھٹیاں ہوتی ہیں' ورنہ تو وہ لاہور میں ہی رہتے ہیں۔ میں کیا اکیلا ہی رہا کروں گا؟"

"کیوں بیٹا! میں جو ہوتی ہوں آپ کے ساتھ۔" منیزہ بیگم بولیں۔

"آپ کے ساتھ میں بور ہوتا ہوں نانو!" انیقہ پھر زور زور سے ہنسنے لگی تھی۔ اندر آتی ہوئی شہلا نے دلچسپی سے کمرے کا ماحول دیکھا۔

"کون سے لطیفے سنا رہے ہو اپنی خالہ کو۔" اس نے بیگ کارنر ٹیبل پر رکھا اور ماں کے قریب بیٹھ گئی۔

"آپ کا بقراط اپنی علمیت کا بھرپور مظاہرہ کر رہا ہے۔" انیقہ ہنس رہی تھی۔ "اور صاف گوئی اپنے عروج پر ہے۔ نانو کی بھرپور محبت کے جواب میں بے پناہ صاف گوئی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔"

شہلا نے عمر کا بازو پکڑ کر خود سے قریب کرلیا اور اس کی پیشانی چومی۔
"کیسا ہے میرا بیٹا!"
"ٹھیک ہوں۔ اگر بیمار ہو جاؤں تو اچھا ہو۔" وہ بگڑا بگڑا سا بولا۔
"خدا نہ کرے۔" شہلا دہل کر بولی۔ "ایسی خراب بات کیوں کی تم نے؟"
"پھر آپ گھر پر تو رکیں گی نا میرے پاس۔ ڈاکٹر تو بیمار کے پاس ہی ہوتا ہے۔" شہلا نے اسے بانہوں میں بھر لیا۔
"ایک بات بتاؤں بیٹا آپ کو میں!"
"بتائیں۔"
"ایک ڈاکٹر کے گھر والوں کو بہت ایثار کرنا پڑتا ہے دوسرے لوگوں کی خاطر۔ اپنے حصے کا وقت بھی دوسرے لوگوں کو دینا پڑتا ہے جب یہ گاڑی چلتی ہے ورنہ ایک بے چارہ ڈاکٹر کہاں کہاں کس کس کو پورا پڑے۔"
وہ ٹکر ٹکر ماں کی صورت دیکھتا رہا۔
"آپ کے حصے کا ٹائم اگر میں کسی اور کو دیتی ہوں تو اس کا دکھ مجھے بھی ہوتا ہے لیکن دوسرے لوگوں کے لیے یہ وقت کتنا قیمتی ثابت ہوتا ہے آپ کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے اور پھر میں آپ کو اکیلا تو نہیں چھوڑتی نا۔ آپ کی نانو ہوتی ہیں، خالہ جانی ہوتی ہیں۔ کبھی کبھار چچا، ماموں بھی آجاتے ہیں۔"
"میرے پپا تو نہیں ہوتے نا۔ سب بچوں کے گھر میں پپا ہوتے ہیں، ہمارے گھر میں تو پپا بھی نہیں ہیں۔ مما بھی چلی جاتی ہیں۔" شہلا کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے آہستگی سے عمر کو خود سے علیحدہ کیا تھا۔
"میں چینج کر کے آتی ہوں پھر سب مل کر کھانا کھائیں گے۔"
منعوذہ بیگم گہری سانس بھر کر رہ گئی ہوئی تھیں۔ انیقہ نے عمر کے سر پر چپت لگا کر اس کی ناک ہلادی تھی۔

❁ ❁ ❁

خالی پڑا ہے پیٹ، غذا کیوں نہیں دیتے
جو دال پکائی ہے، کھلا کیوں نہیں دیتے
اس آنت سے اس آنت تک ہیں دوڑ لگاتے
چوہوں کو مارنے کی دوا کیوں نہیں دیتے

وہ اسٹیل کی پلیٹ ڈائننگ ٹیبل پر اوندھی کیے بجا بجا کر گا رہا تھا۔
فردوس بیگم جھلا کر کچن سے برآمد ہوئیں۔ "علی! اسد مر جاؤ تم۔"
"کدھر جاؤں خالی پیٹ۔" وہ مسخرے پن سے بولا۔
"کمبخت جو رہی ہوں پک رہا ہے کھانا۔"
"تب تک سنتی رہیے میرا گانا۔"
"یا اللہ۔" انہوں نے ماتھا پیٹنا چاہا تو ہاتھ میں تھامی کفگیر ماتھے پر لگی۔ علی کی ہنسی نکل گئی۔
"میں کھینچ کر ماروں گی یہی کفگیر۔" انہیں طیش آگیا۔
"کہیں اور جاتا ہے یہ فقیر۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا اور شرٹ کھینچ کر جینز کے اندر کرنے لگا۔ "جو دے اس کا بھی بھلا، جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔ فقیر سائیں جاتے ہیں۔"
"جائے گا اب چچی یا پھپھی کی دہلیز چھونے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے کچن میں گھس گئی تھیں۔

"باجی! ایک کپ چائے بنادو۔"
بھاری گمبھیر آواز پر وہ مڑی تھیں۔ اختر میاں کچن کے دروازے کی چوکھٹ تھامے کھڑے تھے۔ ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔
"بیٹھو باہر۔" قدرے توقف سے وہ بولی تھیں۔ "میں آتی ہوں لے کر۔"
وہ منہ ہی منہ میں گنگناتے ہوئے کچن کے باہر پڑی چھوٹی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گئے۔
کچھ دیر بعد فردوس بیگم چائے کا مگ لے کر باہر آئی تھیں۔
"جیتی رہو باجی! شاد رہو، آباد رہو۔" انہوں نے بڑی ترنگ میں مگ تھاما۔
"اختر! تم اپنی حرکتوں سے کب باز آؤ گے؟" وہ غصہ ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں۔
"ہم تو مستقل بے حس و حرکت خیال کرتے ہیں خود کو باجی! ایک جمود ہے زندگی پر طاری، جو ٹوٹتا ہی نہیں۔ آپ کون سی حرکت کی بات کر رہی ہیں؟" ان پر فردوس بیگم کے غصے کا مطلق اثر نہ ہوا تھا۔ بہت اطمینان سے چائے کے گھونٹ بھرتے رہے۔
"کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑتے ہی رہا کرو۔" وہ جیسے پھٹ پڑیں۔ "یہ بھی خیال نہیں کہ یہ ہمارے ابا کا گھر نہیں، بہن کا سسرال ہے۔ میں کوئی حاکم وقت نہیں ہوں یہاں، جو ہر وقت تمہاری شکایتوں پر کان لپیٹ کر بے نیازی کی چادر اوڑھے رکھوں۔ جانتے ہو فاروق نے مجھے کس قدر ذلیل کیا ہے۔ ان کی اماں نے سندیسہ کہلوایا تھا کہ اختر کو کسی کھونٹے سے باندھ کر رکھو نہیں، بندھتا تو نکال کر باہر کرو گھر سے۔ یہاں ہماری بہن بیٹیاں ہیں۔ ہم ایسے سرپھرے، بے شرم، منچلے لفنگوں کو کب تک پالیں۔"
"ہم نے کیا کیا ہے باجی!" وہ جیسے زچ ہوئے۔ "ہمارا قصور تو بتلائیے؟"
"اس روز تم بچوں کی محفل میں جا گھسے اور اس "حسن کی دیوی" کو دیکھ دیکھ کر عجب قسم کے اشعار پڑھے تم نے، ذرا شرم نہ آئی تمہیں۔ اس نے جا کر ماں سے شکایت کی اور ماں نے فاروق حسن کو بلوا بھیجا۔ کیسا تماشا بنایا تم نے سارے گھر میں۔"
"اف۔ حسن کی دیوی! سچ کہا باجی، دیوی ہی تو لگتی ہے۔ اور۔ اور اب تو جیسے شراب پرانی ہو کر دو آتشہ ہو جائے، ہائے۔"
"ہائے مرے۔" وہ منہ کھول کر کتنی ہی دیر انہیں تکتی رہیں۔ "یہ ہے میری سرزنش کا جواب۔ اختر میاں! تم خود تو ڈوبو گے مجھے بھی لے ڈوبو گے۔ ارے میں کہتی ہوں اب وہ بیاہتا، دو بچوں کی ماں ہے۔ اب تو اس کا پیچھا چھوڑ دو۔"
"ہم اس کا پیچھا کب کرتے ہیں باجی!" وہ افسردگی سے گویا ہوئے۔ "وہ ظالم سراب کی مانند خود ہی نظر آتی ہے، خود ہی بلاتی ہے، خود ہی دور بھاگتی ہے۔ پیاسا تو بے اختیار ہے۔"
فردوس بیگم بھائی کی صورت دیکھتی رہ گئیں۔ ان کا جی کٹ گیا تھا۔ ایک ہی تو بھائی تھا ان کا۔ ان سے کئی برس چھوٹا۔ انہیں اپنی اولاد کی طرح عزیز تھا۔ ان کی شادی کے وقت وہ آٹھ دس برس کا تھا۔ ماں باپ سر پر نہیں تھے۔ وہ انہیں اپنے ساتھ ہی سسرال لے آئی تھیں۔
"کیسی منتیں کی تھیں میں نے اماں کی۔ پر تم بھی تو کسی قابل ہوتے۔ ان کا بھی کیا قصور۔ اپنی لاڈلی بیٹی کیسے دے دیتیں۔ آٹھ جماعت پاس نکھٹو کو۔ نہ کسی روزگار سے ہی لگے، بھلا کیا دیکھ کر وہ بیٹی دیتیں۔"
"ہمارا دل دیکھتیں۔" ان کے لہجے میں درد تھا۔
"دل یہاں کون دیکھتا ہے۔" وہ بڑبڑائیں۔ "عذرا بیگم کی پڑھائی پٹیاں آنکھ سے اتریں تو شفیقہ حیات بیگم کو کچھ

سمجھائی دے۔ وہ تو آنکھ بند کر کے ان کے اشاروں پر چلتی ہیں۔ میں بڑی بہو ہوں' پہلا حق میرا بنتا ہے لیکن ہر کام میں فوقیت عذرا کو حاصل ہے۔ ہر مشورہ پہلے اس سے کیا جاتا ہے پھر میری باری آتی ہے۔

کیسی نظر تھی میری رافع پر۔ اس خاندان کا سب سے قابل اور سمجھ دار لڑکا ہے۔ چھوٹا سا تھا تو میں اپنی عریشہ کو اس کے ساتھ ساتھ رکھتی تھی لیکن ہوا کیا' کسی نے مجھ سے مشورہ لینا بھی پسند نہ کیا۔ میں بھی تہیہ کیے بیٹھی ہوں' اپنے تینوں لڑکوں کے لیے اس خاندان کی ایک لڑکی نہ لوں گی۔ سا بین اپنے گھر کی ہو گئی۔ اللہ نے چاہا تو عریشہ کے لیے اس سے اچھا رشتہ آجائے گا۔ ہاشم علی اور حمزہ کے لیے میں غیر خاندان کی لڑکیاں لاؤں گی اور ایسی لڑکیاں کہ دنیا دیکھے گی۔" لاؤنج سے ملحقہ بیڈروم میں لیٹی عریشہ کے کانوں تک ماں کی آواز صاف پہنچ رہی تھی۔

ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اس نے تکیہ اٹھا کر سینے پر رکھ لیا۔ بچپن سے ماں نے جو خواب آنکھوں کی پتلیوں پر نقش کر دیا تھا' کبھی کبھی وہ چبھنے لگتا تھا۔ ہر چند کہ وہ خوابوں کے سہارے جینے والی لڑکی نہ تھی' واضح اور پریکٹیکل سوچ رکھتی تھی۔

لیکن پھر بھی کبھی کبھی۔۔۔

❁ ❁ ❁

"السلام علیکم اماں!" رابعہ بیگم نے اندر داخل ہوتے ہوئے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام' جیتی رہو۔" شفیقہ حیات بیگم کے لبوں پر مسکراہٹ آئی۔ "بہو آج کہاں ہو تم' کئی کئی دن ماں کو سلام کرنے کی فرصت بھی نہیں ملتی تمہیں۔"

وہ ماں کے قریب بیٹھ کر محبت سے ان کے پیر دبانے لگیں۔

"اچھی تو ہو؟" انہوں نے بیٹی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

"جی اماں! اللہ کا احسان ہے۔ بہت آرام سے ہوں۔"

"رابعہ آئی ہے۔" عذرا بیگم بڑے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ "کیسی ہو رابعہ!"

"شکر ہے اللہ کا بھابی! آپ سنائیں' بچے کہاں ہیں۔"

"رافع اور نافع تو پچھواڑے میں پانی کی موٹر ٹھیک کر رہے ہیں۔ سدرہ اور ثانیہ کچن میں ہیں۔ کوئی نئی ڈش بنا رہی ہیں۔ ان موئے ٹی وی والوں کو تو عورتوں کو سکھ دینا نے کا شوق چڑھا ہے۔ مہنگی مہنگی چیزیں' بنا کر کوئی عجیب سا کھانا تیار کر کے دکھا دیتے ہیں۔ لڑکیاں اسی وقت بھائیوں کے پیچھے کہ ابھی چیزیں لا کر دو تو ابھی ہم بنائیں۔ بتاؤ ذرا' صبح رافع پانچ سو کی چیزیں لایا ہے اور بنے گا کیا۔ موئی سویٹ ڈش۔ کھانے کے بعد سب ایک ایک دو دو چمچ کھا لیں گے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ میں پانچ سو کی سبزی میں دس دن نکال لیتی ہوں۔"

"ارے تم لوگ اپنے بچوں سے عاجز بھی بہت ہو۔" شفیقہ حیات بولی تھیں۔ "یہ بھی آج کل کا فیشن ہوا کہ جو بات بچوں کے منہ سے نکلے' اسے پورا کرنا ماں باپ کا فرض ٹھہرے۔ گویا یہ زیادہ سے زیادہ محبت کی نشانی ہوئی۔ ہم تو اپنے بچوں کو ایک شیر کی نگاہ دیکھتے تھے اور پھر انہیں بات پر اصرار کی طاقت نہ ہوتی تھی۔ آج کل کے بچے بچیاں تو اودھم' طوفان مچا ڈالتے ہیں۔ پانچ سو یہ لڑکیاں کل لے گئیں تم سے بوتلیں پینے کے بہانے' پانچ سو کا خرچا آج کروا دیا۔ مجال ہے ان کا فشار لگا ہے کہیں۔"

"اب وہ آپ کی شیر کی نگاہ کیا ہوئی؟" عذرا بیگم ہنستے ہوئے بولیں۔

"ہمارے بچوں کے لیے تو آپ بھی بکری کا سا کلیجہ رکھتی ہیں۔ میں نہ دوں پیسے تو آپ سے ہی سفارش کرواتے ہیں سارے۔ اس وقت ان کی اصرار کی طاقت کمزوری میں بدلا کریں نا۔"

"ارے بہو! وہ کیا کہتے ہیں اصل سے سود پیارا۔ بالکل سولہ آنے صحیح کہا جس نے بھی کہا۔ اپنے بچوں کو تو ڈانٹ مار بھی لیتے تھے' ان سب کو دیکھ کر جانے کہاں سے پیار اُمڈ آتا ہے اور چالاک بھی کیسے ہیں سب کے سب۔ نئے سے نیا بہانہ تراش کر لاتے ہیں۔ میں تو اپنے رکھے ہوئے بھی اٹھا کر دے دیتی ہوں۔"

رابعہ بھی ہنسنے لگیں۔ "پھر بھابی کو کیا کہتی ہیں۔"

"ارے ہاں' دھیان آیا۔ عاشر میاں آرہے ہیں۔" شفیقہ حیات چونک کر بولی تھیں۔

"اچھا۔" رابعہ بیگم کو بھی مسرت ہوئی۔ "کب؟"

"کل ایمان کا فون آیا تھا۔ خوشی کے مارے باؤلی ہو رہی تھی۔ صحیح طور سے کچھ بتلایا بھی نہیں۔ رافع کا پوچھ رہی تھی۔ اسے ایئر پورٹ بھیجے گی عاشر میاں کو لینے۔ ہاشم بھی جائے گا۔"

"اچھا!" رابعہ بیگم کا چہرہ بھی چمکنے لگا تھا۔ "اللہ اس کی خوشیاں سلامت رکھے۔ بہت محسوس کرتی ہے عاشر کی غیر موجودگی کو۔ کتنے دنوں کے لیے آرہا ہے؟"

"بتا تو رہی ہوں' اس دیوانی کو کچھ نہ سوجھتا تھا' بس اتنا کہا' اماں! پرسوں عاشر آرہے ہیں' رافع کہاں ہے' اس سے کہنا مجھ سے فوراً بات کرے۔ بس اتنی ہی بات کی۔"

اسی اثناء میں ثانیہ اور سدرہ دو ڈونگے اٹھائے اندر داخل ہوئی تھیں۔

"اللہ۔ پھپھو بھی ہیں۔ السلام علیکم پھپھو! دیکھیں تو کیسی کلرفل ڈش تیار ہوئی ہے!" ان کے چہرے چمک رہے تھے۔

"وعلیکم السلام۔ ابھی تمہاری اسی ڈش گفتگو کا موضوع تھی۔ کیا بنایا ہے؟"

"بنایا کچھ ہے بابگاڑا ہے۔" ہنستا ہوا رافع اندر آیا تھا

"کھا کر دیکھیں بھائی! انگلیاں چبا جائیں گے۔" ثانیہ فخریہ بولی۔

"بشرطیکہ انگلیاں تمہاری ہوں!" وہ فولڈ کی ہوئی آستینیں سیدھی کرنے لگا۔

"میری تو جیب چبا گئے جب ڈش پسند نہ آئے۔ اطالوی ڈش ہے' اس کا تو نام ہی اتنا مزے دار تھا۔ بھلا کیا نام تھا سدرہ؟"

"کچھ عجیب و غریب سا ہی تھا۔ خیر چھوڑو' بیر مت گنو۔"

وہ پیالوں میں کسٹرڈ نما چیز ڈالنے لگی۔

"پائن ایپل اس میں' مینگو اس میں' کریم اس میں' بھلا مزے دار کیوں نہ ہو؟" رافع نے چمچ بھر کر منہ میں ڈالا۔ "یہ سب چیزیں ویسے ہی مکس کر کے کھاؤ تو مزہ دیں گی۔ تمہارا کیا کمال اس میں؟"

"جی ہاں۔ وہ گھنٹے ہم نے کچن میں بھاڑ جھونکا ہے!" وہ جھلائی۔

"وہ تو تمہارے بال دیکھ کر ہی لگتا ہے!" حمزہ برآمد ہوا۔

"رافع بھائی! آپ یہاں دعوتِ شیراز اڑا رہے ہیں' وہاں نافع سمجھ رہا ہے آپ چار منہ والا پیچ کس لینے گئے ہیں۔"

"ارے یار! میں بھول گیا۔ ذرا دو ڈال کر دے آؤ۔"

"آپ اپنا پیالہ مجھے پکڑا دیں ناں۔ میرا تھن میں آپ حصہ لے لیں۔ یوں بھی نافع کے بس کی بات نہیں مشین کو ٹھیک کرنا۔ وہ صرف آپ کو اسسٹ کرتا ہے۔"

"ارے چھوڑو میرا پیالہ۔ یہ مجھے پانچ سو کی قربانی دے کر ملا ہے۔ اسے چھوڑ کر میں کہیں نہ جاؤں گا۔"

"اور وہ آپ کا اسسٹنٹ؟"

"اسے بھی بلالو۔ دعوت اطالیہ اڑانے کو۔"

"اللہ۔ آپ سارے مل گئے تو ہماری ڈش کا دیوالیہ نکل جائے گا!" ثانیہ گھبرائی۔

"نکل جانے کا نہیں "نکل چکا!" نافع اور علی بھی چلے آئے۔

ثانیہ اور سدرہ ٹھنڈی سانس بھر رہ گئیں۔

"جاؤ ثانیہ! وردہ اور ناعمہ کو بھی بلا لاؤ۔ ہاشم کو بھی دیکھو گھر پر ہو تو اسے بھی بلالو۔ سب مل کر کھاؤ۔" عذرا بیگم نے بیٹی سے کہا۔

"جی امی!" اس نے سر ہلایا اور بے بسی سے اٹھ کر چل دی۔

❀ ❀ ❀

اس نے اپنی سب کتابیں اور نوٹس وغیرہ نکالے ہوئے تھے اور اب بیٹھ کر انہیں تسلی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ان سب کی درجہ بندی کر کے ترتیب سے رکھنا چاہتی تھی۔ کئی دنوں سے وہ یہ کام کرنے کا سوچ رہی تھی لیکن ہر مرتبہ سستی آڑے آجایا کرتی۔ آج اس نے یہ کام کرنے کا تہیہ کر ہی لیا تھا۔

یوں بھی اب وہ سوچتی تھی کہ فارغ اوقات میں زیادہ سے زیادہ پڑھائی کرے۔ بی اے کا امتحان اس نے یونہی معمولی سی تیاری کے ساتھ دے دیا تھا لیکن ایم اے وہ پوزیشن کے ساتھ کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لیے مکمل توجہ کے ساتھ پڑھائی کی ضرورت تھی جو وہ دادی کی اچانک وفات کے بعد سے اب تک نہ کر سکی تھی۔ اس کا ذہن متاثر ہوا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہوئی تھیں، سو اب وہ اطمینان اور تسلی سے بیٹھ کر اسی کمی کو پورا کرنے کا عزم کیے ہوئے تھی۔

دروازہ بجا تو اسے کوفت ہوئی۔ کتنے موڈ کے ساتھ وہ کتابیں لے کر بیٹھی تھی۔ ہر مرتبہ اس کے ساتھ یہی ہوتا تھا۔ محلے والے اس کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنے کے چکر میں اس کے آرام اور سکون میں بھی مخل ہو جایا کرتے تھے۔

اس نے اٹھ کر دروازے کی چٹخنی گرائی۔ باہر نفیسہ خالہ کھڑی تھیں۔

"آئیں خالہ!" اس نے چہرے پر مسکراہٹ سجائی۔

"ٹھیک ہو بیٹی؟" وہ پیر گھسیٹتی چلی آئیں۔

"جی۔ شکر ہے خدا کا!"

"پڑھ رہی تھیں؟" انہوں نے حالات کا بغور معائنہ کیا۔

"جی بس۔" وہ منمنائی۔

جانتی تھی کہ اب خالہ گھنٹہ بھر سے پہلے نکلنے والی نہ تھیں۔ وہ تو جاتے جاتے دروازے پر بھی آدھا گھنٹہ نمٹا دیا کرتی تھیں۔ کئی مرتبہ "خدا حافظ" کہتیں اور پھر انہیں کوئی نیا خیال چھیڑ جاتا۔

"اچھا اچھا۔ پڑھو پڑھو۔ میں تو یونہی نگاہ مارنے چلی آئی تھی!" وہ چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ "اکیلی بچی ہو، بار بار دھیان تمہاری طرف جاتا ہے۔ میں تو اپنے سکون سے گئی۔ بھلا بتاؤ! چین کی نیند سو سکتی ہوں۔ دھیان تو تم میں اٹکا رہتا ہے۔" رابعہ مسکرا دی۔

"کیوں فکر کرتی ہیں خالہ جان! میں نے کتنی مرتبہ سمجھایا ہے آپ کو۔ میں بالکل اطمینان سے رہتی ہوں۔ نہ کوئی خوف، نہ ڈر، نہ کھٹکا نہ اندیشہ۔ آپ سب لوگ میرے آس پاس بستے ہیں۔ دیوار سے دیوار ملتی ہے۔ پھر بھی میں ہر وقت دروازے کھڑکیاں بند کر کے رکھتی ہوں۔ کبھی آپ کو دروازہ کھلا ملا؟"

"وہ تو سب ٹھیک ہے بیٹی! لیکن مجھ سی بڈھیوں کو تو وسوسے ستاتے ہی ہیں۔ تم ماشاءاللہ جوان ہو، بہادر ہو، تم دنیا کو اپنی نظر سے دیکھتی ہو جو معصوم اور شک سے صاف ہوتی ہے۔ ہم بوڑھے لوگوں کو تو وقت یوں بھی شکی مزاج بنا جاتا ہے۔" وہ ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

"اور پھر تمہیں بھلا زمانے کی کیا پہچان! یہاں تو شیطان بھی فرشتے کا بہروپ بدل کر آتا ہے۔ شیطان بن کر آئے تو لوگ لاحول پڑھ کر بھگا نہ دیں!"

رابعہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔ آج نفیسہ خالہ کی باتوں میں فلسفے کا کچھ زیادہ ہی رنگ ملا ہوا تھا اور ایسا تب ہی ہوتا تھا جب ان کے پاس کرنے کو کوئی اہم بات ہوتی۔ ورنہ زیادہ تر تو وہ محلے میں گردش کرتی خبروں پر تبصرے سے گفتگو کا آغاز کیا کرتی تھیں۔

"کیا بات ہے خالہ؟"

"اے لو۔ بات کیا ہوتی ہے۔ کچھ نہیں بھلا بتاؤ!" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیں۔ "پریشان ہو گئیں؟"

"نہیں پریشانی کی کیا بات خالہ جان! آپ جیسے بھلے لوگ میسر ہیں۔"

"بھلے مانسوں میں بھی برے لوگ چھپے بیٹھے ہوتے ہیں بیٹی!" وہ تذبذب سے بولیں۔ "یہ بتاؤ! تمہارا دور پار کا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں، جس کے پاس تم یہ تنہائی کے چند دن گزار لو اور دنیا کی بری نظروں سے بھی بچی رہو۔ کوئی تایا، ماما، چچا، پھپھا، کوئی تو ہو گا؟"

"پتا نہیں خالہ۔" وہ اداس ہو گئی۔ "دادی جان تو کبھی اس موضوع پر بات ہی نہ کرتی تھیں، مجھے تو اب ہوش آیا ہے کہ دنیا میں انسان کے اتنے رشتے ناتے ہوتے ہیں۔ میرے ذہن نے تو حالات و واقعات سے خود بخود ہی یہ اخذ کیا ہوا تھا کہ دادی جان کے سوا میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے نہ کبھی میں نے پوچھا، نہ انہوں نے بتایا۔"

"دادی کے سامان سے تمہیں ایسا کچھ نہ ملا جو تم اندازہ کر تیں اس بات کا؟ کوئی خط، کسی کی کوئی چٹھی۔"

رابعہ کے ذہن میں وہ تصاویر اور کاغذات گھوم گئے، جو دادی کے صندوق میں پڑے تھے۔

"ہاں خالہ جان! کچھ خط وغیرہ پڑے تو ہیں لیکن میں نے ابھی پڑھے نہیں۔"

"بھلا بتاؤ!" انہوں نے اس کی کم عقلی پر ماتھا پیٹا۔ "اے ہے بیٹی! ایسی معصومیت بھی انسان کو نفع نہ دے نقصان ہی دے۔ پڑھ کر دیکھو تو کیا لکھا ہے ان میں۔"

"اچھا میں آج دیکھتی ہوں خالہ!" وہ پریشان سی ہو گئی۔

"لیکن بات کیا ہے، آپ بتاتی کیوں نہیں؟"

"دیکھو بیٹی! بات یہ ہے کہ تمہاری سکینہ بوا کے جو بہنوئی ہیں عرفان شوکت صاحب ان کی نظر اب تمہارے مکان پر ہے۔ سکینہ کے مکان اور تمہارے مکان کو ملایا جائے تو اچھا بھلا رقبہ بنتا ہے۔ وہ یہاں بڑے پیمانے پر چوڑیوں کا کام کرنا چاہتے ہیں تاکہ محلے کی غریب عورتوں کو کم اُجرت دے کر زیادہ نفع کمایا جائے۔ اب سکینہ تو اپنا مکان بیچنے پر تیار ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی اپنا مکان اونے پونے انہیں بیچ دو تاکہ وہ دونوں مکان ملا کر بڑی جگہ پر تعمیر کر سکیں۔ تم کے تم ٹھگلیوں کے دام۔ سکینہ آج میرے پاس آئی تھی۔ اس پر تو بہنوئی کا جادو چل گیا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ تم بھی مکان بیچنے پر رضامند ہو جاؤ۔"

ربیعہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

"لیکن۔ لیکن خالہ جان! میں کیوں اپنا گھر بیچوں؟ اور پھر میں جاؤں گی کہاں۔ یہ گھر تو میری پناہ گاہ ہے۔ میری دادی کی نشانی۔"

"جب ہی تو کہتی ہوں تمہیں کسی عزیز رشتہ دار کے گھر جا کر رہو۔ یہاں تالا ڈال دو۔ ورنہ یہ لوگ تمہیں تنگ کریں گے، وہ کم بخت پیسے والا آدمی ہے۔ ہے بھی پورا بدمعاش۔ کہیں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔"

ربیعہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس طرح کے حالات کا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نام و نشان نہ تھا۔

"اور سکینہ بوا۔" اسے یقین نہ آ رہا تھا۔ "وہ بھی؟"

"ارے بیٹی! اچھے اچھوں کا ایمان ڈگمگا جاتا ہے۔ سکینہ کو اس نے الٹے سیدھے خواب دکھلائے ہیں کہ کارخانے کی انچارج بنا دے گا۔ بعد میں کہیں گھر بنوانے میں بھی مدد دے گا۔ بس وہ آ گئی اس کی باتوں میں اور پھر اس کا تو بہنوئی ہے۔ ہو سکتا ہے اس کے ساتھ کوئی رعایت مروت برتے۔ لیکن تم سے اس کا کیا واسطہ۔ تمہیں تو وہ ہتھیانے کی کوشش کرے گا۔" ربیعہ مزید پریشان ہو گئی۔

"میں سوچتی ہوں خالہ جان!" وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

❀ ❀ ❀

ہرا رنگ اسے پسند تھا۔ بے حد پسند تھا۔ بقول اس کے اس نے جب ایقان کو پہلی مرتبہ دیکھا تو وہ ہرے رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھی۔

یوں بھی وہ زندگی کی روزمرہ کی باتوں میں بھی اپنی پسند کا اظہار کر دیا کرتا تھا۔ کوئی چیز خریدتا اپنی پسند کے رنگ کو ضرور ملحوظ خاطر رکھتا تھا۔

ایقان کی وارڈ روب ہرے رنگ کے ملبوسات سے بھری پڑی تھی۔ اس کی جیولری میں زیادہ تر ہرے موتی یا نگ ہوتے۔ ہری چوڑیوں سے ڈبے کے ڈبے اَٹے پڑے تھے۔ بچوں کے کپڑوں میں بھی اسی رنگ کا تناسب سب سے زیادہ تھا۔

ایقان کو گلابی رنگ پسند تھا۔ ان کی شادی ہوئی تو عاشر نے بیڈ روم میں گلابی پینٹ کروا لیا۔ فرنیچر بھی گلابی اور سفید رنگ میں تھا۔ پردے گہرے گلابی تھے۔ قالین سفید تھا اس پر مگر پھول گلابی تھے۔ ان کا بیڈ روم بے حد

خوبصورت لگتا تھا۔

لیکن آج اس بیڈ روم کی ہیئت تبدیل ہو چکی تھی۔

دیواروں پر بہت ہلکا پستئی رنگ ہو چکا تھا۔ فرنیچر تبدیل ہو گیا تھا۔ فریش گرین کلر کا کارپٹ دیوار تا دیوار اپنی بہار دکھلا رہا تھا۔ جیسے پیروں تلے سرسبز گھاس ہو۔ پردے مونگیا رنگ کے تھے جن پر سنہری پتے دھیرے سے اپنی چمک کبھی کبھی دکھاتے تھے۔ سائیڈ ٹیبل پر خوبصورت سنہری سیٹ سجے تھے۔ فینسی لائٹس کی مدھم حسین روشنی میں سنہری و سبز رنگ ماحول کو بہت پرفسوں اور رومان انگیز بنا رہے تھے۔

اس نے بہ نظر غائر ہر شے کا جائزہ لیا پھر مطمئن ہو کر کمرے سے نکل آئی۔

ایمان اور مومن لاؤنج میں بچھے کارپٹ پر بیٹھے "سلانٹی" کے پیکٹ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ ان تک چلی آئی۔

"میرے پیارے پیارے بچے کیا کر رہے ہیں!" اس نے دونوں کو بانہوں میں بھر لیا۔

"مما! سلانٹی کھائیں!" مومن نے اس کے منہ میں ڈالی۔ وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

وہ دل سے وہ اسی "مصروفیت" کا شکار تھی۔ بھرپور اگھر بدل ڈالا تھا۔ ہر شے میں اس کی پسند کا خیال رکھا تھا۔ اپنے لیے بھی وہ مہنگی بنیادوں پر ایک سبز سوٹ خرید کر لائی تھی۔ ساتھ میں سفید اور ہرے موتیوں والی خوبصورت چپل بھی لی تھی۔ پارلر سے فیشل بھی کروا لیا تھا۔ یعنی کہ ہر طرح کی تیاری مکمل تھی۔ بس اب اس کی آمد کا پل پل گنتا رہ گیا تھا۔

"مما!" مومن نے دھیان سے چونکایا۔

"ہوں۔" اس نے گہری سوچ سے باہر آ کر بیٹے کی صورت دیکھی۔

"پپا کب آئیں گے؟" وہ بھرپور طریقے سے مسکرا دی۔

"کل!"

❀ ❀ ❀

"ہاشم۔ تیز چلاؤ نا گاڑی۔" وہ جھلائی ہوئی تھی "ایسا لگتا ہے گدھا گاڑی میں بیٹھی ہوں۔"

"یہ رافع جو آگے بیٹھا ہے۔" وہ مسکرایا "گدھا گاڑی ہی ہے۔"

"ریسے گاڑی آپ کھینچ رہے ہیں۔ اطلاعاً عرض ہے!" وہ طنز سے بولا۔

"یہ ذرا مختلف قسم کی گاڑی ہے۔ اس میں گدھا برابر میں بیٹھا ہوتا ہے۔" اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

رافع نے سیاہ گلاسز کے عقب سے اسے دیکھا۔

"تم غالباً میرے ہینڈسم نظر آنے سے جل رہے ہو۔"

"ہینڈسم پیدائشی طور پر ہوتے ہیں، جیسا کہ میں۔ بجینز پہن کر کالا چشمہ چڑھا لینے سے کوئی ہینڈسم نہیں بن جاتا!" ہاشم نے اسے چڑایا۔

"خیر اب یوں تو مت کہو۔" پیچھے بیٹھی ایقان چپ نہ رہ سکی۔ "رافع تو خاندان کا سب سے وجیہہ لڑکا ہے۔"
"یہ تو آپ زیادتی کر گئیں پھپھو!" ہاشم خفا ہوا۔ "یعنی آپ نے مجھ سے حسین نوجوان کو نمبر ون کر دیا!" رافع اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔
"ہاں۔ تم بھی گڈ لکنگ ہو۔" وہ بولی۔
"ہائیں۔ مزید زیادتی، جیسے دل رکھ رہی ہوں۔" وہ مزید خفا ہوا۔
"جائیں۔ میں نہیں تیز گاڑی چلاتا۔ گھنٹہ بھر انتظار کرواؤں گا آپ کے صاحب کو۔" اس نے رفتار بالکل کم کر لی۔
"اللہ ہاشم! سچ بولنے کی تو سزا نہیں ہوتی۔ سزا تو جھوٹ بولنے کی ہونی چاہیے۔"
"کس دور میں جی رہی ہیں ڈیئر پھپھو؟" وہ ہنسا۔ "اب تک پرانی اقدار میں زندہ ہیں۔ یہاں تو سچ بولنے والے کے لیے گولی ہے۔ سرد رو کی نہیں، بندوق کی۔"
"بھئی۔ مجھ سے خطرناک باتیں مت کرو۔ میرا موڈ آج بہت اچھا ہے۔"
"وہ تو آپ کی تیاری سے ظاہر ہے۔" اس نے بیک ویو مرر سے اسے دیکھا۔ "بس نتھ ٹیکے کی کسر ہے۔" ایقان کو ہنسی آگئی۔
"رافع بزرا ایک چپت لگاؤ اس بدتمیز کے۔" رافع نے جھٹ ایک مکا اس کے بازو پر رسید کیا۔
"ارے بدتمیز شخص!" وہ بلبلایا۔ "ڈیئر پھپھو نے چپت کہا تھا۔ تمہیں چپت اور مکے میں فرق نہیں پتا۔"
"نہیں!" اطمینان سے جواب دیا۔
"یہ مکا۔ اور یہ چپت!" اس نے گیئر چھوڑ کر اسے دونوں اشیاء سے نوازا۔ رافع نے بلبلا کر اسے دیکھا۔ ایقان کی ہنسی چھوٹ گئی۔
"توبہ توبہ! ایک سے بڑھ کر ایک ماڈل ہے "حیات ولا" میں۔"
"آپ تو بہت خوش ہیں "حیات ولا" سے جا کر!" رافع ہنسا۔
"ہاں۔ خوش تو ہوں۔" اس کے لبوں پر پھر دلفریب مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔ وہ باہر گزرتے مناظر دیکھنے لگی۔ ایئرپورٹ کی عمارت دور سے نظر آ رہی تھی۔

❁ ❁ ❁

کاغذات سامنے پھیلا کر اس نے ان کا بغور جائزہ لیا۔ ان میں کئی خطوط تھے۔ اس نے ایک خط منتخب کیا اور کھول کر پڑھنے لگی۔ لکھا تھا۔
پیاری امی جان!
السلام علیکم
ربیعہ نے حیرانی سے کاغذ سینے سے لگا لیا۔
"امی جان! کیا مطلب؟"

❁

(باقی انشاء اللہ آئندہ ماہ)

ہم بھی کتنے سادہ تھے

راحت جبیں

مکمل ناول

امی کہتی تھیں۔
"میری دونوں بیٹیاں نمونہ ہیں۔"
اور وہ یہ بات انتہائی دلگیر اور سنجیدہ لہجے میں آہیں بھرتے ہوئے کہتی تھیں۔

"دونوں کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ اللہ نے شکل اچھی دی تھی تو تھوڑی عقل بھی دے دی ہوتی۔"
ان کی یہ بات سن کر نور تو ناک سے پھسلتی عینک ٹھیک کرتے ہوئے مدبرانہ انداز میں مسکراتی اور مولی سے کتاب میں گم ہو جاتی۔

مگر عینا کو امی کی اس بات سے سخت اختلاف ہوتا تھا۔ وہ کمر کس کر بحث پر آمادہ ہو جاتی۔
"ہم جیسی بیٹیاں تو چراغ لے کر ڈھونڈیں تو بھی نہ ملیں۔"
"ٹھیک۔" امی فوراً تائیدی انداز میں گردن ہلاتیں۔ "تمہارے جیسی کوئی اور ہوں تو ہی ملیں۔"
عینا اس انفرادیت پر وہ پوری طرح خوش بھی نہ ہو پاتی کہ امی اپنا جملہ پورا کرتیں۔

"پھوہڑ، بدتمیز، اور بے عقل۔" وہ ایک نظر امی کو دیکھتی اور سنجیدگی سے کہتی۔
"کہتے ہیں بیٹیاں ماں پر جاتی ہیں۔"
امی اندر ہی اندر تلملاتیں، بظاہر اک ٹھنڈی سانس بھر کر کہتی۔
"کاش۔"
"آپ، آپ بہت ناشکری ہیں امی۔" وہ چڑتی۔ تب تک امی کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو جاتا۔
"ہاں ایسے کون سے گن ہیں تم دونوں میں۔ نہ صبر

نہ برداشت، نہ گھرداری کا سلیقہ نہ لوگوں سے برتنے کا طریقہ۔ ایک وہ محترمہ ہیں جنہیں سارا دن ان موٹی موٹی کتابوں کو چاٹنے سے فرصت نہیں۔ نہ چہرے پر کوئی رنگ رہا نہ سر پر کوئی بال۔"

"ایسے میں وہ "محترمہ" موٹی سی کتاب سے نظر ہٹا کر امی کو دیکھتی اور مدبرانہ انداز میں فرماتیں۔

سونفٹ کہتا ہے۔

"جب کوئی ذہین ہستی اس دنیا میں آتی ہے تو تم اس کو اس نشانی سے پہچان سکتے ہو کہ تمام کند ذہن اپنا ایک گروہ بنا کر اس کی مخالفت کرنے لگتے ہیں۔"

"جہنم میں جائے تمہارا یہ سونفٹ سپاری۔ جس نے یہ نہیں بتایا کہ ماں کو کند ذہن کہنا کیسی بے ادبی ہے۔" امی کو جلال آجاتا تو ان انگریز فلاسفوں کو کوستے ہوئے ماں کے ادب و احترام پر سیر حاصل لیکچر پلا دیتیں۔

نور ہکا بکا تذبذب سی ہو کر ذہنی "سونفٹ سپاری" میں الجھ جاتا۔

"اور ایک یہ میری چھلاوا ہے۔" امی چلاتیں۔ مگر وہ واقعی کسی چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتی۔ اب اسے واقعی ڈھونڈا جاسکتا تھا۔ آم کے درختوں کی ٹہنی شاخوں میں کیریاں توڑتے ہوئے، ٹیرس پر لٹک کر پڑوسیوں کے بچوں سے چھیڑ خانی کرتے ہوئے، فون سے چپٹے، کیبل کے چینل سرچ کرتے ہوئے۔ یہ نہیں کہ اسے صرف یہی کام تھا۔ کام تو اسے سارے آتے تھے۔ موڈ میں ہوتی تو امی کو پلنگ پر بٹھا کر خدمت کرتی۔ وہ چلاتی رہ جاتیں۔

"بھئی مجھ سے یوں ہاتھ پاؤں توڑ کر نہیں بیٹھا جاتا۔"

مگر وہ سنتی نہ تھی کچن اور سارے گھر کا انتظام یوں مہارت سے سنبھالتی کہ اپنی جگہ سے کوئی چیز نہ ہلتی تھی۔ نت نئے چائنیز، پاکستانی کھانے بنتے۔ بقول سعد "اس گھر کا سب سے بہترین دور وہی ہوتا ہے۔" پھر اس کا موڈ بدل جاتا۔ کوئی تخلیقی کام کرنے کا خیال آتا تو وہ نت نئے منصوبے بناتی۔

کبھی کپڑوں کی ڈیزائننگ شروع ہو جاتی۔

کبھی گھر کی ڈیکوریشن ہوتی۔

کبھی خود کو صادقین کا جانشین تصور کرتے ہوئے رنگوں سے کھیلنے لگتی۔

اس کے مزاج میں بلا کا تنوع تھا۔ ایک جگہ رکنا یا روٹین نبھانا اسے کوفت میں مبتلا کر دیتا۔

"کوئی تھرل ہو کوئی ایڈونچر۔ یار! زندگی میں کچھ تو نیا پن ہونا چاہیے۔"

اور جس سے یہ بات کہی جاتی تھی اس کے لیے سارے تھرل، سارے ایڈونچر اور سارا نیا پن محض ایک اچھی کتاب میں تھا۔ امی سر پکڑ کر رہ جاتیں۔

"ان کو ہی جانا ہے آگے نئے لوگوں میں۔ نہ کوئی طریقہ نہ سلیقہ۔ ناک کٹوائیں گی میری۔ ارے نور الصباح! اٹھو بیٹا بال بنا اچھے کپڑے پہن۔ اپنی کسی سہیلی کی طرف ہی ہو آؤ۔ یا چلو نہیں تمہاری خالہ کے گھر ہی لے چلتی ہوں۔" وہ کتاب سے نظر ہٹا کر انہیں دیکھتی۔

"ابھی کل ہی تو کپڑے بدلے تھے۔ سہیلی سے کالج میں روز ہی مل لیتی ہوں اور خالہ سے تو ابھی پچھلے مہینے ہی ملے تھے۔"

امی دانت پیس کر رہ جاتیں۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا پچھلے مہینے بھی کن جتنوں سے اسے لے کر گئی تھیں۔ وہاں بھی جا کر خالو کی لائبریری میں گھس گئی۔ تب ہی باہر نکلی جب امی نے واپسی کے لیے پر تولے۔

"اپنے اندر تھوڑا ٹھہراؤ پیدا کرو عینا بی بی! لڑکیوں میں اتنا۔"

کبھی وہ عینا کو نصیحت کرنا چاہتیں تو وہ پہلے جملے پر ہی چونک جاتی۔

"ٹھہراؤ؟۔ ٹھہرے پانیوں سے بدبو اٹھنے لگتی ہے۔ کائی جمنے لگتی ہے۔ زندگی ابر رواں کا نام ہے۔"

"یہ کس احمق نے کہا تھا؟۔"

"راحت جبیں کے افسانے میں پڑھا تھا۔"

"بھاڑ میں گئی تمہاری یہ راحت جبیں۔ دنیا جہان کی باتیں پڑھنا بھی ہیں اور عمل بھی کرنا ہیں۔ ماں کیا کہتی ہے کبھی اس پر غور نہ کرنا۔"

چلیں جی ساری بحث سمٹ گئی۔ امی بڑبڑاتی رہ جاتیں اور وہ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتیں۔

سعد البتہ ان کا بہت پیارا اور "بیبا" بیٹا تھا۔ ان کی ہر بات مانتا۔ باہر کے ہر کام کے لیے اسے ہی دوڑایا جاتا اور وہ بنا ماتھے پر بل ڈالے سارے حکم بجا لاتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بات سنو! تم لوگ فوراً میرے کمرے میں آؤ۔" عینا کے اس حکم پر نہ تو سعد کی نظریں ٹی وی اسکرین سے ہٹی تھیں اور نہ نور کی کتاب سے۔ وہ کچھ لمحے انہیں گھورتی رہی۔ پھر جل بھن کر آگے بڑھی۔ نور کے ہاتھ سے کتاب اور سعد کے ہاتھ سے ریموٹ کنٹرول جھپٹا۔

دونوں ہڑبڑا کر سیدھے ہو گئے۔

"کیا ہوا؟۔ زلزلہ آگیا؟ یہ چھت ہمارے سر پر گرنے والی ہے یا یہ زمین پھٹنے والی ہے۔ آخر ایسا کیا ہو گیا ہے جو تم اتنی خوفناک صورت بنائے ہمارے سروں پر مسلط ہو گئی ہو۔" سعد نے بے حد سنجیدگی سے دریافت کیا تھا۔

"تم دونوں میرے کمرے میں آؤ۔" حکم دوبارہ صادر ہوا۔

"کہیں تمہارے کمرے میں اسامہ بن لادن آچھپا ہے یا جن کا کنواں دریافت ہو گیا ہے؟۔"

"پہلی صورت خطرناک ہے ہم یقیناً انتہا پسند قرار دے کر دھر لیے جائیں گے دوسری صورت ایک لحاظ سے خوش آئند ہے مگر کچھ زیادہ بھی نہیں کیونکہ اس صورت میں بھی امریکہ ہم پر چڑھ دوڑے گا ابا۔"

عینا انہیں چند لمحے گھورتی رہی پھر جھٹکے سے مڑی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

"آؤ اس کلنیا شاہکار دیکھیں۔" سعد نے کہا تو نور نے بھی اس کی تقلید کی۔ چھوٹا سا اسٹور روم اب عینا کا اسٹوڈیو بن چکا تھا۔ رنگوں کے ڈبے، کینوس، برش یہ سب لانے کے لیے وہ اپنی ساری پاکٹ منی خرچ کر چکی تھی بلکہ سعد اور نور سے ادھار بھی لے چکی تھی۔

پچھلے کئی دنوں سے وہ یہاں آکر بند ہو جاتی۔ رنگوں سے کھیلتے ہوئے خود کو پاکستان کی اعلا پائے کی مصورہ تصور کرتی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ضرور ہی کوئی شاہکار تخلیق کرلے گی۔

"لاؤ بھئی۔ دکھاؤ اپنا وہ شاہکار جس کی وجہ سے تم بین الاقوامی سطح پر مشہور ہونے والی ہو۔" سعد نے اندر گھستے ہوئے کہا۔

وہ خاموشی سے برش صاف کرتی رہی۔

"دکھاؤ نا یار! تم نے تو ابھی سے نخرے شروع کر دیے۔"

"تم لوگ اس قابل ہی نہیں ہو کہ۔"

"پلیز۔" دونوں ہی منتی سی شکل بنا کر کھڑے تھے۔

"آپ اتنی منتیں کرتے ہو تو۔" اس نے ڈرامائی انداز میں کہتے ہوئے اپنے شاہکار کی پردہ کشائی کی۔

دونوں ساکت و صامت کھڑے رہ گئے۔

"کیسا؟" عینا نے فخریہ انداز میں انہیں دیکھا۔

دونوں گم صم تھے۔

"کیا ہوا؟" عینا نے ذرا سا جھک کر بغور اپنے شاہکار کو دیکھا کہ کہیں غلط تصویر تو نہیں دکھا دی۔

"ایکسیلنٹ۔" سعد کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ساتھ ہی اس کی کہنی نور کی پسلیوں کو چھو گئی۔ بت کی طرح ساکت نور بری طرح لڑکھڑا کر ہوش میں آئی۔

"ہاں۔ ہاں۔ واقعی۔ تم نے تو کمال کر دیا عینا۔"

"میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا عینا ڈیئر! کہ تمہارے اندر اس اعلا پائے کا فن کار چھپا ہے۔ تم واقعی مشہور ہو جاؤ گی میری بہن۔ لوگ انٹرویو کے لیے

وقت مانگیں گے۔ ٹی وی والے تمہارے آگے پیچھے ہوں گے۔ پیسہ' نام' شہرت' تمہارے پاس کیا نہیں ہوگا۔"

"اچھا!" عینا کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ ایک بار جھک کر دوبارہ تصویر کو دیکھا۔ "عالمی میڈیا اس عظیم مصورہ کو ڈھونڈتے ہوئے ہمارے گھر تک آئے گا۔ بی بی سی پر تمہاری کوریج ہوگی تم نے وہ کام دکھایا ہے جو مونالیزا کا خالق بھی نہ دکھا سکا۔"

"واقعی!" اس کا چہرہ فوراً جوش سے دمکنے لگا۔ ملکی سطح تک تو اس نے سوچا تھا مگر یہ بین الاقوامی سطح پر۔

"کام کے حوالے سے لوگ تمہیں کلاڈ مونے کا ہم پلہ قرار دیں گے۔" سعد کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔

"کلاڈ۔ ز۔" عینا گڑبڑائی۔ مصوری کے حوالے سے اس کی معلومات اتنی زیادہ بھی نہیں تھیں۔

نور منہ کھولے کبھی سعد کو دیکھ رہی تھی کبھی تصویر کو۔ گاہے گاہے نگاہ عینا پر بھی ڈال لیتی۔ جس کا چہرہ سرخ اور گردن کے اکڑاؤ میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔

"رنگوں کا خوبصورت امتزاج۔ سوچ کی گہرائی' فنکارانہ مہارت میں اب اور کیا کہوں۔"

"آخر یہ سعد کیا بک رہا ہے۔" نور خاصی پریشان ہو گئی تھی۔

"لیکن عینا۔" وہ عظیم مصورہ کی طرف پلٹی۔

"آخر اس تصویر میں تم نے بنایا کیا ہے؟" بہت سوچ بچار کے بعد اس نے یہ سوال اٹھایا تھا۔

"تم۔ تم تو ہو ہی بدذوق۔ تم کیا جانو فن کس چڑیا کا نام ہے۔" عینا کے قدم زمین پر نہیں تھے۔

"سعد میرے بھائی! تم بتاؤ۔ ذرا اس کوڑھ مغز کو ایکسپلین کر دو۔ اب فنکار اپنے فن پارے کا تعارف کرواتا اچھا لگتا ہے؟۔"

"اس میں۔" سعد نے بغور جائزہ لیا پھر سیدھا ہو کر نور کی طرف پلٹا۔

"اس میں عینا نے دراصل آلو کا کھیت دکھانے کی کوشش کی ہے بلکہ انتہائی کامیاب کوشش کی ہے۔ یعنی کہ ہر ہر آلو الگ الگ نظر آ رہا ہے۔"

دانش مندانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے اس نے عینا کی طرف دیکھنے کی ہرگز غلطی نہیں کی تھی۔ جس کے چہرے کے تاثرات ناقابل فہم تھے۔

"آلو۔" نور نے عینک کو آگے پیچھے کھسکا کر ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

"مجھے تو کہیں سے کوئی آلو دکھائی نہیں دے رہا میرا خیال ہے کہ کرکٹ بال ہیں۔ شاید کسی فیکٹری [cut off] تیاری کا منظر۔ یونیک آئیڈیا ہے۔"

اس نے ڈرتے ڈرتے عینا پر نگاہ ڈالی۔ جس کے چہرے کا رنگ تیزی سے بدل رہا تھا۔

"تم اپنی عینک بدلواؤ۔ یہ سامنے ڈھیر سارے بھی نظر نہیں آ رہے تمہیں۔" سعد اب باقاعدہ [cut off] رکھ کر آلو دکھا رہا تھا۔

"اور میرا خیال ہے کہ تم ضرور ہی عینک لگوالو۔ کرکٹ بالز ہیں اور بس۔"

"آلو ہیں اندھی۔"

"کرکٹ بالز ہیں احمق۔"

"آلو۔"

"کرکٹ بالز۔"

"آ۔"

"کر۔"

"شٹ اپ۔" عینا حلق کے بل چلائی۔

دونوں ایک دم خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگے [cut off] جب عینا کو زار و قطار روتے دیکھا تو تیزی سے اس کی طرف لپکے۔

"ارے ہم تو مذاق کر رہے تھے۔ عینا ڈیئر۔ سویٹ سسٹر۔"

اور سویٹ سسٹر نے جو کچھ بھی ہاتھ لگا انہیں [cut off] تاک کر رسید کیا تھا۔

❀ ❀ ❀

"یار! زندگی میں کچھ نہیں رہا۔" تربوز کا آخری ٹکڑا کانٹے میں پھنساتے ہوئے عینا نے کہا۔

"واقعی۔" نور نے خالی تھال کو غور سے دیکھتے ہوئے ٹھنڈی سانس کھینچی اور کانٹا تھال میں رکھ دیا۔

"زندگی میں کچھ تو ہونا چاہیے۔" اپنے پینٹنگ کے شوق کے دردناک انجام کے بعد اس نے بہت دنوں تک کوئی مشغلہ نہیں اپنایا تھا۔ بس خاموشی سے امی کا ہاتھ بٹاتی رہی۔ امی خاصی خوش تھیں کہ چلو ایک بیٹی کو تو عقل آئی۔

سعد اکثر رازداری سے پوچھتا۔

"سسٹر! تم نے اس پینٹنگ میں آخر کیا بنانے کی کوشش کی تھی۔ چپکے سے بتا دو۔ قسم سے کسی کو نہیں بتاؤں گا۔"

"تمہارا سر۔" عینا چڑ کر کہتی۔

"لیکن میرا تو صرف ایک ہی سر ہے اور وہاں تو۔۔"

اس کے بعد ظاہر ہے وہ تو آگے آگے تھا اور عینا پیچھے اور اس کا نشانہ خاصا پکا تھا۔

"ہاں!" نور خود کتابوں کے اس مشغلے سے اکتائی تھی۔

"تھوڑا تھرل' تھوڑا ایڈونچر کچھ تو ایسا ہو کہ زندگی میں ہلچل سی مچ جائے۔"

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔" نور نے مشورہ دیا۔

"ہونہہ! شادی کے بعد انسان کچھ اور کرنے کے قابل رہتا ہے؟۔ جو کچھ کرنا ہے اس سے پہلے پہلے کرنا ہے۔"

"نور۔ عینا!" نیچے سے امی مسلسل آوازیں دے رہی تھیں۔

"چلو نیچے چل کر سوچتے ہیں۔"

نیچے رمشہ آپی ٹی پنک نازک سی کڑھائی والے لان کے سوٹ میں ملبوس بڑی نزاکت سے کانٹے میں تربوز کا ٹکڑا پھنسائے امی کے ساتھ محو گفتگو تھیں۔ باتوں سے لے کر جیولری تک کی میچنگ کی ہوئی تھی۔ بلکے گھنگھریالے بال اونچی سی پونی کی قید میں جھول رہے تھے۔ رمشہ ان کی تایازاد تھیں۔

تایا کی تین ہی بیٹیاں تھیں۔ رمشہ جو کہ مقامی کالج میں انگلش کی لیکچرر تھیں۔ رشنا ایم۔ اے انگلش کر رہی تھی۔ رائمہ ایف۔ ایس۔ سی کی اسٹوڈنٹ تھی۔ بھائی کوئی تھا نہیں۔ باپ نے بیٹوں کی طرح پرورش کی۔ سو خاصی بولڈ شوخ اور ہنس مکھ لڑکیاں تھیں۔ اپنی زندگی خود بنانے اور اپنے فیصلے خود کرنے والی رمشہ نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ خوشحال و خوش باش زندگی گزار رہی تھیں۔ کم از کم عینا کے نزدیک تو ان کی زندگی قابل رشک ہی تھی۔

"رمشہ آپی! آپ کب آئیں؟۔" عینا کی ساری بے زاری انہیں دیکھتے ہی ہوا ہو گئی۔

"بس ابھی آئی ہوں۔ آپ لوگوں سے ملنے کو دل چاہا پھر چھٹی بھی تھی۔" نازک سے سرخ لبوں کی تراش میں سفید موتی جھلملانے لگے تھے۔

"اکیلی آئی ہیں؟" نور نے حیرت سے سوال کیا۔
"تو ساتھ کسے لاتا تھا۔ اپنی گاڑی پر آئی ہوں۔"
عینا کو رشک آ رہا تھا۔ کیا آزاد اور خود مختار زندگی تھی۔
"پھر بھی بیٹا! ایک شہر سے دوسرے شہر تک کا تنہا سفر۔ جو بھی ہو اتنی بے احتیاطی بھی ٹھیک نہیں۔" امی نے فکرمندی سے کہا۔
"آج کے دور میں سب چلتا ہے آنٹی۔" وہ لاپروائی سے گویا ہوئیں۔
"خیر اب بھائی صاحب کو لڑکیوں کو اتنی بھی آزادی نہیں دینی چاہیے۔" امی کو برا لگا۔
"امی! آپ بھی نا۔ نجانے کن زمانوں کی باتیں لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ آج کے دور میں۔"
"نور بس کرو تم' سب جانتی ہوں میں۔ اٹھو اٹھ کر کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو۔" امی جانتی تھیں عینا شروع ہو گئی تو خاصا وقت لگے گا سو فوراً ہی ٹوک دیا۔
"لیکن آپ رشنا کو بھی ساتھ لے آتیں۔" نور کی دوستی رشنا کے ساتھ تھی۔ اسے بھی نور کی طرح تو نہیں مگر اچھا لٹریچر پڑھنے کا شوق ضرور تھا۔
"بھئی اس کا ٹیسٹ تھا اور رائمہ۔" وہ تفصیل بتانے لگیں۔ عینا نے قیمہ مٹر پکایا تھا جو رمشہ کی فیورٹ ڈش تھی۔ ساتھ میں بریانی اور کدو کا رائتہ۔
"تم آج کل کیا کر رہی ہو؟"
"کیا کرنا ہے۔ فراغت 'بوریت' بےزاری 'بس یہی زندگی ہے۔" جگ میں ٹینگ گھولتے ہوئے اس نے اکتاہٹ سے جواب دیا تھا۔
"یہ تو کوئی طریقہ نہیں۔ اپنا وقت اور زندگی دونوں برباد کر رہی ہو۔" رمشہ کے لہجے میں تاسف در آیا۔
"ابو تو کچھ نہیں کہتے مگر ہماری امی حضور اس سلسلے میں خاصے پرانے خیالات کی مالک ہیں۔ وہ ہمیں کچھ بھی نہیں کرنے دیں گی۔" عینا مایوسی سے گویا ہوئی۔
"نہیں کچھ سوچنا پڑے گا۔ یہ تو کوئی طریقہ نہیں۔" رمشہ خود بھی ایک لمحہ فارغ بیٹھنا پسند نہیں کرتی تھیں اور نہ لوگوں کو فارغ دیکھ سکتی تھیں۔

❋ ❋ ❋

"اٹھ جاؤ عینا! اگر اب بھی تم نہ اٹھیں تو امی کا غصہ قہر بن کر اس طرح نازل ہو گا کہ اگلے کئی دنوں تک تم سونے کے قابل نہیں رہو گی۔"
سعد کی کوشش جاری تھی۔ نہ وہ ہارتا تھا نہ عینا جاگتی تھی۔
"عینا!"
"سعد! مجھے مت اٹھاؤ میں نے ابھی ابھی پہلی کا... سے چھلانگ لگائی ہے۔" وہ نیم غنودہ سی کیفیت میں گویا ہوئی۔
"عینا کی بچی! تجھے خودکشی کرنے کا کوئی اور طریقہ نہیں ملا۔ چھلانگ ہی لگانی تھی تو اپنی تیسری منزل سے لگاتیں۔ اگر زندہ بچ جاتیں تو میں اپنا نام بدلوا دیتا۔"
"پیراشوٹ کے ذریعے لگائی تھی احمق۔ ساتھ میں سلویسٹر بھی تھا۔"
"وہ تمہارے ساتھ کیا کر رہا تھا الو کا۔" سعد کو سلویسٹر کی موجودگی خاصی گراں گزری۔
"ہم دونوں مجرموں کا پیچھا کر رہے تھے۔" وہ خواب کے زیر اثر تھی۔
"مائی سویٹ سسٹر! اس سے قبل کہ امی تمہارا ... کرتے ہوئے یہاں تک چلی آئیں خدا کے لیے اٹھ جاؤ۔" اس نے فریج سے آئس کیوبز نکالے (گرمیوں میں امی کچن سے فریج نکلوا کر کمرے میں رکھوا لیتی تھیں) اور چادر کا کونا اٹھا کر سارے کے سارے کیوبز اندر الٹ دیے۔ اگلے لمحے وہ کمرے سے باہر تھا۔ دو منٹ نہیں گزرے تھے جب عینا پورے گھر میں سعد کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ رمشہ اور نور ناشتہ کر رہی تھیں۔
"اٹھ گئی میری رانی بیٹی۔ بلکہ مہارانی بیٹی۔" کچن میں آئی تو قیمے والا پراٹھا بیلتے ہوئے امی نے طنزیہ استقبال کیا۔

"تو اب اس مہارانی بیٹی کو ناشتہ بھی چاہیے امی حضور۔" اس نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا۔
"دیکھا تم نے رمشہ! یہ اتنی ہی ڈھیٹ ہے۔"
"امی یہ تو کہتی ہوں اسے میرے ساتھ بھیج دیں۔ ماحول بدلے گا تو اس کے مزاج پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔" رمشہ نے سلائس پر مارجرین لگاتے ہوئے کہا۔
"ہاں امی! میں کچھ دنوں کے لیے تایا کے ہاں نہ چلی جاؤں۔" وہ فوراً سے پیشتر تیار تھی۔
"کچھ دنوں نہیں میں ذرا تمہیں مستقل لے جانا چاہتی ہوں۔"
"مستقل؟" جیم کا ڈھکن کھولتے ہوئے وہ رک گئی۔ "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تایا کا تو کوئی بیٹا ہی نہیں ہے نور۔"
"مقصد!" پریشان صورت بنائے پوچھ رہی تھی۔
"زبان کو لگام دے عینا ورنہ ابھی کاٹ کر فرائی کر دوں گی۔" امی کی تنبیہی آواز پر اس نے زبان دانتوں تلے دبالی۔
"میرا کافی عرصے سے ارادہ تھا ایک پرائیوٹ اسکول کھولنے کا۔ لیکن ظاہر ہے میں تو جاب کرتی ہوں۔ مجھے کسی قابل بھروسہ ساتھی کی ضرورت ہے۔ اب اگر تم ساتھ دو تو ہم یہ کام چند ہفتوں میں ہی شروع کر دیں گے اور مستقل اس طرح کہ وہیں کہیں تمہاری شادی بھی کروا دیں گے۔"
"شادی تو خیر میں نے کرنی ہی نہیں ہے۔ البتہ اسکول کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔"
"بکی بیٹھی رہو تمہارے ابو نہیں مانیں گے۔" امی نے ٹھوکا۔
"ابو کو منانا میرا کام ہے اور آپ کو منانا ابو کا۔"
"عینا! تم سنجیدہ ہو؟" نور نے حیرت سے اسے دیکھا۔
"ہاں میں سنجیدگی سے اس پر غور کر رہی ہوں۔" وہ اپنے فیصلے یونہی کیا کرتی تھی اچانک اور اٹل۔
"تم نے بچے شور شرابا تھا۔ لیکن رمشہ آپی! مجھے تو کوئی تجربہ ہی نہیں ہے۔"
"بھئی! میں ہوں نا تمہارے ساتھ سب سنبھال لوں گی۔ تمہیں تو صرف نگرانی کرنی ہے پرنسپل بن کر۔"
"پرنسپل۔ زبردست۔" وہ اچھل پڑی۔
"پرنسپل صاحبہ! پہلے ناشتہ ختم کریں۔" امی کی طنز میں ڈوبی آواز ابھری تو وہ خاموشی سے پلیٹ پر جھک گئی۔
"اچھا اگر پکا ارادہ ہے تو مجھے انفارم کر دینا۔" جانے سے پہلے رمشہ نے کہا تھا اور ارادہ تو ایک طرف وہ پوری کی پوری تیار ہو گئی تھی۔ ابو کو منانا تو کوئی مسئلہ ہی نہ تھا مگر امی شروع ہو گئیں۔
"مجھے سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ نے لڑکیوں کو اتنا سر پر کیوں چڑھا رکھا ہے۔" انہوں نے سب سے پہلے ابو کو ہی لپیٹا۔
"ہر پل ان کے لاڈ اٹھاتے رہیے گا۔ انہیں اگلے گھر بھی جانا ہے۔"
"اگلے پچھلے' ہمیں کسی گھر نہیں جانا۔" وہ منمنائی۔
"ختم۔" امی غضب ناک ہو کر کچھ کہنے جا رہی تھیں کہ ابو نے ہاتھ اٹھا کر خاموش کروا دیا۔
"عینا بیٹا! تم اب جاؤ۔"
عینا خاموشی سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔
"ہاں بھئی کیا بات ہے۔"
"آپ کچھ خیال کریں۔ بچیاں جوان ہو چکی ہیں انہیں کوئی سلیقہ طریقہ بھی سیکھنے دیں۔ گھر گرہستی بھی کوئی چیز ہے احمد صاحب! ایک کو کتابوں کی لت لگا دی دوسری کو نت نئے شوق سوار رہتے ہیں۔ اب چچا وطنی جا بیٹھے گی۔"
"کسی غیر کے گھر تو نہیں جا رہی۔"
"بس بیٹی نے کوئی فرمائش کی نہیں اور یہ ہو گئے تیار۔ آپ جانیں اور آپ کے بچے۔ میں کون ہوتی ہوں نہ تین میں نہ تیرہ میں۔"
"کمال ہے اپنی بچیوں کا مزاج بھی نہ سمجھ سکیں تم

۔کون سا ایسا کام ہے جو تم نے انہیں نہیں سکھایا ہر کام تو کر سکتی ہیں۔ باقی رہی لاپروائی والا البیلا پن تو یہ ان کی عمر کا تقاضا ہے۔ عینا کو جانے دو وہ وہاں چار دن نہیں رکے گی چند دنوں میں اکتا کر نہ بھاگی تو مجھے کہنا۔ چار دن کا شوق ہے پورا کر لینے دو۔"

اسی نقطے پر آکر امی اسے بھیجنے پر آمادہ ہوئی تھیں۔

* * *

سیاہ کولتار کی جلتی بلتی سڑکیں قدرے دور دور بنے بے حد خاموش گھر یوں لگتا تھا ان بند دروازوں کے اس طرف بھی صرف خاموشی ہے 'مہیب خاموشی۔' کہیں کوئی ذی روح' کوئی جاندار نہیں۔ سنسان' خاموش اور ویران سا علاقہ تھا جہاں رمشہ آپی کا اسکول تھا۔ اسکول چھوٹا مگر خوبصورتی سے ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ عینا کو بہت پسند آیا۔

"السلام میڈم جی۔" نیتاں بی بی 'قدرے بھاری وجود مگر بڑے کٹھے کی عورت تھی۔ بے صاف ستھرا لباس' بات کم اور کام پر دھیان زیادہ دیتی تھی۔

"میں نے صبح سے کئی بار صفائی کی تھی کہ آج باجی نے آنا ہے۔"

رمشہ نے پورے اسکول کا جائزہ لیا۔ ایک دو نقص نکالے چند ایک ہدایات دیں۔ عینا کو اس کا کام سمجھایا۔

"چند بچے آجائیں تو ٹیچرز رکھیں گے۔ کل پرسوں میلاد رکھ لیتے ہیں۔ اس ایریا کی تمام خواتین کو بلائیں گے۔" انہوں نے دراز کھول کر کارڈز نکالے یہ میلاد کے دعوت نامے تھے۔

"بچے آئیں گے نا؟" عینا فوراً ہی اسکول کو بھرا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔

"ان شاء اللہ ضرور آئیں گے لوگ خاصے متجسس ہیں اس اسکول کے بارے میں کیونکہ اس علاقے میں کوئی اور اسکول تو ہے نہیں۔ بچے خاصے دور جاتے ہیں۔" وہ پر امید تھیں دوپہر تک وہ دعوت نامے لکھتی رہی۔ ایک دو خواتین گیٹ کھلا دیکھ کر ملنے چلی آئیں۔ اچھی گہما گہمی رہی' عینا نے خاصا انجوائے کیا۔ شام کو چائے پیتے ہوئے وہ اسی جوش میں رشنا اور رائمہ کو تفصیل سنا رہی تھی۔

"یار! کیا بورنگ سا کام شروع کر دیا ہے تم نے۔ میں نے سوچا تھا تم آؤ گی تھوڑا انجوائے کریں گے مگر تم تو۔۔۔" رشنا خاصی مایوس ہوئی تھی۔

"بورنگ نہیں بہت انٹرسٹنگ ہے۔ ہر روز نت نئے لوگوں سے ملنا ایسی ایسی خواتین آتی ہیں کہ کیا بتاؤں! ایک آتی ہے تو دوسرے گھر کی پوری ہسٹری بیان کر جاتی ہے۔ دوسری آتی ہے تو تیسری کی برائیاں شروع کر دیتی ہے۔"

"ایڈمیشن تو ابھی کوئی نہیں ہوا لیکن ہو گا ضرور نیا اسکول ہے نا۔ اس لیے لوگ تھوڑا گھبراتے ہیں۔" اس نے گویا خود کو تسلی دی ورنہ دس دن ہو گئے تھے لوگ بس آ جا رہے تھے۔ جائزہ لے رہے تھے۔ وعدے کر رہے تھے۔ پھر اسکول میں پہلی بچی آئی۔ پھولے پھولے گالوں اور گھنگھریالے بالوں والی نور فاطمہ ایک اسکول ٹیچر کی بیٹی تھی۔ وہ بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئی۔ اس کے بعد بچوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہونے لگا۔ تین ٹیچرز بھی رکھ لی گئیں۔ عینا خوش تھی وہ جو بے مقصدیت کا احساس زندگی کو بے زار کرتا تھا۔ ختم ہونے لگا۔

سعد فون کرتا تو ضرور پوچھتا۔

"عینا آپی! واپسی کا کب تک ارادہ ہے؟"

اور حیران ہوتی۔ "عینا تمہارا سچ مچ وہاں دل لگ گیا ہے؟"

* * *

اسکول چل نکلا تھا۔ رمشہ مطمئن تھی اور عینا خوش۔ اور گھر والے جو یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ وہ چند دنوں میں اکتا کر بھاگ نکلے گی اب اس کی مستقل مزاجی پر حیران تھے۔

چھٹی ہونے میں چند ہی منٹ باقی تھے' وہ اپنی چیزیں سمیٹ رہی تھی جب باہر شور مچ گیا۔ بچوں کی چیخ پکار

سن کر اس کے ہاتھ سے رجسٹر چھوٹ گیا۔ تیزی سے کرسی کھسکا کر وہ کھڑی ہوئی اور باہر نکل کر دیکھا۔

"سانپ۔۔۔ میڈم سانپ۔"

سارے بچے کلاسوں سے باہر تھے۔ نیتاں بی بی ہاتھ میں ڈنڈا پکڑے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اور میڈم سانپ کا لفظ سنتے ہی واپس بھاگنے کو تیار تھی۔ مگر بچوں کو دیکھ کر رک گئی۔ جو اس وقت مکمل اس کی ذمہ داری تھے۔ چوکیدار ابھی آدھا گھنٹہ پہلے اس سے چھٹی لے کر گیا تھا کہ اسے اپنے بچے کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا تھا۔ دونوں ٹیچرز حواس باختہ کھڑی تھیں۔

"ک۔۔۔ کہاں ہے سانپ؟"

"یہاں۔۔۔ وہاں۔۔۔ ادھر سے آیا۔ ادھر گیا۔ اس نے دیکھا۔ اس نے دیکھا۔"

بھانت بھانت کی آوازیں۔۔۔ شور ہنگامہ۔

"شٹ اپ۔"

ساری آوازیں سرگوشیوں میں ڈھل گئیں۔ بچے ڈرے کم اور پرجوش زیادہ تھے۔ البتہ نرسری کلاس کے بچے ذرا سہمے ہوئے تھے۔

"میڈم! وہ دیوار سے اتر کر آیا تھا میں نے خود دیکھا تھا۔" احسن نے ذرا آگے نکل کر بتایا۔

"سانپ تھا یا کوا جو اتر کر آیا تھا۔" عینا نے تنا زا پھر تیا کے پکارا۔

"کدھر سے آیا یہ تو میں نے نہیں دیکھا۔ پر اب وہ دیوار کے اس سوراخ میں ہے۔"

"اتنا بڑا ہے۔" عارف نے بازو پھیلایا۔ عینا کے چاروں طرف سرسراہٹیں سی ہونے لگیں۔

"اتنا موٹا ڈنڈا ہے تمہارے ہاتھ میں ایک سانپ نہیں مار سکیں تم۔"

"آ۔۔۔ آ۔۔۔"

وہ ایکدم اچھل پڑی۔ وہ اپنے پاؤں کی ایڑی پر کچھ رینگا تھا۔

"کیا ہوا' میڈم کیا ہوا" کی آوازیں ابھریں اور میڈم اپنے دوپٹے کے پلو کو کوس رہی تھیں۔

"میڈم جی! آپ خود ماریں۔" نیتاں بی بی نے آرام سے ڈنڈا اس کی سمت بڑھا دیا۔

"شٹ اپ۔ چھٹی کا ٹائم ہو گیا ہے۔ نکل جاؤ۔"

پھر چھوٹے بچوں کو اپنی نگرانی میں اسکول سے باہر نکالا تھا کہ بڑی کلاسوں کے بچے ابھی سانپ کو دیکھنا چاہتے تھے۔ دو بچیاں تھیں جنہیں نیتاں بی بی خود ان کے گھروں تک چھوڑنے جاتی تھیں۔ عینا آفس میں آکر دونوں پاؤں کرسی پر رکھ کر بیٹھ گئی۔ رمشہ اسے پک کرتی تھیں اور اب وہ آنے والی تھیں۔ نیتاں بی بی واپس آئی تو مس تہمینہ اور مس نذیاریہ بھی چلی گئیں۔ عینا کو بہر صورت سانپ مروا کر جانا تھا۔ یہ نہ ہو کہ کل کسی کلاس روم میں گھس جائے۔ خواہ مخواہ کا رسک۔

"رمشہ آپی کیوں نہیں آرہیں۔" اس نے بے کلی سے گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ تبھی یاد آیا آج کالج میں پارٹی تھی۔ رمشہ نے کہا تھا انہیں دیر ہو جائے گی اس لیے وہ گھر چلی جائے۔

"اُفوہ۔ پارٹی بھی آج ہی ہونا تھی۔ چوکیدار کے بچے کو بھی آج ہی بیمار ہونا تھا اور سانپ کمبخت کو بھی آج ہی نکلنا تھا۔" نیتاں اسٹول پر ڈنڈا ہاتھ میں لیے سوراخ پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

"میڈم! آپ سے کوئی ملنا چاہتا ہے۔"

وہ پریشان سی بیٹھی تھی جب نیتاں نے آکر بتایا۔

"ہاں بھیجو۔" وہ بے خیالی سے گویا ہوئی۔

"مجھے محمد رئیس سدھو کہتے ہیں۔"

"سدھو۔" اس نے اسی بے خیالی میں سر اٹھا کر سفید کاٹن کے کلف لگے کپڑوں میں ملبوس چھ فٹ سے نکلتے قد والے شخص کو دیکھا پھر تیزی سے پاؤں نیچے اتارے۔

"ذات ہے ہماری۔"

"جی۔ فرمایئے۔" اب وہ سنبھل چکی تھی۔

"اسکول دیکھنے آیا تھا۔ بچے کا ایڈمیشن کروانا ہے۔" اس نے دو مختصر جملوں میں مدعا بیان کیا۔

"سدھو صاحب۔" عینا کے ذہن میں اچانک خیال آیا تھا۔

"رئیس۔ رئیس کہتے ہیں مجھے۔"

"جی کہتے ہوں گے۔ آپ سانپ مار سکتے ہیں؟"

"سانپ۔" سامنے والے نے تحیر سے اسے دیکھا جیسے سوال کا مقصد سمجھ میں نہ آیا ہو۔

"ہمارے اسکول میں سانپ گھس آیا ہے۔"

"کہاں ہے؟" دونوں ہاتھ پشت پر باندھتے ہوئے ذرا سی گردن موڑ کر فرش کا جائزہ لیا۔

"باہر ہے۔ آپ مار سکتے ہیں؟" رئیس نے مڑ کر اسے دیکھا جو بڑی امید سے پوچھ رہی تھی۔ اس نے جواب دینے کے بجائے کسی کو پکارا تھا۔

"جاجی۔"

بوتل کے جن کی طرح جس قسم کا "جاجی" اندر آیا تھا۔ اسے دیکھ کر عینا کو جھرجھری آگئی۔ اس تیم شحیم بالکل سیاہ رنگ بندے کے چہرے پر دو بڑے بڑے زخموں کے نشان تھے۔ ایک نشان تو اس کی آنکھ سے شروع ہو کر ہونٹوں کو چیرتا ہوا آگیا تھا۔ مزید جب اس نے چادر اتار کر چادر میں چھپی کلاشنکوف کو دیوار سے ٹکایا۔ تو عینا کے ہاتھوں کے طوطے بھی اڑ گئے تھے۔ وہ اضطراری انداز میں کھڑی ہو گئی۔

"یہ۔ یہ کیا ہے؟"

"کلاشنکوف ہے۔" سامنے کھڑے بندے نے بے حد نارمل انداز میں بتایا تھا۔

"اس۔ اس سے ماریں گے؟۔" حلق بالکل خشک ہو گیا تھا۔ رئیس نے بظاہر سرسری مگر بغور اسے دیکھا۔ پھر پیلی پڑتی رنگت دیکھ کر گویا ترس آگیا تھا۔ تبھی تسلی آمیز لہجے میں بتایا۔

"خراب ہے ٹھیک کروانے لائے ہیں۔"

جاجی نے عینا سے دریافت کر کے کہ سانپ کہاں ہے سوراخ میں پانی ڈالا تو وہ تڑپ کر باہر آگیا۔ جاجی جو ہاتھ میں پتھر لیے اس کا سر کچلنے کو تیار تھا۔ قدرے حیران ہو کر رئیس کو دیکھنے لگا۔ وہ خود بے حد متحیر تھا۔

"یہی سانپ ہے؟"

"ہاں جی۔" عینا نے زور و شور سے سر ہلایا۔

جاجی نے بغیر مارے چٹکی سے اس پانچ چھ انچ کے سانپ کے بچے کو پکڑا اور باہر لے گیا۔

"تو اسے مارا کیوں نہیں؟" عینا نے تشویش سے پوچھا۔

"بچہ ہے زہریلا نہیں' بے ضرر سانپ ہے خوامخواہ مارنے کا فائدہ۔ کسی نالے میں ڈال دے گا تو ہنستا ہوا دور نکل جائے گا۔"

"واپس تو نہیں آئے گا؟"

اس نے گردن گھما کر پنک کاٹن کے امبرائڈری والے سوٹ میں ملبوس گلابی سی لڑکی کی تشویش کو جانچا اور بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"آ بھی سکتا ہے۔"

"جی۔" وہ قدرے خوفزدہ سی اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ جب احساس ہوا کہ اس نے بے حد سنجیدگی سے مذاق کیا ہے تو اس کی صبیح پیشانی پر شکن سی ابھری۔ تب ہی وہ عینا کی طرف گھومی۔

"کمرے اچھی طرح سے چیک کر کے لاک کرو۔"

خود وہ آفس میں آکر اپنی چیزیں اٹھانے لگی۔ اور ساتھ ہی رئیس سے پوچھا۔

"فرمایئے۔"

"نام بھی بتا چکا ہوں اور کام بھی۔" عینا کی بے توجہی پر اس کے لہجے میں ناگواری سی در آئی تھی۔ عینا کو احساس ہوا تو سب کام چھوڑ کر پوری کی پوری اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"بیٹھیے۔"

وہ کرسی پر یوں بیٹھا تھا۔ گویا اس پر احسان کیا ہو۔ ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر ایک بازو دوسری کرسی پر پھیلا لیا تھا۔

"بچہ آپ کا ہے؟۔"

"میرے ملازم کا۔" اس نے جاجی کی طرف اشارہ کیا۔ جس نے دوبارہ سے چادر اوڑھ کر کلاشنکوف اٹھالی تھی۔ اور عینا کا ہرگز ارادہ نہیں تھا کہ وہ شکل سے ڈاکو نظر آنے والے شخص کے بچے کو ایڈمیشن دے۔ سراسر اپنے سر پر مستقل خوف مسلط کرنے والی بات تھی۔

"ایڈمیشن تو بند ہو گئے ہیں۔" رئیس نے نگاہ اٹھا کر بغور اسے دیکھا۔

"میرا مطلب ہے کافی دیر ہو گئی ہے۔ اسکول کے رولز اور۔" عینا گڑبڑا سی گئی تھی۔ وہ بازو سمیٹ کر آگے کو جھکا۔ اب اس کا ہاتھ میز پر پڑے پیپر ویٹ کو چھو رہا تھا۔

"دیکھیں آپ کچھ دن پہلے آجاتے تو شاید کچھ ہو جاتا۔"

اب وہ پیپر ویٹ گھما رہا تھا۔ پھر ایک دم اٹھ کر کھڑا ہوا۔

"کل یہ بچے کو لے کر آئے گا اسے کلاس میں بٹھا دیجئے گا۔" اس کا لہجہ ٹھوس اور قطعی تھا۔ عینا کچھ بول نہ سکی۔

"کیا؟ بے وقوف لڑکی۔ تم نے انکار کیوں کیا۔ تمہیں پتا نہیں ہے ایسے لوگوں کا؟" رشنا چیخ اٹھی۔

"لوگ بھی وہ" جو کلاشنکوف رکھتے ہیں۔" رائمہ نے لقمہ دیا۔

"خراب تھی۔" عینا نے اطلاع دی۔

"ٹھیک بھی ہو سکتی ہے۔"

انہوں نے ایسے ایسے نقشے کھینچے کہ اگلے دن جب جاجی اپنے بچے کے ساتھ آیا تو عینا نے خاموشی کے ساتھ ایڈمیشن فارم آگے رکھ دیا تھا۔ اس نے فارم کو الٹ پلٹ کر دیکھا پھر اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولا تھا۔

"باجی جی! تساں آپی پر کردیو۔ بڑی مہربانی ہوئے گی۔"

اس کالے دیو کے منہ سے اتنی مؤدبانہ فریاد سن کر وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔

❁ ❁ ❁

وہ گھر آئی تو تائی کے پاس اک گوری سی بزرگ خاتون بیٹھی تھیں۔ رمشہ سلام کر کے اپنے کمرے میں گھس گئیں۔ تائی نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔

خاتون نے خاص دلچسپی اور پیار سے اسے دیکھا تھا۔ عینا کو بھی وہ چہرہ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔

"میں آپ سے پہلے بھی کہیں ملی ہوں۔"

خاتون مسکرا دیں۔

"تمہارے اسکول میں میلاد ہوا تھا۔ تب ملاقات ہوئی تھی۔"

"اچھا آپ وہیں رہتی ہیں۔"

"اسی بلاک میں۔ ہمارے ہاں کوئی چھوٹا بچہ تو ہے نہیں لیکن دعوت نامہ ملا تو آگئی۔"

انہوں نے بتایا تو عینا سر ہلا کر رہ گئی۔ دعوت نامے اس پورے علاقے میں تقسیم کیے گئے تھے۔ تب ہی تایا آگئے۔ تائی جان اٹھنے لگیں۔ عینا نے انہیں بٹھا دیا۔

"آپ بیٹھیں۔ کھانا میں نکال دیتی ہوں۔"

ویک اینڈ تھا اور اسے گھر جانا تھا۔ شروع میں سعد اسے لینے اور چھوڑنے آتا رہا لیکن ایک دو بار کے بعد اس کی جھجک ختم ہو گئی۔ اب وہ خود ہی آجاتی تھی۔ کبھی کبھی رمشہ کا موڈ ہوتا اور وقت بھی تو وہ بھی ساتھ ہو لیتیں۔ یوں ایک بھرپور ویک اینڈ کے بعد وہ واپس چلی آتی تھی۔ جہاں اس کے گھر والے اس کے بغیر اداس ہوتے۔ وہیں عینا کو یہ احساس بھی ہوتا کہ وہ زندگی گزار رہی ہے زندگی اسے نہیں گزار رہی۔ اگرچہ اداس تو وہ بھی ہو جاتی تھی۔

❁ ❁ ❁

چھپی چھپا چھپی۔ چھپا کے چھپی۔
بانٹلی۔ جھنجلیں اڑاتی ہوئی لڑکی
دیکھی کسی نے آئی ہوئی لہروں پہ
جاتی ہوئی لڑکی چھپی...."

گھنگھور گھٹائیں مچل مچل کر برس رہی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا کے سنگ سوندھی مٹی کی خوشبو محو رقص تھی۔ موسم اتنا خوبصورت تھا کہ نور بھی کتاب لیے برآمدے میں آبیٹھی تھی۔ سعد ہاف جینز میں ملبوس پورے صحن میں بقول امی کے باؤلا ہوا پھر رہا تھا۔

"یہ تم نے کون سی لڑکی دیکھ لی ہے۔"
اسے ایک ہی گانے کی تکرار کرتے سن کر عینا نے کچن سے جھانکا۔ وہ چکن پکوڑے بنا رہی تھی۔

"تم کیا جانو آپی۔" وہ اک لمبی سلپ لگا کر بیرونی دروازے سے باہر غائب ہوگیا تھا۔ وہ پکوڑے اور فرنچ فرائز املی کی چٹنی کے ساتھ لے کر برآمدے میں ہی چلی آئی۔

"امی! بس اب آجائیں۔" اس نے پکارا مگر اسی وقت فون چیخنے لگا تھا۔ امی فون کی طرف بڑھ گئیں۔ واپس آئیں تو چہرہ کھل رہا تھا۔

"تمہاری نانی کا فون تھا۔"

"خیریت تو تھی؟" عینا نے پوچھا۔

"تم واپس کب جا رہی ہو؟"

"کل۔"

"تمہارے ساتھ ہم بھی جائیں گے۔"

"کیوں؟" نور نے کتاب سے نظریں ہٹائیں۔

امی پراسرار انداز میں مسکرا رہی تھیں۔ کم از کم عینا کو تو ان کی مسکراہٹ پراسرار ہی لگ رہی تھی۔

"بھئی! لڑکا دیکھنے۔"

"کیوں امی! آپ نے پہلے کبھی لڑکا نہیں دیکھا۔" عینا نے خاصا بے تکا سوال کیا تھا۔

"تمہارے لیے۔"

"میرے لیے۔ مگر کیا؟" بات سمجھنے کے بعد وہ چلا اٹھی تھی۔

"کسی خاتون نے تمہیں اسکول میں دیکھا اور پسند کرلیا۔ وہ تمہاری نانی کے پاس آئی تھیں پرپوزل لے کر۔ لڑکی انہیں پسند ہے۔ اب انہوں نے ہمیں دعوت دی ہے کہ ہم آکر لڑکا دیکھ لیں۔ تمہارے نانا نانی خوش ہیں۔ بہت اچھا پرپوزل ہے۔"

"نانا نانی خوش ہیں تو خود کرلیں۔" عینا ایک دم بھڑک اٹھی۔

"یہ کیا بکواس ہے۔" امی کی تیوری چڑھ گئی۔

"اپنی بیٹیوں پر بس نہ چلا تو میرے پیچھے پڑ گئے۔ اتنا ہی اچھا ہے تو رمشہ کی کردیں۔" وہ اچھی خاصی بدلحاظی سے بولی تھی۔

"چپ کر جا عینا! حد ہوتی ہے بدتمیزی کی۔" امی کہاں برداشت کرسکتی تھیں۔

"امی! جب میں نے کہا ہے کہ میں شادی نہیں کروں گی تو یہ لڑکا۔" اب کہ اس کا لہجہ احتجاجی ہوگیا تھا۔

"میں نے کہا زیادہ زبان چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی اتنی آزادی نہیں دی ہم نے تمہیں کہ ایسے فیصلے خود کرو۔ ہم زندہ ہیں اور جانتے ہیں کہ کیا کرنا ہے کیا نہیں۔"

امی نے اس کے بولنے کی گنجائش ہی کہاں چھوڑی تھی۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ اندر جا گھسی۔ نور پکوڑا ہاتھ میں لیے ہکا بکا دیکھ رہی تھی۔ پھر امی کی طرف متوجہ ہوکر اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

"امی! کون لوگ ہیں؟"

عینا کا خیال تھا اس کا احتجاج کچھ تو رنگ لائے گا۔ مگر کہاں؟ امی ابو دونوں خوشی خوشی چلے گئے۔ وہ دعائیں ہی مانگتی رہ گئی کہ کاش وہ بندہ انہیں پسند ہی نہ آئے۔ مگر وہ جتنے خوش خوش گئے تھے اس سے زیادہ خوش ہوکر واپس آئے۔

سعد اور نور انہیں گھیر کر بیٹھ گئے۔

ڈھیٹ بن کر عینا بھی وہیں بیٹھ گئی۔

"وہ لوگ باقاعدہ پرپوزل لائیں گے تو ہم لوگ ہاں کردیں گے۔"

امی کی پوری گفتگو کا لب لباب یہی آخری جملہ تھا جسے سن کر عینا کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔

"آپ دیکھ لیجیے گا میں منگنی کی انگوٹھی ہی نہیں پہنوں گی۔"

وہ دھمکیاں دیتی وہیں ڈٹی گئی تھی کہ ابھی رمشہ وغیرہ سے بھی دو دو ہاتھ کرنے تھے۔

❁ ❁ ❁

"میری سمجھ میں نہیں آرہا آپ کے ہوتے ہوئے

یہ سب ہو کیسے گیا۔"

نیل کے پتے نوچ نوچ کر اس نے ڈھیر لگا دیا تھا۔ جتنی بار وہ نیل کی طرف ہاتھ بڑھاتی۔ رمشہ کا منہ اتنی بار ہی کھلتا تھا۔ مگر اس کی حالت کے پیش نظر لب بھینچ لیتیں۔

"بھئی! میں کیا کرسکتی تھی۔" رمشہ نے خاصی حیرت سے اسے دیکھا۔

"اپنے لیے لڑسکتی ہیں اور میری اتنی سی مدد بھی نہیں کرسکتیں۔" وہ دھپ سے ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

"میں جتنا کہہ سکتی تھی وہ کہا۔" وہ اپنے لمبے ناخنوں کو سرخ نیل پالش سے سجا رہی تھیں اور ان کی گوری مخروطی انگلیوں پر یہ رنگ سجا بھی بہت تھا۔

"اب تم ہی اپنا مقدمہ ڈھنگ سے نہیں لڑسکیں تو میری فیور کا فائدہ؟ بھئی وہ زمیندار بندہ ہے۔ کون جانے اس کا مینٹل لیول کیا ہے۔ کل کلاں کو گاؤں لے جاکر تمہیں گھر میں بٹھادے تو تم تو گئیں کام سے۔"
اپنی نیل پالش کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے کچھ اور ڈرا لیا۔

"امی ابو نے میرے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا بس بوجھ کی طرح اتار رہے ہیں۔ میں کیا کوئی ان پڑھ جاہل لڑکی تھی جو اپنے بارے میں فیصلہ نہیں کرسکتی۔"

"اُف۔ کیا ہوگیا ہے آپ لوگوں کو؟" رشنا جو کب سے صبر کیے سن رہی تھی جھنجھلا گئی۔

"کیوں کررہی ہیں ایسی عجیب و غریب باتیں۔ ایسی کیا انہونی ہو رہی ہے تمہارے ساتھ، سب کی شادیاں ہوتی ہیں۔"

"تمہاری ہوگی تو پوچھوں گی۔" عینا چڑ کر بولی۔

"تمہاری طرح واویلا نہیں کروں گی۔ آرام سے انگوٹھی پہن کر مزے سے شادی کی تیاریاں کروں گی اور اس بات پر رب کا شکر ادا کروں گی کہ مناسب کام، مناسب وقت پر ہونے جا رہا ہے۔" عینا کو پہلی بار پتا چلا رشنا کے خیالات رمشہ سے بالکل الٹ ہیں۔

"تم تو بس چپ کرو مجھ سے بنا پوچھے ہاں کردی میں کوئی بھیڑ بکری تھی نہ کچھ پوچھا نہ بتایا۔ تصویر تک نہیں دکھائی۔"

اسے پھر سے رونا آگیا۔ اور اب تک وہ نجانے کتنی بار رو چکی تھی۔ سچویشن ہی کچھ عجیب سی تھی وہ یہاں آئی تو اس معاملے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی سی چھاگئی تھی۔ نانی جان سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی تھی وہ سمجھی شاید معاملہ ٹھپ ہوگیا ہے۔ مگر امی کے فون نے گویا قدموں تلے سے زمین ہی کھینچ لی۔ وہ لوگ باقاعدہ پرپوزل لے کر گئے تھے اور امی ابو نے ہاں کردی تھی۔

"اتوار کو منگنی کی رسم ہے۔"

تب سے اب تک عینا کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کس کس سے لڑے۔ لے دے کر سارا غصہ کزنز کے سامنے ہی اترتا تھا۔

"یہ تو زیادتی ہے۔ کم از کم تصویر تو تمہیں دکھانی چاہیے تھی۔" اب کے رشنا نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

"تصویر کا کیا مسئلہ ہے منگوالیتے ہیں۔" رمشہ نے کہا۔

"اگر مجھے پسند نہیں آیا تو میں انکار کردوں گی۔" عینا نے گویا دھمکی دی۔

"ضرور کرنا۔ تمہارا حق ہے۔" رمشہ نے اس کی پیٹھ تھپکی۔

رشنا سر پکڑ کر رہ گئی۔

جوں جوں منگنی کا دن نزدیک آرہا تھا۔ عینا کے اضطراب میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اور تصویر تھی کہ آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ سونے پر سہاگا تایا ابا نے کیا تھا منگنی کی رسم انہی کے گھر پہ ہوگی جس پر ابو آرام سے راضی ہوگئے۔

"میں کچھ کر بیٹھوں گی۔" عینا یہاں وہاں چکراتی پھرتی۔

"تم صرف بیٹھ جاؤ تو کافی ہے۔" رشنا چڑ جاتی۔

تائی دہائی دیتیں۔

"بازار ہو آؤ منگنی کا جوڑا پسند کرلو۔"

انھوں نے مشترکہ رائے سے انگوٹھی اور دیگر لوازمات کے لیے نقد رقم کی بات کی تھی کہ بچی بعد میں اپنی پسند سے شاپنگ کر لے گی اور بچی ترت جواب دیتی تھی۔

"جنھوں نے "منگنی والا" پسند کیا ہے وہی جوڑا بھی پسند کر لیں۔" کبھی وہ بے حال ہو کر رمشہ سے پوچھتی۔

"رمشہ! تصویر کیوں نہیں آ رہی؟"

"گاؤں جا چکے ہیں موصوف۔ آئیں گے تو ہی تصویر بھجوائیں گے۔"

ساری تیاریاں ہو گئیں۔ اس کا جوڑا سل کر آ گیا۔ دن ایک ایک کر کے گزرتے چلے گئے۔ وہ مایوس سے مایوس تر اور سب سے خفا ہوتی چلی گئی اور تصویر آئی منگنی سے ایک دن قبل۔ رشنا لے کر بھاگی چلی آئی۔

"لو دیکھ لو۔ پر خدا کے لیے کوئی گڑبڑ مت کرنا۔"

"اب بھی کیا ضرورت تھی۔ سب کچھ تو ہو گیا۔"

"پلیز میری اچھی بہن۔" رشنا نے منت کی۔

عینا نے بددلی سے تصویر تھام کر نگاہ دوڑائی۔ پھر ایک پل کو اس کی نگاہیں ساکت اور تاثرات جامد ہو گئے۔

"میرا نام محمد رئیس سدھو ہے۔"

"واپس تو نہیں آئے گا؟"

"آ بھی سکتا ہے۔"

"کل یہ بچے کو لے کر آئے گا۔ اسے کلاس میں بٹھا دیجیے گا۔" کیسا دھمکی دیتا لہجہ تھا۔

تصویر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر بیڈ پر جا پڑی اور خود وہ گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر روئی تو روتی چلی گئی۔

* * *

جتنی جلدی اس کے سسرال والوں کو شادی کی تھی اس سے زیادہ جلدی امی کو تھی۔ جو زور و شور سے شادی کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ مجبوراً نور کو کتابیں چھوڑ کر ان کے ساتھ بازاروں کے چکر لگانے پڑے کہ عینا نے قسم کھا رکھی تھی وہ کسی کام کو ہاتھ نہ لگائے گی۔ امی اپنی ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی بات میں مشورہ کر بھی لیتیں تو وہ سعادت مندی سے کہتی تھی۔

"جیسے آپ کی مرضی۔"

اور اس "سعادت مندی" کے پیچھے جو طنز چھپا ہوا ہوتا تھا اسے سمجھ کر امی بلبلا کر رہ جاتیں۔

"میں کوئی دشمنی تو نہیں کر رہی۔ اولاد ہے میری، سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کیا ہے۔ اپنے باپ کے سامنے یہ نخرے دکھائے۔ ایسی اولاد کو تو سو جوتے لگنے چاہییں۔"

وہ عینا کے پیچھے چپکے چپکے بڑبڑاتیں کہ چند دن بعد پرائی ہو جانے والی بیٹی کا دل مزید خراب نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

سعد کبھی کبھی حیرت سے پوچھتا۔

"عینا آپی! آخر اس رشتے میں برائی کیا ہے؟"

"بھلے ایک بھی نہ ہو بس مجھے نہیں پسند تو نہیں پسند۔" اس کا لہجہ دو ٹوک ہوتا۔

"تو انگوٹھی کیوں پہنی تھی؟" وہ مزید حیران ہوتا اور انگوٹھی اس نے اپنی مرضی سے کہاں پہنی تھی۔ وہ تو مجبوراً پہننی پڑی تھی جب تایا نے آ کر پوچھا۔

"عینا بیٹی! میں نے سنا ہے کہ تم کچھ پریشان ہو؟"

تو عینا کی آنکھوں سے آنسو جھر جھر بہنے لگے۔ تایا نے پاس آ کر شفقت سے سر پر ہاتھ رکھا۔

"رو کیوں رہی ہو۔ بیٹی ہو میری، برا تو نہیں سوچوں گا تمہارے لیے۔ آخر ہم اتنے سارے لوگ گئے تھے، ملے تھے اس سے۔ کچھ اچھائی دیکھی ہے جبھی تمہارے لیے پسند کیا ہے۔ لیکن اگر تم سمجھتی ہو کہ تم ایک کی سوچ ہم سب کی سوچ سے بہتر ہے اور تم ہم سے بہتر فیصلہ کر سکتی ہو تو ٹھیک ہے اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ ہم انکار کر دیتے ہیں۔"

کیسے چن چن کر فقرے استعمال کیے تھے تایا نے کہ وہ چوں بھی نہ کر سکی اور خاموشی سے انگوٹھی پہن لی اور گھر والوں کے ساتھ ہی واپس آ گئی۔ رمشہ چیختی رہ گئیں۔

"میرے اسکول کا کیا ہوگا۔"

مگر عینا کی جانے بلا۔ ایک مشرقی بیٹی کی طرح اس نے ماں باپ کی لاج رکھ لی تھی۔ شادی کے دن جوں جوں قریب آ رہے تھے اس کے ہیجان و اضطراب میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ نجانے کون کون سے خدشے اور واہمے تھے جو اسے ستاتے تھے۔

* * *

دلہن کا استقبال بے حد ارمانوں، چاہتوں اور جوش و جذبے کے ساتھ ہوا تھا۔ اس کی اکلوتی نند انیسہ جو کہ میڈیکل کی اسٹوڈنٹ تھی، کے پاؤں زمین پر نہ ٹک رہے تھے۔ دروازے پر ہی روک کر نجانے کون کون سی رسمیں ادا کیں۔

"میرا دل گھبرا رہا ہے۔" عینا کے ساتھ رمشہ اور چھوٹی پھپھو آئی تھیں۔ اس نے رمشہ کا ہاتھ تھام کر بمشکل یہ جملہ بولا۔ فوراً ہی افراتفری پھیل گئی۔ اسے سنبھال کر صوفے پر بٹھا دیا گیا۔

"جلدی سے ٹھنڈا پانی لاؤ۔"

"کولڈ ڈرنک لاؤ۔"

اس کی ساس نے کسی کو دوڑایا تھا۔ کولڈ ڈرنک پی کر اسے کچھ سکون کا احساس ہوا۔

"طبیعت زیادہ تو نہیں گھبرا رہی؟" اس کی ساس نے بے حد شفقت سے پوچھا۔

عینا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ گہرے سرخ راجستھانی رنگ میں میچنگ زیور پہنے "الوہی سا روپ" لیے وہ سب کے دل میں سما رہی تھی۔ ساس نے نجانے کتنی بار اس کی نظر اتاری تھی۔ پھر سلامیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اگرچہ مہمان بہت زیادہ نہیں تھے۔

"رئیس کو بلاؤ فوٹو سیشن ہو جائے۔"

اور رئیس صاحب بڑے طمطراق کے ساتھ پھیل کر اس کے پاس براجمان ہوئے تھے۔ وہ بس پہلو بدل کر رہ گئی۔ فوٹوگرافر کیا ہدایات دے رہا تھا، وہ کچھ نہیں سن پائی تھی بس نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔

"بس کرو، دلہن کو اس کے کمرے میں پہنچا دو، کچھ دیر آرام کر لے۔"

اس کی ساس نے کہا۔ فوراً ہی چند رشتے دار خواتین اسے حجلۂ عروسی میں لے گئیں۔ رمشہ نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا تھا۔

"تم ذرا ریلیکس ہو جاؤ۔"

عینا نے سر اٹھا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ تازہ گلاب اور موتیے کی کلیوں سے سجی مسہری جبکہ در و دیوار بھی تازہ گلابوں سے سجے تھے۔ پورا کمرہ مہک رہا تھا۔ بہت آرٹسٹک انداز میں سجاوٹ کی گئی تھی۔

"باذوق لوگ ہیں۔" رمشہ نے بے اختیار سراہا۔

"رمشہ آپی! میری شادی ہو گئی۔"

اسے اب بھی اعتبار نہیں آتا تھا کہ تمام تر احتجاج کے باوجود یہ شادی ہو گئی۔

"بے فکر رہو، ابھی آئیں گے وہ موصوف تو یقین بھی دلا دیں گے۔" رمشہ مزے سے بولیں پھر چونک گئیں۔

"تمہیں اتنا پسینہ کیوں آ رہا ہے؟"

"بس میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

"اتنا نروس کیوں ہو رہی ہو، ایزی فیل کرو۔" رمشہ نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا پھر ٹشو پیپر لے کر اس کا پسینہ خشک کرنے لگیں۔

"یہ بھی غنیمت ہے کہ زیادہ مہمان نہیں ہیں۔ تمہیں روایتی دلہنوں کی طرح کئی گھنٹے بیٹھنا نہیں پڑا مگر تم اتنی ٹھنڈی کیوں ہو رہی ہو؟"

"پتا نہیں۔" وہ ایکدم ہاتھ پیر چھوڑ کر لیٹ گئی تھی۔ تبھی رمشہ نے گھبرا کر دروازہ کھول کر باہر کسی کو آواز دی۔ اس کی ساس اور نند تیزی سے اندر آئیں۔

"عینا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"خدا خیر کرے۔" اس کی ساس نے دہل کر کہا۔ ڈاکٹر کو آنے میں زیادہ وقت نہ لگا تھا۔ کمزوری، لو بلڈ پریشر، کم خوابی، اسے صرف آرام کی ضرورت تھی۔ رئیس ڈاکٹر کے پاس ہی کھڑا تھا۔

عینا نے اپنا بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ ڈاکٹر نے اسے سکون آور انجکشن دیا تھا، تھوڑی ہی دیر بعد اس پہ

غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔

❀ ❀ ❀

"کیسی طبیعت ہے بیٹی!" اس کی ساس کا پُرشفقت لمس اس کے ماتھے پر جاگا۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کمرے میں گلابوں کی باسی خوشبو تھی۔ کل کے تازہ گلاب اب مرجھائے ہوئے تھے۔ رات کا خطرہ ٹل گیا تھا اور وہ خاصی مطمئن تھی اور قدرے پُرسکون بھی۔ ایک بھرپور نیند نے اس کے اعصاب پرسکون کردیے تھے۔ رات رمشہ اس کے ساتھ ہی سوئی تھیں۔ چھوٹی پھپھو دوسرے کمرے میں تھیں۔ رمشہ شاید باتھ روم میں تھیں۔

"نظر لگ گئی' کل تک بھی تو اتنی پیاری رہی تھیں۔" ماں جی نے پیار سے اس کی پیشانی چومی پھر ملازمہ کو آواز دی۔ ایک ساتھ کئی ملازمائیں اندر آئیں جن کے ہاتھوں میں پکڑے تھالوں میں نجانے کیا کیا تھا جو عینا پر وار وار کر انہیں دوبارہ پکڑا دیا گیا۔

"تم تیار ہو جاؤ پھر میں ناشتہ لگواتی ہوں۔"

وہ پیار سے کہتے ہوئے چلی گئیں۔ اس کی نند نے آکر فیروزی پشواز اور زیور نکال دیا تھا۔ میک اپ تو رمشہ کو ہی کرنا تھا۔

"ولیمہ تو شام کو ہے' یہ ابھی سے اتنا بھاری ڈریس اور زیور۔" رمشہ باہر آئیں تو عینا نے کہا تھا۔

جواباً رمشہ نے اسے گھور کر دیکھا اور یاد دلایا۔

"ایک دن کی دلہن ہو تم! ویسے رات کو تم نے حد کردی۔ کوئی تک تھی طبیعت خراب کرنے کی۔ لوگ کیا کیا نہیں سوچتے سہاگ رات کے بارے میں اور تم۔۔۔ ان سرخ گلابوں کی ہی لاج رکھ لی ہوتی۔" انھوں نے خاصے تاسف سے مرجھائے ہوئے گلابوں کی لڑیوں کو دیکھا۔

عینا لاپروائی سے پاؤں ہلاتی زیور کے ڈیزائن پر غور کرتی رہی۔

تھوڑی دیر بعد چھوٹی پھپھو بھی آگئیں۔ تشویش سے خیریت دریافت کرتی رہیں۔

رمشہ کے ہاتھ بے حد مہارت سے اس کے چہرے کے نقوش سنوارنے لگے۔ وہ اسے زیور پہنا رہی تھیں جب نفیسہ نے کمرے میں جھانکا۔

"واؤ۔ بھابھی! آپ تو کل سے بھی زیادہ پیاری لگ رہی ہیں۔" وہ اس کے قریب آکر بے اختیار گویا ہوتی۔

"اور تم اس ڈریس میں بالکل گڑیا سی لگ رہی ہو۔" عینا نے جواباً اس کی تعریف کی تو وہ کھلکھلا اٹھی۔

"اور رئیس بھائی کہتے ہیں' میں یہ ڈریس پہن کر بالکل پنک پینتھر لگ رہی ہوں۔" اس نے مزے سے بتایا تو عینا سوچنے لگی۔ اگر ایسی تعریف معد اس کی کرتا تو وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتی۔

"ماں جی پوچھ رہی ہیں۔ اگر آپ تیار ہوگئی ہوں تو ناشتہ لگوادیں؟۔ رئیس بھائی تو بہت جلدی ناشتہ کرلیتے ہیں۔"

عینا نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔

رمشہ نے اوکے کا سگنل دیتے ہوئے دوپٹہ سیٹ کرنا شروع کردیا۔

آناً فاناً کمرے میں محفل سیٹ ہوگئی جس پر انواع واقسام کی چیزیں دلوازمات سج گئے۔ وہ حواس باختہ ہوگئی۔

"رمشہ آپی! میں۔۔۔ مجھے ناشتہ نہیں کرنا۔"

"کیا مصیبت ہے تمہیں۔" وہ دانت پیس کر رہ گئی۔ "یا تو شادی نہیں کرنا تھی' کرلی ہے تو اب بھگتو۔"

"آپی! پلیز۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"وہ تمہیں کھا نہیں جائے گا۔"

"آپ ہمارے ساتھ ناشتہ کرلیں۔" عینا نے گویا منت کی۔

"میں اور پھپھو دوسرے کمرے میں کرنے جارہے ہیں۔" انھوں نے بے مروتی سے کہہ کر میک اپ کی چیزیں سمیٹنا شروع کیں۔ عینا بیٹھی انگلیاں چٹخاتی رہی۔

"ریلیکس ہو کر بیٹھو' اینڈ بی بریو۔" آہستگی سے اس کا ہاتھ تھپتھپا کر وہ باہر نکل گئیں۔ کمرے میں کھڑی ملازمائیں بھی فوراً غائب ہوگئیں۔ وہ کچھ اضطراری انداز میں کھڑی ہوئی پھر صوفے کے کنارے پر ٹک گئی۔ چہار سو بہت گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ کوئی شور' کوئی آہٹ نہیں اور اس سناٹے میں وہ اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز صاف سن سکتی تھی۔

"پتا نہیں سب کے ساتھ یہی سچویشن ہوتی ہے یا میں ہی کچھ زیادہ پزل ہو رہی ہوں۔" گہری گہری سانسیں کھینچتے ہوئے اس نے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

تب ہی سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ ابھری۔ کوئی بہت تیزی اور مگن سے انداز میں سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

عینا کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

وہ اسی تیزی اور مگن سے انداز میں دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔

"السلام علیکم۔" ہشاش بشاش تروتازہ لہجہ۔

جواب تو عینا نے بھی دیا تھا مگر آواز کہیں حلق میں گُٹ کر رہ گئی تھی۔

وہ اسی انداز میں صوفے کے دوسرے کنارے پر بیٹھ گیا۔

"طبیعت کیسی ہے اب؟۔"

عینا نے ذرا سا کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

"ٹھیک ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ ویسے آپ نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" پُرتبسم لہجے میں کیا گیا ہلکا سا شکوہ' عینا کو تھوڑا سا شرمندہ کر گیا۔ اس نے چور نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ گلاس میں پانی ڈال رہا تھا۔

"رات کیسی گزری؟۔"

"ٹھیک۔" وہ دوبارہ اپنی چوڑیوں سے کھیلنے لگی تھی۔

"ٹھیک یا۔۔۔" معنی خیز لہجے میں کہتے ہوئے وہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ لبوں پر اک گہری سی مسکراہٹ آن رکی تھی۔ عینا کی ہتھیلیوں پر پسینہ سا اتر آیا۔ کچھ مناسب جواب نہ سوجھا تو انگلیاں چٹخانے لگی۔

"چلیں ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" وہ ناشتے کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "کیا لیں گی آپ؟"

"آپ لیں' میں لیتی ہوں۔" سنبھل کر پہلا مکمل جملہ بولا تھا۔ وہ بھی اس کی گھبراہٹ بھانپ گیا تھا سو ناشتے سے انصاف کرنے لگا۔ وقتاً فوقتاً مختلف چیزیں اسے بھی آفر کرتا رہا تھا۔ وہ بس فرائی انڈا پلیٹ میں ڈالے کانٹے سے کودتی رہی۔ جیسے ہی اس نے ہاتھ کھینچا' عینا نے بھی پلیٹ رکھ دی تھی۔

"آپ نے تو کچھ لیا ہی نہیں۔" اس کی پلیٹ میں انڈا جوں کا توں موجود تھا۔

"میرا جی نہیں چاہ رہا۔"

"کسی خاص چیز کو جی چاہتا ہو تو۔۔۔"

"نہیں' بس مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ چائے بنائیں اپنے لیے بھی اور میرے لیے بھی۔" اس نے زیادہ جرح نہیں کی۔ قدرے ریلیکس ہو کر بیٹھتے ہوئے ایک بازو صوفے کی پشت پر پھیلا کر اب وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ عینا نے محسوس کیا اس کی گھبراہٹ پہلے سے کم ہوگئی تھی۔ شاید یہ رئیس کے نارمل انداز اور دوستانہ لہجے کا اعجاز تھا۔ اس نے چائے صرف رئیس کے لیے بنائی اور کپ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"گویا آج ناشتے کی مکمل ہڑتال ہے۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔ بس ہلکا سا مسکرائی تھی اور یہ پہلی مسکراہٹ تھی جو تب سے اب تک اس کے چہرے پر آئی تھی۔ رئیس کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ چائے کے دوران بھی بس وہی بولتا رہا تھا۔ اپنی دلچسپیاں' مشغلے' مصروفیت' زمینیں' الیکشن' کبھی کوئی سوال پوچھ بھی لیتا تو وہ ہوں ہاں سے زیادہ جواب نہیں دے سکی تھی۔

پھر وہ ایکدم خاموش ہوگیا۔ اس کی نظریں گہرے سے گہری عینا کی طرف اٹھی تو تھیں مگر وہ کچھ بھی نہیں

بول رہا تھا۔ عینا اس کی اچانک خاموشی سے خائف سی ہوگئی تو گھبرا کر پوچھنے لگی۔

"آپ بول کیوں نہیں رہے؟"

"جب سامنے سے کوئی رسپانس نہ مل رہا ہو تو خاموش ہونا ہی بہتر ہے۔" اس کے لہجے میں سنجیدگی در آئی۔

"ایسی بات نہیں ہے، میں آپ کو سن رہی تھی۔"

"مجھے صرف ایک اچھے سامع کی ضرورت نہیں ہے عینا! کیا تمہیں مجھ سے کچھ بھی نہیں پوچھنا؟"

"آپ کو غصہ تو نہیں آتا۔" جھجکتے ہوئے لہجے میں بے حد معصومیت لیے سوال کیا گیا۔

رئیس نے بمشکل اپنی مسکراہٹ کا گلا گھونٹا اور سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"بہت آتا ہے۔"

"نہیں۔" عینا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر پوچھنے لگی۔ "مجھ پر بھی غصہ ہوں گے؟"

"تم ایسی بات ہی مت کرنا کہ مجھے غصہ آئے۔" وہ سہولت سے آپ سے تم پر آگیا تھا۔

"گویا جی حضوری کرنی ہوگی۔" اس نے خاصی مایوسی سے سوچا۔ ٹپیکل سوچ' بیویوں سے ہر بات منوانے والی۔"

"رئیس اپنے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتا اور دوستوں سے کبھی زیادتی نہیں کرتا۔ یہ اصول کی بات ہے۔"

"انسان کے رویے میں لچک ہونی چاہیے۔"

"اصولوں پر کوئی لچک نہیں۔"

"اصول انسانوں کے لیے ہوتے ہیں' انسان اصولوں کے لیے نہیں۔" وہ بحث پر آمادہ ہوگئی۔

"معاف کرنا اچھی بات ہے۔"

"ہر بات معاف نہیں کی جاسکتی۔" رئیس کا لہجہ بے لچک اور ٹھوس تھا۔

"آپ کا یہ رویہ ہر کسی کے ساتھ ایسا ہوتا ہے؟" وہ چڑ سی گئی تھی۔

"میں نے کہا نا' دوستوں کے ساتھ بالکل نہیں۔"

"اور میں کہاں آتی ہوں؟" رئیس کا قہقہہ بھرپور تھا۔

"اس کا تعین تم خود کرو گی۔ ویسے کیا دشمنی کا ارادہ ہے؟"

"میں خاصی معصوم لڑکی ہوں' ایسے کام مجھے نہیں آتے۔" وہ تھوڑا خفا ہوئی۔

"خیر' تم شکل سے اتنی بھی معصوم نہیں لگتیں۔"

"آپ۔۔۔" وہ نجانے کیا کہنے جارہی تھی۔ رئیس نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر جیب سے مخملیں ڈبیا نکال کر اس میں سے رنگ نکالی۔

"لڑنے کے لیے تو ساری عمر پڑی ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا' حقیر سا تحفہ ہے۔ نجانے پسند بھی آئے گا یا نہیں۔ لاؤ پہنا دوں۔" رئیس نے ہاتھ بڑھایا۔ عینا نے جھجکتے ہوئے اپنا ہاتھ سامنے کیا تھا۔ رئیس نے آہستگی سے تھام لیا۔

"عینا! ایسا نہیں ہے کہ میں نے تمہیں دیکھتے ہی تمہارے ساتھ کی خواہش کی ہو لیکن جب تمہاری تصویر میرے سامنے آئی تو مجھے لگا تم میری قسمت میں لکھ دی گئی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ایک اچھی زندگی گزاریں گے۔ میری طرف سے تم پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ تم جس طرح رہنا چاہو' جہاں جانا چاہو' بس اعتبار اس رشتے کی اساس ہوگی۔ اعتبار کرنا ہے تمہیں مجھ پر اور مجھے تم پر۔" اس کا مدھم دوستانہ لہجہ عینا کو پرسکون کرگیا۔ رنگ پہنا کر وہ اس کا ہاتھ لبوں تک لے گیا۔ عینا نے بے اختیار ہاتھ کھینچ لیا۔

وہ ہنس دیا۔

"ٹھیک ہے' اسنیہ بھابی اسٹیپ سے نیچے چلیں۔" اس سے قبل کہ وہ جواب دیتی' دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

"یس۔" رئیس نے کہا تو انیسہ اندر آگئی۔

"آپ کا فون ہے رئیس بھائی۔"

"تم اپنی بھابی کو کمپنی دو۔" وہ انیسہ کے سر پر چپت لگاتا ہوا باہر نکل گیا۔

"بھائی نے کیا دیا؟" انیسہ قریب آکر اشتیاق

سے پوچھنے لگی۔ عینا نے ہاتھ آگے کر دیا۔
"بہت خوبصورت ہے" آپ کو ہمارے بھائی کیسے لگے؟"
"اتنی جلدی کیا رائے قائم کی جاسکتی ہے۔"
عینا دھیرے سے بولی مگر اس کے چہرے پر چھائی شرگیں سی مسکان بتاتی تھی کہ اس کی رائے اتنی بھی بری نہیں۔ شام کو ولیمہ تھا۔ امی 'سعد اور نور اسے لینے آئے تھے۔ رئیس نے معذرت کرلی۔ اسے کسی کام کے سلسلے میں کراچی جانا تھا اور چار دن کے بعد آنا تھا۔ عینا مطمئن سی گھر والوں کے ساتھ واپس آئی تھی۔

* * *

چار دن کے بعد رئیس اور ماں جی اسے لینے آئے تھے۔ نور اور سعد جو رئیس بھائی سے تفصیلی ملاقات کے خواہش مند تھے۔ خاصے مایوس ہوئے کہ وہ لوگ بہت کم وقت کے لیے آئے تھے۔ کھانے کے فوراً بعد انھوں نے اجازت چاہی۔
"سمجھتے کیا ہیں یہ رئیس بھائی خود کو' کہیں کے پرائم منسٹر لگے ہیں کیا۔" نور کمرے میں آکر بڑبڑانے لگی۔
"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ موصوف خود کو کیا سمجھتے ہیں۔" زیور پہنتے ہوئے وہ سخت جھنجلاہٹ کا شکار ہو رہی تھی پھر کڑے پھینک کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بیٹھ گئی۔
"تمہیں کیا ہوا؟" وہ اپنا شکوہ بھول گئی۔
"مجھ سے نہیں ہو رہا یہ سب۔"
وہ چلائی۔ نیل پالش لگاتے ہوئے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ آئی لائنر کی لائن ٹھیک نہیں بنی تھی۔ زیور کئی بار ہاتھ سے چھوٹا تھا۔
"عینا۔" نور اس کے پاس آئی تو اس نے نور کے ہاتھ دبوچ لیے۔
"مجھے سخت گھبراہٹ ہو رہی ہے نور! مجھے نہیں جانا۔"
نور اس سے زیادہ گھبرا گئی۔
"میں امی کو بلاتی ہوں۔"

"عینا! بتی کیا ہوا۔" امی اندر آئیں تو وہ ان سے لپٹ کر روئی تو پھر روتی چلی گئی۔ امی کی اپنی آنکھیں بھر آئیں۔
"امی! میں نے نہیں جانا۔"
"کیا فضول بولتی ہو۔" وہ بھیگی بھیگی سی ہنسی ہنس دیں۔ محض عینا کی وجہ سے خود کو سنبھال رہی تھیں۔
"بیٹیوں کو اپنے گھر جانا ہی ہوتا ہے اور شکر کرو' تمہیں اتنے اچھے لوگ ملے ہیں۔"
"بس امی! دو چار دن اور روک لیں۔ میں نے کہا بھی تھا کہ میں نے شادی نہیں کرنی۔"
آخری جملہ بے حد جھنجلا کر کہا گیا تھا۔
"بس۔" امی نے جھٹکے سے اسے خود سے الگ کیا اور بے حد خفگی سے گویا ہوئیں۔ "خبردار جو ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو۔ نور اس کا میک اپ ٹھیک کرکے باہر لاؤ' ان لوگوں کو جلدی ہے۔"
امی کے باہر جاتے ہی سوال سوال کرتی نور اس سے لپٹ گئی اور رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ ماں جی نے اس کا رویا رویا روپ دیکھا تو گلے سے لگا کر پیار کرتے ہوئے بولیں۔
"کوئی دور تھوڑی جا رہی ہو' جب دل چاہے ملنے چلی آنا۔"
سعد مسلسل رئیس کے ساتھ محوِ گفتگو تھا۔ امی نے ہنستے ہوئے نور کی شکایت رئیس تک پہنچائی تو وہ اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے شفقت بھرے لہجے میں گویا ہوا۔
"پھر آئیں گے تو لمبی نشست رہے گی بلکہ اب تم لوگ آنا۔"
اور نور اس کے لہجے پر ہی نہال ہو گئی تھی۔
گھر پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ قریب و نزدیک کے تمام مہمان جا چکے تھے۔ بی بی زینب ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ کھانا وہ لوگ کھا کر ہی آئے تھے۔
"بی بی! چائے کا ایک کپ میرے کمرے میں بھجوا دیجیے گا۔"
رئیس کہہ کر اوپر چلا گیا تو عینا قدرے ریلیکس

ہو کر بیٹھ گئی۔ ماں جی اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔
"انیسہ کہاں ہے آنٹی۔"
"آنٹی۔ رئیس کی طرح تم بھی مجھے ماں جی کہو گی تو مجھے بہت اچھا لگے گا۔" انھوں نے شفقت سے ٹوکا۔
"جی۔"
"انیسہ کے پرچے تھے۔ بمشکل دو دن ہی نکل سکی تھی۔ پرسوں واپس ہوسٹل چلی گئی۔ بس نہ رئیس گھر پر ہوتا ہے نہ انیسہ۔ ہم دو بوڑھی جانیں اور نوکر۔ اب تم آگئی ہو میرے گھر کی رونق۔ تمہارے بہلانے رئیس بھی آجایا کرے گا' ورنہ اس کا دل شہر میں نہیں لگتا۔ پہلے میں بھی وہیں ہوا کرتی تھی مگر اب میری طبیعت کا کچھ بھروسہ نہیں کب بگڑ جائے۔ یہاں سے ڈاکٹر کو بلانا یا اسپتال جانا آسان ہوتا ہے۔" انھوں نے تفصیل سے بتایا۔ بی بی زینب چائے لے کر آئی تھیں۔ چائے کے بعد بھی وہ اسے رئیس اور انیسہ کے بچپن کی باتیں سناتی رہیں۔ تب ہی گھڑی نے گیارہ بجائے تو وہ چونک گئیں۔
"اتنی رات ہو گئی۔ زینب جاؤ' بہو کو اس کے کمرے میں چھوڑ آؤ۔ فریج میں دودھ اور فروٹ بھی رکھوا دینا۔"
"اور ممی رانی۔"
ممی رانی بادل نخواستہ اٹھی تھی۔ سیڑھیاں عبور کرکے اوپر آئی تو کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ کاؤچ پر نیم دراز ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھا۔ اسے دیکھ کر چونکا پھر ہلکا سا مسکرا دیا۔
"لو میاں! اپنی امانت سنبھالو۔" بی بی زینب نے کہا اور فریج میں چیزیں رکھنے لگیں۔ کمرے میں سب کچھ ویسے کا ویسا تھا۔ گلدان میں ادھ کھلے گلاب مسکرا رہے تھے۔ بی بی اسے دعا دیتے ہوئے چلی گئیں۔
کمرے میں ٹی وی چل رہا تھا۔
"جو میری روح کو چین دے پیار دے
وہ خوشی بن گئے ہو تم
زندگی بن گئے ہو تم"

"بیٹھ جاؤ عینا! تمہارا ہی بیڈ روم ہے۔"
وہ سنگل صوفے کے کنارے پر ٹک گئی۔
رئیس چینل بدلنے لگا۔
دل نے یہ کہا ہے دل سے
محبت ہو گئی ہے تم سے
گانے کے بول اور رئیس کے لبوں پر پھیلی ہلکی شوخ مسکراہٹ اسے بے کل کر رہی تھی۔ وہ وہیں بیٹھی انگلیاں چٹخاتی رہی۔ نجانے کتنا وقت گزرا تھا۔ جب اس نے ٹی وی آف کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ بھرپور مسکراہٹ اس کے لبوں کا احاطہ کیے ہوئے تھی کہ بولا تو لہجہ معنی خیز تھا۔
"ہاں جی کیا رات یونہی گزارنی ہے۔"
عینا کی سانس سینے میں اٹک کر رہ گئی تھی اور دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔

* * *

شمالی علاقہ جات سے واپس آئے تو گویا وہ اپنے سارے خدشے' سارے واہمے وہیں کسی پہاڑی کے دامن میں دفن کر آئی تھی۔ اس کا کھلا کھلا شاداب چہرہ اندرونی خوشی کا عکاس تھا۔ رئیس بالکل بھی ویسا نہیں تھا جیسا سوچ سوچ کر وہ پریشان ہوتی رہی تھی۔ بظاہر سخت اور سنجیدہ نظر آنے والا اندر سے اتنا ہی نرم اور محبت کرنے والا تھا اور وہ اس کی محبتوں کی اسیر ہو گئی تھی۔ ہر بات کا آغاز رئیس کے نام سے ہوتا تھا تو اختتام بھی اسی کے نام پر۔
نور دانت پیسنے لگتی۔ جتنی دفعہ وہ رئیس کا ذکر کرتی' اتنی ہی بار وہ کہتی۔
"اسے پکڑ کر جوتے لگاؤ۔"
عینا خود نہیں جانتی تھی' وہ اتنا کیسے بدل گئی ہے۔ یہ سب اس کی محبتوں کا اعجاز تھا۔ وہاں سے آتے ہی دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسے حیرت ہوئی جب ماں جی نے اپنے خاندان میں سے کسی کی دعوت قبول نہیں کی جبکہ عینا کے خاندان کی تمام دعوتوں کو بخوشی قبول کیا تھا۔ اس نے رئیس سے پوچھا تو وہ آرام سے

بولا۔

"یہ ماں جی کا ڈپارٹمنٹ ہے' میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔"

"آپ نے ولیمہ گاؤں میں کیوں نہیں کیا؟۔"

"کیوں؟۔"

"ویسے ہی' اسی بہانے میں گاؤں دیکھ آتی۔ وہاں بھی تو آپ کے رشتے دار رہتے ہوں گے؟۔" وہ اپنی چوڑیوں سے کھیلتے ہوئے سرسری سا پوچھ رہی تھی۔

"کچھ خاص نہیں لیکن عینا! تمہیں بہانے کی کیا ضرورت ہے۔ ویسے ہی کسی دن لے چلیں گے گاؤں۔" رئیس نے کہا تو وہ مسکرا دی۔

روٹین لائف شروع ہوئی تو رئیس گاؤں جانے لگا۔ ہر روز کہہ کر جاتا' دو دن بعد آؤں گا اور ہر روز آجاتا پھر جھنجلا کر کہتا۔

"کیا چیز ہو تم' کھینچ لیتی ہو۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس دیتی۔

❋ ❋ ❋

"رئیس! مجھے آج تایا جان کی طرف جانا ہے۔"

چائے کا مگ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے عینا نے کہا۔ عینا کو اس کی ایک ہی عادت بری لگتی تھی کہ وہ چائے بہت پیتا تھا۔ ہر دس منٹ بعد اسے چائے کی طلب ہونے لگتی اور عینا چڑنے کے باوجود جب بھی وہ فرمائش کرتا اس کے لیے خود چائے بناتی تھی۔

"گاڑی تو موجود ہوگی' چلی جانا۔" وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے تھا۔ پرفیوم اسپرے کرتا ہوا اس کی طرف پلٹا۔

"آپ رات کو آئیں گے؟۔"

"نہیں' دو تین دن لگ جائیں گے۔" اس نے قریب آکر مگ اٹھالیا۔

"دو تین دن؟۔" عینا نے آنکھیں پھیلائیں۔

"جانتے ہیں نا کیسے گزرتے ہیں۔"

"جانتا ہوں جاناں' مگر مجبوری ہے۔ کام ہے تھوڑا۔" وہ پیار سے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے

صوفے پر بیٹھ گیا۔ عینا نے کچھ لمحے سوچا پھر اشتیاق سے فلور کشن کھینچ کر سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"میں چلوں آپ کے ساتھ؟۔" رئیس نے کپ سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

"تم۔ تم کیا کروگی؟۔"

"آپ کے ساتھ رہوں گی۔"

"میں گاؤں میں نہیں ہوں گا' ڈیرے پر جاؤں گا۔" اس نے ٹالا۔

"تو میں ڈیرے پر رہ لوں گی۔"

"ڈیرے پر ایسی سہولتیں نہیں ہیں کہ میں تمہیں ساتھ لے جاؤں۔" رئیس کے لہجے میں ہلکی سی ناگواری در آئی تھی۔

"آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ نہر کے کنارے بہت خوبصورت جگہ ہے۔" عینا نے ہمت نہیں ہاری۔

"لیکن وہاں سانپ ہوتے ہیں بہت زیادہ اور تم تو چھپکلی کے سانپ کے بچے سے ڈر جاتی ہو۔"

"آپ لے جانا نہیں چاہتے۔"

"پاگل ضد نہیں کرتے۔" وہ کپ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی چیزیں سمیٹنے لگا۔

"یہ۔ یہ کیا ہے۔" عینا والٹ کے ساتھ گولیوں کا بیلٹ دیکھ کر بری طرح چونکی۔

"گولیاں ہیں۔" رئیس نے سادہ و نارمل انداز میں بتایا۔

"رئیس! یہ کیوں رکھتے ہیں اپنے پاس؟۔"

"یونہی رعب کے لیے گاؤں میں رکھنا پڑتا ہے۔"

"خوامخواہ ہی بس رہنے دیں آپ۔"

"کتنی ڈرپوک سی بیوی ہے میری۔" وہ اس کی ناک کھینچتا ہوا ہنسا۔ "یونہی رکھتے ہیں اپنے پاس کوئی فکر کی بات نہیں۔ گاؤں میں سب لیتے پھرتے ہیں۔ اب ایسا ہے کہ تم اپنا خیال رکھنا' تایا کی طرف چلی جانا۔ چاہو تو دو دن رک جانا لیکن تھوڑا زاد اور راہ تو دے جاؤ' آخر تین دن لگیں گے۔"

آخر میں اس کا لہجہ و انداز دونوں بدل گئے تھے۔

❋ ❋ ❋

میں نے اک خواب دیکھا ہے
شہر کی سب سے اونچی کھڑکی کے پیچھے سے
ایک نیا سورج نکلا ہے

رائمہ فل آواز میں ڈیک چلا کر ڈلیاری تیک کر رہی تھی۔ رشنا کسی انگریزی ناول میں مگن تھی۔ رمشا ابھی تک کالج سے نہیں لوٹی تھیں۔ ایک ہی شہر میں ہونے کی بنا پر عینا کو یہ سہولت تو تھی کہ جب بھی اداس ہوتی ان کی طرف آجاتی۔ اس وقت بھی وہ بیزار سی اٹھی تھی کہ چائے وہ خود بنائے گی۔ رشنا نے اس کے اس فیصلے کو خاصا سراہا تھا۔

تائی جان کھانا بنا رہی تھیں۔ ان کے منع کرنے کے باوجود اس نے کیتلی میں پانی ڈال کر چولہے پر رکھ دی۔ وہ اسے چھوٹی چھوٹی گھر کی باتیں بتانے لگیں۔

"تائی جان! مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ سب کاموں کے لیے ملازم موجود ہیں۔ کچن بی بی زینب کے حوالے ہے۔ میں تو سارا دن فارغ ہی ہوتی ہوں۔"

"بی بی زینب کون ہے؟۔"

"کوئی دور پرے کی عزیزہ ہیں۔ شوہر فوت ہوگیا' اولاد تھی نہیں' بہت عرصے سے ماں جی کے ساتھ ہی ہیں۔"

"چلو اچھا ہے۔ تمہاری ساس کو بھی دو سراہٹ رہتی ہوگی۔ اللہ کا شکر ہے تمہیں سسرال اچھی مل گئی۔"

کہتے ہوئے جو تاثر ان کے لہجے میں ابھرا تھا عینا نے اسے پوری طرح محسوس کیا۔ وہ دل سے چاہتی تھیں کہ رمشا بھی گھر کی ہو جائیں مگر رمشہ کی ضد؟ اور وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ رمشہ' عینا نہیں جسے آسانی سے منالیا جائے۔ اب تو وہ سنجیدگی سے سوچ رہی تھیں کہ رشنا کی کہیں بات طے کردیں۔

"اوں ہوں! یہ چائے کی خوشبو تو دماغ کو چڑھ رہی ہے۔" عینا یکدم ناک پر ہاتھ رکھ کر پیچھے ہٹی۔ "تائی جان! آپ چائے چھان دیں۔ میں رشنا کو بھیجتی ہوں۔"

وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ تائی نے فوراً تشویش سے اسے دیکھا پھر خود ہی چائے نکال کر پیچھے چلی آئیں۔ وہ بیڈ پر لیٹی تھی بلکہ رشنا اس کے پاس بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا؟۔"

"یونہی کمزوری سی محسوس ہو رہی ہے' ذرا سا چکر آگیا تھا۔" وہ ان کی تسلی کے لیے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"پہلے بھی ایسا ہوا ہے؟۔"

"نہیں پہلی بار ہوا ہے۔"

"بس! تائی کو اک نئی فکر لاحق ہوگئی۔" رشنا ہنس دی۔ عینا نے چونک کر تائی کو دیکھا جو رشنا کو ڈانٹنے لگی تھیں۔

"تم میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلنا۔" آخر میں انہوں نے عینا سے کہا تھا۔

"ارے نہیں تائی جان! یہ تو بس۔"

"چپ کرو' مجھ سے زیادہ نہیں پتا تمہیں۔" انہوں نے ڈپٹ کر کہا۔ وہ صرف تائی جان کی وجہ سے ڈاکٹر کے پاس گئی تھی جس کی رپورٹ نے بتایا کہ تائی جان کا خیال غلط نہ تھا۔ خدا اس پر مہربان ہوگیا تھا۔ ماں جی نے یہ خبر سنی تو بہت دیر سجدے سے سر نہ اٹھایا تھا۔

❋ ❋ ❋

رئیس نہیں ہوتے تھے تو اسے نیند نہیں آتی تھی۔ بس ٹی وی کے چینل بدلتے بدلتے آدھی رات گزار دیتی۔ ماں جی کچھ دیر کمپنی دیتیں پھر انہیں تسبیح کرنا ہوتی تو اسے آرام کرنے کا کہہ کر اٹھ جاتیں۔ اب بھی انہوں نے آتے ہی اسے ڈانٹ پلائی تھی۔

"بیٹی! کتنی بار کہا ہے ایسی حالت میں یہ شیطان کا ڈبہ زیادہ مت دیکھا کرو۔ سورہ یوسف کی تلاوت کیا کرو۔"

ان کے ڈانٹ میں اتنا پیار اور مان تھا کہ اس نے چوں چرا کیے بغیر ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کردیا۔ وہ اس سعادت مندی پر نہال ہو کر دعائیں دینے لگیں۔

"رئیس کا فون نہیں آیا ماں جی!" عینا نے جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

"نہیں' خود میں نے بھی نہیں کیا۔ وہ آئے گا تو تم

خوشخبری سناؤں گی۔"

عینا نے ان چار دنوں میں ہی محسوس کیا تھا۔ وہ جتنی زیادہ خوش تھیں اتنی ہی ڈری ہوئی تھیں۔ جیسے بہت ہی انمول خوشی بڑی دقتوں کے بعد ہاتھ آنے والی ہو۔ حتیٰ کہ بی بی زینب کے سوا کسی اور گھریلو ملازمہ کو اس خوش خبری کی ہوا تک نہ لگنے دی تھی۔ عینا کو بھی منع کر دیا تھا۔ وہ کچھ لمحے زیر لب پڑھ پڑھ کر اس پر پھونکتی رہیں پھر آرام کی تاکید کرتے ہوئے چلی گئیں۔ تھوڑی دیر میں بی بی زینب دودھ اور فروٹ لے آئیں۔

"ابھی تو کھانا کھایا ہے بابی بی!" وہ چڑ گئی۔

"دودھ تو ویسے بھی رات کو ضرور ہی پینا ہوگا۔"

"فریج میں رکھ دیں بابی بی سب کچھ، تھوڑی دیر میں لے لوں گی۔"

"پھر تم سو جاؤ گی۔"

"ابھی مجھے نیند نہیں آ رہی۔" وہ بچوں کی طرح ٹھنکتے ہوئے بولی تھی۔

اس کا انداز دیکھ کر زینب نے سب کچھ فریج میں رکھ دیا مگر نصیحت کرنے سے باز نہ آئیں۔

"پوری نیند لیا کرو بیٹے اور ٹھیک سے کھایا پیا کرو۔ تو کیا جانے کتنے برسوں کے بعد یہ خوشی اس گھر اور حویلی کا مقدر بنی ہے۔ کیسا خوف سمایا ہے ہم سب کے دلوں میں۔ اللہ تجھے ساتھ خیریت کے فارغ کرے۔ آنے والا زندگی اور صحت پائے تو حویلی کا مقدر جاگ جائے۔"

"کتنے برس بی بی زینب... ہماری شادی کو تو ابھی سال بھی نہیں ہوا۔" عینا ہنس دی۔

اپنے خیالوں میں بڑبڑاتی زینب چونکی پھر مسکرا دی۔ آہستگی سے اس کا سر تھپتھپا کر چلی گئی۔

"حد کرتے ہیں یہ لوگ بھی۔ سیدھے سادے مسئلے کو پراسرار بنا دیتے ہیں۔"

وہ بیڈ پر چت لیٹ گئی پھر گردن گھما کر سائیڈ پر رکھی رئیس کی تصویر کو دیکھنے لگی۔

"کہاں ہیں رئیس! اب آ بھی جائیں۔" جتنی شدت سے ان دنوں اس نے رئیس کا انتظار کیا تھا۔ عینا کے خیال میں اسے ویسے ہی آ جانا چاہیے تھا۔

"یاد ہے رئیس! جب میری چاہت آپ کو آدھی رات کو بھی کھینچ لاتی تھی۔ اب... میری چاہتوں کی شدت میں تو کوئی کمی نہیں آئی پھر آپ کہاں رک گئے ہیں۔"

اس کی تصویر سے باتیں کرتے کرتے نجانے کب نیند کی مہربان دیوی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ بہت گہری اور پرسکون نیند اور پھر نیند سے خواب تک کا سفر۔

وہی حویلی تھی۔ وہی گہما گہمی، شور، ہنگامہ، جشن، خوشی، ہر جا روشن جگمگاتا ہوا اور وہ خود شہزادیوں کی سی آن بان کے ساتھ ان سب کے بیچ بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے مٹھائیوں کے تھال بھر بھر آ رہے ہیں اور وہ ہاتھ بھر بھر تقسیم کر رہی ہے۔

"کس کی مٹھائی۔" نجانے کس نے پوچھا تھا۔

"رئیس بابا کا بیٹا ہے۔" نجانے کس نے بتایا تھا۔

وہ ناز سے مسکرا رہی تھی۔

اس کے سامنے گورے، سانولے، گندمی، چھوٹے بڑے ہاتھ آ رہے تھے اور بھر بھر کر جا رہے تھے۔ تبھی اس کے سامنے دعا کے انداز میں جڑی ہوئی ہتھیلیاں آ گئیں۔

وہ ٹھٹک سی گئی۔

نجانے کیوں مگر یہ ہتھیلیاں اسے سب سے مختلف لگی تھیں۔ زردی مائل سپید ہاتھ جس کی دائیں ہتھیلی کے عین درمیان سیاہ تل تھا۔

"یہ ہاتھ کس کے ہیں؟" عینا نے سوچا نہیں تھا بس اسے لگا وہ اسے عام لوگوں کی طرح مٹھائی نہیں دے سکتی۔

"پلیٹ دو۔" اس کے سامنے پلیٹ آ گئی تھی۔ اس نے ہر تھال سے چن چن کر بہت ساری مٹھائی اس پلیٹ میں بھری اور پلیٹ ان ہاتھوں میں دے کر چپکے رومال سے ڈھانپ دی تھی۔ ان ہاتھوں نے اس پلیٹ کو تبرک کی طرح سنبھالا اور تبھی عینا کی آنکھ کھل

گئی۔

کچھ لمحے وہ غائب دماغی کے ساتھ پڑی رہی۔ پھر اس کے وجود میں جنبش ہوئی اور اس نے کروٹ بدلی۔ سوال کلاک پر نظر پڑتے ہی اندازہ ہوا اس کی نیند کا دورانیہ زیادہ طویل نہیں۔ یہی کوئی پندرہ بیس منٹ اور ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ اس نے یہ خواب پہلی بار نہیں دیکھا۔ وہ یہ سب پہلے بھی دیکھ چکی ہے۔ کب...؟ شاید شادی سے چند روز قبل یا شادی کی رات مگر وہ یہ خواب پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔

عینا الجھ کر رہ گئی۔

حویلی کے پس منظر میں وہ ہاتھ کس کے تھے؟

❁ ❁ ❁

جس انداز میں ماں جی نے رئیس کو یہ خوش خبری سنائی تھی وہ انداز دیدنی تھا۔ ایک نظر عینا پر ڈال کر وہ ماں جی کا چہرہ تکنے لگا تھا اور عینا ان دونوں کو۔ اس کے کانوں میں ابھی تک نور اور سعد کی آوازیں تھیں۔ خوشی سے معمور چہکتی آوازیں۔

"عینا... میں خالہ بن جاؤں گی۔"

"عینا... کمرے میں میری تصویر لگا لو۔ صبح و شام درشن کرنا۔ میرا بھانجا میرے جیسا ہونا چاہیے۔" اور بہت کچھ۔

رئیس نے اس کی نگاہوں کی تپش کو محسوس کیا۔ سر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرا دیا مگر وہ بدلی سی ہوئی تھی۔ رئیس سے جس گرم جوشی کی توقع وہ کر رہی تھی وہ مفقود تھا۔ وہ اٹھ کر اوپر آ گئی۔ موسم بدل سا گیا تھا۔ بادل گھر کر آ رہے تھے۔ ریلنگ سے لپٹی سفید بیل سے سفید پھول ٹوٹ ٹوٹ کر برس رہے تھے۔ ہواؤں میں مستی اور نمی تھی۔ شاید دور کہیں بادل کھل کر برسے تھے۔ کبھی یہی موسم اسے دیوانہ کر دیا کرتا تھا۔ اب وہ ریلنگ پر دونوں کہنیاں ٹکائے ذرا سا سر اٹھا کر بادلوں کو دیکھتے ہوئے ماں جی اور رئیس کے رویے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جب عقب سے اس نے اسے اپنے حصار میں جکڑ لیا۔

عینا نے پلٹ کر دیکھنا چاہا مگر اس نے پلٹنے نہیں دیا۔

"جان رئیس۔"

"بس رئیس! مت کریں۔" آج اس کی شدتوں سے الجھن ہو رہی تھی۔

"کیوں نہ کروں، اتنی بڑی خوش خبری سنائی ہے۔"

"خوش خبری... آپ خوش ہیں؟"

"کیا نہیں ہونا چاہیے۔" وہ الٹا اسی سے پوچھنے لگا۔

"مجھے لگا آپ خوش نہیں، خوف زدہ ہو گئے ہیں۔" رئیس کی گرفت کمزور پڑ گئی تو وہ آہستگی سے پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔

"ایسا کیوں ہے؟ آپ... ماں جی... بی بی زینب... سب کے رویے میں کوئی چیز ہے جو کھٹکتی ہے۔"

"پاگل... ایسی بات نہیں ہے۔" وہ اسے جھٹلانے لگا۔ "بس یہ مرحلہ بہت دشوار ہے اور تم بہت نازک سی ہو۔"

"اگر کسی کو خوف زدہ ہونا چاہیے تو مجھے ہونا چاہیے۔ آپ... آپ جیسا شخص اس طرح بی ہیو کرے گا تو پریشانی تو ہوگی نا۔" عینا الجھی ہوئی تھی۔

"پاگل لڑکی! میں خوش ہوں بہت خوش۔ ہمارے خاندان کا وارث..."

"وارث..." عینا نے سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "روایتی زمین داروں کی طرح صرف وارث کے بارے میں کیوں سوچ رہے ہیں؟"

"ہمیں تو گڑیا بھی اتنی ہی پیاری ہوگی۔ بس تمہارے جیسی بغیر ناک کے نہیں ہونی چاہیے۔" وہ اس کی چھوٹی سی ناک پر انگلی مارتے ہوئے بولا تو وہ خفا سی ہو گئی۔

"آپ کے جیسی پھیلی ناک بھی نہیں ہوگی۔"

"چلو طے ہو گیا نہ تمہارے جیسی نہ میرے جیسی بلکہ..." بادل زور سے گرجے۔

عینا نے اس کا بازو دبوچ کر ایکدم سر اٹھا کر اوپر

دیکھا۔ بادل برس پڑے تو اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"رئیس! بارش..."

اس کے چہرے پر قوس قزح کے رنگوں کی طرح بکھرتی مسکراہٹ نے اسے مبہوت سا کر دیا۔ یہ اس خوش خبری کا اثر تھا یا اچانک خوبصورت ہو جانے والے موسم کا اعجاز۔ وہ اتنی خوبصورت پہلے کبھی نہیں لگی تھی تب ہی عینا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"چلیں بارش میں نہاتے ہیں۔"

"بیمار ہو جاؤ گی۔" اپنے خوبصورت احساسات سے ہاتھ چھڑا کر اس نے سرزنش کی۔

"گرمیوں کی بارش میں کون بیمار ہوتا ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"اندر چلتے ہیں عینا!"

"اس موسم میں اندر بیٹھیں گے؟" وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹی اور دونوں بازو پھیلا کر چہرہ اوپر اٹھا لیا۔

"آئیں نا' بارش میں نہائیں' شور مچائیں' خوب ہلا گلا کریں۔" بارش اسے ہمیشہ یونہی بے تاب اور پاگل کرتی تھی۔

"عینا! اندر چلو۔" رئیس نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھاما اور نہ۔۔۔ نہ کرنے کے باوجود کھینچتا ہوا اندر لے گیا۔ عینا نے کمرے کے دروازے کے قریب جا کر اپنا بازو چھڑایا پھر وہیں کھڑی ہو کر بارش دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی خفگی جھلکنے لگی تھی۔ پودوں کا سبز رنگ کچھ اور نکھر آیا تھا۔ سبز شاخوں میں چھپے سپید پھول کچھ اور تازہ ہو گئے تھے۔ آسمان پر اک بھیگا پرندہ چھپنے کے لیے بے تاب تھا۔ بارش اس کے پروں کو بے جان کر رہی تھی۔ رئیس خاموش سا جا کر کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ عینا کو اچانک اس ماحول پر اداسی اور خاموشی چھاتی محسوس ہوئی۔ بس تیز ہوتی بارش کی آواز تھی جو اس خاموشی کو توڑ رہی تھی۔

چھپی۔۔۔ چھپا چھپی۔۔۔

پانیوں پہ چھینٹے اڑاتی ہوئی لڑکی۔۔۔

سعد کی شوخ و شریر آواز بارش کے ساتھ تال ملانے لگی۔

"کیا کر رہے ہوں گے سب۔" عینا کے اندر ایکدم اس ماحول کا حصہ بننے کی خواہش ابھری تو وہ رئیس کی طرف پلٹی۔

بارش اب اس کے عقب میں شور مچا رہی تھی۔

"رئیس! مجھے گھر جانا ہے۔" رئیس نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ پھر سے پلٹ کر باہر جھانکنے لگی پھر جیسے خود کلامی کے سے انداز میں گویا ہوئی۔

"وہاں بارش کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ امی کچن میں پکوان تلنے لگتی ہیں۔ ابو ڈھیر سارے آم اٹھا لاتے۔ سعد ہاف جینز پہن کر سڑکوں پر نکل جاتا تھا اور۔۔۔"

"پکوان یہاں بھی تلے جا سکتے ہیں' آموں کے ڈھیر بھی لگ سکتے ہیں' ہاں مگر یہ ہاف جینز۔۔۔" وہ اس کے عقب میں آ کھڑا ہوا تھا۔

عینا خاموش سی ہو گئی پھر اچانک اس نے پوچھا۔

"گاؤں میں بارش کیسی ہوتی ہے؟"

"بارش تو ہر جگہ ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔" اس نے گول مول سا جواب دیا۔ وہ عینا کے گاؤں سے متعلق تجسس اور اشتیاق سے اچھی طرح واقف تھا۔

"رئیس! گاؤں چلیں' میں گاؤں اور حویلی دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"وہاں کچھ بھی خاص نہیں ہے عینا!"

"یونہی کچھ دن رہ کر آ جائیں گے۔ آپ بھی تو جاتے ہیں۔" وہ مصر تھی۔

"جائیں گے' ابھی تو گرمی بہت ہے۔" وہ حسب معمول ٹال گیا۔ عینا چڑ کر باہر نکل آئی۔ اب کے رئیس نے بھی اسے روکا نہیں تھا۔

❁ ❁ ❁

ماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹنا کیا ہے' وہ پہلی بار محسوس کر رہی تھی۔ سکون ہی سکون' سرور ہی سرور وہ کب سے ان کی گود میں سر رکھے دونوں بازو ان کی کمر

کے گرد کسے ایک ہی زاویے پر لیٹی تھی۔ ابھی چند منٹ قبل امی اسے اٹھانے آئیں۔ عینا نے پکڑ کر انہیں بھی بٹھا لیا۔ جتنی خاموشی سے وہ پڑی تھی امی نے گھبرا کر خود ہی اسے جھنجوڑ ڈالا۔

"بس کرو عینا! کب تک یوں پڑی رہو گی۔"

"امی! سکون مل رہا ہے۔"

"شکر ہے اٹھا دیں امی! ورنہ میں اسے اٹھا کر باہر پھینک دوں گی۔ غضب خدا کا جس دن سے آئی ہے سوائے سونے کے اور کوئی کام ہی نہیں۔ ہم بات کرنے کو ترس جاتے ہیں۔ یہ محترمہ اٹھتی ہیں کھاتی ہیں پھر سو جاتی ہیں پھر اٹھتی ہیں کھانا کھاتی ہیں دوبارہ سو جاتی ہیں۔"

نور کفگیر یوں لہرا رہی تھی جیسے دو منٹ میں نہ اٹھی تو اسی سے تواضع کرے گی۔ جس دن سے عینا کی شادی ہوئی تھی امی نے اس کی کتابوں کو الماری میں لاک کر کے اسے کچن میں کھڑا کر دیا تھا۔

"تمہیں کیا معلوم لڑکی! خواہ آپ سسرال میں کتنے ہی عیش کر لیں میکے آنا کتنی بڑی عیاشی ہے۔" اسا مندی سے جمائی لیتے ہوئے گویا ہوئی۔

"اچھا اٹھ جاؤ' اب نہا لو' کپڑے بدلو پھر کچھ کھا لو۔"

امی کی ہدایت پر وہ اٹھ کر کچن میں گھس گئی۔ نہا کر نکلی تو بال بنانے لگی۔ اسے یہاں آئے ہوئے بس چند ان ہی ہوئے تھے اور کن جتنوں سے رئیس نے اسے آنے کی اجازت دی تھی۔ تنگ آ کر وہ لڑ پڑی تھی۔

"وہ میرے اپنے ہیں رئیس! آپ کو کیوں لگتا ہے' میرا خیال تمہیں رکھیں گے۔"

ماں جی اور بی بی زینب کی بے تحاشا توجہ اور محبت نے اسے تقریباً مفلوج کر دیا تھا۔ رئیس تو پھر بھی اکثر گاؤں جاتے تھے مگر یہ دونوں خواتین اسے تنگ کر دیتی تھیں۔ یہ کھاؤ' یہ نہ کھاؤ۔ یہاں بیٹھو' وہاں کھڑی نہ ہو۔۔۔ وہ حقیقتاً وہاں سے فرار کا رستہ ڈھونڈ رہی تھی۔ چیک اپ تو ہو ہی رہا تھا۔ ماں جی نجانے کہاں کہاں سے تعویذ منگوا کر اسے پہناتی رہتیں۔ نجانے

کن کن بزرگوں سے دعا کروائیں۔ اسے لگتا وہ اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے پا رہی۔ جب وہ لڑتے لڑتے رو دی تب رئیس اسے یہاں چھوڑ گیا تھا۔ ان چند دنوں میں صبح و شام ماں جی اور رئیس کے فون آ رہے تھے۔

امی رشک کرتیں۔ عینا چڑ جاتی۔

"مجھے تو لگتا ہے یہ بچہ دنیا کا انوکھا بچہ ہے یا میں دنیا کی پہلی عورت ہوں جو ماں بننے جا رہی ہوں۔"

"شکر کرو عینا! ورنہ وہ عورتیں بھی ہیں جن کے سسرال والے انہیں اس حال میں پوچھتے تک نہیں۔" امی ناراض تھیں۔

"امی! زیادہ میٹھا بھی کبھی کبھی زہر ہو جاتا ہے۔"

"تم ناشکری ہو۔" وہ صاف کہتیں۔

"عینا! اب آ بھی جاؤ۔" سعد شور مچا رہا تھا۔ وہ منہ اوڑھ کر باہر آ گئی۔

"تم بہت سست ہوتی جا رہی ہو عینا آپی!" سعد نے دیکھتے ہی شکوہ کیا۔ سب ٹیبل پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ نور کھانا لگا رہی تھی۔

"میری فیورٹ ڈشز۔" وہ میتھو دیکھ کر خوش ہو گئی۔ اس نے سب سے پہلے مسالا بھری مچھلی کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔

"رئیس کا فون آیا تھا' وہ کل تمہیں لینے آ رہا ہے۔" امی نے بتایا تو اس کا ہاتھ درمیان میں ہی رک گیا۔

"امی! آپ نے بتایا نہیں۔"

"میں نے کہا تھا کہ تمہیں تھوڑے دن اور رہنے دے مگر وہ نہیں مانا بلکہ میں نے تمہاری ساس سے بھی کہا تھا کہ ہمارے ہاں پہلا بچہ میکے میں ہوتا ہے۔ مگر وہ لوگ نہیں مانتے۔ اب خود بتاؤ' میں اور کتنا اصرار کروں۔" وہ بے چارگی سے گویا ہوئیں۔

عینا کا کھانے سے ہی دل اچاٹ ہو گیا پھر سے ان ہی پابندیوں میں جانے کے خیال نے اسے پریشان سا کر دیا تھا۔ اب تو رئیس کی چاہتوں اور بے تابیوں سے بھی تسکین نہیں ہوتی تھی۔ یوں لگتا یہ ساری چاہتیں

اس کے لیے نہیں بلکہ بچے کے لیے ہیں۔

"اچھا کھانا تو کھاؤ۔" امی نے کہا۔ "تمہیں رئیس سے کہوں گی وہ جلدی ہی تمہیں ملانے لاتا رہے گا۔"

"میری آزادی کا آخری دن۔" عینا نے سعد اور نور کو دیکھا۔

"تم نے سارے دن سو سو کر گزارے ہیں۔" نور سخت خفا تھی۔

اسے لینے رئیس ہی آیا تھا۔ سب سے مل کر گاڑی میں بیٹھی تو خفا سے لہجے میں پوچھنے لگا۔

"تم نے میرے بغیر اتنے دن کیسے گزار لیے؟"

"بس۔" وہ ہنس دی۔

"آئندہ لینا تو نام رہنے گا۔ ساتھ لاؤں گا اور ملا کر واپس لے جاؤں گا۔"

"کوئی زبردستی ہے؟"

"بالکل ہے۔" وہ آرام سے بولا تھا۔ رعونت بھرے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔

یونہی دن مہینوں میں ڈھلتے گئے۔ جب کائنات پر بہار نے اپنے اولین قدم جمائے تو اس کے آنگن میں پہلا پھول کھلا تھا۔ وہ بیٹے کی ماں بنی تھی۔

❋ ❋ ❋

وہ بال بناتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں منعکس ہوتا رئیس کا عکس دیکھ رہی تھی۔ وہ بیڈ پر دراز کہنی کے بل ایک ہاتھ سے سر کو سہارا دیے بچے کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ کبھی اس کے ننھے منے پاؤں چھوتا کبھی کومل ہاتھوں کو لبوں سے لگاتا تو کبھی جھک کر اس کی ننھی سی ناک چوم لیتا۔ بڑا مگن سا انداز تھا۔ ایک عجیب سی سرشاری و سرخوشی اس کے وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ گھر سے خواہ کتنا ہی ضروری کام کیوں نہ ہوتا وہ روز ہی واپس آنے لگا تھا۔ ڈلیوری کے وقت جو حالت ماں جی اور رئیس کی تھی وہ سب کے لیے اچنبھے کا باعث تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے جان سولی پر لٹکی ہو اور جب ڈاکٹر نے آکر ماں اور بچے کی خیریت کی اطلاع دی تو جس طرح وہ سجدے میں گئے وہ بھی قابل

حیرت ہی تھا۔ حالانکہ عینا کے اپنے گھر والے وہیں موجود تھے۔

وہ اٹھ کر رئیس کے قریب آبیٹھی۔

رئیس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ مسکرایا اور پھر سے بچے پر جھک گیا۔

"آپ کو تو اب بچے کے سوا کچھ اور سوجھتا ہی نہیں ہے۔" وہ خفا سی ہو کر اٹھنے کو تھی جب رئیس نے اس کی کلائی پکڑ کر کھینچ لیا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں جاناں!"

"ایسی ہی بات ہے۔"

"بس یار! مجھے یقین نہیں ہوتا یہ جیتا جاگتا وجود میرا ہے۔" رئیس کے لہجے میں بے یقینی سی تھی۔

"حد ہے دیوانگی کی رئیس! اس میں بے یقینی کی کیا بات ہے۔ آپ کے سامنے ہی تو ہے۔ اب دیں اسے مجھے فیڈ کروانا ہے۔"

عینا نے بچے کو گود میں بھر لیا تو رئیس نے سیدھے ہو کر دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ لیے۔ وہ عین اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ سیاہ بال بڑھ کر کندھوں سے نیچے آگئے تھے۔ میک اپ سے مبرا شفاف چہرہ پتا نہیں وہ مزید خوبصورت ہوگئی تھی یا اسے لگنے لگی تھی یا یہ ممتا کا نور تھا جو اس کے فربہی مائل وجود کو بھی ایک الوہی روپ دیے رہا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے بکھرے بال ہاتھ سے سمیٹتے ہوئے بولا۔

"تمہارا بدن نکھرتی جا رہی ہو۔"

"موٹی ہوگئی ہوں بلکہ پنج سی لگنے لگی ہوں۔ آپ مجھے بنائیں مت۔" وہ برجستگی سے گویا ہوئی۔

رئیس کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"پاگل۔۔۔ کبھی خود کو میری نظر سے دیکھو۔"

"آپ کو مجھے دیکھنے کی فرصت ہے، ساری محبتیں تو یہ لے گیا ہے۔" وہ شکوہ کناں لہجے میں گویا ہوئی۔

"بیٹے سے رقابت۔"

"جی نہیں۔"

"پاگل! یہ تحفہ بھی تو تم ہی نے مجھے دیا ہے۔"

وہ جھک کر بچے کو دیکھنے لگی۔ ماں جی کہتی تھیں کہ بچہ ہو بہو رئیس کی تصویر ہے۔

"سنو ہم کیا گفٹ لو گی؟۔"

"میں نے کیا لینا ہے۔"

"پھر بھی۔"

"سب کچھ تو مل گیا رئیس! اتنا اچھا سسرال محبت کرنے والا شوہر اور اولاد۔۔۔ اب اور مجھے کیا چاہیے۔" اس کے لہجے میں سکون ہی سکون تھا۔

"پھر بھی کچھ تو مانگو کوئی ڈائمنڈ سیٹ لیا۔"

عینا کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس نے گردن موڑ کر رئیس کو دیکھا۔

"جو مانگوں گی دیں گے؟۔"

"بس میں ہوا تو ضرور۔"

"آپ کے بس میں ہے۔ پہلے وعدہ کریں جو مانگوں گی دیں گے۔"

"یہ رئیس کی زبان ہے جناب! کہو۔" وہ اپنے مخصوص لہجے میں گویا ہوا اور اس کے بعد وہ جانتی تھی' وہ اپنی کہی بات سے ایک انچ نہیں ہٹے گا۔ تب ہی آہستگی سے گویا ہوئی۔

"مجھے گاؤں لے جائیں۔"

ساتھ ہی اس کے چہرے کے تاثرات جانچے۔ وہاں جامد خاموشی چھا گئی تھی۔ ایک طویل سانس لے کر وہ ذرا پیچھے کھسکا اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر اسے دیکھنے لگا۔ عینا کو اس کی نگاہوں سے الجھن ہونے لگی تھی کہ وہ پوچھنے لگا۔

"کیوں جانا چاہتی ہو؟"

"آپ کیوں نہیں لے جانا چاہتے؟" وہ الٹا پوچھنے لگی۔

"عینا۔۔۔"

"آپ وعدہ کر چکے ہیں۔" وہ تیزی سے گویا ہوئی۔ رئیس لب بھینچ کر اسے دیکھنے لگا پھر ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ تیاری کرلو ہم گاؤں جائیں گے۔"

❊ ❊ ❊

اسے گاؤں آئے تیسرا دن تھا' ماں جی بہت پریشان ہوئیں۔ انہوں نے عینا اور رئیس کو روکنے کی بہت کوشش بھی کی تھی۔ رئیس نے انہیں کیا کہہ کر خاموش کروایا' عینا نہیں جانتی تھی۔ بہرحال وہ لوگ گاؤں آگئے تھے۔ رئیس نے ماں جی کے کہنے پر دوبارہ دیگیں پکوا کر تقسیم کروائی تھیں۔ وہ حلوائی ڈیوڑھی میں اپنے سامان سمیت آبیٹھا تھا۔ تین دن مٹھائی بنتی رہی تھی۔ وہ بھی کبھی کبھار یونہی بی بی زینب کے پاس آبیٹھتی۔ آنے والی مزارعین عورتوں اور بچیوں میں مٹھائی بانٹا کرتی تھی اور بہت غور سے انہیں دیکھتی مگر بی بی زینب اسے زیادہ دیر وہاں بیٹھنے نہیں دیتی تھیں۔ فوراً کسی نہ کسی بہانے اٹھا دیتیں۔ ماں جی کے پاس عورتوں کا تانتا بندھا رہتا۔ وہاں بھی ماں جی فوراً احمد کو اس کی گود میں دے کر گویا حکم دیتیں "جاؤ' اسے سلادو۔" جیسے اسے وہاں سے ہٹانا چاہتی ہوں۔ عینا نے محسوس کیا کہ وہ اس کا عورتوں میں زیادہ بیٹھنا پسند نہیں کرتیں اور احمد پر تو کسی کا سایہ بھی نہیں پڑنے دینا چاہتی تھیں۔ شام کو باقاعدگی سے ان کی نظر اتروائیں۔ وہ یہاں بھی بس اپنے کمرے میں محصور ہو کر رہ گئی تھی۔ رئیس الگ سارا دن اپنے کاموں میں مصروف ہوتے تھے۔

"مجبوری ہے نا' گاؤں آکر فارغ نہیں بیٹھ سکتے۔" اس کے اعتراض کے جواب میں رئیس نے اپنی مجبوری بیان کی تھی۔ عینا کی سمجھ میں نہ آتا' وہ یہاں کیوں آئی تھی۔ کیا چیز تھی جو اسے اس طرف کھینچتی تھی۔ ان کھلے کھلے کمروں' گول برآمدوں اور بے حد وسیع و عریض صحن جس میں بہت پھیلے ہوئے آم اور جامن کے درخت گھنی چھایا کیے رہتے تھے۔ وہاں بچھی چارپائیاں' ان کے درمیان پڑا حقہ' کونے میں لگا تنور جسے شیدو سرشام دہکا کر روٹیاں پکانے بیٹھ جاتی تھی۔ یہاں آتے جاتے لوگ' حویلی کا لکڑی کا بڑا سا گیٹ پورا دن کھلا رہتا۔ کچھ بھی تو ایسا نہ تھا جو اسے اپنی طرف کھینچتا۔

"پھر میں یہاں آئی کیوں؟" لائٹ چلی گئی تھی۔

اس نے اٹھ کر کھڑکیاں کھول دیں۔ دوپہر کے ڈھائی بجے تھے۔ صحن پورے کا پورا دھوپ سے بھرا تھا۔ ماں جی اور بی بی زینب درختوں کی چھایا میں آبیٹھی تھیں۔ بی بی زینب کی گود میں احمد تھا۔ جیسے دو تو اترے پنکھی جھل رہی تھیں۔ دوسری پنکھی نوراں کے ہاتھ میں تھی جو پائنتی پر ٹکی ماں جی کو ہوا دے رہی تھی۔ اپریل کا اختتام تھا۔ آم کے درخت بور سے بھرے تھے جن میں چھپی پیاسی کوئل بس کبھی کبھی ہی کوکتی تھی مگر اس سنسان اور گرم دوپہر میں چڑیوں کی چہچہاہٹیں ہلکے ہلکے شگاف ڈال رہی تھیں۔

عینا کی نگاہ اس چھوٹے سے گھر پر جا رکی جس کی ایک دیوار کے ساتھ کلیوں کا جھنڈ پھیل کر دور تک چلا گیا تھا جس پر اتنی سفید کلیاں کھلتی تھیں کہ اس کا سبز رنگ ماند پڑ جاتا تھا۔ یہ گھر بظاہر تو اسی گھر کا حصہ معلوم ہوتا تھا مگر یہ رئیس کی چاچی کا گھر تھا۔ اس کے چچا کا کئی برس قبل انتقال ہو چکا تھا۔ بیٹا کوئی تھا نہیں' بس دو بیٹیاں تھیں۔ دونوں شادی شدہ۔ چاچی اس سے ملنے آئی تھیں۔ ساڑھے چار فٹ کے ننھے سے وجود کو دیکھتے ہی احساس ہوا کہ اس نے ساری عمر دکھ کی فصل ہی کاٹی ہے۔ اتنی آہستگی سے بولتی تھیں کہ عینا کو ان کا کوئی جملہ سمجھ میں نہیں آتا تھا بلکہ وہ بولی ہی کہاں تھیں۔ بمشکل پانچ منٹ بیٹھیں۔ احمد کو ہزار روپیہ دیا۔ دعا دی اور چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی ماں جی نے جھپٹ کر احمد کی ننھی سی مٹھی سے وہ نوٹ کھینچا۔ احمد پر سے وار کر بی بی زینب کو تھما دیا۔

عینا ہکا بکا رہ گئی۔

لائٹ آگئی تھی۔ وہ کھڑکیاں بند کر کے ہٹ گئی۔ یہاں دوپہریں کچھ زیادہ ہی طویل ہوتی تھیں۔ کسی طرح گزرنے میں نہ آتیں۔ تب ہی دروازہ کھلا' بی بی زینب احمد کو لیے اندر آگئیں۔

"اسے بھوک لگی ہے۔"

عینا نے احمد کو گود میں لے لیا۔

زینب واپس چلی گئی تھیں۔ وہ احمد کو فیڈ کرواتے ہوئے اس سے باتیں کرتی رہی۔ وہ سو گیا تو اسے کاٹ میں لٹا دیا۔ خود کرسی پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگی۔

"کچھ کتابیں ہی لے آتی تو وقت کتنا آسان ہو جاتا۔"

اس نے آنکھیں موند کر سر پشت سے ٹکا دیا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ یہی سمجھی بی بی زینب احمد کو لینے آگئی ہیں' تبھی قدرے اکتائے ہوئے انداز میں گویا ہوئی تھی۔

"بی بی! وہ سو گیا ہے' اسے یہیں رہنے دیں۔"

آنے والا اس پر جھک گیا۔

"اور میں۔۔۔ میں کہاں رہوں؟"

عینا نے پٹ سے آنکھیں کھولیں۔

"آپ۔۔۔ اس وقت۔۔۔"

"ہونہی' مجھے لگا تم بور ہو رہی ہو' بس ہر کام ادھورا چھوڑ کر چلا آیا۔"

"بور تو میں واقعی ہو رہی تھی۔ یہاں وقت بالکل نہیں کٹتا۔"

"تو واپس چلیں؟۔"

"واپس۔۔۔" عینا نے کچھ لمحے سوچا پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "جلدی کیا ہے۔" وہ اٹھنے لگی تھی مگر رئیس نے کرسی کے دائیں بائیں ہاتھ رکھ لیے اور شریر سے لہجے میں گویا ہوا۔

"کوئی جلدی نہیں۔"

"ارنہوں۔" عینا نے سرزنش کی۔ تبھی نگاہ بھٹک کر دروازے تک گئی۔ وہ جو کوئی بھی تھی' کھلے دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی انہیں گھور رہی تھی۔ اس کی نگاہیں ایک پل کو عینا کی نگاہوں سے ٹکرائیں تو اسے جھرجھری سی آگئی۔ اس نے بے اختیار رئیس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دھکیلا تھا۔ رئیس کو اس کے چہرے کے تاثرات عجیب سے لگے۔ اس کی نظروں کے زاویے پر بے اختیار پلٹ کر دیکھا' وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

"کیا ہوا عینا!"

"وہاں۔۔۔ رئیس۔۔۔ وہاں دروازے پر کوئی تھا۔"

"کون؟"

عینا نے جواب نہیں دیا۔ اٹھ کر دروازے تک آئی اور باہر جھانکنے لگی۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔

"کون تھا بھئی۔۔۔ کوئی ملازمہ ہوگی۔" رئیس اس کے پیچھے چلا آیا۔

"ملازمہ۔۔۔ نہیں' ملازمہ تو نہیں تھی۔"

"اس بھری دوپہر میں اور کون ہو سکتا ہے؟۔" وہ سرسری انداز میں بولا مگر وہ سرسری نہ لے سکی۔

رات کو سونے کے لئے لیٹی تو وہ چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ اگرچہ اس نے ایک پل کو ہی دیکھا تھا مگر وہ اسے بڑی وضاحت سے سوچ سکتی تھی۔۔۔ بے حد گوری رنگت' جاذب نظر نقوش اور ان سے چھلکتا دکھ' پریشانی' تکلیف اور۔۔۔ کچھ اور بھی۔۔۔ کچھ ایسا جو عینا محسوس تو کر رہی تھی مگر سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

اس نے باتوں ہی باتوں میں ماں جی سے بھی پوچھا تھا کہ دوپہر میں کوئی ان سے ملنے آیا تھا مگر انہوں نے یہی کہا۔

"اتنی دوپہر میں کون آئے گا۔"

"تو وہ کون تھی اور اتنی اچانک کیوں چلی گئی؟۔"

❀ ❀ ❀

"نوراں! ایک بات پوچھوں تم سے؟۔"

وہ عینا کے پاؤں دبا رہی تھی۔ جب عینا پاؤں سمیٹ کر اٹھ بیٹھی۔

"پوچھیں باجی!"

"سچ سچ بتاؤ گی؟۔"

"جھوٹ کیوں بولوں گی۔"

"یہ چاچی وغیرہ کے ساتھ کوئی جھگڑا ہے رئیس لوگوں کا؟۔"

اس کے اچانک سوال پر نوراں گڑبڑا سی گئی۔

"نہیں۔۔۔ نہیں تو۔"

"نوراں!" عینا کی تنبیہی آواز پر وہ سنبھل گئی۔

"جھگڑا کوئی نہیں ہے' بس چاچی خود ہی کسی سے نہیں ملتی۔"

"اس کی بیٹیاں کہاں بیاہی ہیں؟۔"

"ایک تو ساہیوال میں ہے اور دوسری باجی خدیجہ۔۔۔" وہ ایکدم چپ ہو کر یوں پلٹ کر دیکھنے لگی جیسے کوئی ان کی بات سن نہ رہا ہو۔

"کوئی نہیں ہے نوراں! تم کیا بتا رہی تھیں خدیجہ کے بارے میں؟۔"

"کچھ نہیں بتا رہی نور باجی آپ مجھ سے پوچھیں بھی ناں۔" وہ کنی کترا گئی۔

عینا کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی پھر "ٹھیک ہے" کہہ کر لیٹ گئی۔ مگر ذہن الجھ گیا تھا۔ بہت سی روایتی کہانیاں ذہن میں چکرانے لگی تھیں۔

"اچھا یہ تو بتاؤ خدیجہ یہیں رہتی ہے؟۔" اس کا متجسس ذہن ادھر ادھر کے نکتے ڈھونڈ رہا تھا۔

"جی۔" نوراں نے مختصراً کہا۔

"اس کا شوہر؟۔"

"دونوں کی بنی نہیں۔ اب میں چلتی ہوں۔ مجھے بڑی بی بی نے بلایا تھا۔" وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ اور خود وہ نجانے سوچ کی کن اتھاہ گہرائیوں میں اتر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ تنور میں روٹیاں لگنے کے عمل کو بے حد دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ مائی کا جھریوں زدہ ہاتھ روٹی کو کئی کئی بل دے جاتا مگر ہے مجال روٹی ٹوٹی ہو اور جب وہ روٹی لگانے کو جھکتی تو عینا کا دل دھک سے رہ جاتا۔ اسے لگتا مائی کا دھان پان سا وجود پورے کا پورا دہکتے تنور میں جا گرے گا۔ مگر وہ بڑی سرعت سے روٹی لگا کر سیدھی ہو جاتی۔ فضا میں گرم روٹی کی سوندھی سوندھی مہک پھیلی ہوئی تھی۔

"باجی عینا! آپ کا ٹیلی فون ہے۔" نوراں بھاگی آئی تھی۔

"احمد اٹھ گیا؟"

"نہیں۔"

"تم اس کے پاس جاؤ۔" وہ اسے کہہ کر اندر چلی گئی۔ فون نور کا تھا۔

"یہ تم گاؤں جا کر کہاں بیٹھ گئی ہو؟۔" وہ چھوٹتے ہی پوچھنے لگی۔

"کیوں میرا گاؤں آنا منع ہے؟۔" عینا ہنسی۔

"گاؤں کیسا ہے؟" نور کے لہجے میں اشتیاق در آیا۔

"جیسے سارے گاؤں ہوتے ہیں۔"

"ہاں ہم نے تو جیسے سارے گاؤں دیکھے ہیں۔"

"سنو! گاؤں کی جو سب سے الھڑ اور خوبصورت مٹیار ہے اسے میرا سلام کہنا۔" ریسیور اب سعد کے ہاتھ میں تھا۔

"یہ سید نور کی فلموں کا گاؤں نہیں ہے۔" یونہی نمونی چھوٹی باتوں میں کال لمبی ہو گئی تھی۔

"باجی باجی۔" نوراں ہراساں سی بھاگی آئی تھی۔

"کیا ہے؟" اسے یوں پریشان دیکھ کر اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھا۔

"احمد کاکا کمرے میں نہیں ہے۔"

"کیا مطلب کمرے میں نہیں ہے۔" عینا نے الجھ کر پوچھا۔

"میں آپ کو ٹیلی فون کا بتانے آئی تھی۔ واپس گئی تو کاکا کاٹ میں نہیں تھا۔" وہ لرز رہی تھی۔

"ماں جی کے پاس دیکھو' بی بی زینب لے گئی ہوں گی۔"

"ادھر بھی نہیں ہے۔ بڑی بی بی تو میری کھال ادھیڑ دیں گی۔" وہ رونے لگی۔

"نور میں تمہیں بعد میں فون کرتی ہوں۔"

ریسیور رکھ کر وہ برق رفتاری سے کمرے میں آئی۔ کمرہ خالی تھا۔ آن واحد میں پورے گھر میں کہرام مچ گیا تھا۔ عینا کی حالت بری تھی مگر وہ خود کو سنبھال رہی تھی۔

"گھر کے اندر سے اتنی جلدی کون لے جا سکتا ہے۔ میں نے کہا تھا تم احمد کے پاس جاؤ تو تم وہاں کہاں رہی تھیں۔" وہ نوراں پر الٹ پڑی۔

"میں تو بس تھوڑی دیر کو۔" وہ منمنا کر رہ گئی۔

"ارے کوئی رئیس کو خبر کرو۔" ماں جی نے دہائی دی۔

"چوہدرائن! ذرا رک جائیں۔" بی بی زینب کی مدھم آواز ابھری تھی۔

"رک جاؤں۔ میری جان جا رہی ہے۔"

"پہلے ادھر دیکھ آئیں۔" بی بی زینب کی آواز کچھ اور دھیمی ہوئی۔

ماں جی نے چونک کر زینب کی طرف دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اتنی جلدی کوئی حویلی سے باہر نہیں جا سکتا مگر حویلی کے اندر تو۔"

"تم خود جاؤ۔" ماں جی نے کہا تھا۔

عینا الجھ کر دونوں کا چہرہ دیکھنے لگی۔

اس سے قبل کہ زینب باہر نکلتی۔ چاچی اندر آئیں اور ان کے بازوؤں میں احمد تھا۔ عینا نے جھپٹ کر احمد کو ان سے لے لیا۔

"چاچی! یہ آپ کے پاس۔"

"وہ خدیجہ۔" چاچی نے شرمندہ شرمندہ سی نگاہ ماں جی پر ڈالی۔

"بس ٹھیک ہے۔ شام کو رئیس آئے گا تو بات کریں گے۔"

ماں جی نے بے حد رکھائی سے کہا۔

چاچی سر جھکا کر باہر نکل گئی تھیں۔

"ماں جی! احمد' چاچی کے پاس کیوں تھا اور خدیجہ۔" عینا نے پوچھنا چاہا۔ مگر وہ درمیان میں ہی بول اٹھیں۔

"احمد کو میرے پاس چھوڑ جاؤ اور تم اپنے کمرے میں جاؤ۔"

عینا کو مزید کچھ پوچھنے کی جرات نہ ہوئی تھی۔ مگر رات کو وہ رئیس سے ذکر کیے بنا نہ رہ سکی۔ وہ خاصی دیر سے لوٹا تھا بلکہ اس کے پاس خاصی دیر سے آیا تھا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ رئیس کافی دیر پہلے ہی واپس آ چکا تھا۔

"اتنی دیر سے کہاں تھے آپ؟"

"ماں جی کے پاس تھا۔" اس نے لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

"تھک گئے ہیں؟۔"

"ہاں۔" اس نے کہا۔ پھر عینا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ماتھے پر رکھ لیا۔ "سر تو دبا دو یار۔"

عینا دھیرے دھیرے سر دبانے لگی۔

"بہت مصروف رہنے لگے ہیں۔ احمد بھی پوچھ رہا تھا۔" عینا نے ہلکا پھلکا لہجہ اختیار کیا۔

"اچھا' وہ بولنے لگا ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"جتنا آپ مصروف رہنے لگے ہیں۔ وہ چلنے بھی لگے گا اور آپ کو پتا بھی نہیں چلے گا۔"

"ایسی بھی بات نہیں محترمہ۔" اس نے ماتھے سے عینا کا ہاتھ ہٹا کر اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا۔ مجھے احساس ہے کہ میں تمہیں وقت نہیں دے پا رہا مگر یہ کام کے دن ہیں۔ نگرانی تو کرنا پڑتی ہے۔

"جانتی ہوں۔ اسی لیے تو شکوہ نہیں کرتی۔"

"ابھی بھی شکوہ نہیں کرتی ہو؟۔" رئیس نے گھورا تو وہ بے اختیار ہنس دی۔

"بس یونہی ہنستی رہا کرو۔" وہ بے اختیار گویا ہوا تو اس کی ہنسی اک مدھم سی مسکان میں ڈھل گئی۔

"اچھا ایک بات تو بتائیں۔"

"پوچھو۔"

"یہ خدیجہ کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟۔"

"کیوں؟" رئیس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"آپ کو پتا ہے آج وہ۔"

"ہاں مجھے ماں جی نے بتایا ہے۔" وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

"لیکن اس نے ایسا کیوں کیا؟؟"

"بس اس کے حالات ایسے ہیں کچھ مینٹلی ڈسٹرب ہے اس لیے مگر تم... یہ چند گھڑیاں ملی ہیں انہیں بھی یونہی ضائع کرو گی۔" رئیس کا لہجہ یک لخت بدل گیا تھا۔

"مگر رئیس؟۔"

رئیس نے اسے آگے بولنے نہیں دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

کسی نے بے حد آہستگی اور احتیاط سے عینا کے پہلو سے احمد کو اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ عینا ابھی نیم غنودگی میں تھی۔ تب ہی ایک دم گردن گھما کر دیکھنے لگی۔ اور دوسرے ہی لمحے تیر کی طرح اٹھ بیٹھی۔

"تم!!"

وہ جو احمد پر جھکی ہوئی تھی۔ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"تم کون ہو؟" عینا نے تیزی سے احمد کو اپنی گود میں سمیٹا تھا۔

اس کے چہرے سے گھبراہٹ بالکل غائب ہو گئی تھی۔ اب وہ ٹکٹکی باندھے عینا کو دیکھ رہی تھی اور عینا اس کے چہرے پر وہ سارے تاثرات دیکھ سکتی تھی' دکھ' کھو دینے کا احساس' تکلیف ہر تاثر اس کی گہری سیاہ آنکھوں سے مترشح تھا اور... اور وہ احساس جسے عینا سمجھ نہ پائی تھی۔ ان سیاہ نگینوں سے چھلکتی بے تحاشا نفرت تھی۔

عینا خوفزدہ سی ہو کر پیچھے کھسک گئی۔

"تم... تم خدیجہ ہو؟!"

خدیجہ کی آنکھوں سے وہ سارے تاثرات یکلخت غائب ہو گئے۔ جتنی سرعت سے وہ سیاہ چمکتے پانیوں میں ڈوبے تھے اور وہاں اب بس اک ہی تاثر ہلکورے لے رہا تھا' بے چارگی اور بے بسی کا۔ پھر اس کے ہاتھ حرکت میں آئے اور اس کے سامنے پھیل گئے۔

عینا ششدر سی رہ گئی۔

وہ اب بھی ہاتھ پھیلائے امید و بیم کی کیفیت میں ڈولی منتظر تھی۔

عینا چاہتی تھی بچے کو سینے میں بھینچ کر بھاگ جائے۔ کسی کو مدد کے لیے پکارے یا اس عورت کو یہاں سے چلے جانے کے لیے کہے۔ مگر کچھ ایسا تھا جو اسے روک رہا تھا۔ اب وہ اس عورت کا چہرہ نہیں اس کے پھیلے ہاتھ دیکھ رہی تھی۔

پھر اس کے وجود میں جنبش ہوئی۔ وہ آگے کو جھکی اور نہ چاہتے ہوئے نجانے کیوں بے حد آہستگی کے ساتھ ننھے منے وجود کو خدیجہ کے بازوؤں میں ڈال دیا۔

خدیجہ نے بے حد بے یقینی سے پہلے اسے پھر بچے کو دیکھا۔ دوسرے پل وہ دیوانہ وار بچے پر جھکی اسے چوم رہی تھی' سینے سے لگا رہی تھی اور زور زور سے روتے ہوئے نجانے کس کس کو پکار رہی تھی۔

"علی... تو تیمور... عاشی۔"

اس کی آواز میں ٹوٹتے کانچ کی چھنک تھی۔ ہر پکار گویا عرش سے ٹکراتی تھی۔ عینا سرتاپا کانپ کر رہ گئی۔ احمد جاگ گیا اور اب اس کی گرفت میں رونے لگا تھا۔ مگر وہ گویا اس کی آواز سن ہی نہ رہی تھی۔

عینا تیزی سے بیڈ سے نیچے اتری۔ اس کی گرفت سے احمد کو چھڑانا چاہا مگر اس نے تیزی سے اس کا ہاتھ جھٹکا اور احمد کو سینے سے بھینچ کر کھڑی ہو گئی۔

"تمہیں نہیں دوں گی۔ یہ میرا ہے۔"

عینا کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ اضطراری انداز میں کھڑی ہو گئی۔

"خدیجہ! اسے مجھے دے دو۔ یہ میرا بچہ ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ تم سب کچھ مجھ سے چھین لینا چاہتی ہو۔ پہلے تم نے رئیس کو چھینا۔ اب میرا بچہ لینا چاہتی ہو۔" وہ حلق کے بل چیخی تھی۔

عینا اس کے کسی جملے پر غور کرنے کے قابل نہ تھی۔ وہ صرف روتے ہوئے بچے کو اس سے واپس لینا چاہتی تھی۔ مگر وہ عورت دیوانگی کی حدوں کو چھو رہی تھی۔

"کیا ہوا عینا۔ کون ہے؟۔" ماں جی اور بی بی زینب سراسیمہ سی اندر داخل ہوئیں اور اندر کی صورت حال دیکھ کر چکرا گئیں۔

"خدیجہ! تم یہاں کیا کر رہی ہو۔" ماں جی کی آواز میں ناگواری اور تحکم تھا۔

خدیجہ انہیں دیکھ کر سہم گئی۔

"نہیں' یہ میرا ہے تائی؟۔"

"بکواس مت کرو۔ بی بی بچہ لے لو اس سے۔"

بی بی زینب نے قدم آگے بڑھایا۔ خدیجہ تڑپ کر ہوا سے جا لگی۔

"خبردار بی بی۔ اگر قدم آگے بڑھایا تو یہ میں کسی کو نہیں دوں گی۔" اس نے بچے کو کچھ اور بھینچ لیا جو رو رو کر بے حال ہو رہا تھا۔

"اپنے تین کھا گئی اب اسے تو بخش دے ڈائن۔"

بی بی زینب کا بھرپور تھپڑ اس کے چہرے پر پڑا تھا۔

"میں نے کھائے ہیں۔" خدیجہ نے بے یقینی سے دیکھا۔ اس کا چہرہ گھوم گیا تھا مگر گرفت اب بھی کمزور نہ پڑی۔

"میں ڈائن ہوں۔ نو مہینے انہیں اپنی کوکھ میں سنبھالا تھا میں نے۔ اپنے خون جگر سے سینچا تھا۔ تکلیف سہی تھی میں نے اور تم کہتی ہو میں نے کھائے ہیں میں ڈائن ہوں تم لوگ ڈائنیں ہو۔ رئیس کو چھین لیا۔ مجھ پر سوکن لے آئیں۔ یہ ڈائن ہے۔ تم ڈائن... میری قسمت ڈائن ہے۔"

بی بی زینب اس سے بچہ چھین رہی تھیں اور وہ اسے دھکے دے رہی تھی۔ چیخ رہی تھی اور عینا کے اندر کہیں یہ احساس ہمیشہ سے موجود تھا۔ ماں جی کا گاؤں کے نام سے کترانا' رئیس کا ہمیشہ ٹال جانا اسے بہت پہلے سے شک میں مبتلا کر گیا تھا۔ پھر بھی ایک پل کو لگا قدموں تلے زمین نہیں ہے۔ لیکن احمد کی آواز نے اسے زیادہ دیر بے اوسان نہیں رہنے دیا۔ اس نے ایکدم آگے بڑھ کر بی بی زینب کا بازو پکڑ کر پیچھے دھکیلا۔

"بس کریں بی بی!" اس کی آواز میں بلا کی سختی تھی۔

پھر وہ خدیجہ کی طرف پلٹی۔

"خدیجہ! یہ بچہ تمہارا ہے' اسے تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔"

خدیجہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"تم سچ کہتی ہو؟"

"ہاں۔" اس کی آواز میں بلا کی نرمی تھی۔

"لیکن دیکھو وہ رو رہا ہے اس کی آواز بیٹھ رہی ہے اگر اسی طرح روتا رہا تو خدانخواستہ اسے بھی کچھ۔"

"نہیں۔" خدیجہ لرز گئی اس نے گرفت ڈھیلی کر کے بچے کو دیکھا اور عینا کا جی چاہا بچے کو اس کی گود سے جھپٹ لے جو اب باقاعدہ ہچکیاں لے رہا تھا وہ خود نہیں جانتی تھی وہ کیوں اتنے صبر سے کام لے رہی

ہے۔

"اسے بھوک بھی لگ رہی ہے۔ میں اسے تمہیں دے دوں گی۔ مگر ابھی اسے مجھے دے دو" میں اسے دودھ پلا دوں۔

"اگر یہ میرا ہے تو دودھ تم کیوں پلاؤ گی؟" خدیجہ نے حیرت و معصومیت سے پوچھا اور وہیں دیوار کے ساتھ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

"میں پلاؤں گی۔" اب وہ اپنی قمیص اٹھا رہی تھی۔

اس عورت کی بے بسی پر عینا کی آنکھیں ایک دم بھر آئیں۔ اس نے بیٹھ کر نرمی سے خدیجہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"میں نے وعدہ کیا ہے نا تمہیں دوں گی۔ ابھی اسے مجھے دے دو۔"

اس کے لہجے کی نرمی کا اعجاز تھا کہ خدیجہ نے ایک معمول کے سے انداز میں بچہ اسے تھما دیا تھا۔ عینا نے وہاں سے اٹھنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ بلکہ وہیں اس کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔ ماں جی اور بابا جی دم بخود تھیں۔

خدیجہ نے دونوں ہاتھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے اسے دیکھا۔

منظر تو مکمل تھا ماں اور بچہ۔

سفاک حقیقت سامنے تھی۔ اس نے بے یقینی سے اپنی خالی گود کو دیکھا تو لبوں سی چیخ سی نکل گئی۔ سب کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ جس سراب کے پیچھے وہ بھاگی تھی' حقیقت بن کر اس کے سامنے تھی۔ وہ اٹھی اور بھاگتے ہوئے باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

"میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔"

شرمندہ شرمندہ سا رئیس اس کے سامنے تھا اور وہ گم صم تھی۔ بہت روئی تھی وہ بہت چیخی چلائی تھی مگر تماشہ وہ شخص سامنے آیا تو چپ تھی۔ بس آنکھوں کی سرخی گواہ تھی کہ وہ کہاں تک ٹوٹ کر بکھری ہے۔ ماں جی نے بھی معذرت کی تھی۔ مگر اب فائدہ؟ عینا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کس کے پاس جا کر روئے۔ تایا جی کے پاس جنہوں نے کہا تھا۔ ہم نے تمہارے لیے بہترین شخص کا انتخاب کیا ہے۔ یا امی ابو کے پاس جنہوں نے ڈھنگ سے چھان بین کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی اور یہ۔ اس نے سر اٹھا کر رئیس کو دیکھا۔

"کتنے چہرے ہیں لوگوں کے۔"

اس نے دکھ سے سوچا۔

"میں تمہیں بتانا چاہتا تھا مگر۔"

"نہیں' آپ کبھی بھی مجھے بتانا نہیں چاہتے تھے۔ آپ صرف دھوکا دینا چاہتے تھے مجھے بھی اور خدیجہ کو بھی۔ اور رئیس میں نے آپ کو کتنا اونچا کتنا بلند سوچا تھا کہ یہ وہ شخص ہے جو کبھی اپنی زبان سے نہیں پھرتا جو اپنے ملازم کے بچے کے لیے بھی فکرمند رہتا ہے وہ کبھی کسی کے ساتھ برا نہیں کر سکتا۔ اور تب آپ کیا نکلے۔"

رئیس لب بھینچ کر رہ گیا وہ جو کچھ بھی کہہ رہی تھی وہ سب کہنے میں حق بجانب تھی۔

"عینا یہ مصلحت کا تقاضا تھا۔"

"دھوکے کو مصلحت مت کہیں۔"

رئیس نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ پھر بول اٹھی۔

"بات تو سنیں رئیس جو کچھ خدیجہ کے ساتھ ہوا وہ قسمت کی ستم ظریفی تھی یا تقدیر کا وار۔ دکھ تو دونوں کو تھا بلکہ خدیجہ کا دکھ آپ سے زیادہ بڑا تھا۔ لیکن آپ نے کیا کیا اس عورت کو پاگل ہونے کے لئے بالکل اکیلا چھوڑ دیا۔ اسے ہی اعتماد میں لیا ہوتا۔ میرے ساتھ تو دھوکا کیا ہی تھا۔" آخر میں اس کا لہجہ ہلکا سا طنز لیے ہوئے تھا۔ رئیس خاموشی سے سن رہا تھا۔ بالکل خاموش' شاید اب اس کے پاس کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں اور عینا سوچنے لگی تھی۔

کاش وہ پہلے جیسی عینا ہوتی سب کچھ چھوڑ چھاڑ یہاں سے بھاگ جاتی۔

"عینا! چلو شہر چلتے ہیں واپس۔ ہماری زندگی تو وہیں سے شروع ہوئی تھی۔ یہاں سے تمہارا۔۔۔"

"میں تو ابھی شہر نہیں جا رہی۔" وہ دو ٹوک لہجے میں گویا ہوئی۔ رئیس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"تم نے کیا سوچ رکھا ہے؟"

"ابھی تو کچھ بھی نہیں سوچا لیکن یہ طے ہے میں ابھی شہر نہیں جاؤں گی۔"

وہ کہہ کر اٹھ گئی تھی۔

ماں جی نے بھی معذرت کی تھی کہ وہ بتانا تو چاہتی تھیں مگر بیٹے کی محبت اور نسل کو بڑھانے کے خیال نے زبان روک دی۔ عینا نے کچھ نہیں کہا خاموشی سے سنتی رہی۔ اس معاملے میں جتنا قصوروار رئیس تھے اس سے کہیں زیادہ ماں جی تھیں۔ انیسہ کا فون آیا تھا۔ وہ آنا چاہتی تھی مگر چھٹیاں نہیں مل رہی تھیں۔ احمد کی پیدائش پر وہ صرف ایک ہفتے کے لیے آئی تھی عینا نے اس سے نارمل انداز میں ہی بات کی تھی۔ وہ خود اپنے رویے کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بھائی صاحب کے ہاں شادی کے دس سال گزرنے کے بعد بھی اولاد نہ ہوئی تھی اور میں دو بچیوں کی ماں بن گئی۔ جب رئیس پیدا ہوا تو خدیجہ پانچ سال کی تھی۔ تب ہی اسے رئیس کے ساتھ منسوب کر دیا تھا۔ خدیجہ نے پرائیوٹ ایف۔ اے کیا تھا۔ رئیس نے تعلیم مکمل کی زمین داری سنبھالی تو دونوں کی شادی کر دی۔ رئیس مزاج کا اچھا ہے۔ خدیجہ کو خوش رکھا تھا اس نے۔ رانیوں کی طرح راج کرتی تھی مگر۔"

چچی کی بے حد مدھم آواز کمرے کی خاموش فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ وہ خاموش ہوئیں تو کمرے کے کونے کونے میں سناٹے کا راج ہو گیا۔

عینا نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے خدیجہ کو دیکھا۔ جو چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ دوپٹے کا پلو منہ پر ڈال رکھا تھا۔

وہ جب ان کے گھر آئی تو چچی نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

"تم؟"

وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ شاید اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا مگر چچی نے اسے اندر آنے کا رستہ دے دیا تھا۔ باہر سے آ کر اس نیم تاریک کمرے میں کچھ بھی سجھائی نہ دینا تھا مگر خدیجہ کی آواز ابھری تھی۔

"امی! اس سے کہیں یہاں سے چلی جائے۔"

تب ہی عینا نے دیکھا تھا وہ پلنگ پر لیٹی تھی۔

"بیٹھو۔" چچی نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

عینا بیٹھ گئی۔ یہ دیکھ کر خدیجہ نے دوپٹہ منہ پر ڈال لیا تھا اور تب سے اب تک اسی طرح پڑی تھی۔

"بہت علاج کروائے۔ رئیس بڑے بڑے ڈاکٹروں کے پاس لے کر گیا۔ بظاہر تو سب ٹھیک ہوتا تھا مگر ہر بار۔ تین بار۔ تینوں بچے زندہ سلامت پیدا ہونے کے چند منٹ بعد ہی ختم ہو گئے۔ رئیس بھی کیا کرتا شادی تو کرنا تھی کر لی۔ تمہاری گود ہری ہوئی۔ بچہ سلامت ہے ہمیں خوشی ہے اس بات کی۔ بس بھی کبھی یہ دیوانی سی ہو جاتی ہے۔ جب سے سنا کہ تم آئی ہو تب سے یہی حال ہے۔ ایک دن بچہ اٹھا لائی۔ کہتی تھی اگر یہ رئیس کا ہے تو میرا بھی تو ہوا۔ اب کتنے دنوں سے بخار میں پڑی ہے۔" انہوں نے ایک سرد آہ بھری اور تیزی سے تسبیح کے دانے گرانے لگیں۔

خدیجہ نے دوپٹہ ہٹا کر عینا کو دیکھا۔

"تم احمد کو ساتھ لے آتیں۔ میں تو صرف اسے دیکھنا چاہتی ہوں پیار کرنا چاہتی ہوں بس۔"

"وہ ماں جی کے پاس تھا۔"

"میں تم سے معذرت کرنا چاہتی تھی۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "اس دن نجانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔" وہ اس وقت بالکل نارمل تھی۔ وہ بھول گئی تھی کہ ابھی کچھ لمحے قبل اس نے کس قدر تنفر سے اسے یہاں سے جانے کو کہا تھا۔

"اس کی ضرورت نہیں خدیجہ! میں تمہاری کیفیت سمجھ سکتی ہوں۔" عینا نے ملائمت سے جواب دیا۔ وہ اس عورت کے لیے اپنے دل میں کچھ خاص جذبات محسوس کرتی تھی۔ اسے ایک بار بھی یہ محسوس نہیں ہوا تھا کہ اس کا اس عورت کے ساتھ رشتہ کیا ہے۔

خدیجہ خاموش ہو کر دوپٹے کی کناری ادھیڑنے لگی پھر اس نے سر اٹھا کر عینا کو دیکھا۔

"تم نے کبھی جلنے کی اذیت سہی ہے عینا! میں ہر روز جلتی ہوں۔ میرا وجود ہر وقت اک ان دیکھی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ اک جہنم ہے۔ جس میں دن سے رات کرتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کوئی میرے وجود سے قطرہ قطرہ روح کھینچ رہا ہے۔ نو ماہ۔ پورے نو ماہ۔ تم نے بھی تو دھاگا دھاگا خواب بنے ہوں گے۔ تمہارا بچہ اس کا لمس۔ اس کی پہلی آواز۔ پہلا قدم۔ پہلی پکار۔ ماں۔ آہ میں نے انہیں جنم دینے کی اذیت سہی ہے۔ میں نے ان کی پہلی چیخ سنی ہے۔ لیکن دیکھو میری گود خالی ہے۔ اللہ نامہربان کیوں ہے عینا! وہ مجھ سے اتنا ناراض کیوں ہے۔ کوئی ایک۔ کوئی ایک بچ جاتا۔ کوئی ایک اپنی سانسیں زیادہ لکھوا لاتا۔ لیکن وہ بس ایک سانس جینے اس دنیا میں آتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ ان کی ماں نے ان کے نام رکھے تھے کن امیدوں اور چاہتوں کے ساتھ۔ یہ دیکھو۔"

وہ اٹھی اور یک دم الماری کھول کر اس میں سے چیزیں نکال نکال کر پھینکنے لگی۔ کھلونے ننھے منے کرتے سویٹر جرابیں ٹوپیاں۔

"انہوں نے یہ بھی نہیں سوچا ان کی ماں نے ان کرتوں میں اپنی ممتا کاڑھی ہے۔ ان سویٹر ٹوپیوں میں اپنی محبت بنی ہے انہوں نے کچھ بھی نہیں سوچا۔ بس آئے ایک سانس لی اور چلے گئے۔ میرا علی۔ میرا توقیر۔ میری عاشی وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی ان سویٹر ٹوپیوں کو اٹھا اٹھا کر اپنی آنکھوں سے لگا رہی تھی۔ عینا کو پتا بھی نہ چلا کہ کب وہ اس کے ساتھ مل کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

لمبے بے کیف اور گرم سلگتے دنوں کا سلسلہ تھا۔ جو ختم ہونے میں نہ آ رہا تھا۔ وہ بے قراری سے برآمدوں آم کے درختوں تلے گھومتی رہتی۔ جن میں چھپے طوطے کچے آموں کو کترتے رہتے۔ ماں جی واپس جانے کو بے تاب تھیں۔ انیسہ آنے والی تھی اور گاؤں آ کر ہمیشہ بور ہی ہوتی تھی۔ رئیس خاموشی سے اپنے کام نبٹائے جاتا۔ زیادہ تر وقت اس کا ڈیرے پہ گزرتا۔ یوں بھی گندم کی کٹائی کا موسم تھا۔ وہ عینا کے فیصلے کا منتظر تھا۔ اور عینا نجانے کیا کیا سوچتی رہتی۔ دل چاہتا تو احمد کو لے کر خدیجہ کے پاس چلی جاتی۔ ماں جی جز بز ہو جاتیں۔ بی بی زینب بڑبڑاتی رہ جاتیں۔ وہ احمد کو خدیجہ کی گود میں دے کر خود کلیاں چنتی رہتی اور خدیجہ کو لگتا وہ جی اٹھی ہے۔ وہ اسے نہلاتی نیا کرتا پہناتی کبھی روتی کبھی ہنستی۔ احمد جب بھی واپس آتا اس کے تن پر نیا کرتا ہوتا۔ جو زینب نے خود کاڑھا ہوتا۔

چچی مشکور نگاہوں سے عینا کو دیکھتیں۔

"وہ تو مر گئی تھی اب پھر سے جینے لگی ہے۔ ساری دوپہر بیٹھی احمد کے کپڑے سیتی رہتی ہے اور خوش رہتی ہے۔"

اور عینا سوچتی۔

"جب ہم واپس چلے جائیں گے تب خدیجہ کیا کرے گی؟"

"نہیں مجھے حسد محسوس نہیں ہوتی۔" ایک دن عینا نے پوچھا وہ جو احمد کو نہلانے کے بعد تولیے سے خشک کر کے پاؤڈر چھڑک رہی تھی۔ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی پھر تکیے میں سہلاتے ہوئے بولی۔

"شادی تو رئیس کو کرنا ہی تھی حالانکہ ضروری تو نہ تھا جس مقصد کے لیے وہ شادی کر رہا تھا وہ پورا ہی ہو تک۔ پھر بھی میں خود اس سے کہتی تھی کہ وہ دوسری شادی کر لے شاید دوسری عورت قسمت کی دھنی ہو۔ وہ ہمیشہ انکار کرتا رہا اور جب شادی کی تو مجھ سے بات تک نہیں کی۔ مجھے اعتماد میں لیا ہی نہیں اور جب میں نے پوچھا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا رئیس؟"

تو اس نے میری بات کا جواب بھی نہیں دیا اور جب مجھے پتا چلا کہ تم ماں بننے والی ہو تو میں ڈر گئی۔ میں نہیں

چاہتی تھی جو عذاب میری جاں پر اترے وہ تم پر بھی اترے۔ اتنی دعائیں تو شاید میں نے اپنے لیے بھی نہیں کی تھیں جتنی تمہارے اور تمہارے بچے کے لیے کیں اور خدا نے میری دعائیں تمہارے لئے ضرور سن لیں۔''

وہ کہتے کہتے چپ ہوئی پھر سر جھٹک کر احمد کو کپڑے پہنانے لگی۔

''تم بہت اچھی ہو عینا۔ تم احمد کو لے آتی ہو۔ مجھے اب احساس بھی نہیں ہوتا کہ میں ماں نہیں ہوں۔

اس نے احمد کو پیار کیا پھر اس کی طرف بڑھا دیا۔

''اور جب ہم چلے جائیں گے خدیجہ تب۔ تب تم کیا کرو گی؟۔'' احمد کو لیتے ہوئے عینا نے اچانک سوال کیا تھا۔

خدیجہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس کے ہاتھوں میں واضح لرزش اتری تھی۔ اس نے ایک پل کو اپنے خالی ہاتھ دیکھے پھر ہتھیلیاں جوڑتے ہوئے گویا ہوئی تھی۔

''میں تم سب کے لیے دعا کروں گی۔''

☼ ☼ ☼

''بس رئیس! بہت ہو گیا ہم لوگ کل شہر جا رہے ہیں۔ اس سے بھی کہو تیار رہے۔ میری برداشت سے زیادہ ہو گیا ہے۔ جب دل چاہتا ہے احمد کو اٹھا کر اس منحوس کے پاس پہنچ جاتی ہے اب تو پوچھنا بھی گوارا نہیں کرتی اور یہ سب تمہاری ڈھیل کا نتیجہ ہے۔ مرد چاہے تو کیا عورت کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے تمہارے رویے پر۔ کیوں اتنی آزادی دے رکھی ہے۔''

''میں جانتا ہوں ماں جی! مجھے کیا کرنا ہے کیا نہیں۔'' رئیس کے لہجے میں ہلکی سی بیزاری در آئی۔

''بہر حال کل کی تیاری کرو۔''

''میں ابھی نہیں جا سکتا۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم لوگ جائیں گے اور کل ہی جائیں گے۔ جان بنا اپنی بیوی کو بھی۔'' وہ حتمی لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔ رئیس خاموشی سے اٹھ گیا۔

''عینا اب شہر جانا چاہیے۔''

رات کو اس نے عینا سے کہا تھا۔ اس کا خیال تھا اسے بحث کرنا پڑے گی۔ عینا کو قائل کرنا پڑے گا مگر عینا نے خاموشی سے ''ٹھیک ہے'' کہہ کر کروٹ بدل لی تھی۔ وہ محو حیران تھا۔

''تو کیا وہ کسی فیصلے پر پہنچ گئی ہے؟۔''

رات گئے تک اس کے ذہن میں یہی سوال چکراتا رہا۔

صبح معمول کے مطابق ہی ہوئی۔ ناشتے کے بعد انہیں روانہ ہونا تھا۔

''میں تیار ہو کر آتی ہوں۔'' وہ احمد کو لے کر کمرے میں چلی گئی اور پھر بہت دیر تک نہیں آئی تھی۔

''گاڑی آ گئی ہے۔'' رئیس نے آ کر بتایا۔ ماں جی اور بی بی زینب چادریں اوڑھ کر آ گئیں۔

''عینا کہاں ہے؟۔''

''بی بی تیار ہو رہی ہیں۔'' نوراں نے بتایا۔

''بلاؤ۔'' وہ ایک لفظ کہہ کر چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔

''بی بی کہتی ہیں ابھی آتی ہوں۔'' اس نے آ کر بتایا مگر بہت دیر ہونے کے بعد بھی وہ نہیں آئی تھی۔ رئیس کو غصہ آنے لگا۔

''تم نے۔'' ماں جی نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر وہ پہلے ہی بول اٹھا۔

''آپ گاڑی میں بیٹھیں میں دیکھتا ہوں۔'' وہ کمرے میں چلا گیا۔

عینا ایک ہی زاویے میں بیٹھی ٹکٹکی باندھے احمد کو دیکھ رہی تھی۔

''کیا مسئلہ ہے عینا! وہاں ماں جی انتظار کر رہی ہیں اور تم ہو کہ۔''

اس نے بہت کوشش کے ساتھ اپنے لہجے کو مدھم رکھا۔

عینا نے چونک کر اسے دیکھا۔

''نہیں میں بس آ رہی ہوں۔''

''جلدی کرو۔'' وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے پلٹا۔

عینا نے دوپٹہ اوڑھ کر احمد کو اٹھا لیا اور اس کے پیچھے ہو لی۔ ماں جی اور بی بی زینب گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں۔ عینا صحن کے بیچوں بیچ رک گئی۔

''عینا! کیا مسئلہ ہے؟۔'' اب کے وہ جھنجلا گیا۔

عینا کچھ نہیں بولی۔ وہ چچی کے گھر کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''عینا۔'' عینا کا بازو اس کی سخت گرفت میں تھا۔

''وہ آ گئی ہے۔'' عینا کے منہ سے اچانک نکلا۔

رئیس نے گردن گھما کر دیکھا۔ نوراں کے ساتھ خدیجہ کو آتے دیکھ کر اس نے عینا کا بازو چھوڑ دیا تھا۔

''نوراں نے بتایا کہ تم جا رہی ہو۔'' خدیجہ اس کے پاس آ کر رک گئی۔ اس نے بس اک سرسری نگاہ رئیس پر ڈالی تھی۔

''ہاں۔ بس تمہیں اک تحفہ دینا تھا اس لیے رک گئی۔'' وہ اپنی آواز کے ارتعاش پر بمشکل قابو پا رہی تھی۔

رئیس نے قدرے تعجب سے عینا کو دیکھا۔

''تحفہ۔'' خدیجہ نے دہرایا۔

''ہاں۔'' اس نے احمد کو دیکھا۔ پھر اسے ہاتھوں میں ذرا سا بلند کرتے ہوئے اس کی پیشانی پر اک طویل بوسہ ثبت کیا پھر احمد کو خدیجہ کی طرف بڑھا دیا تھا۔ وہ کچھ نا سمجھی کے انداز میں عینا کو دیکھنے لگی۔

''لو خدیجہ یہ تمہارا ہی ہے۔''

''نہیں۔'' وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''عینا! تم پاگل ہو؟۔'' رئیس کو جھٹکا سا لگا تھا۔

''ہاں میں پاگل ہوں۔'' وہ آرام سے کہتے ہوئے خدیجہ ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''تم ایسا کس طرح کر سکتی ہو؟۔''

''میں ایسا کر رہی ہوں اور آپ مجھے روکیں گے نہیں۔'' عینا کا لہجہ ٹھوس اور بے لچک تھا۔

''لے لو خدیجہ! اللہ نے چاہا تو وہ مجھ پر اپنا کرم دوبارہ کرے گا۔ مگر یہ تمہارا ہی ہے۔ تم اسے علی سمجھو یا توقیر۔ شاید اللہ نے مجھے یہاں بھیجا ہی اس لیے تھا۔''

خدیجہ نے رئیس کو دیکھا جو لب بھینچے کھڑا تھا۔ پھر اس کے بازو پھیلے اور اس نے آہستگی سے احمد کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ جن سے آنسو بہنے لگے تھے اور وہ لرزتے ہونٹوں سے کیا کہہ رہی تھی عینا سننا نہیں چاہتی تھی۔ تب ہی تیز تیز قدم اٹھاتی رئیس سے پہلے گاڑی میں جا بیٹھی تھی۔

☼

افشاں آفریدی

پیمانہ نیت شوق کا

''بھوک۔'' اس چار حرفی لفظ کی سفاکیت آج مجھ پر روزِ اول کی طرح روشن تھی۔ بظاہر بے چارگی سے بھرپور نظر آنے والا یہ لفظ اپنے اندر کس قدر اذیت سمیٹے ہوئے ہے میں آج پوری طرح محسوس کر سکتا تھا۔

بھوک ہڑتال کا ارادہ کرتے ہوئے مجھے اس کی سنگینی کا قطعی اندازہ نہ تھا۔ میرے جیسے ''مسلمان'' کے لیے جو رمضانوں میں بھی صرف جمعہ کے جمعہ روزہ رکھتا ہو اس کے لیے اتنی بھاری ذمہ داری اٹھانا کس قدر جانگسل اور دشوار ہوگا۔ کاش میں پہلے ہی جان جاتا تو شاید اپنی ضد منوانے کے لیے کوئی اور جائز طریقہ اپناتا۔

آج تین دن ہو گئے تھے' پانی کی ایک بوند اور اناج کا ایک دانہ تک پیٹ میں نہیں گیا تھا اور اس وقت میں بستر پر پڑا ماہیٔ بے آب بلکہ مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اماں نہ صرف میری کیفیت سے واقف تھیں بلکہ گھر میں پکنے والے کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو میں مجھے کس طرح تڑپا رہی تھیں' اس کا بھی انہیں بخوبی اندازہ تھا۔ جب ہی آج اتوار کا دن ہونے کے باوجود انہوں نے بریانی اور بڑا تکلف کے بجائے محض ماش کی بھنی ہوئی دال بنائی تھی مگر انہیں کیا معلوم کہ بگھار کی یہ خوشبو اس وقت دنیا کی بہترین سے بہترین ڈش کی خوشبو سے بھی زیادہ بھلی معلوم ہو رہی تھی مجھے۔

تین دنوں سے میں کمرے ہی تھا جس سے تمام گھر والوں کو اندازہ تھا کہ میں واقعی بھوکا ہوں۔ باہر جاتا تو ''باہر سے کچھ کھا آیا ہوگا'' کہہ کر اماں مطمئن سی ہو جاتیں' لیکن میں نے بھی کام پورا کیا تھا۔ دن میں رنی اور بھابھی دس بار کھانا ٹرے میں سجا سجا کر لاتیں مگر میرے مصمم ارادے میں ذرا دراڑ نہ پڑتی۔

اس بار میں نے سوچ لیا تھا کچھ بھی ہو میں بھیا اور بھابھی کی طرح اپنی زندگی کو تماشا ہرگز نہیں بناؤں گا۔ تمام زندگی اماں کی انگلی تھام کر غلط اور صحیح راستے کا تعین کیے بغیر ہم سارے بہن بھائی چلتے رہے۔ حتیٰ کہ اماں نے برادری میں شادی کرنے کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے بھیا اور آپی کی بے جوڑ شادیاں کروا لیں جس کا اثر اب تک ہم سب کی زندگیوں پر پڑ رہا تھا اور نجانے کب تک پڑنا تھا۔

رنی کے لیے البتہ خاندان میں ہی ایک معقول رشتہ مل گیا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ وہ دل سے خوش بھی تھی مگر میرے لیے اس پھیکے فلاپ جیسی رانیہ کا انتخاب قطعی ناموزوں تھا۔ نہ صرف وہ عمر میں مجھ سے چار سال بڑی تھی بلکہ اچھی خاصی موٹی ہونے اور کرخت چہرے کی وجہ سے مجھے سخت ناپسند تھی۔

اس کے مقابلے میں ماہین کا تر و تازہ' شگفتگی سے بھرپور وجود کس قدر مسحور کن تھا یہ میرا دل جانتا تھا۔ میں دس سال کا تھا جب ہم اس کالونی میں آکر رہے تھے اور جس لڑکے سے میری سب سے پہلے دعا سلام اور بعد میں گہری دوستی ہوئی وہ ماہین کا بھائی ظفر تھا۔ گزرے سترہ سالوں میں نہ صرف ظفر سے میری دوستی مضبوط ہوتی گئی بلکہ ماہین کے لیے میرے دل میں پھوٹ پڑنے والی محبت کی کونپل بھی اب ایک تناور درخت بن چکی تھی۔

ماہین کا ہمارے گھر آنا جانا بھی تھا اور اپنے نازک اور حسین سراپے کے ساتھ ساتھ دل موہ لینے والی سیرت کے باعث وہ گھر والوں کی پسندیدہ بھی تھی مگر جب اسی ماہین کا نام میرے لبوں سے نکلا تو اماں یوں غش کھاتے

فلمی جیسے میں نے کسی بدشکل لڑکی کا نام لے ڈالا ہو اور اس روز مجھے اماں کے بے لچک رویے کی سنگینی کا احساس ہوا۔

اس کے باوجود میں نے انہیں منانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ میرے ارادے کی پختگی اماں پر بھی واضح ہو چکی تھی مگر انہوں نے بھی ہار نہ ماننے کا عہد کر لیا تھا۔ ایسے میں صرف ''بھوک ہڑتال'' ہی ایسا آخری ہتھیار تھا جو ان کی بے جا ضد کو شکست دے سکتا تھا۔

''میں نتائج و عواقب کی پروا کیے بغیر یہ کام بھی کر گیا۔ اور واقعی اس ہتھیار کی طاقت کا مجھے اس وقت صحیح معنوں میں یقین آیا جب چوتھے دن بھوک سے نڈھال ہوتے ہوئے میں نے خود کو عالم غشی میں جاتا محسوس کیا۔ اسی لمحے اماں کا متورم چہرہ میری دھندلائی آنکھوں کے سامنے آیا تھا۔

''کھانا کھالو میرے چاند! مجھے تمہاری خوشی قبول ہے۔'' اماں کے الفاظ تھے یا آبِ حیات' میں نے بے قراری سے اٹھنا چاہا مگر چکرا کر رہ گیا۔ امی کے مہربان ہاتھوں نے میرے منہ میں بریانی کا نوالہ ڈالا تو جان میں جان آئی۔

اور پھر آگے کے سارے مراحل بڑی آسانی سے طے ہو گئے۔ ماہین کے گھر والے مجھے بچپن سے جانتے تھے' سو کوئی نکتہ اعتراض نہ اٹھا اور یوں وہ محبوب ہستی میری ہو گئی۔

وہ وجود جسے میں نے برسوں سوچا تھا' آج ایک انگوٹھی کے عوض میرے نام الاٹ ہو چکا تھا۔ اس احساس کے نشہ نے مجھے مخمور کر رکھا تھا اور اس خمار میں مجھے اماں کا بجھا بجھا بلکہ اچھی خاصی ناگواری سے بھرا رویہ بھی نظر نہ آیا۔ حتیٰ کہ ماہین میری خواب گاہ میں چلی آئی۔

اور موگرے کے پھولوں جیسا وجود میری خواہش پر سرخ کے بجائے شربتی رنگ کے عروسی جوڑے میں آراستہ تو بہ شکن لگ رہا تھا۔ میں نے اس لمحے دل میں سوچا تھا۔

''ہاں یہی تو وہ حسین چہرہ ہے جو میرے آئینۂ دل پر نقش ہے۔''

اطمینان سے سوچتے ہوئے میں نے اس کا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگا لیا۔

❀ ❀ ❀

شادی کے بعد بھی کئی دن تک میں اس خمار میں

رہا۔ بار بار بہانے بہانے سے میں ماہین کو بلا کر اپنے پاس بٹھا لیتا اور وہ شرما کر رہ جاتی۔ اماں کے تیور میرے اس والہانہ پن پر اور بھی کڑے ہو جاتے جن کا بھگتان ماہین کو بھگتنا پڑتا۔

البتہ اور لڑکیوں کی طرح ماہین کی کوشش یہ نہیں ہوتی کہ وہ مجھے لے کر الگ ہو جائے بلکہ کبھی کبھی میں اماں کے رویے سے بے زار ہو جاتا تھا اور ماہین ان کے دل میں گھر کرنے کی مرتوڑ کوششیں جاری رکھتی۔ کبھی کبھی مجھے اس پر ترس آتا جب سارا دن اماں کے ایک اشارے پر ناچتے ناچتے رات کو وہ بے دم سی ہو کر بستر پر آگرتی مگر میں کیا کرتا۔ نہ وہ اماں کو جیتنے کی کوشش سے باز آ رہی تھی نہ اماں اسے دھتکارتے ہوئے تھک رہی تھیں۔

ان ہی دنوں میں عون کی پیدائش نے مجھے اور اماں کو یکسر بدل ڈالا۔ بھیا اور بھابھی ابھی تک بے اولاد تھے ایسے میں پہلے ہی سال ماہین نے اماں کو پوتے کا تحفہ دے کر ان کا دل جیت لیا تھا۔

میں باپ بن گیا تھا اور ماہین ماں۔ لہٰذا آپ ہی آپ ہمارے درمیان سے رومانویت غائب ہوتی چلی گئی بلکہ کبھی میں ماہین کے قریب ہونے کی کوشش کرتا بھی تو وہ "پلیز شجاع! عون رو رہا ہے میں ابھی آتی ہوں۔" کہہ کر منظر سے غائب ہو جاتی پھر بعد میں بھلے وہ لاکھ سر پٹختی میرا غصہ کم نہ ہوتا۔

یوں ہی ہنستے روتے دو سال اور گزر گئے اور دو جڑواں بیٹیوں کی پیدائش کے بعد ماہین خود سے اور مجھ سے مزید لاپرواہ ہوتی چلی گئی۔

اب نہ اس کے بدن میں لچکتی شاخوں جیسی نرمیاں رہی تھیں نہ اس کے چہرے پر موگرے کے پھولوں جیسا ان چھوا حسن۔ اب وہ مکمل بیوی تھی۔ بھائی کی شادی کے بعد تو اس پر گھر کی ذمہ داریاں اور بھی بڑھ گئی تھیں۔ تین بچوں نے اسے گھن چکر بنا دیا تھا۔ ان کے لیے وہ ایک مکمل ماں تھی۔ اماں کے لیے اچھی بہو اور گھر کی منتظم اعلا۔ مگر میرے لیے اب وہ محض ایک بیوی تھی محبوبہ نہ رہی تھی۔

کہتے ہیں مرد کے دل میں دو خانے ہوتے ہیں ایک محبوبہ کے لیے دوسرا بیوی کے لیے۔ ماہین میرے خانۂ دل میں پہلے محبوبہ بن کر اتری تھی مگر اب وہ ایک بیوی تھی اور جب محبوبہ بیوی بن جائے تو اس کا چارم ختم ہو جاتا ہے۔

میرے دل میں بیوی کا خانہ اب بھر چکا تھا مگر محبوبہ کا خانہ۔۔۔

ایک کمی کا احساس تھا جس نے مجھے دھیرے دھیرے ماہین سے اور بھی دور کر دیا۔ وہ محض ایک ضرورت تھی خواہش نہیں۔

❊ ❊ ❊

نہ وہ بری تھی نہ پری چہرہ۔ گندمی رنگت والی فکر سی لڑکی تھی اور میں نجانے کیوں اسے دیکھتا رہ گیا تھا جس کی مسکراہٹ میں جوہی کی کلیوں جیسی چٹک تھی۔

عون کے رزلٹ ڈے پر آج میں ماہین کی دس بار منت سماجت کے بعد آیا تھا اور اب سوچ رہا تھا کہ پچھلے ایک سال سے میں کہاں تھا کیوں نہیں یہاں۔

وہ عون کی کلاس ٹیچر تھی جہاں بچوں کی کلاس اس قدر شور مچا ہوا تھا مگر وہ ہنوز خوش دلی سے رزلٹ کارڈ بانٹ رہی تھی۔

"مسٹر شجاع! آپ کا بیٹا بہت انٹیلی جنٹ ہے بہت جلدی پک کرتا ہے۔" وہ عون کا رزلٹ کارڈ دیتے ہوئے بڑی بے ساختگی سے مسکرائی تھی۔

"یہ سب آپ کی محنت ہے مس۔۔۔" میں رکا۔

"مس صومعہ۔" میرے جملے کی تکمیل کرتے ہوئے وہ بالوں کو ایک جھٹکے سے پیچھے کرتے ہوئے مسکرائی۔ "دیسے یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے ورنہ پڑھاتی تو میں ان سب بچوں کو ہوں مگر فرسٹ صرف عون آیا ہے۔"

اپنی تعریف پر اس کے ملیح چہرے پر مجوب سا رنگ بکھر گیا تھا۔ وہ بے حد عام سی مگر بہت پرکشش لڑکی

با پھر مجھے ہی لگ رہی تھی۔ واپسی پر سارے راستے بس اسے ہی سوچتا آیا تھا۔ آج شور مچاتے عون کی کوئی بات مجھے گراں نہیں گزری تھی۔

درحقیقت آج بہت عرصے بعد میں نے خود کو ویسے ہی فریش محسوس کیا تھا جیسے کہ شادی سے پہلے ماہین کے ایک دیدار پر میرا دل کھل اٹھتا تھا۔ راستے بھر دماغ مجھے سرزنش کرتا رہا۔ عقل کہتی تھی میں ماہین کے ساتھ ناانصافی کر رہا ہوں اس طرح خوش ہو کر لیکن میں بھی کیا کرتا انسان بھلا خود سے کبھی چھپتا ہے۔

درحقیقت جس طرح بچے کو بہلانے کے لیے کھلونا عورت کے لیے ایک گھر کا ہونا بہت ضروری ہے اسی طرح مرد کے لیے دل بہلانے اور دل لگانے کے لیے ایک عورت کا ہونا بہت ضروری ہے۔ ایک ایسی عورت کا جو بیوی نہ ہو بس دل میں بھی کسی ان چھوئی سی خواہش ہو۔

میں نے عون کو اسکول لانے اور لے جانے کی ذمہ داری اٹھالی۔ ماہین کے لیے میری یہ روٹین نہ صرف خوشگوار تھی بلکہ وہ حیران بھی تھی مگر شاید میری اس تبدیلی کی وجہ اس نے عون کے رزلٹ کو سمجھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں عون کے رزلٹ کے بارے میں زیادہ سوچ تک نہ سکا تھا تاہم صومعہ کے سامنے جو میرا مان بڑھا تھا اس وجہ سے میں عون سے بے حد خوش تھا۔

اور پھر یہ تو ہوتا ہے کہ جب آپ کسی خاص ہستی کے لیے خود پر توجہ دینے لگتے ہیں تو ارد گرد کے لوگ چونک اٹھتے ہیں۔ اس صبح بھی میں بڑے دل سے تیار ہوا تھا۔ بلیک پینٹ اور گرے شرٹ میں میں کافی جچ رہا تھا جس کی گواہی آئینے نے بھی دی تھی۔

اس پر مہنگے پرفیوم کا چھڑکاؤ کافی مسحور کن تھا۔ کچھ تھا ان میری تیاری میں میرے چہرے پر کہ دروازے سے اندر آتی ماہین بھی ٹھٹک گئی۔

"کیا بات ہے آج کل بہت دھیان سے تیار ہونے لگے ہیں آفس جاتے ہوئے۔" اس نے خاصے سرسری سے انداز میں کہا تھا تاہم اس کی آنکھوں میں ہلکی سی تشکیک میں نے پڑھ لی تھی۔

"کوئی خاص بات نہیں بیگم! ان فیکٹ ہماری فرم کے ایم ڈی آج کل میری برانچ میں بیٹھنے لگے ہیں اور یہ سب جو تمہیں نظر آ رہا ہے ان کا حکم ہے۔" ٹائی باندھتے ہوئے میں نے اس سے نظریں چرالیں۔

اور وہ مطمئن سی ہو گئی تھی۔ پتا نہیں یہ عورتیں واقعی احمق ہوتی ہیں یا شاید ہم جیسے مردوں کو اسی طرح بے وقوف بناتی ہیں۔ تاہم میرے پاس ان سب باتوں کو سوچنے کے لیے قطعی وقت نہیں تھا لہٰذا چائے کا ایک گھونٹ لے کر میں "دیر ہو رہی ہے" کا شور مچاتا باہر نکل گیا۔

پھر صومعہ اور میں محبت کے راستے پر چل پڑے۔

"محبت۔" اس چار حرفی لفظ میں بھی بڑی طاقت ہے۔ روحانی جسم کے لیے یہ بھی غذا کا درجہ رکھتی ہے۔ صومعہ محض ایک اس لفظ کی اسیر ہو کر میرے دام میں گرفتار ہو گئی تھی اور شاید میں اس کے دام میں۔

تاہم اس کو رام کرنے کے لیے مجھے کیا کیا دقتیں اٹھانا پڑیں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے اس سے قطع نظر اب وہ مجھے دل سے چاہتی تھی۔ بھلا ایک شادی شدہ مرد کو چاہنا بھی کس قدر احمقانہ کام ہے۔

میں جانتا تھا کہ ماہین ہی میری بیوی ہے میرے بچوں کی ماں ہے۔ اس کی جگہ مجھے کسی کو نہیں دینا تھی۔ ہاں مگر یہ جو دل میں ایک خانہ خالی رہ گیا تھا اسے بھی تو بھرنا تھا نا!

ایک بچے کی طرح مرد کا دل بھی ایک کھلونے سے نہیں بہلتا۔ مجھے گھر بنانے کے لیے ایک بیوی کی ضرورت ہے جسے ماہین بخیر و خوبی پورا کر رہی ہے مگر ساتھ ہی دل بہلانے کے لیے چاہے جانے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ایک محبوبہ کی اور اس کے لیے صومعہ ہے نا۔ کیا کروں اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔

❊

نگہت سیما
ناولٹ
"پھر یوں ہوا کہ" عبدالعلی کی آنکھیں آنسوؤں سے
بھر گئیں۔
"فرات و دجلہ لہو کے اشکوں سے بھر گئے ہیں
وہ جن کے سینوں میں
الف لیلیٰ کی سحر انگیز داستانیں دھڑک رہی تھیں
ان ہی کی روحوں میں
خوف کے صد ہزار جنگل اتر گئے ہیں"
"فارگاڈ سیک عبدالعلی!" محب اللہ نے اس کے
کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"اتنی جذباتیت اچھی نہیں ہے۔ قوموں اور ملکوں

کی زندگی میں ایسے مقام آیا ہی کرتے ہیں۔"

"یار! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم یہاں جرنلزم میں کیوں آگئے ہو۔ تمہیں تو ادیب ہونا چاہیے تھا۔"

چوہدری عظمت اللہ نے تیزی سے لکھتے ہوئے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور ناک کی پھننگ پر اٹکی عینک کو دوبارہ درست کر کے ناک کی پھننگ پر جمایا۔

"ایڈیٹر صاحب نے تمہیں عراق کے موجودہ حالات پر چھوٹا سا کالم لکھنے کو کہا ہے۔"

"کالم ہی تو لکھ رہا ہوں۔"

"یہ کالم ہے یا نوحہ؟" چوہدری عظمت اللہ کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھری۔

"زندگی اس مقام پر ہے
کہ بابل و نینوا کی تہذیب رو رہی ہے۔"

محب اللہ نے جو عبدالعلی کی کرسی کے پیچھے کھڑا تھا جھک کر پڑھا۔

"یار عبدالعلی! میرا خیال ہے اس وقت تم جذباتی ہو رہے ہو.... کچھ دیر بعد لکھ لینا اسے پھاڑ دو۔ خوامخواہ ایڈیٹر صاحب کا پارہ چڑھ جائے گا اسے دیکھ کر۔"

"میں تو اسے پھاڑ دوں گا محب اللہ خان!" عبدالعلی نے گردن پیچھے کر کے محب اللہ کو دیکھا۔

"لیکن کیا تم تاریخ کے چہرے سے درندگی و سفاکی کے بدنما داغ بھی مٹا سکو گے؟ نہیں محب اللہ! آنے والی نسلیں اور آنے والا زمانہ اس درندگی اور سفاکی کو اسی طرح تاریخ کے صفحات پر رقم کرے گا جس طرح ہلاکو اور چنگیز خان کی سفاکی کو رقم کیا گیا ہے۔"

"لیکن اس سے کیا ہو گا عبدالعلی! اگر تاریخ کے صفحات پر یہ خونریزی رقم بھی ہو گئی تو کیا یہ جو ہر روز سینکڑوں لوگ مارے جا رہے ہیں۔ عورتوں کی عزتیں و عصمتیں لوٹی جا رہی ہیں۔ معصوم بچوں کو بموں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے کیا یہ معصوم بچے دوبارہ زندگی پا سکیں گے کیا لوٹی ہوئی عصمتیں واپس ہو سکیں گی کیا ان خون اگلتے نوجوان سینوں میں زندگی پھر دھڑک سکے گی عبدالعلی! بتاؤ۔"

محب اللہ کا ہاتھ پھر اس کے کندھوں پر آ ٹکا تھا اور عبدالعلی کو اس کی انگلیاں اپنے کندھوں میں کھبتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

"ہاں! تم شاید صحیح کہتے ہو محب اللہ!" عبدالعلی کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"جب ہم خود کچھ نہیں کر سکتے تو ہم تاریخ کے کندھوں پر سارا بار ڈال کر خود کو ہر طرح کے بوجھ سے آزاد کر لیتے ہیں کہ چلو ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا اور باقی کام آنے والی نسلوں کا ہے کہ وہ اس خونریزی پر نوحے لکھیں اور مرثیے کہیں اور پچھلی نسل کی بے حسی کا ماتم کریں۔ خاندان برامکہ کے زوال پر کتنے نوحے لکھے گئے۔ سقوط غرناطہ، سقوط بغداد اور پھر سقوط ڈھاکہ پر کیا کچھ نہیں لکھا گیا لیکن۔"

"سقوط ڈھاکہ!" چوہدری عظمت اللہ نے پھر لکھتے لکھتے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور عجیب طرح سے ہنسا۔

"یہ تو ابھی کل پرسوں کی بات ہے جب ہمارا دل ٹکڑے ہوا تھا۔ لیکن میرا بیٹا نہیں جانتا کہ مشرقی پاکستان کون سا ملک ہے۔ اسے یہ تک خبر نہیں کہ بنگلہ دیش کبھی اسی پاکستان کا ایک بازو تھا جو کاٹ دیا گیا۔"

اس نے رک کر باری باری دونوں پر ایک طنزیہ نظر ڈالی۔

"تو عزیزان من! تاریخ بھلے کچھ نہ کر سکے لیکن آنے والی نسلوں کو آگاہی تو دیتی ہے ایک امید تو دیتی ہے کہ شاید پچھلوں کی غلطیاں اگلے نہ دہرائیں شاید کوئی سبق سیکھ لیں۔ تاریخ ہمارے ان آج کے لکھنے والوں کو کبھی معاف نہیں کرے گی جنہوں نے تاریخ کے صفحات سے مشرقی پاکستان کا نام ہی مٹا دیا۔ میرا بیٹا اکثر مجھ سے پوچھتا ہے۔ پپا! یہ بابا کس ملک کا نام لیتے ہیں اور کیا آپ بھی کبھی بابا کے ساتھ اس ملک میں گئے تھے۔ میں کہتا ہوں 'بیٹا وہ ہمارا ہی ملک تھا' تو حیرانی سے مجھے دیکھتا ہے۔ پپا ہماری ٹیچر تو کہتی ہیں

اس نام کا کوئی ملک نہیں ہے۔" میں شرمندہ ہو کر سر جھکا لیتا ہوں اسے کچھ نہیں کہہ پاتا تو بابا سے الجھتا ہوں کہ وہ کیوں نہیں بھول جاتے مشرقی پاکستان کو اور کیوں بچے کو الجھاتے ہیں۔ لیکن میں بابا کے ذہن و دل سے مشرقی پاکستان کو نہیں نکال سکتا۔ بھلے تاریخ کو مسخ کر دوں۔"

اس نے میز پر رکھا ہوا قلم اٹھایا اور پھر جھک کر یوں انہماک سے لکھنے لگا جیسے وہ بہت دیر سے یونہی بیٹھا لکھ رہا ہو۔

"اور یہ کتنا بڑا المیہ ہے محب اللہ خان!" عبدالعلی نے ایک گہری سانس لی "ہم اپنی تاریخ کو مسخ کرنے کے مجرم ہیں۔"

"ہماری تاریخ صرف المیوں سے ہی مرتب ہوئی ہے ایک نہیں کئی المیے۔" محب اللہ کے لہجے میں دکھ [illegible] رہا تھا۔

"اور ابھی مزید کئی المیے جنم لیں گے۔" وہ ہنسا۔

"یہ جو چوہدری عظمت اللہ آج اس بات پر شکوہ کناں ہے کہ اس کا بیٹا نہیں جانتا کہ مشرقی پاکستان کبھی پاکستان کا ہی حصہ تھا۔ کل اس بات پر روئے گا کہ اس کا بیٹا اور بیٹے کی اولاد یہ تک نہیں جانتی کہ یہ ملک کیوں حاصل کیا گیا تھا۔ اس لیے کہ ہم نے انہیں اپنے نصاب میں اب باور کرایا ہے کہ پاکستان کوئی نظریاتی مملکت نہیں۔ نہ ہی کسی اسلامی نظریے کے تحت وجود میں آیا ہے۔ بلکہ یہ تو دو بھائیوں کی مانند تھے جو ایک دوسرے سے الگ ہو کر رہنا چاہتے تھے۔"

"تم کیا کہہ رہے محب اللہ؟" عبدالعلی کی آنکھوں میں یکدم اضطراب کروٹیں لینے لگا۔

"صحیح کہہ رہا ہوں میری جان!" محب اللہ گھوم کر اس کے سامنے والی کرسی پر آ بیٹھا۔

"ہم بابل و نینوا کی تہذیب کے لٹنے پر رو رہے ہیں عبدالعلی! آؤ تو کچھ دیر کے لیے اپنی تہذیب و ثقافت کے لٹنے پر آنسو بہا لیں۔ کہ ہم نے اپنے نصاب میں یہ بتایا ہے کہ اگر پاکستان اسلامی نظریہ کی بنیاد پر وجود میں آتا تو مشرقی پاکستان کے بجائے افغانستان اس میں شامل ہوتا۔ ارے احمقو! افغانستان تو ایک الگ ملک تھا برصغیر کی تقسیم سے پہلے آزاد ہو چکا تھا۔ تقسیم تو برصغیر کی ہوئی تھی۔"

"اوہ مائی گاڈ!" عبدالعلی نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

تب ہی السلام علیکم کا پرزور نعرہ لگاتے ہوئے سید مجاہد حسین اندر داخل ہوئے اور ہاتھ میں پکڑا لفافہ ٹیبل پر رکھا۔

"یہ کیا ہے مجاہد صاحب؟" ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے محب اللہ نے پوچھا۔

"تصاویر ہیں۔ ابھی مدنی صاحب نے دی ہیں۔" مدنی صاحب اور مجاہد صاحب دونوں ہی اخبار کے فوٹو گرافر تھے۔

"کل کے اخبار میں لگیں گی۔" محب اللہ نے لفافہ کھول کر تصاویر نکالیں۔

چند عراقی بچوں کی خون میں لت پت نعشیں سڑک پر پڑی تھیں اور قریب ہی چند امریکی فوجی کھڑے قہقہے لگا رہے تھے۔

رات ہی انہوں نے ٹی وی پر یہ خبر سنی تھی کہ چند عراقی بچے اسکول سے نکل کر اس تباہ شدہ امریکن گاڑی کو دیکھ رہے تھے جو ایک خودکش حملے میں تباہ ہو گئی تھی کہ ایک موبائل آ کر رکی جس میں امریکی فوجی سوار تھے انہوں نے ان ہنستے کھلکھلاتے بچوں پر فائر کھول دیا۔ ان کے بستے ان کے گلوں میں لٹکے تھے اور معصوم گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ منجمد ہو گئی تھی۔

"یہ.... یہ دیکھو عبدالعلی!" محب اللہ نے تصاویر اس کی طرف بڑھائیں تو وہ جو ابھی تک سر پکڑے بیٹھا تھا اس نے سر اٹھا کر تصاویر کو دیکھا اور اس کے اندر سے ایک چیخ اٹھی جو وجود کی دیوار کے اندر ہی کہیں گونج کر خاموش ہو گئی۔ وہ نم آنکھوں سے تصاویر دیکھتا رہا۔

اور یہ صرف آج کی بات نہ تھی۔

ایسی اور اس جیسی کئی تصاویر وہ ہر روز دیکھتا تھا۔
بظاہر سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔
عراق فتح ہو گیا۔
بعث پارٹی کا خاتمہ ہوا۔
صدام حسین گرفتار ہو گئے۔
لیکن کچھ بھی تو ختم نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ظلم و ستم کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔
عراق میں جمہوریت قائم کرنے کے وعدے۔
عراقی عوام کو ظلم و ستم سے نجات دلانے کے خواب سب ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ سامنے کیا تھا۔
خود کش حملے کرتے عراقی جوان' لٹی پٹی عراقی عورتیں' لہو میں نہائے معصوم جسم اور بین کرتی مائیں۔
اور وہ جو امن کی مشعلیں جلا کر ہماری تہذیب کو نئی منزلوں کا مژدہ سنا رہے تھے۔ جو آسمانوں کی سمت رستہ دکھا رہے تھے۔
خدا کے لہجے میں بات کرتے یہ چند انسان زمین کی تقدیر اپنے ہاتھوں میں لے رہے ہیں۔ نجف میں' بصرہ میں اور بغداد کی فصیلوں میں اب دراڑیں پڑی ہوئی ہیں۔
اس نے بغور تصویر کو دیکھا۔
"میرے ننھے فرشتو! کاش تم نے اس سرزمین پر جنم نہ لیا ہوتا جہاں خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے لیکن کہاں کھلتے تم ننھے بچو! کیا اس دھرتی پر کوئی ایسا گوشہ ہے جہاں تم بے خوف ہو کر ہنستے اور نڈر ہو کر تتلیوں کے پیچھے بھاگتے۔"
ایک سرد آہ عبدالعلی کے ہونٹوں سے نکلی۔ اس نے لفافہ ٹیبل پر رکھتے ہوئے دائیں ہاتھ کی پشت سے ان نادیدہ آنسوؤں کو پونچھنے کی سعی کی جو آنکھ تک آنے کے بجائے اندر ہی کہیں ٹوٹ کر گم ہو گئے تھے۔

"سر جی۔۔۔!"
بابا کرماں والے نے دروازے سے چق اٹھا کر اندر جھانکا۔
"کیا ہے بابا؟" محب اللہ نے پوچھا۔
"آپ نے عبدالعلی کرماں والے کو اپنے ایڈیٹر صاحب یاد کر رہے ہیں۔"
بابا کا نام تو نہ جانے کیا تھا لیکن وہ اپنی گفتگو میں "کرماں والے" کا لفظ زیادہ استعمال کرتا تھا۔ اس لیے یہاں اخبار کے اس آفس میں سب ہی اسے بابا کرماں والا کہتے تھے۔
"اچھا آتے ہیں پہلے تم چائے لاؤ چار کپ۔"
"جی سر جی! ابھی لایا۔" بابا نے دانت نکالے اور چق گرا دی۔ عبدالعلی نے کلپ بورڈ سے لکھے ہوئے کالم والا کاغذ نکالا اور اسے گول مول سا کر کے ویسٹ بن میں پھینک دیا۔
"جذبات کو ذرا ایک طرف رکھ کر لکھنا سو نمبر۔" چوہدری عظمت اللہ نے سر اٹھائے بغیر کہا اور عبدالعلی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے قلم اٹھا کر کلپ بورڈ پر جھک گیا۔

☼ ☼ ☼

مے کدہ جہاں میں کیا ہیں رسوم مے کشی
آنکھ تو سیر ہو چلی دل وہی تشنہ کام ہے
آنکھ تو سیر ہو چلی۔۔۔۔"

دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے ٹیبل بجاتے ہوئے آنکھیں بند کیے اسجد اونچی آواز میں گا رہا تھا۔ کمپیوٹر پر کام کرتے ہوئے عنیزہ نے جھلا کر اسے دیکھا۔
"تم اناڑی ایلیوم تھوڑا کم نہیں کر سکتے اسجد۔"
"بشرطیکہ دل کی تشنگی کم ہونے کی کوئی سبیل ہو۔" اسجد نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا جبکہ انگلیاں بدستور میز پر تال دے رہی تھیں۔
"کیا تم تھوڑی دیر صبر نہیں کر سکتے۔"
"تھوڑی دیر' ارے ہم تو نہ جانے کب سے صبر کر رہے ہیں اور کب تک کرتے رہیں گے۔ بلکہ شاید صبر ہی کرتے کرتے اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔" اس کی زبان چل پڑی تھی۔
"لیکن اس وقت اگر تم دو منٹ کے لیے اپنی زبان بند کر لو تو میں تمہاری از حد ممنون ہوں گی۔" عنیزہ نے چبا چبا کر بات مکمل کی۔
"اوکے' اوکے لیکن یہ اس وقت تم کیا ضروری کام کر رہی ہو؟"
"میں اپنی اور علولہ کی سی وی بنا رہی ہوں' ہمیں ایک انٹرویو کے لیے جانا ہے۔ علولہ ابھی آتی ہو گی۔"
"ہم۔۔۔ یعنی تم بھی اب گھر سے رخصت ہو رہی ہو۔ واہ کیپٹن اسجد تاجدار تمہاری قسمت ہی خراب ہے۔ پورے تین ماہ بعد گھر کے در و دیوار ہی دیکھنے تھے تو وہاں کیا برا تھا کم از کم شام میں کبھی کبھار اچھی صورتیں بھی نظر آ جاتی ہیں۔ ہائے وہ سونے سے ترشی میجر حمزہ کی دختر نیک اختر کس قدر لوانس تھی میرے لیے اور میں خوامخواہ مرا جا رہا تھا یہاں آنے کو۔"
"ہم ابھی آ جائیں گے بس آدھ گھنٹے تک اور ابھی تو علولہ بھی نہیں آئی۔"
عنیزہ کو اس پر ترس آ گیا۔
سچ ہی تو کہہ رہا تھا کہ اتنے ماہ بعد آیا ہے اور یہاں کسی کو اس کی پروا تک نہیں۔ وہ رات دیر سے آیا تھا اس لیے علی سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی اور صبح عبدالعلی کو کسی جگہ ایک تقریب کی کوریج کے لیے جانا تھا۔ اس لیے وہ اس کے جاگنے سے پہلے ہی جا چکا تھا اور ممانی کو آج شام اپنے لیڈیز کلب میں ایک تقریب اٹینڈ کرنا تھی' سو وہ ناشتے کے بعد ہی فیشل وغیرہ کے لیے اپنی بیوٹیشن کے پاس چلی گئی تھیں۔ علینہ کو بالوں کی کٹنگ کروانا تھی سو وہ بھی ان کے ساتھ تھی اور کیپٹن اسجد تنہائی دور کرنے کے لیے اس وقت عنیزہ کے کمرے میں بیٹھا اس کا سر کھا رہا تھا۔ بلکہ یہ عنیزہ کا بھی نہیں عبدالعلی کا کمرہ تھا جہاں اس کے کمپیوٹر پر وہ سی وی بنانے آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

کرنل تاجدار کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بڑے بیٹے اسعد کو ایم بی بی ایس کے بعد امریکہ میں ہی فیلوشپ مل گئی تھی اور آج کل وہ وہیں مقیم تھے۔ اس سے چھوٹا اسجد تھا جو ان کی خواہش پر آرمی میں گیا تھا اور اب کیپٹن تھا جب کہ علینہ سب سے چھوٹی تھی اور اس وقت یونیورسٹی کی طالبہ تھی اس کا ارادہ فزکس میں ڈاکٹریٹ کرنے کا تھا۔
عنیزہ اور عبدالعلی کرنل تاجدار کی بہن کے بچے تھے۔ عبدالعلی ساتویں میں تھا اور عنیزہ کلاس تھری میں تو ان کے والدین کار کے حادثے میں ان سے جدا ہو گئے تھے۔ میجر ڈاکٹر عابد علوی اور ان کی بیوی ڈاکٹر آصفہ علوی اپنے ایک کولیگ ڈاکٹر کے ذاتی کلینک کے افتتاح کے سلسلے میں ہونے والی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے جا رہے تھے کہ پیچھے سے آتا بھاری ٹرک ان کی کار کو کچلتا چلا گیا تھا۔ ڈاکٹر عابد کا کوئی قریبی عزیز نہ تھا۔ نہ والدین نہ بہن بھائی سو عنیزہ اور علی کی ذمہ داری نانی کو اٹھانا پڑی تھی۔ مالی لحاظ سے تو کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اسلام آباد کی کوٹھی کرائے پر دے کر نانی دونوں بچوں کو اپنے ساتھ لاہور لے آئی تھیں۔ جہاں وہ اکیلی ہی رہتی تھیں اکلوتے بیٹے کرنل تاجدار کی پوسٹنگ مختلف علاقوں میں ہوتی رہتی تھی اور وہ سال چھ مہینے بعد کبھی ماں کے پاس چکر لگا جاتے تھے۔ لیکن پچھلے دو سال سے ان کی فیملی لاہور میں ہی تھی۔ ان کی پوسٹنگ کھاریاں میں ہو گئی تھی اور انہوں نے وہاں کے بجائے اپنے ذاتی گھر میں ماں کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی تھی۔ گو ماڈل ٹاؤن میں ان کا یہ آبائی گھر خاصا بڑا اور اچھا بنا ہوا تھا لیکن ان کی بیگم جہاں آرا تاجدار نے شروع میں خاصی ناک بھوں چڑھائی تھی۔
وہ ان کے ساتھ کھاریاں میں ہی رہنا چاہ رہی تھیں۔
"جہاں تک علینہ کی تعلیم کا مسئلہ ہے وہ ہوسٹل میں رہ لے گی ہمیں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ پھر

شروع سے بچے اور ہم ایک مخصوص ماحول میں رہنے کے عادی رہے ہیں۔ ہر ویک اینڈ پر آجایا کریں گے۔"
لیکن کرنل تاجدار نے ان کی بات پر زیادہ غور نہیں کیا تھا۔ جہاں آرا کی بہت ساری باتیں مان لینے کے باوجود وہ کبھی کبھار اپنی بات بھی منوا لیتے تھے۔
"میں اپنی ماں کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ اتنے سالوں سے وہ تنہا رہ رہی ہیں۔ بچے اور تم یہاں رہو گے تو میں بھی ہر ویک اینڈ پر آجایا کروں گا۔ ماں جی بھی خوش ہوں گی۔"
"تنہا کہاں، عنیزہ اور عبدالعلی بھی تو ہیں۔"
"عبدالعلی اور عنیزہ کے سلسلے میں میرا بھی فرض بنتا تھا کہ ان کا ساتھ دیتا کھانے پر ابلم تو نہیں تھا انہیں، عابد بھائی اور امینی کا بہت کچھ ہے ان کے پاس لیکن۔۔۔"
"آتے تو رہتے تھے ہم۔"
"کبھی کبھار کے آنے اور ذمہ داریاں سنبھال لینے میں بڑا فرق ہوتا ہے جہاں آرا بیگم۔"
اور پھر انہیں خاموش ہونا پڑا تھا۔ گھر آنا جانا تو لگا رہتا تھا۔ بہت شروع میں بھی جب عنیزہ کے والدین کے حادثے کو سال بھر ہوا تھا تو کرنل تاجدار کی پوسٹنگ لاہور میں ہو گئی تھی اور اس وقت سال بھر کے لیے سب کو اکٹھے رہنے کا موقع ملا تھا۔ لیکن پھر بھی اتنی بے تکلفی نہ تھی جتنی اب ان دو سالوں میں ہو گئی تھی۔ اسجد کی پوسٹنگ چند ماہ پہلے ہی کوئٹہ ہوئی تھی اور وہ پورے تین ماہ بعد آیا تھا۔ اس سے پہلے کھاریاں سے تو اکثر ویک اینڈ پر چلا آتا تھا۔ کرنل تاجدار بھی دس بارہ دن بعد چکر لگا لیتے تھے۔ جہاں آرا بھی ایڈجسٹ ہو گئی تھیں۔ بیگم کرنل ہدایت اللہ کے ساتھ مل کر انہوں نے کئی این جی اوز کی رکنیت حاصل کر لی تھی۔
اسجد نے جو بغور عنیزہ کی پشت پر لہراتے لمبے سیاہ بالوں کو دیکھ رہا تھا پوچھا۔ "نانو سو رہی ہیں کیا؟"
"ہاں، صبح جلدی اٹھ جاتی ہیں، اس لیے ناشتہ کر کے سو جاتی ہیں۔" عنیزہ نے کمپیوٹر آف کر کے اسے دیکھا۔
"کتنے دن کا پروگرام ہے؟"

"صرف چار دن۔"
"اتنے تھوڑے دن۔" بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔
"کہو تو زیادہ دن رک جاؤں بلکہ حکم کرو تو واپس ہی نہ جاؤں۔"
"کیسی باتیں کرتے ہو اسجد؟" عنیزہ کے رخساروں پر رنگ سا بکھرا جسے اسجد نے بے حد دلچسپی سے دیکھا۔
"سمجھنے کی کوشش کیا کرو یار عینی! ان باتوں میں بڑے معنی ہوتے ہیں۔" اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سی وی عنیزہ کے ہاتھوں سے لے لی۔
"علولہ چوہدری۔" اس نے پڑھا۔
"واہ بھئی واہ! بڑی لائق فائق ہیں یہ بی بی بھی۔"
"جی!" عنیزہ نے خوش ہو کر کہا۔ "عاولہ بہت لائق ہے۔ شروع سے ہی ہر جماعت میں اول آتی ہے۔"
"پہلے تو تم نے کبھی ان کی ان خوبیوں سے متعارف نہیں کرایا۔
ایک بات تو بتاؤ تم دونوں کیا ایک ہی جاب کے لیے انٹرویو دینے جا رہی ہو۔ اگر ایسا ہے تو پھر تم تو گئیں کام سے۔"
"نہیں، آج تو مجھے علولہ کے ساتھ جانا تھا ویسے عاولہ پہلے سے ہی جاب کر رہی ہے۔ ایک پرائیویٹ چینل ہے وہاں پر خبروں کی ایڈیٹنگ وغیرہ کرتی ہے لیکن وہ مطمئن نہیں ہے اپنی جاب سے، دراصل وہ کوئی تخلیقی کام کرنا چاہتی ہے اس سے بہتر۔"
"اور تم؟"
"میں! مجھے آفس ورک وغیرہ کرنا مشکل لگتا ہے میرا ارادہ کسی کالج میں جاب کرنے کا ہے۔"
"ویسے ایک اور جاب بھی ہے اگر تم کرنا چاہو تو۔"
"کون سی؟" عنیزہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔
"میاں اور بچوں کی جاب۔"
"اسجد تم۔۔۔!" اس کے رخساروں سے جھلکتی سرخی

گہری ہو گئی اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا عاولہ السلام علیکم کہتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔
"بڑی دیر کی مہماں آتے آتے۔" اسجد چہکا۔
"یہاں بڑی دیر سے لوگ انتظار کر رہے تھے۔" اس نے عنیزہ کی طرف اشارہ کیا۔
"سوری عینی! تمہیں انتظار کرنا پڑا۔ وہ دراصل بھابھی کو عالی کے ساتھ ہاسپٹل جانا تھا تو میں پہلے ان کے ساتھ چلی گئی۔ تمہیں تو پتا ہے کہیں اکیلا جانے سے وہ کتنا گھبراتی ہیں۔"
"کیا ہوا تھا عالی کو۔"
"وہ گلے میں کچھ تکلیف تھی اور ٹمپریچر بھی۔ اسکول میں کھٹی چیزیں کھا لیتا ہے اوپر سے ٹھنڈا پانی اور پھر یہ پاپڑوں اور چپس کے نام پر خوب صورت پیکٹوں میں بند جو منرل ملتا ہے ناکھنائی میں رچا ہوا اس نے بچوں کو مسلسل بیمار کر دیا ہے۔ کبھی جو عالی کا گلا ٹھیک رہتا ہو۔" اس نے تفصیل سے بتاتے ہوئے اسجد کی طرف دیکھا وہ کھنکارا۔
"خاتون ایک نظر کرم ادھر بھی۔"
"او ہاں، کیسے ہیں آپ اسجد بھائی! کب آئے؟"
"رات کو اہل لاہور کی محبت میں بھاگا آیا ہوں اور یہاں کی مخلوق اس قدر بے وفا ہے کہ جی چاہ رہا ہے ابھی واپس پلٹ جاؤں۔" اس نے برا سا منہ بنایا تو عاولہ مسکرا دی۔
"کیوں عینی! مناسب پروٹوکول نہیں دیا کیپٹن صاحب کو۔ کیا خبر آنے والے سالوں میں اپنی تاریخ کو دہراتے ہوئے پاکستان کی سربراہی کے حقدار ٹھہرائے جائیں۔"
"بالکل بالکل۔۔۔" اسجد نے سر ہلایا اور پھر چونک کر عاولہ کی طرف دیکھا۔
"کیا کہا تھا۔"
"بات دہرائی جائے تو اپنا حسن کھو دیتی ہے۔"
"ہونا صحافی کی بہن۔ طنز کرنے کے ہنر سے آشنا۔"
"یعنی غور کرنا کل کو تم سے بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے۔"

"ارے ہاں اپنے عبدالعلی بھائی بھی تو۔" اسجد نے کان کھجائے۔
"ویسے آج کل ان کے کالموں کی دھوم ہے۔ کیا بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں۔ بلکہ لوگ شیخ صاحب کا اخبار صرف ان کے اور محب اللہ کے کالموں کی وجہ سے خریدتے ہیں۔"
"ہاں! بھائی جان بھی بتا رہے تھے، سرکولیشن کافی بڑھ گئی ہے۔ ورنہ دور میاں میں تو نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی کہ شیخ صاحب اسے بند کرنے کا سوچنے لگے تھے۔"
علولہ نے تائید کی۔
"تم دونوں باتیں کرو میں تمہارے لیے پانی لے آؤں۔"
"کوک یا پیپسی نہ لانا۔"
"مجھے پتا ہے میں اسکوائش بنا کر لاتی ہوں۔"
"کیوں کیا بائیکاٹ کر رکھا ہے؟"
"نہیں۔" اس کے ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔
"کس کس چیز کا بائیکاٹ کریں گے اسجد یہ تو ہماری رگوں میں اتر گئے ہیں اور ہمارے خون کو زہریلا کر دیا ہے انہوں نے۔" اسے اپنے بابا جان کی بات یاد آ گئی تھی۔
"ہاں یہ تو ہے۔" اسجد بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔
"مجھے ویسے ہی پسند نہیں ہے یہ پیپسی کوک اور اس طرح کے دوسرے مشروبات دراصل بابا جان اس کو محض پیسے کا زیاں سمجھتے ہیں، وہ کہتے ہیں۔۔۔ یہ محض فیشن ہے ورنہ فائدہ وغیرہ کچھ نہیں۔"
"نہیں لسی پسند ہو گی؟" اسجد نے بے حد سنجیدگی سے پوچھا۔
"ہاں۔"
علولہ اپنی سی وی دیکھ رہی تھی۔
"زیادہ نہیں لیکن کبھی کبھی پی لیتے ہیں گرمیوں میں کہتے ہیں آم کھاؤ تو لسی ضرور پینی چاہیے۔ وہی اور دودھ کو ملا کر بنائی گئی لسی۔"

عاولہ نے حسب معمول تفصیل سے بات کی۔ اسجد کو سادہ سی عاولہ اچھی لگتی تھی۔ عام لڑکیوں سے بالکل مختلف گندمی رنگت 'بڑی بڑی چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں 'لانبا قد اور سیدھی مانگ نکال کر بنائے ہوئے بال۔ بڑی سی چادر لپیٹ کر اس گھر میں عنیزہ کے پاس آتے اس نے بارہا اسے دیکھا تھا اس سے باتیں کی تھیں۔ اتنی سادگی کے باوجود بلا کی خود اعتمادی تھی اس میں اور اس نے کئی بار عنیزہ سے عاولہ کی اس خوبی کی تعریف کی تھی اور وہ عنیزہ کی یہ خواہش بھی جانتا تھا کہ عنیزہ اسے عبدالعلی کے لیے بہت پسند کرتی ہے اور اس کی شدید خواہش ہے کہ عاولہ اس کی بھابی بنے لیکن عبدالعلی فی الحال اس موضوع پر بات کرنے کے لیے تیار ہی نہ ہوتا تھا۔

یہ سب سوچ کر اس کے ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

اس نے سوچا کہ آج ضرور وہ عبدالعلی کو اس حوالے سے کریدے گا کہ موصوف کے دل میں کیا ہے۔"

عنیزہ اسکوائش لے آئی تھی۔

"ہاں جی جناب لیجیے۔"

اس کے ہاتھ سے اسکوائش لیتے ہوئے اسجد نے پوچھا۔

"نہیں نانو ابھی سو رہی ہیں۔"

"اچھا۔ اور تم دونوں کیسے جاؤ گی؟۔"

"رکشہ لے لیں گے۔"

"میں چھوڑ دوں گا۔ یوں بھی مجھے احمر سے ملنے جانا ہے۔" ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر کے ٹیبل پر رکھ کر وہ کھڑا ہوگیا۔

"میں گاڑی کی چابی لے کر آتا ہوں۔"

"یہ اسجد۔" عاولہ نے اس کے جانے کے بعد ایک گہری نظر عنیزہ پر ڈالی۔

"مجھے لگتا ہے جیسے تم میں بہت انٹرسٹڈ ہے۔"

"پتا نہیں۔" عنیزہ نے نظریں چرالیں۔ وہ بھی اسجد کی وارفتگیوں کو سمجھ رہی تھی لیکن اسے جہاں آرا سے خوف آتا تھا۔ ان کے مزاج کے رنگ پل میں بدلتے تھے۔ وہ یہاں رہ تو رہی تھیں 'لیکن ان کی رہائش اپنے ہی پورشن میں تھی جو ان کے آنے پر نانو نے کھلوا دیا تھا۔ اپنا کچن الگ تھا جہاں خانساماں اور دوسرے ملازم تھے۔ عنیزہ نانو کے کمرے میں رہتی تھی شروع سے ہی اور نانو کے کمرے کے ساتھ ہی عبدالعلی کا کمرہ تھا باقی گھر کے کمرے بند ہی رہتے تھے۔ ہاں ڈرائنگ روم کھلا رہتا تھا۔ لیکن جب کرنل تاجدار نے ادھر رہائش کا پروگرام بنایا تو نانو اوپر والے پورشن میں اٹھ آئی تھیں۔ یہاں بھی وہ نانو کے کمرے میں رہتی تھی اور ساتھ والا کمرہ اس نے عبدالعلی کے لیے سیٹ کر دیا تھا۔ سامنے ٹی وی لاؤنج تھا۔ ساتھ سٹنگ اور ساتھ ہی لاؤنج کے ساتھ ہی کچن تھا۔

نانو کی پرانی ملازمہ اوپر کا سب کام کر جاتی تھی۔ البتہ جب سے وہ یونیورسٹی سے فارغ ہوئی تھی تو عنیزہ کچن میں نانو کا ہاتھ بٹانے لگی تھی بلکہ اس نے ایک طرح سے نانو کو فارغ ہی کر دیا تھا اور کچن کی ساری ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ جہاں آرا کے مزاج میں سختی تھی اور وہ عبدالعلی اور عنیزہ سے کم ہی مخاطب ہوتی تھیں۔ البتہ بچے چند ہی دنوں میں گھل مل گئے تھے۔ علینہ اور اسجد گھر پر ہوتے تو زیادہ وقت اوپر ہی گزارتے۔ شروع میں وہ اوپر شفٹ ہونے پر اپ سیٹ ہوئی تھی تو نانو نے پیار سے سمجھا دیا تھا۔

"جہاں آرا اور مزاج کی ہے 'شروع سے الگ رہی ہے اپنے میاں کے ساتھ حالانکہ شروع میں تاجدار نے کہا بھی تھا کہ اماں جی جہاں آرا یہیں رہے گی آپ کے پاس لیکن میں نے کہا۔ نہ پتر تیرے سکھ کے لیے بیاہا ہے نہ کہ اپنے لیے۔ تو بیٹی بیٹا! میں نہیں چاہتی کہ کوئی بات ہو۔ مزاج کی تیز ہے نا۔"

اور واقعی ان دو سالوں میں کوئی بات نہ ہوئی تھی۔ نانو کا جی چاہتا تو نیچے جا کر بیٹھی رہتیں اسے بھی لے جاتیں جہاں آرا سے بھی گپ لگتی لیکن عنیزہ نے ہمیشہ محسوس کیا تھا کہ جہاں آرا ماں بڑے تکلف سے بات کرتی تھیں۔ کسی بات کا جواب دیتیں تو یوں جیسے

بحالت مجبوری دے رہی ہوں۔ اس لیے اسجد کی واضح پسندیدگی کے باوجود وہ نظر انداز ہی کرتی تھی۔

"شاید تم نے کبھی اپنی طرف اٹھتی اس کی نظروں پر غور نہیں کیا یعنی!" عاولہ نے خالی گلاس ٹیبل پر رکھا۔

"شاید۔ لیکن میرا خیال ہے 'تمہیں وہم ہوا ہے ایسی کوئی بات نہیں۔" عنیزہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو اب۔"

"ہاں چلو۔" عاولہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں نانو کو بتا دوں۔" اس نے چادر اوڑھتی ہوئی عاولہ کو دیکھا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں 'نانو کو سلام کر لوں۔" اور وہ دونوں آگے پیچھے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئیں۔

☼ ☼ ☼

"لعنت ہے ہم پر۔ مجھے تو اپنے آپ سے شرم آ رہی ہے۔ یہ ہم ہیں۔" عبدالعلی نے چلتے چلتے کوئی پچاسویں بار کہا۔

"کیوں۔ کیا کیا ہے ہم نے۔ ایسا کیا ہو گیا ہے جس پر تمہیں شرم آ رہی ہے۔"

چوہدری عظمت اللہ نے چلتے چلتے ذرا سی دیر کو رک کر اسے دیکھا۔

"بس ہم نے کام ذرا وقت سے پہلے ختم کر لیا ہے اور وقت سے پہلے گھر جا رہے ہیں اور یہ کوئی اتنی بڑی بددیانتی ہرگز نہیں ہے۔ ارے جہاں لوگ اتنی بڑی بددیانتیاں کر رہے ہوں 'وہاں ہمیں اس ذرا سی بددیانتی پر شرمانا بالکل نہیں چاہیے جبکہ ہمارا کام ہو چکا ہے۔" عبدالعلی نے ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھا اور پھر اس کے قدم بہ قدم چلنے لگا۔

دراصل شیخ صاحب آج آفس نہیں آئے تھے اور اخبار تیار تھا۔ یہ ایک ہفت روزہ ایڈیشن تھا۔ شیخ صاحب نے کچھ عرصہ پہلے اسے شروع کیا تو ان کا خیال تھا کہ یہ محض ایک مذہبی اور مذہبی ایڈیشن ہوگا۔ "ندائے اسلام" کے نام سے اس ہفتہ وار اخبار کی سرکولیشن بہت کم تھی۔ بگڑ ہولے ہولے اس میں سیاسی مضامین اور حالات حاضرہ پر تبصرہ چھپنے لگا۔ ایک صفحہ خواتین کے لیے مختص کر دیا گیا اور ایک صفحہ بچوں کے لیے۔ ٹی وی پروگراموں پر بھی تبصرے ہونے لگے۔ یوں دال روٹی کا سلسلہ چل پڑا تھا۔

شیخ صاحب نے جوانی میں ہی۔ اخبار نکالنے کا خواب دیکھا تھا 'لیکن ایک متوسط طبقے کا شخص جس کی تنخواہ سے بمشکل جسم و جاں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہوں وہ بھلا ایسے خواب کہاں افورڈ کر سکتا ہے۔ شیخ صاحب ملازمت کرتے رہے اور یہ خواب ان کے اندر جڑ پکڑتا رہا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے ساری جمع پونجی اس اخبار میں لگا دی تھی۔

انہوں نے محسوس کیا تھا کہ معاشرے میں دین سے متعلق علم کی بہت کمی ہے۔ بہت سی غلط باتیں رائج ہو چکی ہیں۔ جس نے جو سنا اسی پر یقین کر لیا اور وہ جو ایک روزنامے کے خواب دیکھتے تھے جو ایک روز ملک کا سب سے بڑا روزنامہ ہوگا انہوں نے اس ہفت روزے کو ہی خواب کی تعبیر جان لیا۔ ایسے میں پہلے انہیں چوہدری عظمت اللہ جیسا صحافی جو ایک بڑے اخبار میں کام کر چکا تھا اور کسی رنجش کی بنا پر استعفیٰ دے کر نوکری کی تلاش میں تھا مل گیا۔ اور پھر محب اللہ اور عبدالعلی جیسے مخلص کارکن میسر آ گئے یوں اس اخبار کی ڈوبتی نیا تیرنے لگی تھی۔

عبدالعلی اور محب اللہ ان دنوں اس اخبار سے منسلک ہوئے تھے جب امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا تھا اور ایسے میں ان کے کالموں اور تجزیے نے دھوم مچا دی تھی اور اخبار کی سرکولیشن ایک دم بڑھ گئی تھی۔ شیخ صاحب نے ایک پرانی سی بقول عظمت اللہ کے موہنجودڑو کے زمانے کی سوزوکی خرید لی تھی اور کارکنوں کو بھی مناسب تنخواہیں مل رہی تھیں۔ شیخ صاحب کا اصول تھا کہ کام بھلے ہو جائے لیکن چھ بجے سے پہلے کوئی دفتر سے بغیر ضروری کام کے نہیں اٹھ سکتا تھا۔

وہ تقریباً چار بجے فارغ ہو گئے تھے۔ آج محب اللہ

بھی نہیں تھا۔ دو دن قبل وہ اپنے علاقے میں گیا تھا اس کا تعلق جنوبی وزیرستان سے تھا اور عبدالعلی کے ساتھ اس نے پنجاب یونیورسٹی سے ہی جرنلزم میں ماسٹرز کیا تھا۔ دونوں بہت گہرے دوست تھے۔ عبدالعلی کچھ خاموش سا تھا۔

"محب اللہ کے بغیر دل نہیں لگ رہا یار؟۔" چوہدری عظمت اللہ نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو چل گھر چلتے ہیں۔"

"تمہارے گھر؟۔" وہ خالی الذہن سا بیٹھا تھا۔

"ہاں! ہمارے گھر۔ بابا تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ بہت دنوں سے مجھے کہہ رہے تھے کہ کسی روز عبدالعلی کو گھر لاؤ۔ بہت دن ہو گئے آیا نہیں۔ اداس ہیں تمہارے لیے۔"

"اچھا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

آج وہ ٹیکسی سے آیا تھا۔ اس کی گاڑی ورکشاپ میں تھی۔ یہ اس کی ابی کی گاڑی تھی جسے نانو نے فروخت نہیں کرنے دیا تھا۔۔۔ ابو کی گاڑی تو حادثے میں تباہ ہو گئی تھی۔ اسے بھی اس گاڑی سے بہت محبت تھی۔ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اسے ماں کے ہاتھوں کا لمس اسٹیرنگ پر محسوس ہوتا تھا وہ عجیب سے احساسات میں گھر جاتا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے یہ گاڑی اسے تنگ کر رہی تھی لیکن اس کا دل نہیں مانتا تھا اسے فروخت کرنے کو۔

"رکشہ یا ٹیکسی لے لیں "آج گاڑی نہیں ہے میرے پاس۔" اس نے عظمت اللہ سے کہا۔

"ویگن میں چلیں گے۔" چوہدری عظمت اللہ نے اپنی عینک درست کر کے ناک پر جمائی۔

"ہم غریب بندے ٹیکسی یا رکشہ افورڈ نہیں کر سکتے۔"

"پھر چوہدری کس بات کے ہو۔"

"صرف نام کے۔"

اس نے قہقہہ لگایا اور ویگن کو ہاتھ دیا۔ جو پہلے ہی بھری ہوئی تھی۔ تاہم انہیں جگہ مل گئی تھی اور ویگن میں اس کے بالکل پیچھے بیٹھی ہوئی دو لڑکیاں مسلسل بول رہی تھیں موضوع گفتگو ڈاکٹر عبدالقدیر خان تھے۔

"مجھے یقین نہیں آتا۔" لڑکی بار بار کہتی۔

"ایک بار وہ ہمارے کالج میں آئے تھے بطور مہمان خصوصی میں نے بہت قریب سے انہیں دیکھا تھا ان کی گفتگو سنی تھی۔ میں پروگرام کی کمپیئرنگ کر رہی تھی۔ وہ شخص؟ وہ شخص جھوٹا اور بے ایمان نہیں ہو سکتا۔ رابعہ! یقین کرو مجھے اپنی فیس ریڈنگ پر بڑا یقین ہے۔ میرے اندازے کبھی غلط نہیں ہوتے۔ کاش میں ایک بار ان سے مل سکتی رابعہ! ان سے کچھ باتیں پوچھ سکتی۔ پتا نہیں وہ کہاں ہوں گے کس حال میں ہوں گے اب تو اخبارات میں ان کی خبریں بھی نہیں آتیں۔"

"کیا پتا وہ ۔۔۔ سب سچ ہو جو بتایا جاتا ہے۔"

"سچ بھی ہو تب بھی تب بھی رابعہ! کیا قوم کے محسنوں کے ساتھ یہ ہی سلوک کیا جاتا ہے۔ کیا۔۔۔ نہیں رابعہ! ہم بہت کمینے ہیں۔ بہت گھٹیا ہیں۔"

"فار گاڈ سیک فرح! یہ کیا باتیں کرنے لگی ہو لوگ سن رہے ہیں۔"

دوسری لڑکی نے اسے گھر کا تو وہ چپ ہو کر گئی۔ عبدالعلی کا بڑا جی چاہا کہ وہ مڑ کر اس لڑکی کو دیکھے لیکن یہ کتنا نامناسب ہوتا لیکن اس کا دل جیسے کسی گہرے بوجھ تلے دبنے لگا تھا۔ کوئی درد جاگ اٹھا تھا اور کسی زخم سے ٹانکے ادھڑ گئے تھے۔ وہ اپنے اسٹاپ پر اتر کر پیدل ہی گھر کی طرف چلنے لگے تھے۔ چوہدری عظمت اللہ کا گھر اسلامیہ پارک میں تھا۔ روڈ کراس کر کے وہ گلی میں آ گئے۔

"لعنت ہے ہم پر۔"

اس نے زیر لب پھر کہا تو چوہدری عظمت اللہ نے اسے گھورا۔

اس کا دل اس کا ذہن اس کا سارا وجود جیسے شرمسار تھا۔

"اور یہ ہم نے اچھا نہیں کیا۔" اب وہ چوہدری

عظمت اللہ کے گھر کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔

"کیا واپس چلیں؟۔" چوہدری عظمت اللہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں۔" عبدالعلی نے آنکھیں اٹھائیں۔ تاسف میں ڈوبی نظریں۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ تم نے "تم نے ان لڑکیوں کی گفتگو سنی تھی۔"

"اوہ ہاں۔" چوہدری عظمت اللہ نے کان کھجائے۔

"واقعی لعنت ہے ہم پر بڑے شرم کی بات ہے۔ لیکن محب اللہ نے کہا تھا ناہماری تاریخ ایسے ہی المیوں سے پر ہے تو یہ بھی ہماری تاریخ کا ایک المیہ ہے۔"

اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان
ہم نے تمہیں اعزازات سے نوازا
ہم نے تمہاری شان میں
قصیدے لکھے
تم ہمارے محسن تھے
تم نے ہمیں دنیا کی قوموں کی صف میں
سر اٹھا کر کھڑا ہونے کے قابل کیا
تم نے ہمیں ایٹمی طاقت بنایا
تم ہم میں سے تھے
اور ہمیں تم پر فخر تھا
ہم نے تمہیں پوجا کی حد تک چاہا
ہم نہیں جانتے تمہارے ساتھ کیا ہوا
ہم سچ اور جھوٹ کو الگ کرنے
کے ہنر سے ناآشنا ہیں
ہمارے ساتھ اتنی بار جھوٹ بولا گیا
کہ ہمیں سچ کی پہچان نہیں رہی
ہم نہیں جانتے کس چیز نے تمہیں
سچ کہنے سے روکا ہے
تم نے جو کہا
وہ ہمیں سچ نہیں لگتا
پتا نہیں یہ ہماری اندھی عقیدت
اور محبت ہے
یا تمہاری ذات کی سچائی اور خلوص
ہم حقیقت نہیں جانتے
پھر بھی ہم تم سے شرمندہ ہیں
ہاں! ڈاکٹر عبدالقدیر ہم تم سے بہت شرمندہ ہیں۔
یہ جاننے کے باوجود کہ ہماری شرمندگی
تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی
پھر بھی ہم تم سے شرمندہ ہیں۔
ہمارے سر تمہارے سامنے جھکے ہیں
اور ہماری آنے والی نسلیں
شاید ہمیں کبھی معاف نہ کریں

"السلام علیکم۔" اپنے دھیان میں کھویا وہ چوہدری عظمت اللہ کے ساتھ صحن تک چلا آیا تھا۔ عادلہ کی آواز سن کر چونک کر اس نے سر اٹھایا۔

"وعلیکم السلام"

عادلہ کے گندم رنگ رخساروں پر ہلکی سی سرخی تھی اور سیاہ آنکھوں کی چمک یکدم بڑھ گئی تھی۔

"کیسی ہیں آپ؟۔" عبدالعلی نے بمشکل اپنے آپ کو خیالات کے بھنور سے آزاد کیا۔

"فائن۔" وہ مسکرائی۔

"آپ بہت دنوں بعد آئے۔"

"بس مصروفیت تھی۔"

اس نے ایک گہری نظر عادلہ پر ڈالی۔ بے نام سی خوشی اس کے چہرے پر رقص کر رہی تھی۔ کئی بار اس نے محسوس کیا تھا کہ عادلہ اس کے لیے اپنے دل میں کوئی خاص جذبہ رکھتی ہے۔ عادلہ اچھی لڑکی تھی۔ وہ اس کی عزت کرتا تھا اور اس کے خیالات کو پسند کرتا تھا لیکن اس کے علاوہ اس نے اس کے لیے کبھی نہیں سوچا تھا۔ گو وہ عنیزہ کی خواہش سے بھی کسی حد تک باخبر تھا۔ لیکن ابھی اس کی زندگی میں کسی دوسرے فرد کی گنجائش نہ تھی۔

"بابا جان کدھر ہیں؟۔" چوہدری عظمت اللہ نے پوچھا۔

"بڑے کمرے میں ہیں ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔" عادلہ نے بتایا۔

"اچھا تم فاٹافٹ اچھی سی چائے پلواؤ اچھی سی

جائے کا مطلب جانتی ہو نا۔ ہم نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ ہم بابا کے کمرے میں ہیں۔ آؤ یار۔"
وہ عبدالعلی کو اشارہ کرتے ہوئے بڑے کمرے کی طرف بڑھا۔
صحن کو طے کرنے کے بعد برآمدہ آتا تھا۔ برآمدے کے آگے گرل تھی اور سامنے ہی وہ کمرے تھے ایک کمرہ بائیں طرف تھا۔ دائیں طرف کچن تھا اور صحن کے ایک طرف کچھ کیاریاں بنی ہوئی تھیں جن میں گلاب اور موتیا کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اور بھی دو کمرے تھے یہ کمرے چوہدری عظمت اللہ کی شادی کے بعد بنوائے گئے تھے۔ عبدالعلی نے ایک سرسری نظر صحن اور پھر برآمدے پر ڈالی۔ یہ ایک ایسا ہی گھر تھا جیسے عام متوسط گھرانوں کے ہوتے ہیں۔
"آپ جب بھی آتے ہیں ضرور یہاں رک کر پورے گھر کو ایک نظر دیکھتے ہیں۔" عادلہ کی نظر بڑی گہری تھی۔ عبدالعلی بے اختیار مسکرایا۔
"میں یہاں اس گھر کے صحن میں رک کر اس اپنائیت کو کھوجتا اور محسوس کرتا ہوں جو یہاں آکر ہوتی ہے۔" عادلہ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔
"اس گھر میں آپ کو ہمیشہ اپنائیت ہی ملے گی۔ بھلے اور کچھ نہیں۔"
"تھینکس۔" عبدالعلی اس پر ایک نظر ڈال کر چوہدری عظمت اللہ کے پیچھے صحن اور برآمدہ پار کر کے بڑے کمرے میں داخل ہو گیا۔
"ارے میرا بیٹا آیا ہے۔" ریموٹ سے ٹی وی آف کر کے بابا یکدم اٹھے اور اسے گلے سے لگایا۔
"بہت دنوں بعد آئے ہو۔"
"بس بابا! مصروفیت ہی رہی۔"
"بہت اچھا لکھ رہے ہو لیکن یہ عظمت اللہ۔"
انہوں نے بیٹھتے ہوئے عظمت اللہ کی طرف اشارہ کیا۔
"بزدل ہے۔ سچ کہتے ہوئے ڈرتا ہے۔ سچ اس طرح ڈر ڈر کر بولتا ہے جیسے جھوٹ بول رہا ہو اور سچ کو مصلحت کے ملبوس میں چھپا دیتا ہے۔" عظمت اللہ نے کان کھجاتے ہوئے عینک ناک کی پھننگ پر رکھی اور سر جھکا لیا۔
دراصل چوہدری عظمت اللہ نے بتیس سال کی عمر میں ہی زندگی کو بہت قریب سے دیکھ لیا تھا۔ جرنلزم میں فرسٹ پوزیشن لے کر گولڈ میڈل جیت کر جب وہ ایک اخبار سے منسلک ہوا تو بہت جلد اس نے جان لیا کہ اس ملک میں جینے کے لیے ضروری ہے کہ سچ کو سچ نہ کہا جائے بلکہ وہ کہا جائے جو مصلحت کا تقاضا ہو۔
لیکن اتنی سی بات جاننے اور سمجھنے کے لیے اسے تین اخباروں سے نکلنا پڑا تھا اور اب جا کر اس نے حقیقت جانی تھی۔
وہ ان لوگوں میں سے تھا جو سچ کی حقیقت جانتے تھے۔ جو برائی کو برائی سمجھتے تھے۔ لیکن سمجھنے کے باوجود وہ کھل کر اسے برا کہنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ عبدالعلی کا قلم بھی ایک دن ہار جائے گا اگر شیخ صاحب اس کے لکھے گئے میں اتنی قطع و برید نہ کرتے تو اب تک ضرور اس کی چھٹی ہو گئی ہوتی۔
جب آخری بار اس کی جاب ختم ہوئی تھی تو اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ اپنے قلم کو اتنا آزاد نہیں چھوڑے گا۔ اس کا ایک بیٹا تھا ایک چھ ماہ کی بیٹی تھی اور اس نے ان کے لیے بہت سے خواب دیکھ رکھے تھے اور ان خوابوں کو تعبیر دینے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے قلم کو مصلحت کا ملبوس پہنا دے۔ بابا کو اس کا نیا انداز پسند نہ تھا۔ وہ اسے بزدل سمجھتے تھے۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے جو وہ جانتا تھا۔
اس ملک میں سب کچھ آزاد ہوتے ہوئے بھی کچھ بھی آزاد نہ تھا۔
نہ قلم نہ زمین نہ ہاتھ سب کچھ گروی رکھا ہوا تھا ان کے پاس جو خود کو سپرپاور کہتے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ سپرپاور تو صرف اللہ کی ذات ہے۔
"آپ کیا دیکھ رہے تھے بابا؟" عبدالعلی ان کی بات نظرانداز کرتے ہوئے ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔
"کیا دیکھنا تھا۔" ان کے لہجے میں دکھ سا اتر آیا۔
"یہاں عراق سے متعلق خبریں دکھا رہے تھے وہی

دیکھ رہا تھا۔ نجف اور کوفہ کے دفاع کے لیے مقتدی الصدر نے جمعہ کے خطبہ کے بعد تقریر کی اور اس کے بعد فلوجہ پر حملہ کے بارے میں خبر دکھائی ہے کہ اتحادیوں نے فلوجہ پر ہیلی کاپٹر سے بم گرائے کئی عراقی شہید ہو گئے۔ عبدالعلی کا دل بھی دکھ سے بھر گیا۔

"ہاں بابا! عراق میں امن و انصاف کا تو نشان تک نہیں رہا۔ امریکی جارحیت اور اس کی ظالمانہ کارروائیوں کے خلاف حریت پسند مسلمانوں کے رد عمل میں شدت آ رہی ہے۔"

"اور ابھی یہ شدت اور بڑھے گی۔ فدائی حملوں کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے وہ بہت طول کھینچے گا۔ بہت۔" بابا بہت افسردہ تھے۔

"آپ سے کہا تھا بابا مت دیکھا کریں یہ سب۔ اس روز بھی آپ کا بی پی خطرناک حد تک لو ہو گیا تھا۔" چوہدری عظمت اللہ نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔

حالانکہ جب بغداد پر حملہ ہوا تھا تو ہر وقت حالات سے باخبر رہنے کے لیے اس نے خود ہی کیبل لگوایا تھا حالانکہ وہ اس کے سخت خلاف تھا اور کیبل کے اثرات سے متعلق اس نے کئی کالم بھی لکھے تھے۔ بہر حال کیبل کا زیادہ استعمال صرف نیوز چینل کے لیے ہوتا تھا اور یوں بھی ٹی وی بڑے کمرے میں تھا جہاں بابا کا مستقل ٹھکانہ تھا۔ اس لیے بچوں کے کیبل سے متاثر ہونے کا امکان کم تھا یوں بھی عباد ابھی صرف پانچ سال کا تھا۔ عاولہ کو ٹی وی سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ یوں وہ خود کو تسلی دے لیتا تھا کہ بہر حال جب عباد بڑا ہو گا تو وہ کنکشن ختم کروا دے گا۔ فی الحال حالات سے باخبر رہنے کے لیے یہ ضروری تھا۔

"تم اپنے مشورے اپنے پاس ہی رکھا کرو۔"

چوہدری ہدایت اللہ نے ناراضی سے اسے دیکھا تو عبدالعلی کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔

"کیا ہمارا اتنا بھی فرض نہیں بنتا کہ ہم ان کے حالات سے باخبر رہیں۔ ہم کچھ نہیں کر رہے ان کے لیے تو رو ہی بھی نہ۔ کیوں عبدالعلی بیٹا! یہ اسلامی ملک آخر کیوں متحد نہیں ہوتے' یہ آواز کیوں نہیں اٹھاتے۔ تم کیوں نہیں لکھتے عبدالعلی اللہ نے تمہیں قلم دیا ہے۔ لکھنے کی طاقت عطا کی ہے پُر اثر الفاظ دیے ہیں پھر تم کیوں نہیں لکھتے کہ یہ سب اسلامی ملک متحد ہو کر ایک طاقت بن جائیں۔"

"بابا۔"

عبدالعلی نے بے بسی سے انہیں دیکھا ان کی سادگی پر اسے پیار بھی آیا اور رونا بھی۔

"آپ کو کیا پتا ہمارے لفظ کھوکھلے ہیں اور ہمارے قلم مجبور' یہ کسی دل میں کوئی جذبہ نہیں جگا سکتے ہم سب بے حس ہو چکے ہیں یہ اسلامی ملک اگر متحد ہوتے تو مسلمانوں پر اتنی تباہی کیوں نازل ہوتی بابا۔

ہم نے اپنے اڈے امریکنوں کو دیے تاکہ وہ یہاں سے ستاون ہزار آٹھ سو حملے افغانستان کی سرزمین پر کر لے۔ ہم نے چھ سو سے زائد افراد کو کیوبا بھجوا دیا محض اس شبے میں کہ ان کا تعلق القاعدہ سے ہے ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے القاعدہ کا نام تک نہ سنا تھا لیکن۔

ہم دوسروں کے سروں سے چادر کھینچ کر سمجھتے ہیں کہ ہم محفوظ ہیں۔"

وہ یکدم جذباتی ہو گیا تو بابا نے ہولے سے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

"نہ نہ پتر۔ بدگمان نہیں ہوتے۔ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ کبھی تو بھائی کے دل میں بھائی کا درد جاگے گا۔ ایسا نہیں سوچتے یہ تو مایوسی ہے۔ ناامیدی ہے۔"

"مگر کوئی تو آس ہو بابا' کہیں سے تو کوئی روشنی کی کرن پھوٹے۔"

"جھلا نہ ہو تو۔" بابا دھیمے سے ہنسے۔

"روشنی ہے تو۔ کیا حماس کے فدائین' کیا عراق میں ہونے والے اکا دکا فدائی حملے' روشنی کی وہ کرن نہیں ہیں جن سے مردہ ضمیر جاگیں گے؟ جو غیرت و حمیت کو بیدار کریں گے۔"

"پتا نہیں بابا۔" چوہدری عظمت اللہ نے بیزاری سے کہا۔

"ابھی تک تو یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ یہ خود کشی ہے یا شہادت۔"

"تمہیں تو فیصلہ نہیں کرنا یہ۔" ان کے لہجے میں ناراضی در آئی۔

"جنہوں نے فیصلہ کرنا ہے وہ فیصلہ کر کے ہی اپنے سینے سے بم باندھتے ہیں۔"

"مگر اس کا فائدہ بابا؟" چوہدری عظمت اللہ نے بحث کی۔ "دو یہودی ایک فدائی حملے میں ہلاک ہوتے ہیں تو دس فلسطینی بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ پندرہ عراقی مرتے ہیں اور ایک دو اتحادی یا امریکی مر جاتے ہیں تو کیا فائدہ' نقصان کس کا زیادہ ہو رہا ہے۔"

"یہ نفع و نقصان' سود و زیاں کی بات نہیں ہے۔ یہ جذبے و ایمان کی بات ہے۔ یہ عزت سے اور آزادی سے جینے کی بات ہے۔ یہ گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے' والی بات ہے۔ پر تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ کیوں عبدالعلی پتر!"

انہوں نے عبدالعلی کی طرف دیکھا جو ابھی تک اپنی جذباتی کیفیت کے زیر اثر تھا۔

تب ہی عاولہ ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔

چوہدری عظمت اللہ نے تپائی جو قدرے فاصلے پر پڑی تھی اٹھا کر سامنے رکھی عاولہ نے ٹرے میز پر رکھ دی۔ چائے کے ساتھ بسکٹ' نمکو اور سموسے تھے۔ ایک ڈش میں پھلکیاں تھیں۔

"یار لو کچھ۔" عظمت اللہ نے باؤل اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ عاولہ پھلکیاں بہت مزے کی بناتی ہے۔"

"نہیں عظمی! میں صرف چائے لوں گا۔"

"لیکن دن میں بھی تم نے کچھ نہیں کھایا' کچھ تو لے لو یہ سموسہ۔"

"نہیں' ایک بسکٹ لے لیتا ہوں کچھ بھی جی نہیں چاہ رہا۔" عاولہ جو ابھی تک کھڑی تھی۔ اس نے چائے دانی سے چائے کپ میں ڈالی اور اس کی طرف بڑھائی۔

"تھینکس۔"

"آج کل کیا ہو رہا ہے؟۔"

عبدالعلی نے ذہن کو ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔

"جاب کی تلاش۔" عاولہ' عظمت اللہ کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ارے ہاں! تمہارے انٹرویو کا کیا بنا؟۔" بابا کو اچانک یاد آیا۔

"پتا نہیں۔" عاولہ نے کندھے اچکائے۔

"دے دیا تھا لیکن امید کم ہے۔ انہوں نے کچھ خاص سوال نہیں کیے لگتا ہے سلیکشن پہلے ہی ہو چکی ہے۔"

"چلو خیر ہے پھر سہی۔ جابز تو نکلتی ہی رہتی ہیں اخبارات بھرے ہوتے ہیں اشتہارات سے۔"

"اور پتہ نہیں یہ جابز کن کو ملتی ہیں۔" عاولہ نے تلخی سے کہا۔

وہ پڑھائی مکمل کرنے کے بعد تقریباً بیسیوں جگہ انٹرویو دے چکی تھی۔ یہ عارضی جاب جو وہ کر رہی تھی یہ بھی عظمت اللہ نے کسی سے کہہ کر دلوائی تھی۔

"مل جائے گی مل جائے گی تمہیں بھی۔"

بابا نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اسے تسلی دی۔

وہ ہمیشہ پرامید رہتے تھے۔ پچیس سال تک انہوں نے ایک اسکول میں پڑھایا تھا اور بڑی صاف ستھری زندگی گزاری تھی۔ جب پاکستان بنا تو وہ تین چار سال کے تھے انہیں پاکستان اور قائد اعظم سے عشق تھا۔ ان کے والد تحریک آزادی کے پرجوش رکن تھے سو ان کے لہو میں بھی یہ شامل تھا۔ چوہدری عظمت اللہ اور عاولہ ان کی دو ہی اولادیں تھیں۔ عاولہ' عظمت اللہ سے سات سال چھوٹی تھی۔ ابھی میٹرک میں تھی جب والدہ کا انتقال ہو گیا تھا اور چوہدری ہدایت اور عظمت دونوں نے ہی اس کے لاڈ اٹھائے تھے اس لیے اس میں خود اعتمادی بہت تھی۔

"عاولہ!"

عبدالعلی کو اچانک خیال آیا کہ شیخ صاحب خواتین کے صفحے کے لیے خاتون انچارج رکھنا چاہ رہے تھے۔ عاولہ کے دل کی دھڑکنیں یکدم مرتعش ہوئیں۔ عبدالعلی کا اس طرح نام لے کر پکارنا اسے بہت اچھا

لگا۔

"آپ کو لکھنے سے کچھ دلچسپی ہے۔ یا لکھنے سے نہ بھی ہو۔ آپ خواتین کا صفحہ ترتیب دے لیں گی۔ اتنا مشکل نہیں ہوگا۔ ہم ہوں گے نا وہاں آپ کی ہیلپ کر دیں گے۔ ہمارے اخبار کے لیے ایک خاتون کی ضرورت ہے۔ خواتین کے صفحے کے لیے۔"

"میں کر لوں گی۔ میں لکھ بھی لوں گی۔ مجھے بہت اچھا لگتا ہے لکھنا۔" اس کی سیاہ آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

"کیوں بابا کر لوں اخبار کی جاب؟۔"

"کر لو۔"

بابا نے کبھی کسی بات پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ پھر یہاں تو عظمت تھا، عبدالعلی تھا۔

"ٹھیک ہے میں بات کروں گا شیخ صاحب سے۔" عبدالعلی نے خالی کپ میز پر رکھا۔

"اب چلوں۔"

"ارے کہاں چلے، کھانا کھا کر جانا۔" عظمت اللہ نے جو بڑے دھیان سے گردوپیش سے بے خبر سموسہ پلیٹ میں رکھے کھا رہا تھا چونک کر سر اٹھایا۔

"نہیں یار! کھانا گھر پر ہی کھاؤں گا نانو اور عینی انتظار کرتی ہیں۔"

"فون کر دو۔ کیا پک رہا ہے عادلہ؟۔"

وہ خالی پلیٹ میز پر رکھ کر عادلہ سے مخاطب ہوا۔

"بھالی پکا رہی ہیں۔ قیمہ کریلے ہیں۔ ساتھ میں آلو کی بھجیا بھی ہے۔"

"پھر بھی یار تو عبدالعلی کو پسند ہے۔"

"لیکن۔"

عبدالعلی نے کچھ کہنا چاہا لیکن عظمت اللہ نے ٹوک دیا۔

"چپ بیٹھے رہو اور مجھے چائے ڈال کر دو۔ میں چائے پی کر فون کر دیتا ہوں تمہارے گھر۔"

"میرے پاس موبائل ہے۔" عبدالعلی نے جیسے ہار مان لی اور اس کے لیے چائے ڈالنے لگا۔

"بابا! آج آپ کے شاگرد نہیں آئے؟۔" چائے پیتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"آج ان کی چھٹی ہے، جمعہ ہے نا۔" بابا کے پاس کچھ بچے ٹیوشن پڑھنے آتے تھے۔

"اور چائے پئیں گے آپ؟۔" عادلہ نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں شکریہ۔"

اس کی نظریں عادلہ کی نظروں سے جا ملیں۔ چمکتی سیاہ آنکھیں کیسی بے ریا تھیں اور ان آنکھوں میں جو رنگ دمک رہے تھے وہ ان رنگوں کے معنی سمجھتا تھا لیکن اس نے ان سے نظریں چرا لیں اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

"تو تم کل واپس جا رہے ہو۔" عنیزہ نے ناشتہ ٹیبل پر لگاتے ہوئے پوچھا۔ اسجد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ویسے تمہیں میرے آنے یا جانے سے کیا فرق پڑتا ہے، ہے نا۔" اس نے ایک گہری نظر عنیزہ پر ڈالی۔

بالوں کی ایک لٹ چٹیا سے نکل کر دائیں رخسار پر لہرا رہی تھی۔ گلابی رخساروں پر چمک تھی۔ اس نے دائیں ہاتھ سے لٹ کو کان کے پیچھے کیا اور اسجد کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"تم ناشتے میں سلائس لو گے یا۔"

"کیوں، مجھے یہ پراٹھے کاٹتے ہیں کیا۔"

اس کا انداز چڑا کر کھانے والا تھا۔ اسے اپنی بات نظر انداز کیے جانے پر بہت غصہ تھا۔ عنیزہ نے بے اختیار سر جھکا کر اپنی مسکراہٹ چھپائی لیکن اسجد نے اس کے ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ کو دیکھ لیا اور یکدم نرم لہجے میں بولا۔

"عینی! جب تم مسکراتی ہو تو بہت اچھی لگتی ہو۔"

عنیزہ سٹپٹا گئی۔

"عینی۔" اس کی آواز بھاری ہو گئی۔

"عینی! تم بہت خوب صورت ہو۔ اتنی جتنا کہ کسی شاعر کا خیال جتنا کسی مصور کا تخیل۔"

"اسجد۔" عینی نے بمشکل نظریں اٹھائیں اور تیزی سے دھڑکتے دل کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"ارشاد۔" دلیاں ہاتھ دل پر رکھ کر وہ تھوڑا سا جھکا۔

"فضول باتیں مت کرو۔" وہ جھینپ گئی۔

"ہائے! سارے رومینس کا بیڑا غرق کر دیا تم نے" وہ جھلا گیا۔

"کس قدر احمق لڑکی ہو تم عینی! اگر میں کسی اور لڑکی سے یہ سب کہتا تو وہ آسمانوں پر اڑنے لگتی۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"اور میں" "کسی اور لڑکی" "نہیں ہوں۔"

عنیزہ کی دھڑکنیں اعتدال پر آ گئی تھیں اور وہ اسجد کے چہرے پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔

"اس بات نے تو مار دیا ہے۔" اسجد نے زیر لب کہا۔ عنیزہ نے گھور کر اسے دیکھا۔

"تم سنجیدہ نہیں ہو سکتے اسجد۔"

"ہائے گاڈ ابھی جب میں تم سے بات کر رہا تھا تو اتنا سنجیدہ تھا جتنا زندگی میں کبھی نہیں ہوا۔" عینی یکدم پلٹ گئی اسجد کی نظروں کی حدت ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔

اس نے ٹی وی لاؤنج میں ہی کھڑے کھڑے آواز دی۔

"اب آ بھی جائیں ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

پہلے نانو اور ان کے پیچھے عبدالعلی اپنے کف لنکس لگاتا اپنے کمرے سے نکلا۔

"ارے میرا بچہ آیا ہے۔"

نانو نے اسجد کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر چوما۔

"تم نے پہلے کیوں آواز نہیں دی عینی! میں تو بس تلاوت کر ہی چکی تھی یونہی ستانے کو ذرا ٹیک لگائی تھی۔"

"ان کو تو غصہ آ رہا ہوگا کہ ایک پراٹھا اور بنانا پڑے گا۔"

"نہ، نہ میری عینی ایسی نہیں ہے۔ بالکل اپنی ماں جیسی ہے فراخ دل۔ سادہ مزاج محبت کرنے والی۔"

"اچھا لیکن ہم سے تو محبت نہیں کرتیں۔" اسجد نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔

"نہ بچے! میری عینی تو ہر ایک سے محبت کرتی ہے۔"

"اور یار! تم سناؤ کب تک واپسی ہے؟۔" عبدالعلی اس کے برابر والی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"کل صبح نکلوں گا۔"

"بچے تو ابھی سب سو رہے ہوں گے۔"

"ہاں گیارہ بجے سے پہلے کس نے اٹھنا ہے اور ہم ٹھہرے سحر خیز فوجی بندے۔ لاؤنج میں بیٹھا ٹی وی سے دل بہلا رہا تھا کہ آملیٹ اور پراٹھوں کی خوشبو اوپر کھینچ لائی۔"

"ارے بچے! باتوں میں ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے شروع کرو۔"

نانو نے دونوں کی پلیٹ میں پراٹھے رکھے۔

"اور عینی بیٹا! تم بھی آجاؤ کہاں چلی گئیں۔"

"نانو چائے کو دم دے کر آ رہی ہوں۔"

"ایک راز کی بات بتاؤں نانو۔" نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے اسجد نے کہا۔

"عینی جیسے پراٹھے اور چائے کوئی نہیں بنا سکتا۔۔۔ کتنی بار اپنے بیٹ مین سے کہا کہ آج ناشتے پر پراٹھے اور آملیٹ ہی کھلا دو۔۔۔ مگر یہ والا مزا نہیں آیا اور نہ ہی بازار سے خریدے ہوئے اچار میں یہ خوشبو ملی۔"

"یہ اچار تو میں خود ڈالتی ہوں بچے!"

"عینی کو بھی سکھا دیں۔ سسرال میں کام آئے گا۔"

اس نے بڑی معصومیت سے اندر آتی عینی کو دیکھا جو اسے گھورتے ہوئے نانو کے پاس ہی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی اور عبدالعلی کو دیکھ رہی تھی۔

"بھائی! آپ کو آج جانا ہے آپ کی چھٹی نہیں ہے کیا؟۔"

"ہاں چھٹی تو ہے لیکن مجھے جانا ہے۔"

"ویسے علی! یار یہ اخبار کی جاب کچھ بور نہیں ہے؟۔"

"نہیں، ساری بات دلچسپی کی ہوتی ہے۔ جہاں دلچسپی ہو وہاں کچھ بھی بور نہیں ہوتا۔" عبدالعلی نے ٹشو سے ہاتھ صاف کیے۔
"بھائی اور لیں نا آپ نے تو بالکل ذرا سا لیا ہے پھر سارا دن بھوکے رہیں گے۔"
"نہیں، آج جلد آجاؤں گا اور باقی کا سارا دن اسجد کے نام۔"
"رئیلی عبدالعلی یار خوش کردیا۔" اسجد یک دم خوش ہوگیا۔ وہ عبدالعلی سے بہت بے تکلف تھا گو عمر میں اس سے چھوٹا تھا۔ نانو بھی خوش ہوگئیں۔
"شکر ہے تم بھی کچھ دیر گھر پر نظر آؤ گے ورنہ میں تو ترس ہی گئی ہوں تم سے باتیں کرنے کو۔ توجہ یہ اخبار کی نوکری۔ تمہارے ماموں نے بھی کتنا منع کیا تھا اور کتنا جی چاہتا تھا میرا کہ اپنے ماں باپ کی طرح تم بھی ڈاکٹر بنو۔"
"نانو! میرا جس طرح کا مزاج اور رجحان تھا میں ڈاکٹر نہیں بن سکتا تھا۔"
"چلو ڈاکٹر نہیں بنے تھے تو کہیں کوئی اچھی نوکری کرتے تاجدار نے کہا بھی تھا کہ وہ کسی اچھے ادارے میں تمہیں جاب دلوا دیں گے۔"
"ہاں! پاپا کہہ رہے تھے عبدالعلی کہ تمہارا اخبار بھی بس ایویں سا ہی ہے۔ تنخواہ بھی کچھ خاص نہیں۔"
"ہاں۔۔۔ لیکن وہاں میں اپنا کتھارسس کرسکتا ہوں۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے کہہ لیتا ہوں۔ سب نہیں لیکن کچھ تو کہہ لیتا ہوں اسجد! اور اگر نہ کہوں تو دم گھٹ جائے میرا۔ مر جاؤں میں۔"
"اللہ نہ کرے بچے! صبح سویرے منہ سے اچھی بات نکالتے ہیں۔"
نانو چلی گئیں۔ عنیزہ نے چائے بنا کر عبدالعلی اور اسجد کے سامنے رکھی۔
"رئیلی یار عبدالعلی!" اسجد نے چائے کا کپ اٹھایا۔
"وہاں میس میں کچھ لوگ تمہارے کالمز کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن ایک بات تو بتاؤ یہ جو کچھ تم لکھتے ہو۔ یہ سب کیا تمہیں یقین ہے کہ ایسا ہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے اس کا۔ تم تو عراق سے ہزاروں میل دور یہاں بیٹھے ہو لیکن تمہارے کالم پڑھ کر لگتا ہے جیسے عراق میں بیٹھ کر لکھ رہے ہو اور پھر اتنا تاثر کیسے آجاتا ہے۔"
"ثبوت اسجد! مائی کزن! ثبوت یہ ٹی وی چینلز جو سب دکھا رہے ہیں۔ بتا رہے ہیں اور اخبارات میں جو لکھ رہے ہیں۔ ساری دنیا کے اخبارات میں سب چھپ رہا ہے۔ کئی ویب سائیٹ ایسی ہیں جو لمحہ لمحہ کی خبریں دیتی ہیں اور پھر میرا دل ہے جو ان سب کو دیکھ کر خون کے آنسو روتا ہے اور جب میں خون دل میں اپنا قلم ڈبو کر لکھتا ہوں تو تاثر خود بخود پیدا ہوجاتا ہے اور وہ غیر نہیں ہیں۔ اسجد وہ ہمارے اپنے ہیں۔ ہم ایک خدا ایک رسول ایک کتاب کے ماننے والے ہیں اسجد پھر ہمارا دل ان کے لیے کیوں نہ تڑپے آنکھیں کیوں نہ آنسو بہائیں۔" عبدالعلی جذباتی ہوگیا۔
"لیکن پاپا رات کو کہہ رہے تھے کہ میڈیا بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے جیسے اب جنوبی وزیرستان کے متعلق کہا جارہا ہے کہ پاکستانی فوج امریکہ کے ساتھ مل کر اس پر چڑھائی کا ارادہ رکھتی ہے وغیرہ وغیرہ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔"
"کیا تم نہیں جانتے اسجد کہ ہم نے اپنوں کو خود اپنے ہاتھوں زنجیریں پہنا کر امریکہ کو سونپ دیا وہ چھ سو جوان جو کیوبا بھیجے گئے کیا ہمارے اپنے نہ تھے؟ اتنے ہی اپنے جتنے جنوبی وزیرستان کے رہنے والے ہیں۔"
"لیکن علی! وہ تو غیر ملکی تھے ان کا تعلق القاعدہ سے تھا۔"
"کیا ہمارے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے اسجد۔ اگر ایسا تھا بھی تو عدالتوں میں اس کا فیصلہ ہوتا لیکن کیا ہماری عدالتیں اتنی ہی نااہل ہیں کہ ہمارے اپنوں کا فیصلہ دوسرے کریں۔ لوگ تو اپنے مجرموں کو بھی دوسرے ممالک کے حوالے نہیں کرتے اور ہم نے ان اپنوں کو دوسرے کے آگے ڈال دیا جن کا جرم ابھی ثابت بھی نہیں ہوا تھا۔

جانتے ہو اسجد! ان چھ سو لوگوں میں ایک عبدالرحمٰن بھی تھا۔ یہ لڑکا یونیورسٹی میں میرے ساتھ پڑھتا تھا۔ اپنے ملک سے دور وہ یہاں فزکس کی تعلیم حاصل کرنے آیا تھا۔ لیکن اس کا جرم یہ تھا کہ وہ سوڈان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی ایک چھوٹی سی بہن تھی ایک بوڑھا نابینا باپ تھا ایک چھوٹا بھائی تھا اور ایک ماں تھی جس کی باتیں کرتا وہ کبھی نہ تھکتا تھا۔ ایک یونیورسٹی فنکشن میں میری اس سے ملاقات ہوئی تھی اور یوں ہمارے درمیان دوستی کا تعلق اور رشتہ بہت گہرا ہوگیا تھا۔ اسے سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اسامہ بن لادن کو اتنا ہی جانتا تھا جتنا تم اور میں جانتے ہیں۔ وہ اسکالرشپ پر یہاں آیا تھا۔ اس کے عزائم بہت بلند تھے وہ سائنس دان بننا چاہتا تھا۔
لیکن اس کا جرم یہ تھا کہ سوڈان میں اس کے بوڑھے نابینا باپ پر الزام لگایا گیا کہ اس نے اسامہ بن لادن کو پناہ دی تھی اور اسے گرفتار کرلیا گیا اس کے خاندان پر تشدد کیا گیا اور اس روز وہ بہت بے چین تھا چھوٹی بہن نے اسے فون پر روتے ہوئے بتایا تھا۔
"دنیا بابا کو پکڑ کرلے گئے ہیں اور بھائی کو بھی۔ ماں کو انہوں نے ٹھڈے مارے ہیں۔ اللہ کرے مر جائے یہ اسامہ۔"
وہ رو رہی تھی وہ ننھی بچی جو سمجھتی تھی کہ ان پر یہ مصیبت اس کی وجہ سے آئی ہے۔ وہ نہ ہوتا تو یہ سب نہ ہوتا۔ اس روز اس نے واپسی کی کوشش شروع کردی تھی۔ حالانکہ ابھی اس کا رزلٹ نہیں آیا تھا اور ابھی اسے کچھ دن اور رکنا تھا یہاں۔ وہ شاید ایئرپورٹ پر ٹکٹ لینے گیا تھا کہ اسے گرفتار کرکے سی آئی اے والوں کے حوالے کردیا گیا۔ میں نے دوسرے روز کے اخبارات میں پڑھا۔ ایک سوڈانی طالب علم کو القاعدہ کا رکن ہونے کے شبہ میں گرفتار کرلیا گیا۔ میں اس کی رہائش گاہ پر گیا وہ وہاں نہیں تھا۔
وہ ساری چیزیں جو اس نے بڑے شوق سے اپنی بہن اور ماں کے لیے خریدی تھیں۔ وہ یونہی پیکٹوں میں بند رہ گئیں اور اسے شاید کیوبا بھیج دیا گیا۔۔۔ کیپٹن اسجد تاجدار! وہ اتنا ہی معصوم اور انجان تھا جتنے کہ تم ہو۔ لیکن ہم نے۔" وہ تلخی سے ہنسا۔ "ہم نے قسم کھا رکھی ہے کہ ہم نے اس بڑی طاقت کو خوش رکھنا ہے خواہ ہمیں اپنے ہاتھوں سے اپنے گلے کاٹ کر اپنے سر اس کے سامنے رکھنے پڑیں۔"
وہ سب ساکت بیٹھے اسے سن رہے تھے۔ وہ خاموش ہوا تو کسی نے کوئی تبصرہ نہ کیا البتہ نانو نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھ کر اٹھتے ہوئے عبدالعلی کی طرف بہت محبت و شفقت سے دیکھا اور دردمندی سے بولیں۔
"بچے! اتنا حساس نہ بن، نہیں تو زندگی مشکل ہو جائے گی۔"
"اور زندگی اب کون سا آسان ہے۔" عبدالعلی نے تلخی سے سوچا۔ ہر لمحہ دکھ دیتی اور اذیت دیتی اور وہ چوہدری عظمت اللہ کہتا تھا۔
"عبدالعلی! تیرے لیے تو زندگی بہت آسان ہے اور خوب صورت ہے۔ تیرے باپ کا اتنا پیسہ ہے تیرے اکاؤنٹ میں، تو چاہے تو زندگی بہت خوب صورت ہو جائے گی تیرے لیے لیکن تجھے خود شوق ہے زندگی کو مشکل بنانے کا۔ تو کیوں اوروں کے غم میں ہلکان ہوتا ہے۔ پہلے تجھے افغانستان کا غم تھا۔ پھر تو مہینوں ایمل کانسی کے لیے لفظ روتا رہا۔ پھر سقوط بغداد پر تیرے لفظوں نے بین کیا۔ اور اب تجھے اہل عراق کا غم ہے۔ تو نے عبدالقدیر خان کے لیے لفظوں کو لہو رلایا۔ یار عبدالعلی! زندگی کو سوکھا کرلے اور ان سارے دکھوں کی گرد دل سے جھاڑ دے اور مزے کر۔" لیکن اس کے دل کی ساخت اللہ نے نہ جانے کیسی بنائی تھی کہ ہر دکھ اس کے اندر رفت ہوجاتا تھا۔
"عینی بیٹا! میں نیچے جارہی ہوں۔ تم برتن سمیٹ کر بریانی کے لیے گوشت نکال دینا۔ پھر نیچے آکر ماموں سے مل لو۔ تاجدار بہت شوق سے بریانی کھاتا ہے۔"

"اور نانو میں بھی۔" اسجد نے خالی کپ عنیزہ کی طرف بڑھایا۔
"پلیز ایک کپ اور بنا دو۔ پھر تو وہاں جا کر اسحاق خان کے ہاتھوں کا بنا جو شاندہ ہی پینا ہے۔"
"او کے اسجد۔" عبدالعلی جو ابھی تک اپنی شدید جذباتی کیفیت کے زیر اثر خاموش کھڑا تھا دھیرے سے بولا۔
"ان شاء اللہ واپسی پر گپیں لگائیں گے۔"
"بھائی ایچ کھر پر ہی کرنا ماموں بھی ہوں گے۔"
"اور ربانی بھی بنے گی۔" اسجد نے لقمہ دیا۔
"آجاؤں گا۔"
عبدالعلی نے جانے سے پہلے ہمیشہ کی طرح عنیزہ کے قریب جا کر اس کے سر پر پیار کیا اور ہمیشہ کی طرح اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ نانو کے ساتھ ہی عبدالعلی بھی سائیڈ ٹیبل سے اپنی گاڑی کی چابیاں اٹھاتا باہر نکل گیا۔
عنیزہ نے چائے بنا کر اسجد کے سامنے رکھی اور اٹھی تاکہ فریزر سے گوشت نکال سکے کہ اسجد نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا دیا۔
"بیٹھو مجھ سے بھاگتی کیوں ہو۔"
اسجد نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا جو بالکل غیر ارادی طور پر کچھ دیر پہلے تھام لیا تھا لیکن عنیزہ کو لگ رہا تھا۔ جیسے اس کا ہاتھ جل رہا ہو۔
"مجھے کام کر کے نیچے جانا ہے ماموں سے ملنے۔"
"پاپا کہیں بھاگے نہیں جا رہے۔ یہیں ہیں اور کل صبح جائیں گے۔" اس نے ناراضی سے اسے دیکھا۔
"آخر تم کیا چاہتے ہو اسجد؟"
"تمہیں چاہتا ہوں۔" اسجد شریر ہو گیا۔

"تم کبھی سنجیدہ نہیں ہو سکتے اسجد۔"
"میں سچ مچ سنجیدہ ہوں عینی! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں نے بہت سوچا ہے۔ بہت غور کیا زندگی کے ہر راستے پر مجھے تم کھڑی نظر آئی ہو۔ تمہارے بغیر زندگی کا سفر بالکل بے معنی ہے۔"

"اور وہ مجرحزو کی حسین و دلکش بیٹی۔"
"ارے لعنت بھیجو اس پر۔" اسجد نے اس انداز سے کہا کہ عنیزہ بے اختیار ہنس پڑی۔
"عینی! کیا تم محبت کو سمجھتی ہو؟"
"ہاں ڈراموں کہانیوں اور افسانوں میں پڑھی اور دیکھی ہے۔"
"وہ تخیل ہوتا ہے لیکن میں سچ مچ کی محبت کی بات کر رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے جیسے میں تمہاری محبت میں ڈوب چکا ہوں۔ لو ہو یار ٹھیک طرح سے اظہار کرنا بھی نہیں آتا مجھے۔" وہ جھنجلایا۔
"تو کس نے کہا ہے اظہار کرنے کو۔" عنیزہ مسکرائی وہ اس کی کیفیت کو انجوائے کر رہی تھی اور دل کے اندر خوشگوار دھڑکنوں کا رقص جاری تھا۔ محبت سے بھلا کون منکر ہو سکتا ہے اور وہ کب سے اسجد سے بھاگ رہی تھی لیکن کب تک بھاگ سکتی تھی۔ دل نے انوکھے انداز میں دھڑک کر اس کی محبت کا اعتراف کر لیا تھا۔
"بتاؤ عینی! میں کیا کروں؟" اسجد نے بے بسی سے اسے دیکھا۔
"تمہیں کیا کرنا چاہیے؟" عینی نے ٹرے میں خالی کپ اور پلیٹیں رکھتے ہوئے اسے دیکھا۔
"مجھے پاپا اور مما سے بات کرنا چاہیے ہے نا۔" اس نے چٹکی بجائی۔
"بالکل۔" عینی نے بے خیالی میں سر ہلا دیا۔
"کیا واقعی؟" اسجد نے چونک کر اس کے رخساروں پر پھیلتے رنگوں کو دیکھا۔
"تم بہت پیاری لگ رہی ہو عینی! ذرا پھر سے کہو ابھی کیا کہا تھا۔"
"تمہارا سر۔" عنیزہ نے ٹرے اٹھائی۔
"ارے یہ کپ بھی لیتی جاؤ۔"
"رکھ دو ٹیبل پر۔" اس نے کچن میں جاتے ہوئے کہا۔
"اٹھا لوں گی۔" اسجد کے سامنے مزید ٹھہرنا اسے مشکل لگ رہا تھا اور وہ بے حد خوش خوش سا بیٹھا تھا۔

اظہار کا یہ انوکھا سا انداز دل کو بہت بھایا تھا۔

برق و شرر ہے امتحاں حوصلہ کلیم کا
دوست کی بارگاہ میں طور بھی اک مقام ہے
مے کدہ جمال میں کیا ہیں رسوم مے کشی
آنکھ تو سیر ہو چلی دل وہی تشنہ کام ہے

دھیرے دھیرے گنگناتے ہوئے وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا اور اطمینان کا سانس لیتے ہوئے عنیزہ نے برتن سمیٹ کر سنک میں رکھے۔ اور بالوں کو انگلیوں سے درست کرتی ماموں سے ملنے کی غرض سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ لاؤنج کے بیچوں بیچ کھڑی جہاں آرا دبے لفظوں میں اسجد کو ڈانٹ رہی تھیں۔
"مجھے یہ سب پسند نہیں ہے اسجد! نانو نیچے آگئی تھیں تو تمہیں وہاں اکیلے عنیزہ کے پاس بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔"
"مما۔"
اسجد نے دبا دبا سا احتجاج کیا۔ اس نے وہیں سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے ٹی وی لاؤنج میں نظر دوڑائی۔ لاؤنج خالی تھا یقیناً نانو ماموں کے بیڈ روم میں ہوں گی۔
"اسجد میں سب سمجھتی ہوں لیکن جو تم سوچ رہے ہو ہرگز نہیں ہوگا۔"
"ارے مما! کیا آپ نجومی ہو گئی ہیں۔ میری سوچ کی کیسے خبر ہو گئی آپ کو۔" اسجد نے بات مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی۔
"میں سیریس ہوں اسجد۔" جہاں آرا کے لہجے میں سختی تھی۔
"میں نے تمہارے اور اسعد کے لیے کچھ اور سوچ رکھا ہے۔" اور عنیزہ کو لگا جیسے ابھی کچھ دیر پہلے جن خوشگوار دھڑکنوں نے دل کے آنگن میں جو رنگ بکھیرے تھے وہ سارے رنگ یکدم پھیکے پڑ گئے ہوں۔
"اور میں ابھی لہجے سے ڈر گئی تھی اسجد لیکن تم۔"
اس نے نچلے ہونٹ کو بے دردی سے دانتوں تلے دبایا اور تیزی سے واپس مڑی۔ لیکن رخساروں تک آجانے والے آنسوؤں پر اسے اختیار نہ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ فرح ہاشمی ہیں۔" شیخ صاحب نے عبدالعلی کی طرف دیکھا۔
"ہم نے جو لیڈی رپورٹر کے لیے اشتہار دیا تھا اس کے لیے آئی ہیں۔"
عبدالعلی نے جو کسی کام سے شیخ صاحب کے کمرے میں آیا تھا ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی۔
"شیخ صاحب میں۔"
"بیٹھو عبدالعلی۔" انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
"پہلے ان سے بات ہو جائے پھر تمہاری بات بھی سنتا ہوں۔"
"تو مس فرح! آپ پر ایک بات واضح کر دوں ہم فی الحال بہت زیادہ سیلری نہیں دے سکتے۔ تنخواہ تین ہزار ہوگی۔"
"او کے۔" اس نے کندھے اچکائے۔
"اس سے پہلے آپ نے کسی اخبار میں کام کیا ہے؟"
شیخ صاحب نے سوال کیا عبدالعلی خاموشی سے ایک طرف کرسی پر سر جھکا کر بیٹھ گیا تھا۔
"نہیں سر! میں نے کسی اخبار میں کام نہیں کیا اور میں آپ پر ایک بات واضح کر دوں میں نے نہ تو جرنلزم میں ماسٹر کیا ہے اور نہ ہی میں اخبارات کے متعلق کچھ زیادہ جانتی ہوں۔ میں نے انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کیا ہے۔"
"اور پھر بھی آپ اس جاب کے لیے آگئی ہیں۔" شیخ صاحب کو حیرت ہوئی۔
"دراصل۔" لڑکی نے سر جھٹک کر پیشانی پر جھک آنے والے بالوں کو پیچھے کیا۔
"میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتی ہوں۔ میں جو سوچتی اور محسوس کرتی ہوں۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ اس کے لیے کسی اخبار سے منسلک ہو جاؤں تو۔"
"لیکن ہم نے لیڈی رپورٹر کے لیے اشتہار دیا

تھا۔" شیخ صاحب نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"تو میں اگر ضرورت پڑی تو رپورٹنگ بھی کر لوں گی۔"

"آپ نے اشتہار پڑھا تھا؟۔" شیخ صاحب نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہاں! سرسری نظر سے دیکھا تھا لیکن جب اشتہار دیکھا تھا تو ذہن میں جاب کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"دراصل ہمارے گھر میں اردو اخبار نہیں آتا۔ اپنی ایک دوست رابعہ کے گھر دیکھا تھا آپ کا اخبار اور مجھے آپ کے اخبار کی یہ بات بہت پسند آئی کہ اس میں بے لاگ تبصرہ ہوتا ہے۔ حالات حاضرہ پر۔ اور میں بھی لکھنا چاہتی ہوں۔"

"ہمارے اخبار میں ایک صفحہ خواتین کے لیے بھی ہوتا ہے اسے بھی ترتیب دینا اور دیکھنا ہوگا۔"

"سر آئی نھنک کہ میں کر لوں گی۔"

"آپ نے اردو اخبار کبھی نہیں پڑھا۔ آپ نے انگلش میں ماسٹرز کیا ہے تو پھر ایک اردو اخبار میں کیسے کام کریں گی؟۔"

شیخ صاحب سوال پر سوال کر رہے تھے۔ اور عبدالعلی سوچ رہا تھا یہ آواز اتنی مانوس سی کیوں لگ رہی ہے جیسے پہلے کبھی یہ آواز سن رکھی ہو یہ لہجہ بھی آشنا سا لگ رہا تھا۔ اپنی جان پہچان کی سب خواتین کے متعلق اس نے سوچ لیا تھا۔ تیز تیز بولتی ہوئی یہ لڑکی۔

"سر پروین شاکر نے بھی انگریزی میں ماسٹرز کیا تھا لیکن وہ اردو کی ایک اچھی شاعرہ تھیں۔" لڑکی مسکرائی۔

"آپ نے کبھی کوئی آرٹیکل لکھا ہو تو اگر ساتھ لائی ہیں تو دکھائیں۔"

"سر! میں نے یہ ایک آرٹیکل لکھا تھا ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے متعلق' یہ سارے الزامات جو ان پر لگائے گئے ان پر تجزیہ و تبصرہ ہے۔ میری فرینڈ رابعہ کہتی ہے کہ......"

اور عبدالعلی کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ویگن کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تیز تیز بولتی لڑکی "بی لیو می رابعہ میرا دل چاہتا ہے کہ کسی طرح میں ڈاکٹر قدیر سے مل سکوں۔ ان سے پوچھ سکوں اصل حقیقت کیا ہے؟۔"

اور کبھی کسی لڑکی کو دیکھنے کی خواہش اتنی شدت سے عبدالعلی کے دل میں پیدا نہیں ہوتی تھی۔ جتنی اپنے پیچھے بیٹھی اس لڑکی کو جو بڑے بولڈ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھی یہ سوچے بغیر کہ وہ ویگن میں بیٹھی ہے۔

رابعہ۔۔۔ فرح۔

یکدم ہی عبدالعلی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

وہ شولڈر بیگ سے پیپرز نکال رہی تھی۔ سانولی رنگت' شولڈر کٹ بال' چھوٹی سی ناک جو اس کے چہرے کے نقوش پر سجی ہوئی تھی۔ چھوٹا سا دہانہ' میک اپ سے بے نیاز چہرے پر ایک چمک سی تھی۔ درمیانی سی آنکھیں نہ بہت بڑی نہ چھوٹی۔ لیکن پلکیں بہت گھنی اور اوپر کو مڑی ہوئی۔ سادا سے شلوار سوٹ میں ملبوس جس کا دوپٹہ گلے میں پڑا زمین کو چھو رہا تھا۔ سادہ سے نقوش کے ساتھ بھی اس میں ایک جاذبیت اور کشش تھی۔ عبدالعلی کو لگا جیسے اس ایک بھرپور نظر نے دل میں کہیں ہلکی سی ہلچل مچائی ہو۔ جیسے کوئی پانی میں کنکر پھینکے اور کچھ دیر بعد ہی پانی معمول پر آجائے۔

"سر یہ۔" اس نے آرٹیکل نکال کر میز پر رکھا۔ ایک نظر عبدالعلی پر ڈالی۔ شاید اس نے اس کی محویت محسوس کر لی تھی۔ عبدالعلی نے سٹپٹا کر نگاہیں جھکالیں۔

"ہوں۔" شیخ صاحب نے سرسری نظر سے [illegible] صفحہ دیکھا۔

"آپ کی اردو تو بہت اچھی ہے جبکہ آپ کے [illegible] آپ نے اردو اخبارات اور اردو لٹریچر بہت کم پڑھا ہے۔"

"ایسا ہی ہے۔" وہ بیگ کے اندر کچھ ٹٹول رہی تھی اور عبدالعلی کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ

گئی۔ ویگن میں سفر کرنے والی کا دعوی تھا کہ اس کے گھر اردو اخبارات نہیں آتے تھے صرف انگریزی۔ اور پتا نہیں لوگ کتنے منافق اور جھوٹے کیوں ہوتے ہیں۔ بلاوجہ جھوٹ محض اپنا آپ چھپانا حالانکہ یہ لڑکی اگر خود کو کسی اعلا طبقے کا ظاہر نہ بھی کرے تب بھی اس میں کچھ ایسا ہے جو اٹریکٹ کرتا ہے اور عبدالعلی کو لگا تب چند لمحے پہلے جو دل میں لمحہ بھر کو ارتعاش سا پیدا ہوا تھا وہ شاید دل کا دھوکا تھا۔

"سر! کیا یہ مضمون چھپ سکتا ہے۔" بیگ کی زپ بند کر کے اب وہ شیخ صاحب کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"نہیں' یہ تو اب پرانی بات ہو چکی۔"

"اتنی پرانی سر! اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ مچل کھا کر رہ گئی۔

"کیا زندہ قومیں اپنے محسنوں کو اتنی ہی جلدی بھلا دیتی ہیں۔ کیا ہمیں بحیثیت قوم یہ حق نہیں ہے کہ ہم جان سکیں کہ ہمارے محسن کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟۔" عبدالعلی نے چونک کر سر اٹھایا۔ اس کے سانولے رخساروں پر سرخی کھنڈ گئی تھی۔

"سر! یہ آرٹیکل مجھے دکھائیں میں دیکھوں گا کہ اس میں کتنی گنجائش ہے۔"

"یہ عبدالعلی صاحب ہیں جو ہمارے اخبار میں "سچ [illegible]" کے عنوان سے کالم لکھتے ہیں۔" لڑکی کی آنکھیں یکدم چمکنے لگیں وہ عبدالعلی کو دیکھنے لگی۔

"میں نے آپ کے صرف دو کالم پڑھے ہیں رابعہ کے [illegible]۔ وہاں سب "تمدن اسلام" "ہمت شوق سے" [illegible] ہیں آپ کے وہ دونوں کالم زبردست تھے۔ یوں [illegible] رہا تھا جیسے آپ جو کچھ لکھ رہے ہیں سب اپنی آنکھوں سے دیکھ اور محسوس کر رہے ہیں۔"

"تھینکس۔" عبدالعلی نے نگاہیں جھکالیں۔

"میرا خیال ہے انہیں دیکھ لیتے ہیں۔" شیخ صاحب نے جیسے خود سے کہا۔ تین دن ہو گئے تھے اشتہار دیے اور یہ آنے والی پہلی لڑکی تھی۔ ایک تو [illegible] کچھ زیادہ پرکشش نہ تھی اور دوسرا ابھی اخبار کو نکلے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ دفتر بھی کوئی خاص نہ تھا چھوٹے چھوٹے تین کمرے۔ ایک میں شیخ صاحب تھے دوسرے میں چوہدری عظمت اللہ' محب اللہ خان اور عبدالعلی بیٹھتے تھے۔ تیسرے کمرے میں مجاہد صاحب اور دوسرے دو تین کلرک تھے۔ جب عادلہ کو رکھا گیا تھا تو عبدالعلی والا کمرا جو نسبتاً بڑا اور کشادہ تھا اسی میں عادلہ کی ٹیبل بھی لگا دی گئی تھی البتہ ہارڈ بورڈ سے پارٹیشن کر دی گئی تھی۔ عادلہ کو چند دن پہلے ایک پرکشش تنخواہ کے ساتھ اچھی جاب مل گئی تھی۔ اس نے یہاں صرف دو ماہ ہی جاب کی تھی۔

"ٹھیک ہے مس فرح! آپ آجایئے کل سے۔ مس عادلہ جو آپ سے پہلے خواتین کا صفحہ ترتیب دیتی تھیں انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ چار بجے سے پانچ بجے تک اخبار کو وقت دیا کریں گی تو وہ بھی آپ کو گائیڈ کر دیں گی پھر بھی کچھ پرابلم ہوں تو عبدالعلی صاحب ہیں عظمت ہیں محب ہیں سب بہت مخلص ہیں آپ کی راہنمائی کر دیا کریں گے۔"

"تھینک یو سر۔" اس کے چہرے کی چمک بڑھ گئی تھی۔ کھڑے ہوتے ہوئے اس نے شولڈر بیگ کندھے پر لٹکایا۔ زمین پر لٹکتا دوپٹا درست کیا۔ پیشانی تک آجانے والے بالوں کو سر جھٹک کر پیچھے کیا۔ عبدالعلی نے محسوس کیا کہ وہ بہت متناسب جسم اور بہت خوب صورت قد کی مالک تھی اس کے انداز میں ایک بے نیازی اور لاپروائی سی تھی جو کم از کم متوسط طبقے کی لڑکیوں میں اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

"او کے اللہ حافظ! میں کل انشاء اللہ آجاؤں گی لیکن سر۔" وہ کچھ جھجکی۔

"میں دس بجے تک آپاؤں گی۔" شیخ صاحب چند لمحے خاموش رہے۔

"ویسے تو سب آٹھ بجے تک آجاتے ہیں لیکن جیسے آپ کو سہولت ہو۔" اور وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔

"ہاں تو عبدالعلی! تم کیوں آئے تھے؟۔"

"سر آپ نے میرا کالم مسترد کر دیا تھا کیوں؟" عبدالعلی نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"ہاں بھئی! کچھ اور لکھو۔ ہر کالم میں ایک ہی بات عراق، فلسطینی، فدائی، میری جان یہ سلسلہ تو اب چلتا ہی رہے گا۔ اب کیا ہر روز ہم ایک ہی بات لکھتے رہیں کہ آج فدائی حملے میں اتنے عراقی شہید ہوئے آج اتنے۔ بور ہو گیا ہوں یار۔" عبدالعلی نے تاسف سے انہیں دیکھا۔

"سر! شاید آپ نے پورا آرٹیکل نہیں پڑھا میں نے لکھا تھا کہ یہ جو فدائی حملوں میں تیزی آگئی ہے تو امریکہ کو سوچنا چاہیے کہ اب حکومت بنا دی جائے۔ عراقیوں کو ان کا ملک سونپ دیا جائے۔"

"تو تمہارا کیا خیال ہے عبدالعلی! کہ امریکن حکومت سونپ کر خاموشی سے اپنے مقاصد حاصل کیے بغیر عراق سے نکل جائیں گے؟۔ پاگل ان کے پروگرام بہت لمبے اور طویل ہیں انہوں نے پوری منصوبہ بندی کر رکھی ہے کہ کب کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔"

محب اللہ خان جانے کب اندر آگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کلپ بورڈ تھا اور ایک تصویروں کا لفافہ۔

"سر یہ ایک نظر دیکھ لیں۔"

اس نے لفافہ اور کلپ بورڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور خود عبدالعلی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ عبدالعلی نے ذرا سا رخ موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی اور آنکھوں میں تھوڑی سرخی۔ عبدالعلی محسوس کر رہا تھا کہ وہ جب سے اپنے علاقے سے آیا تھا بہت پریشان تھا۔ وہ ایک بار عبدالعلی نے پوچھا بھی تو وہ ٹال گیا۔

"تو نہی وہاں کے حالات کچھ اچھے نہیں ہیں۔"

"بیک وقت دو میچ۔" شیخ صاحب نے بلند آواز سے پڑھا۔

"بھئی یہ دوسرا میچ کون سا ہے محب اللہ خان! میں نے تو تمہیں راولپنڈی کے میچ کے متعلق لکھنے کو کہا تھا جو انڈیا اور پاکستان کے درمیان ہوا۔ ٹی وی پر دیکھا تھا مزا آگیا۔"

"پڑھ لیں سر۔"

محب اللہ خان کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی۔

"جس وقت پوری قوم انہماک سے راولپنڈی میں ہونے والا میچ دیکھ رہی تھی۔ گیندے کے پھول اور ہولی کے رنگ سجائے لڑکے لڑکیاں رقص کر رہے تھے۔ سیٹیاں بجا کر نعرے لگا کر تالیاں پیٹ پیٹ کر کھلاڑیوں کو داد دی جا رہی تھی۔ عین اسی وقت ایک اور میچ بھی ارض پاک کے قبائلی علاقے میں ہو رہا تھا جسم و جان اور گولہ بارود کا میچ سنسناتی گولیوں اور آگ برساتے بموں کا میچ۔" شیخ صاحب نے برا سا منہ بنایا۔

"یار! تم لوگوں کو یہ نعش بم گولیاں ان سب سے بڑی دلچسپی ہے۔ پوری قوم خوش ہے ناچ رہی ہے رنگ رلیاں منا رہی ہے اور تم نے خوشیوں کے بیچ کہاں جا کر ملا دیے۔"

"سر! جب ہمارے ارد گرد خون بہہ رہا ہو گولیاں چل رہی ہوں تو ہم ان سے کیسے نظریں چرا سکتے ہیں۔" عبدالعلی نے جواب دیا۔

"مگر یہ تو ایک سیدھا سادا کرکٹ کا میچ تھا۔ پوری قوم پاگل ہو رہی ہے اس میچ کے لیے۔"

"پوری قوم اگر ایک غلط راہ پر چل رہی ہے تو کیا ہم بھی اس بھیڑ چال میں شامل ہو جائیں؟۔" گو عبدالعلی کم گو تھا مگر جب بحث پر آتا تو شیخ صاحب قائل ہو جاتے تھے۔

"اچھا اچھا ٹھیک ہے لگا دو یہ مضمون۔" انہوں نے تصویروں والا لفافہ کھولا۔

سب سے اوپر راولپنڈی کے میچ کی جھلکیاں تھیں۔ بینرز اٹھائے تالیاں پیٹتے لوگ۔ ایک لڑکی گاگلز سر پر لگائے کو کبری کا نشان بنائے کھڑی تھی۔

"اور سر اس میں کچھ اور تصویریں بھی ہیں جو صاحب نے اپنے ایک دوست سے حاصل کی ہیں ایک بڑے روزنامے کا فوٹوگرافر اور رپورٹر ہے اور کل وانا میں ہے۔ اسے بھی دیکھ لیجیے۔"

شیخ صاحب جانتے تھے کہ ایسی تصاویر مجاہد صاحب کہاں سے حاصل کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے وسائل اتنے زیادہ نہ تھے اس لیے وہ بڑی فراخدلی سے مجاہد کو اجازت دے دیتے تھے کہ وہ اپنے رپورٹر دوست سے دفتر کے فون پر رابطہ رکھے۔

انہوں نے تصاویر نکالیں۔ "پہلی تصویر ایک وادی قبائلی کی تھی جس کا لباس پھٹا ہوا تھا جس کی پگڑی کھل کر آدھی سنگلاخ زمین پر اور آدھی اس کے سر کے گرد لپٹی تھی۔ وہ گولی کھا کر سیدھا گرا تھا اور اس کے سینے سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔"

شیخ صاحب نے ایک جھرجھری سی لی۔ "دوسری تصویر پہاڑوں کے دامن میں کچے مکانوں کی تھی ٹوٹی دیواروں والے مکان۔ ایک بوڑھی عورت چہرہ چھپائے ایک ٹوٹے مکان کے پاس گھٹنوں پر چہرہ رکھے بیٹھی تھی۔ اس گھر کے ساتھ کیا کچھ ختم ہو گیا تھا کون جانتا ہے۔"

"یہ تصویر بھی اس رقص کا بوزو تی کو کبری کا نشان والی لڑکی کی تصویر کے ساتھ ہی چھپے گی۔"

عبدالعلی کھڑا ہو گیا۔ شیخ صاحب عبدالعلی سے اختلاف نہیں کر سکتے تھے کہ ایک وقت پر جب وہ اخبار شروع کرنے لگے تھے اور ان کا لگایا ہوا سرمایہ سارا کا سارا ڈوب چکا تھا۔ بیوی الگ منہ پھلائے بیٹھی تھی تو ان دنوں میں عبدالعلی نے نہ صرف ذاتی طور پر دلچسپی لے کر بلکہ مالی مدد کر کے ان کو سہارا دیا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اب زیادہ سرمایہ عبدالعلی کا ہی لگا ہوا تھا اس میں لیکن عبدالعلی نے نہ کبھی جتایا نہ ذکر کیا۔ بلکہ انہی کی بیٹی کی شادی میں بھی عبدالعلی نے بارات کا سارا خرچ برداشت کیا تھا۔

"تمہاری فیملی کہاں رہتی ہے محب اللہ خان؟۔"

"وانا سے بیس پچیس کلومیٹر دور ہے ہمارا گاؤں۔"

عبدالعلی کے ساتھ ہی محب اللہ بھی باہر آگیا تھا۔

"تم نے بہت اچھا لکھا۔" عبدالعلی نے سراہا۔

ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دونوں اپنے کمرے میں آ گئے۔

"بابا! چائے تو پلوائیے۔"

عبدالعلی نے اندر فرش پر بیٹھے بابا کرماں والے سے کہا تو وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

"ابھی لایا کرماں والیو۔"

اور عبدالعلی تھکا تھکا سا کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھا۔ محب اللہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا اپنی میز کی طرف بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

"کرنل صاحب! اسعد آجائے تو میں چاہتی ہوں دونوں کی شادیاں ایک ساتھ کر دوں۔"

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھے چہرے پر کسی کریم کا مساج کرتے ہوئے جہاں آرا نے ذرا سا رخ موڑ کر کرنل تاجدار سے کہا۔

"کیا اسعد نے آنے کے بارے میں کچھ کہا ہے؟"

انہوں نے اخبار سے ذرا کی ذرا نظریں ہٹا کر جہاں آرا کی طرف دیکھا۔

"ہاں صبح آپ واک پر گئے تھے تو اس کا فون آیا تھا کہہ رہا تھا ٹکٹ لے کر سیٹ کنفرم کروانے کے بعد آنے کی پوزیشن بتائے گا۔"

"او تو گویا صاحبزادے کو بھی خیال آگیا ہمارا۔"

"خیال کیوں نہیں آئے گا اسے۔" جہاں آرا کو برا لگا۔

"لیکن یہاں کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دس پندرہ ہزار کی جاب مل جاتی اسے۔ یہاں ایک ڈاکٹر اور ایک اسکول ماسٹر کی تنخواہ ایک جیسی ہے۔"

"آپ ایک اسکول ماسٹر کا ذکر اتنی تحقیر سے مت کریں جہاں آرا۔" کرنل تاجدار کو برا لگا۔

"یہی اسکول ماسٹر ہیں جنہوں نے آپ کے بیٹے کو اس قابل بنایا کہ وہ ڈاکٹر بن سکے۔"

"آپ تو بات پکڑ لیتے ہیں۔" جہاں آرا نے تنگ کر جواب دیا۔

"میں آپ سے اسعد اور اسجد کی شادی کی بات کر رہی تھی۔ کچھ دیر کو اخبار رکھ دیں۔"

"جی فرمائیے۔" وہ اخبار رکھ کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"کیا کوئی لڑکی دیکھ لی ہے آپ نے اسعد کے لیے؟۔"

"اسعد کی بات تو بہت پہلے سے میں نے آپا جان سے کر رکھی ہے ان کی عمائمہ کے لیے۔"

"آپ نے اسعد سے بھی پوچھا یا خود ہی فیصلہ کر لیا؟۔" کرنل تاجدار یکدم سنجیدہ ہو گئے تھے۔

"میں جانتی ہوں اس کی پسند۔ اس کا رجحان بچپن سے ہی اپنے ننھیال کی طرف ہے اور عمائمہ کی تو وہ ہمیشہ بہت تعریف کرتا ہے۔"

"تعریف کرنا اور بات ہوتی ہے جہاں آرا بیگم اور عمر بھر کا ساتھی چننا اور بات۔"

"اسعد سے بھی پوچھ لوں گی۔" جہاں آرا بیگم اب نرمی سے ہاتھوں پر مساج کر رہی تھیں۔

"لیکن مجھے پتا ہے کہ وہ میری پسند سے انکار نہیں کرے گا۔ صبح بھی وہ کہہ رہا تھا کہ مستقل رہائش کے لیے اس کی ترجیح پاکستان ہی ہے۔"

"بہرحال مزید بات آپ اسعد کے آنے پر ہی آگے بڑھائیے گا اور رہی اسجد کی بات تو میرا خیال ہے پہلے علینہ اور اسعد کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں پھر اسجد کے لیے سوچیں گے۔" اپنی طرف سے بات ختم کر کے انہوں نے دوبارہ اخبار اٹھا لیا۔

"اسجد کے لیے میں نے لڑکی دیکھ لی ہے۔ پتا ہے کون؟" وہ جوش میں ان کے بیڈ کے قریب آ گئیں۔

"مسز یزدر ہاشمی کی بیٹی۔ اتنی بڑی جائداد کی اکلوتی وارث ہے۔ اتنی بے تحاشا دولت' آپ نے نام سنا تو ہو گا نا مسز یزدر ہاشمی کا۔ ہماری این جی او کی بھی وہی چیئر پرسن ہیں۔"

"جہاں آرا بیگم۔" کرنل تاجدار نے مضبوط آواز میں کہا۔

"اسعد کی شادی جہاں مرضی چاہے کریں لیکن اسجد کی شادی عنیزہ سے ہو گی۔"

"ہرگز نہیں۔" جہاں آرا تڑپ اٹھیں۔

"مجھے نہ وہ لڑکی عنیزہ پسند ہے اور نہ ہی علی۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ لیکن یہ نہیں ہو گا کرنل صاحب۔"

"علینہ کے لیے میں نے نہیں کہا میں صرف عنیزہ کی بات کر رہا ہوں۔" وہ بے حد سنجیدہ تھے۔

گو انہیں عبدالعلی اور عنیزہ دونوں سے ہی بہن کے بچے ہونے کے ناتے انسیت اور محبت تھی لیکن عبدالعلی سے وہ کچھ ناراض تھے کیونکہ ان کی خواہش کے برعکس عبدالعلی نے جرنلزم کو بطور پیشہ چنا تھا۔ ہاں اگر وہ انجینئر یا ڈاکٹر بن جاتا تو وہ اس کے متعلق سوچتے بھی لیکن اب نہیں۔ البتہ عنیزہ کے متعلق سال پہلے ہی انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے اپنی بہو بنائیں گے۔ عنیزہ کی تربیت ان کی ماں نے کی تھی اور وہ جانتے تھے کہ وہ اسجد کی بہترین شریک حیات ثابت ہو گی۔

"لیکن مجھے عنیزہ ہرگز پسند نہیں ہے۔" وہ ان کے سامنے ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئیں۔

"صرف اس لیے کہ وہ میری بھانجی ہے' میری مرحوم بہن کی بیٹی جن سے اس کی زندگی میں بھی آپ کی کبھی بنی نہیں تھی۔" جہاں آرا تلملا کر رہ گئیں۔

"آپ جو بھی سمجھیں۔" ان کا انداز لاپروا سا تھا۔ گو آگ اندر تک بھڑک اٹھی تھی۔

"آپ کے دل میں اپنی عزیز از جان بھانجی کی محبت بہت زیادہ ہی ہے تو اس کی بارات کا خرچ اٹھا لیجیے گا۔ میں کسی شادی دفتر سے رابطہ کر کے کسی اچھی جگہ اس کی شادی کروا دیتی ہوں۔"

"شٹ اپ۔"

کرنل تاجدار نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کہا۔ بمشکل اپنے غصے پر قابو پا کر جہاں آرا کی طرف دیکھا جو بظاہر بڑی مطمئن سی بیٹھی ابھی تک ہاتھوں کو ہولے ہولے انگلیوں سے سہلا رہی تھیں۔

"ان دونوں کے ذاتی اکاؤنٹ میں اتنی دولت ہے کہ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے اور جائداد و زمین اس کے علاوہ ہے۔ وہ ہمارے محتاج نہیں ہیں۔" وہ ہولے سے طنزیہ انداز میں ہنسیں اور سوچا۔

"اگر ذاتی اکاؤنٹ میں اتنی رقم ہوتی تو عبدالعلی صبح و شام چند ہزار روپوں کے لیے خوار نہ ہوتا۔"

وہ روز اول سے ہی آصفہ سے جیلس تھیں۔ اس کی تعلیم' اس کا سلیقہ' اس کا حسن وہ خوامخواہ ہی احساس کمتری کا شکار ہو گئی تھیں حالانکہ آصفہ کا اخلاق بہت اچھا تھا اور باوجود اس کے کہ جہاں آرا کا "نا" ان کی اپنی پسند تھی اماں اور آصفہ نے کبھی جہاں آرا کو اس کا احساس نہیں دلایا تھا۔

پھر جب ان کی شادی میجر ڈاکٹر علی سے ہو گئی تب آصفہ سے ان کا جلاپا اور بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے کرنل تاجدار سے کہا تھا کہ وہ ان کی چھوٹی بہن کے لیے ڈاکٹر علی سے بات کریں۔ تب انہوں نے رسان سے منع کر دیا تھا اور بتایا تھا کہ ان لوگوں نے آصفہ کے لیے پروپوزل دیا ہے۔ آصفہ ڈاکٹر تھیں اور خود ان کی تعلیم صرف انٹر تک تھی۔

"ازدواجی زندگی کے چھبیس سال اگر بہت خوشگوار نہ تھے تو ناخوشگوار بھی نہ تھے۔"

اخبار سامنے رکھے کرنل تاجدار نے سوچا۔ انہوں نے کبھی جہاں آرا کے معاملات میں دخل نہ دیا تھا۔ ان کی کتنی خواہش تھی کہ عنیزہ اور عبدالعلی ان کے ساتھ ہی رہیں۔ کم از کم عبدالعلی ان کے ساتھ ہوتا تو اتنا خود سر نہ ہوتا اور وہ اپنی خواہش کے مطابق تعلیم دلوا کر علینہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیتے لیکن صرف جہاں آرا کی وجہ سے وہ مجبور ہو گئے تھے۔ وہ انہیں ساتھ رکھنے کو تیار نہ تھیں۔ لیکن اب عنیزہ کے معاملے میں کم از کم جہاں آرا کا رویہ انہیں ناگوار گزرا تھا۔

انہوں نے اخبار سے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا جو بے حد مطمئن اور پرسکون سی بیٹھی تھیں تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

"آجاؤ بھئی۔"

ان کا خیال تھا علینہ ہو گی جو سونے سے پہلے انہیں شب بخیر کہنے ضرور آتی تھی۔ لیکن دروازے پر گھبرائی ہوئی سی عنیزہ کھڑی تھی۔

"کیا ہوا عینی؟" وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔

"وہ ماموں' نانو کی طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی ہے۔ وہ بڑی مشکل سے سانس لے رہی ہیں۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"چلو میں آتا ہوں۔"

انہوں نے جلدی سے سلیپر پہنے' جہاں آرا مڑ کر عنیزہ کی طرف دیکھ رہی تھیں اور ان کی آنکھوں میں عنیزہ کے لیے اتنی نفرت تھی کہ لمحہ بھر کو وہ ٹھٹکے اور پھر عنیزہ کے پیچھے تیزی سے باہر نکل گئے۔ عنیزہ تقریباً" بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ گئی تھی اور جب وہ اوپر پہنچے تو وہ نانو کے بیڈ کے پاس دو زانو بیٹھی ان کے ہاتھ سہلا رہی تھی۔

"اماں جان' اماں جان!" کرنل تاجدار نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر آواز دی پھر نبض دیکھی۔ ہارٹ بیٹ بہت تیز تھی۔

"بہت گھبراہٹ ہے بیٹا!" انہوں نے بمشکل کہا۔

"بلڈ پریشر۔" انہوں نے آنسو بہاتی عنیزہ کی طرف دیکھا۔

"اماں جان کو بلڈ پریشر کا مسئلہ تو نہیں تھا؟۔"

"تھا۔" عنیزہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کبھی کبھی ہائی ہو جاتا ہے وہ ٹیبلٹ لیتی ہیں۔ ڈاکٹر حسن راجہ کی پیشنٹ ہیں۔"

"اوہ۔"

انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر فون کی طرف بڑھ گئے۔ ڈاکٹر حسن راجہ ان کے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر رہائش پذیر تھے ان سے پرانے تعلقات تھے۔ کچھ ہی

دیر بعد وہ آگئے۔

"سوری ڈاکٹر! آپ کو اس وقت تکلیف دی۔" ڈاکٹر حسن راجہ نے مسکرا کر انھیں دیکھا۔

"تکلیف کیسی کرنل صاحب۔" وہ مسکراتے ہوئے بلڈ پریشر چیک کرنے لگے۔ عنیزہ ایک طرف خاموش کھڑی تھی۔

"خطرے کی تو کوئی بات نہیں ڈاکٹر!" کرنل تاجدار فکر مندی سے بولے۔

"نہیں بس کچھ بی پی زیادہ ہے میں یہ انجکشن لگا رہا ہوں کچھ دیر تک گھبراہٹ کم ہو جائے گی اور یہ سو جائیں گی۔ بیٹا! آپ سے کیا تھا اس روز بھی غذا میں نمک بہت کم کر دیں۔" وہ بات کرتے کرتے عنیزہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"نانو! بالکل پرہیز نہیں کرتیں انکل نمک خود ہی ڈال لیتی ہیں اگر کم ہو تو۔"

"یہ تو ٹھیک نہیں ہے اماں جان! پرہیز بہت ضروری ہے۔" ڈاکٹر حسن نے ان کی طرف دیکھا۔

انجکشن کے بعد کچھ دیر وہ بیٹھے کرنل تاجدار سے باتیں کرتے رہے۔ عنیزہ نے چائے کا پوچھا تو انھوں نے منع کر دیا۔ نانو کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی تو ڈاکٹر حسن اٹھ کھڑے ہوئے۔

"او کے اب میں چلوں گا۔" انھوں نے ایک بار پھر بی پی چیک کیا۔

"پہلے سے کچھ کم ہے۔ بہر حال کچھ دیر تک زیادہ بہتر محسوس کریں گی۔"

ڈاکٹر حسن کو گیٹ تک چھوڑ کر کرنل تاجدار واپس آئے تو عنیزہ بیڈ کے پاس بیٹھی ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے سہلا رہی تھی۔

"یہ عبدالعلی ابھی تک نہیں آیا۔" وہ ان کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئے۔

"آج ہفتہ ہے، صبح پرچہ نکالنا ہوتا ہے تو بھائی کچھ دیر سے آتے ہیں۔"

کرنل تاجدار نے برا سا منہ بنایا اور اماں جان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ دل ہی دل میں انھیں شرمندگی ہو رہی تھی کہ وہ ماں کی بیماری سے بے خبر تھے۔

ڈاکٹر حسن نے انھیں بتایا تھا کہ ان کا دل بھی پھیل رہا ہے۔ بہر حال یہ عمر کا تقاضا ہے۔ دو چار گھڑی ماں کے پاس بیٹھ کر وہ سمجھتے تھے کہ فرض ادا ہو گیا اور کیسی ماں تھیں ان کی جو کبھی کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں لائی تھیں۔

"جاؤ بیٹا! جا کر سو جاؤ۔" انھوں نے کہا۔ "میں ٹھیک ہوں اب۔ بس گھبراہٹ زیادہ ہو گئی تھی اور یہ گھبرا گئی۔"

"سو جاؤں گا اماں جان! ابھی کوئی ایسی دیر نہیں ہوئی اور ڈاکٹر حسن کہہ رہے تھے آپ ٹینشن نہ لیا کریں کسی بھی قسم کی۔ کوئی پریشانی ہے کیا؟"

"پریشانی کیا ہونی ہے بچے بس۔" انھوں نے عنیزہ کی طرف دیکھا۔

"چاہتی ہوں زندگی میں یہ اپنے گھر کی ہو جائے عبدالعلی تو لڑکا ہے، یہ میرے بعد اکیلی ہو جائے گی بالکل۔"

عنیزہ کے دل کو کچھ ہوا۔ "خدا نہ کرے نانو کو کچھ ہو میں بھلا ان کے بغیر کیسے رہوں گی۔" اس نے ہول کر سوچا۔

"میں ہوں نا اماں جان! آپ فکر نہ کریں عینی کی۔"

"کیسے فکر نہ کروں۔ علی ہے تو اپنے ہی کاموں میں الجھا رہتا ہے پھر وہ لڑکا ہے کوئی خالہ پھوپھی بھی نہیں جو اس کا سوچے کس سے کہوں کہ اس کے لیے کوئی [illegible]۔"

"یہ نانو کو کیا ہوا ہے بھلا۔" عنیزہ نے نانو کو دیکھا۔

"بھلا یہ کون سا وقت ہے ان باتوں کا۔" وہ وہاں سے اٹھ کر بلاوجہ کچن میں چلی گئی۔

"باہر کوئی لڑکا دیکھنے کی کیا ضرورت ہے اماں جان! اسجد ہے نا۔"

کرنل تاجدار نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں

ان کی آنکھیں یکدم چمک اٹھیں لیکن دوسرے ہی لمحے بجھ گئیں۔

"جہاں آرا کا رجحان نہیں ادھر، میں نے ایک بار بات کی تھی یونہی سرسری سی۔"

"میں ہوں نا اماں جان! آپ یہ فکر چھوڑ دیں۔ عینی میری ذمہ داری ہے۔"

کرنل تاجدار ہولے ہولے ان سے کہہ رہے تھے اور کچن میں فرج کے پاس کھڑی عنیزہ وہیں ٹھٹک گئی۔

"اب بھلا ماموں کو کیا پتا آنٹی جہاں آرا کے خیالات کا۔" اس کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ آگئی۔

"ویسے شیخ صاحب! آپ تنخواہیں بہت کم دیتے ہیں۔" فرح نے سموسوں کی پلیٹ شیخ صاحب کی طرف بڑھائی۔

"اتنے دنوں میں مجھے اتنا تو اندازہ ہو گیا ہے کہ آمدنی اتنی بھی کم نہیں ہے۔ کم از کم مدنی صاحب شروع سے آپ کے ساتھ ہیں ان کی تنخواہ ضرور بڑھنا چاہیے پانچ بچے ہیں ان کے۔"

"اور آپ کو پتا ہے مس فرح! میرے سات بچے ہیں چھ لڑکیاں اور ایک لڑکا جو کہ سب سے چھوٹا ہے اور لڑکیاں شادی کے قابل۔ دو کی شادی ہو گئی باقی چار باقی ہیں۔" شیخ صاحب نے سموسہ اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھا۔

"تو شیخ صاحب! آخر آپ کو اتنے بچے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ تو اچھے خاصے پڑھے لکھے ہوئے ہیں۔" فرح نے سنجیدگی سے پوچھا۔

محب اللہ خان اور چوہدری عظمت نے بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپائی جبکہ عبدالعلی سنجیدہ سا بیٹھا چائے پیتا رہا۔ بابا کرماں والا قہقہہ مار کر ہنس پڑا تو شیخ صاحب نے جھینپ کر اسے گھورا۔

"مس فرح! بس بیگم کی خواہش تھی کہ بیٹا ہو جائے۔"

"اور اگر بیٹا نہ ہوتا تو؟"

فرح سنجیدہ لگ رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں ہنسی مچل رہی تھی۔

"پھر سات آٹھ تو لڑکیاں۔"

"توبہ کریں مس فرح! میں نے تو کہہ دیا تھا بیگم سے اب جو ہمارا نصیب اس کے بعد نہیں۔"

شیخ صاحب نے کبابوں کی پلیٹ اپنی طرف کھسکائی۔

"بچیاں تو پڑھ رہی ہوں گی۔"

"جی جی تین تو دس جماعتیں پڑھ کر فارغ ہو چکیں ایک بچی اور بیٹا پڑھ رہا ہے۔"

"کمال ہے شیخ صاحب! آپ تعلیم کی افادیت سے منکر ہیں۔ آج کل کے دور میں بھلا دس جماعتیں۔ بچیاں پڑھ لکھ کر باشعور ہوتی ہیں زندگی میں کام آتی ہے یہ تعلیم۔"

عبدالعلی نے بغور فرح کو دیکھا جو شرارت بھول کر بے حد سنجیدگی سے شیخ صاحب کو قائل کر رہی تھی کہ وہ بچیوں کو مزید تعلیم دلوائیں۔

فرح میں نہ جانے کیا بات تھی کہ ہفتہ بھر میں ہی اس نے سب کے ساتھ دوستی کر لی تھی۔ اب تو اسے مہینہ ہو گیا تھا آئے ہوئے۔ آج آفس میں اس نے بابا کرماں والے کی سالگرہ کی پارٹی ارینج کی تھی۔ وہ پورے ستر سال کے ہو گئے تھے۔

"اس قدر گھٹن ہے۔ اتنے آنسو ہیں ایسے میں اگر تھوڑا سا ہنس بول لیا جائے تو یہ آنسو قابل برداشت ہو جائیں گے۔" یہ اس کی منطق تھی۔ سب نے ہی اس کی بات سے اتفاق کیا تھا۔ بابا کرماں والا نیا سوٹ پہنے بہت خوش تھا اور سب نے ہی اسے کچھ نہ کچھ گفٹ دیا تھا۔ عبدالعلی کو فرح نے متاثر کیا تھا۔ کئی بار اس نے دل میں فرح کے لیے کچھ انوکھا سا جذبہ محسوس کیا تھا۔

شیخ صاحب کچھ دیر بعد اٹھ گئے انھیں اپنی بڑی بیٹی کو سسرال سے لانا تھا، لیکن اٹھنے سے پہلے وہ مدنی صاحب کی تنخواہ میں پانچ سو کا اضافہ کر گئے تھے اور یہ فرح کا کمال تھا۔

"ایسی پارٹیاں ہوتی رہنا چاہئیں۔ دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔" چوہدری عظمت اللہ نے شیخ صاحب کے جانے

کے بعد راستہ کوئی۔

"ہاں ضرور' فرح! تم ایسا کرو ہم سب کی تاریخ پیدائش نوٹ کرلو۔" مجاہد حسین نے فرح کو دیکھا۔

"نوٹ کروا دیتا۔"

"اگلے ہفتے عبدالعلی کی برتھ ڈے ہے۔" عاولہ نے انکشاف کیا اور یہ لڑکی کیسے اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا دھیان رکھتی تھی۔

عبدالعلی نے عاولہ کو دیکھا۔ نظریں ملنے پر عاولہ کی پلکیں جھک گئیں اور رخسار گل رنگ ہوگئے۔ لیکن پتا نہیں کیوں وہ اس کے لیے اپنے دل میں کوئی جذبہ کیوں محسوس نہیں کرتا تھا۔ وہ عظمت کی بہن تھی۔ بس اتنا ہی خیال تھا اسے عاولہ کا یا پھر عینی کی دوست تھی۔

"تو پھر وہ دن' عبدالعلی کی برتھ ڈے سیلیبریٹ کریں گے۔"

"نہیں مجھے پسند نہیں ہے دوسروں پر بردن ڈالنا۔" عبدالعلی نے چونک کر کہا۔ وہ بہر حال اس کی مالی حیثیت جانتا تھا۔

"تو ٹھیک ہے مت ڈالیں بردن کسی پر' اپنی جیب سے سب کو لنچ کروادیں۔" اس نے فوراً ہی فیصلہ سنا دیا۔ وہ یوں ہی بے تکلف اور بولڈ تھی۔

"بس یار! اب اور کچھ نہ کہنا۔"

محب اللہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتے عبدالعلی کو دیکھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ خاموش ہوگیا۔

یہ لڑکی اپنے انداز' اپنی گفتگو اور حد سے بڑھے ہوئے اعتماد سے ہرگز نہیں لگتی تھی کہ اس کا تعلق کسی متوسط گھرانے سے ہوگا۔

"اور لنچ ہم اپنی پسند کے ہوٹل میں کریں گے۔" سب نے تالیاں بجا کر اس کی تائید کی۔

عبدالعلی نے کچھ نہیں کہا جانے اس کا دھیان کہاں تھا۔ عاولہ کے آفس میں آج چھٹی تھی اس لیے وہ صبح سے ہی آئی تھی۔ اسے لکھنے سے دلچسپی تھی وہ کوئی تخلیقی کام کرنا چاہتی تھی اس لیے اپنی مرضی سے آئی تھی۔

"بابا! تم نے شادی نہیں کی؟"

فرح عبدالعلی کو خاموش دیکھ کر بابا کرماں والے کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔ عاولہ سکھڑ لڑکیوں کی طرح ٹیبل پر پڑی ڈسپوزایبل پلیٹیں اور کپ اکٹھے کر رہی تھی۔

"کی تھی فرح بی بی۔" بابا کرماں والے کی سیاہ رنگت جیسے چمک اٹھی۔

"بچے وغیرہ ہیں؟"

"نہ جی' بچے وچے کدھر سے آئے۔ کرماں والی دوسرے دن ہی نس (بھاگ) گئی تھی اپنے مامے کے ساتھ۔"

"پھر آپ کو دوسری شادی کرلینا چاہیے تھی۔"

بس جی فرح بی بی! میں نے سوچا کیا خبر کبھی واپس آجائے تو بس شادی نہیں کی دوبارہ۔" عبدالعلی کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی جبکہ فرح بڑی سنجیدگی سے اسے دوسری شادی کا مشورہ دے رہی تھی۔ باقی سب کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ فرح کی آمد نے یہاں اس آفس میں زندگی کی لہر سی دوڑا دی تھی۔ یہ چوہدری عظمت اللہ اور مجاہد حسین کا یکساں خیال تھا۔ حالانکہ شروع شروع میں اس کے لیے جذباتی مضمون دیکھ کر وہ بہت جزبز ہوتا تھا۔

"رپورٹنگ اور افسانے میں فرق ہوتا ہے بی بی!" اس سے بات کرتے ہوئے خوامخواہ ہی اس کا لہجہ تلخ ہوجاتا تھا شاید اس پہلے روز کی چھوٹی سی بے ایمانی کی وجہ سے۔ ورنہ تو فرح کی بولڈنیس اسے پسند آئی تھی۔

عاولہ نے میز صاف کرکے بچا کھچا سامان شاپر میں ڈال کر بابا کرماں والے کو دے دیا۔

"گڈ۔"

فرح نے توصیفی نظروں سے اسے دیکھا۔

"مدنی صاحب اس ہفتے کی خبریں اکٹھی کرلی ہیں آپ نے؟"

"آج تو پرچہ نکل گیا اور ابھی پورے چھ دن ہیں اگلے پرچے کی تیاری کے لیے۔" چوہدری عظمت کو پیٹ بھرنے کے بعد اب نیند آرہی تھی اور وہ گھر جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔

"اور یہ چھ دن مسلسل کام۔" آخری قسط آئندہ

ثمارہ حجاب

"اور یہ ہو کتنے عرصے سے رہا ہے؟" مجھے اتنی حیرت ہو رہی تھی کہ بہت دیر بعد میرے منہ سے یہ جملہ نکلا اور وہ بھی بڑی دقتوں سے۔

"تقریباً دو مہینے ہونے کو آئے ہیں۔" ابا کے لہجے میں دکھ تھا "پہلے تو میں نے براہ راست بہو سے بات کرنے کا سوچا تھا لیکن پھر۔" وہ تھوڑا رکے "بس پھر مجھے یہ زیادہ بہتر لگا کہ میں تم سے بات کرلوں۔ تم معاملے کو زیادہ اچھی طرح ہینڈل کرسکو گے۔" اب ابا جان کا لہجہ پرسکون تھا۔

"میری تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا کہ یہ کس طرح ہوسکتا ہے؟ میں تو گھر کے معاملات پر بہت زیادہ توجہ دیتا ہوں۔" میں اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔ آخر غلطی ہوئی کہاں ہے؟ امی جان کا کچھ خشک سا رویہ تو مجھے محسوس ہو رہا تھا لیکن اس کے لیے یہ وجہ ہوگی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے واقعی اپنی بے خبری پر ندامت تھی۔

"لیکن ابا جان! آپ نے مجھے یہ سب شروع ہی میں کیوں نہیں بتا دیا۔ شاید بات اتنی نہ بگڑتی۔" میرے دل میں اس بارے میں خیال آیا اور میں نے فوراً ابا جان سے پوچھ بھی لیا۔

"اصل میں شروع شروع میں میں یہ سمجھتا رہا کہ تمہاری امی کو کچھ غلط فہمی ہوگئی ہے۔ پھر جب میں نے نوٹ کیا اور بہو نے میرے ساتھ بھی یہی کیا تب ان کی بات پر یقین آیا۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ بہو شاید کسی بات پر ناراض ہے۔ میں تو اسی وقت تم سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن تم اپنی امی کو تو جانتے ہو سختی سے منع کردیا تھا مجھے۔ بس پھر اس لیے بات نہیں کی لیکن اب تو تم دیکھ رہے ہو دو مہینے ہونے کو آئے ہیں ابھی بھی میں تمہاری امی کو بتائے بغیر ہی تم سے بات کر رہا ہوں اگر پوچھ لیتا تو کہتیں حمزہ کو پریشان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ابا جان نے ایک گہرا سانس لیا۔ "حالانکہ وہ خود اچھی طرح جانتی ہیں کہ اس طرح معاملہ زیادہ خراب ہو رہا ہے۔ بعض معاملات انسان کو بالکل کلیئر رکھنے چاہئیں ان میں زیادہ بہتری ہوتی ہے۔ لیکن یہ ماں کا دل

"ابا جان چپ ہوگئے اس طرح جیسے اب آگے کچھ مزید کہنے کو کچھ نہ رہا ہو۔

میں ابا جان سے سو فیصد متفق تھا۔ اس لیے چند لمحوں کے لیے تو چپ کا چپ ہی رہ گیا۔

"لیکن ابا جان! میں جب بھی آپ کو فون کرتا تھا نوریہ تو باقاعدہ اصرار کر کے امی جان سے بات کرتی تھی۔ البتہ پچھلے ایک ہفتے سے یا۔" میں تھوڑا اٹکا۔ یا شاید اس سے کچھ زیادہ دن ہوئے ہیں کہ اس نے خود بڑھ کر مجھ سے ریسیور نہیں لیا۔ میں دیتا تو بات کر لیتی ورنہ اصرار نہیں کرتی تھی۔ اب میں سوچ کر اپنا محاسبہ کر رہا تھا تو جیسے ہر ہر منظر میری آنکھوں کے آگے گھوم رہا تھا۔

"میرے خیال میں پچھلے دنوں بہت زیادہ مصروفیت کی وجہ سے میں یہ تبدیلی محسوس نہیں کر سکا۔ اصل میں ابا جان! ہمارے آفس میں آج کل بہت اہم پروجیکٹ چل رہا ہے۔ بس اسی وجہ سے صبح سات بجے نکلتا ہوں تو رات دس بجے واپسی ہوتی ہے۔ آپ سے بھی زیادہ تر آفس سے ہی بات کر لیتا ہوں نا! بس اسی لیے اندازہ نہیں ہو سکا۔ خیر انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے ان کو تسلی کے لیے اپنا لہجہ خوشگوار بنایا۔ "اور گھر میں باقی سب خیریت سے۔ حارث کی پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟"

"پتا نہیں بھئی۔ یہ تو تم اسی سے پوچھنا۔ ہاں "باقی سب" خیریت سے ہیں اور تمہیں بہت یاد کر رہے ہیں۔" ابا جان کے لہجے میں ہلکی سی شوخی تھی میں ان کا مذاق سمجھ گیا تھا کہ ظاہر ہے اب حارث کے علاوہ تو گھر میں ابا جان اور امی جان ہی بچتے ہیں۔ مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

"ابا جان! میں بھی "باقی سب" کو بہت یاد کر رہا ہوں۔" ابا جان ہلکا سا ہنسے۔ "اچھا میں آپ سے پھر بات کروں گا۔ اللہ حافظ۔" دوسرے فون سے کسی کی کال آ رہی تھی اس لیے میں نے جلدی سے انہیں خدا حافظ کہا۔ "ایک منٹ حمزہ!" میں ریسیور کریڈل پر رکھنے ہی والا تھا جب مجھے ابا جان کی آواز سنائی دی۔

میں نے دوبارہ ریسیور کان سے لگایا۔

"بیٹا! اپنا بہت خیال رکھنا اور دیکھو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے اللہ بہتر کرے گا یہ معاملات تو چلتے ہی رہتے ہیں زندگی کے ساتھ ساتھ بس زیادہ سر پر سوار کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس مسئلے کو۔" ابا جان کے انداز میں شفقت ہی شفقت تھی۔ میرا دل نجانے کیوں بھر آیا۔ میں جواب میں کچھ کہہ ہی نہ سکا اور ابا جان نے خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

ابا جان سے بات کرنے کے بعد پھر میرا آفس میں بالکل دل نہیں لگا اور میں گھر کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ پورے راستے میں اسی مسئلہ کو سلجھانے کی ترکیب سوچتا رہا۔ دل تو چاہ رہا تھا گھر جا کر صاف صاف نوریہ سے پوچھوں لیکن ادھر ابا جان کا حکم کہ نوریہ سے نرمی سے بات کرنا۔ اب ظاہر ہے بغیر سختی کے مسکرا مسکرا کر تو میں اس سے اتنے سنجیدہ مسئلے پر بات نہیں کر سکتا تھا۔

میں گھر پہنچا تو نوریہ نہانے گئی ہوئی تھی۔ میں نے کپڑے تبدیل کیے اور اپنی اسٹڈی میں آ گیا۔ سوچ سوچ کر میرا سر دکھنے لگا تھا اور اس الجھن کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے سر جھٹک کر ساری سوچوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی اور راکنگ چیئر پر بیٹھ کر آنکھیں موند لیں۔ یہ میری بہت پرانی عادت ہے۔ آپ سمجھ لیں کہ یہ سکون کا ایک ٹانک ہے جب بھی کوئی پریشانی لاحق ہوتی ہے اور میرا دماغ بہت زیادہ الجھ جاتا ہے تو میں راکنگ چیئر پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور مجھے سونے میں پانچ منٹ بھی نہیں لگتے۔ اور جب میں سو کر اٹھتا ہوں تو بڑی حد تک پُرسکون ہو چکا ہوتا ہوں۔ نوریہ کو اچھی طرح علم ہے کہ جب میں اسٹڈی میں ہوں تو مجھے ڈسٹرب نہیں کرنا۔ لہٰذا اس طرف سے مطمئن ہو کر میں آرام سے سو گیا۔

☼ ☼ ☼

"نوریہ سے میری پہلی ملاقات بلکہ شادی سے پہلے کہ پہلی اور آخری ملاقات برٹش کونسل میں ہوئی تھی۔ میں نے سیدھی راہ اپنائی اور امی جان کو اس کے گھر بھیجا۔ یہ میں نے کس طرح کیا؟ میرا خیال ہے کہ مجھے بہت آسانی نہیں تو بہت زیادہ مشکل بھی پیش نہیں آئی اور اگلے ہی سال ہماری شادی ہو گئی۔

میں نے چونکہ اپنی پسند سے شادی کی تھی لہٰذا اس طرح میرے اوپر دوہرا بوجھ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ امی جان کے دل میں نوریہ کے متعلق کوئی شکایت پیدا نہ ہو اور میں بہت حد تک اس میں کامیاب بھی رہا۔ شادی کے دو مہینے کے بعد میرا ٹرانسفر اسلام آباد ہو گیا۔ اس طرح میں اور نوریہ اسلام آباد آ گئے۔ جبکہ گھر میں ابا جان اور امی جان کے پاس حارث تھا۔ میں نے ابا جان سے بہت کہا کہ آپ لوگ ہمارے ساتھ چلیں لیکن اس معاملے میں تو امی جان بھی ابا جان کی ہم نوا تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ "کراچی جیسے بارونق شہر میں رہنے کے بعد اب اسلام آباد میں کہاں ہمارا دل لگے گا۔"

اسلام آباد سے میں ہر دوسرے تیسرے دن گھر فون کرتا تھا اور خط الگ لکھتا تھا کہ اس بارے میں امی جان نے خاص تاکید کی تھی۔ میں نوریہ سے بھی امی جان کی خاص طور پر بات کرواتا تھا۔ اور اب تو اسے بھی بہت حد تک میرے بارے میں اندازہ ہو گیا تھا اور وہ میری طبیعت کو جان گئی تھی کہ میں امی جان سے کتنی زیادہ انسیت رکھتا ہوں۔ بلکہ ایک بار تو میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "اگر تم مجھے خوش دیکھنا چاہتی ہو تو میری ماں کو خوش رکھو۔" البتہ بعد میں مزید میچیور ہونے کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا کہ بعض باتوں کو سویٹ ریپر میں لپیٹ کر دوسرے تک پہنچانا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

اور اب ہماری شادی کو ڈیڑھ سال ہونے کو آیا تھا اور میں اپنی طرف سے تو گھریلو معاملات پر بہت گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ایک بار بھی میرے دل میں یہ بال آئے کہ میں نے نوریہ سے شادی کر کے غلط کیا ہے یا امی جان کو اس کے حوالے سے مجھ سے شکایتیں ہوں اور وہ ہم سے ناخوش ہوں۔

میں نے جتنے بھی لوگوں کو ان معاملات کے بارے میں پریشان دیکھا میں نے یہ نوٹ کیا کہ اس خرابی کے پیچھے ننانوے فیصد ہاتھ مرد ہی کا ہوتا ہے کہیں نا کہیں اس سے بے وقوفی سرزد ہوتی ہے۔ اور بعض تو بالکل ہی احمق ثابت ہوتے ہیں نہ بیوی کو خوش رکھ پاتے ہیں اور نہ ماں کو۔

مجھے لگتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مرد کو قوام بنایا ہے تو ظاہر ہے اس کو اتنی عقل بھی ضرور دی ہے کہ وہ معاملات کو عقلمندی اور حکمت سے سنبھال سکے۔ لیکن زیادہ تر لوگ اس حکمت اور ذہانت کو باہر کے تمام معاملات میں خوب استعمال کرتے ہیں کہ لوگ ان کا ذکر بہترین بزنس مین بہترین انجینئر یا بہترین ڈاکٹر کے طور پر کرتے ہیں لیکن معاملہ جب گھر کا آتا ہے تو وہ بدترین بیٹے اور بدترین شوہر ثابت ہوتے ہیں۔

میں بہرحال اللہ کی دی ہوئی عقل اور حکمت کا صحیح استعمال کرنا چاہتا تھا اور اس کے لئے ہر ممکن کوشش بھی کرتا آ رہا تھا۔ لہٰذا پچھلے ڈیڑھ سال سے میں بہت مطمئن تھا۔ لیکن ابا جان کی آنے والی اس کال نے میرا سارا اطمینان رخصت کر دیا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میری ساری محنت ضائع ہو گئی اور اب میں بھی ان بے وقوف مردوں کی لائن میں لگ گیا ہوں جن کا آج تک میں مذاق اڑاتا آیا تھا۔

ابا جان مجھے بتا رہے تھے کہ پچھلے دو مہینوں سے یہ ہو رہا ہے کہ امی جان گھر فون کرتی ہیں تو اول تو نوریہ فون اٹھاتے ہی بند کر دیتی ہے اور اگر بند نہیں کرتی تو ریسیور اٹھا کر الگ رکھ دیتی ہے۔

"ابا جان! لائن خراب ہو جاتی ہوگی۔" مجھے کسی طرح یقین ہی نہ آیا تھا۔

"نہیں حمزہ! جب وہ ریسیور اٹھا کر سائڈ پر رکھ دیتی ہے تو اس کی سب آوازیں بھی آ رہی ہوتی ہیں۔ ہم بھی پہلے یہ سمجھتے رہے کہ لائن میں کچھ گڑبڑ ہے لیکن پھر یہ غلط فہمی بھی دور ہو گئی۔" ابا جان کا لہجہ مستحکم تھا۔

پھر ایک طرف یہ رویہ تو دوسری طرف جب تمہارے سامنے بات ہوتی ہے تو لگتا ہی نہیں کہ اس نے پہلے یہ کیا ہے۔ میں بس یہ چاہتا ہوں پتہ تو چلے کہ ہوا کیا ہے؟ بس بیٹا آرام سے بات کرنا۔"

ابا جان نے تو آرام سے بات کرنے کی تلقین کر دی اور میں مشکل میں پڑ گیا۔ میں بھی اپنی اس حکمت کو کام میں لانا چاہتا تھا جو اللہ تعالیٰ نے بطور "قوام" مجھے عطا کی۔ میں چاہتا تھا کہ مناسب طریقے سے مجھے اس مسئلے کا سبب پتہ چل جائے۔ اور مجھے نویرہ سے براہ راست اس مسئلے پر بات نہ کرنا پڑے۔ اور بس یہ پتہ چل جائے کہ غلطی ہو کہاں رہی ہے؟ نویرہ سے میں بات کرنا اس لیے نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ بہت زیادہ حساس تھی۔ میری ناراضی اس سے ذرا برداشت نہ ہوتی تھی۔ فوراً ہی رونے دھونے کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور پھر منانا بھی ظاہر ہے مجھے ہی پڑتا تھا۔ میں اسے بھی تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا تھا کیونکہ میں واقعی اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ اور دوسری طرف امی جان کا دکھ بھی میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔

اس مسئلے پر قابو پانے کیلئے میں نے اللہ تعالیٰ سے بہت دعائیں کیں۔ بعض اوقات دعا مانگتے مانگتے میرے دل میں عجیب و غریب خیالات آتے۔ میں سوچتا کہ کتنا اچھا ہوتا اگر اللہ تعالیٰ بی بی آمنہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شادیوں تک حیات رکھتا۔ تاکہ ساس بہو کے بہترین تعلقات، ماں اور بیوی کے درمیان توازن کی بہترین مثال ہمارے سامنے ہوتی۔ شاید ہمیں اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس قدر مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ پھر میں اللہ تعالیٰ سے ان سوچوں کے متعلق توبہ کرتا اور بار بار معافی مانگتا کہ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ کیا چیز کس طرح ہونی چاہیے۔

☼ ☼ ☼

"میں آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا جب نویرہ ناشتہ بنانے کے بعد کمرے میں آئی میں نے شیشے میں اس کو دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"پتا ہے حمزہ! کل میں نے حسنہ سے کہا کہ تمہارے بال اتنے خراب ہو رہے ہیں۔ عجیب الجھے ہوئے رہتے ہیں۔ صحیح سے بنا کر آیا کرو اور آج پتا ہے اس نے کیا کیا؟" نویرہ کا جوش قابل دید تھا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف باقاعدہ متوجہ ہو گیا۔ "اس نے اپنے سارے بال کاٹ ڈالے ابھی ابھی آئی ہے اور آتے ہی مجھے اپنے کٹے ہوئے بال دکھائے مجھے تو تھوڑی کھسکی ہوئی سی لگ رہی ہے۔" نویرہ کے انداز میں اب تشویش تھی۔

"تنگ کر دو سری رکھ لو۔" ایسے مشورے میں چٹکی بجاتے ہوئے پیش کرتا تھا۔ میری بات کا نویرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے حیرت سے اس کو دیکھا۔ وہ کسی سوچ میں گم تھی۔ مجھے واقعی بے حد تعجب ہوا تھا۔ حسنہ کے خلاف تو وہ کچھ سن ہی نہیں سکتی تھی۔ حالانکہ خود اس کو بھی حسنہ سے کافی شکایتیں تھیں، مثلاً "ایک دفعہ رات کو کھانا کھاتے ہوئے اس نے بتایا کہ "حسنہ" گھر میں ہر وقت ایسے بغیر دوپٹے کے پھرتی ہے جیسے یہ اس کا اپنا گھر ہے اور وہ خود مالک۔ آج میں نے اس سے کہا کہ اپنا دوپٹہ اوڑھو تو ان خاتون نے ترخ کر جواب دیا کہ "تم بھی تو بغیر دوپٹے گھر میں پھرتی ہو۔ پہلے خود تو اوڑھو۔" میں نے یہ سن کر نویرہ کا اچھا خاصا ریکارڈ لگایا تھا جس پر اس نے با آواز بلند یہ قسم کھائی تھی کہ وہ آئندہ حسنہ کے متعلق کوئی مسئلہ مجھ سے شیئر نہیں کرے گی۔

اتوار کے دن ہم دونوں لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ میں چائے پیتے ہوئے اخبار پڑھ رہا تھا جبکہ نویرہ ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ حسنہ گھر کی ڈسٹنگ کر رہی تھی۔ جب وہ لاؤنج میں اسی غرض سے آئی تو نویرہ نے اس سے کہا۔ ذرا پانی پلا دو بتا حسنہ! حسنہ صاحبہ نے سر اٹھا کر نویرہ کو گھورا اور پھر جھڑکنے والے انداز میں فرمایا۔

"میں کیوں پلاؤں؟ خود پی لو اٹھ کر۔" مجھے تو چائے پیتے ہوئے اچھو لگ گیا اور نویرہ جھینپتے ہوئے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی لیکن پھر بھی وہ حسنہ کی چھٹی کرنے پر راضی نہ تھی کہ حسنہ کا ایک مثبت پہلو

اس کی باقی تمام خامیوں پر بھاری تھا کہ وہ کام بہت اچھا اور تیزی سے کرتی تھی۔ گھر گندا ہو رہا ہے۔ حسنہ صاحبہ کی انٹری ہوئی اور گھر ایک دم صاف۔ فریج میں کچھ ختم ہو جائے حسنہ کو پیسے دیئے اور پھر کوئی فکر نہیں۔ یہ سب معلومات مجھے نویرہ نے دی تھیں میں نے اپنی آنکھوں سے اس کو بے حد تیزی سے کام کرتے دیکھا تھا۔ اس سارے پس منظر کے لحاظ سے نویرہ کی خاموشی باعث تشویش تھی۔

☼ ☼ ☼

آفس سے واپسی پر میں نے اگلے ہفتے کی کراچی کی سیٹیں بک کروائیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اس گڑبڑ کے پیچھے اس بات کے بہت زیادہ چانسز ہیں کہ پچھلے دنوں میں بہت زیادہ مصروف رہا۔ گھر کو بھی صحیح توجہ نہ دے سکا۔ اور کراچی گئے ہوئے بھی اب چھ مہینے ہونے کو آئے تھے ورنہ میں ہر تین مہینے کے بعد ایک ہفتے کے لیے کراچی ضرور چلا جاتا تھا۔ اس سے تھوڑا ماحول بھی تبدیل ہوتا امی جان کو بھی اطمینان ہو جاتا اور نویرہ بھی اپنے گھر والوں سے مل کر خوش ہو جاتی اور اس کی یہ خوشی اگلے تین مہینے گھر کے ماحول کو خوشگوار رکھنے میں بہت معاون ثابت ہوتی تھی۔

میں جب گھر پہنچا۔ اس وقت شام کے سات بج رہے تھے اور نویرہ گھر پر نہیں تھی۔ شاید پڑوس میں کہیں گئی تھی۔ میں لاؤنج میں بیٹھا وقت گزاری کے لیے میگزین دیکھ رہا تھا جب نویرہ واپس آ گئی۔

"ارے آج آپ اتنی جلدی کیسے آ گئے؟" نویرہ کے انداز میں خوشی تھی جسے محسوس کر کے میں مسکرایا۔

"بس ویسے ہی۔ ایک خوشخبری بھی ہے میرے پاس۔" میں نے بے کار سا تجسس پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"مجھے معلوم ہے۔ ہم کراچی جا رہے ہیں۔" میں نے تعجب سے نویرہ کو دیکھا۔ اس نے میری حیرت محسوس کر کے فخریہ کالر جھاڑے۔

"ارے ہاں! آج مسز عثمان مجھ سے کہنے لگیں؟" نویرہ تھوڑا رکی۔ "کہ کیا آپ کے شوہر کی جاب ختم ہو گئی ہے؟ مجھے تو اتنی حیرت ہوئی میں نے ان سے کہا کہ نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے تو چپ ہو گئیں۔ مجھے لگا کہ وہ کچھ اور بات بھی کرنا چاہ رہی ہیں لیکن ہچکچا رہی ہیں۔" نویرہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔

"کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" مجھے بھی تھوڑا تجسس ہوا۔

"پتا نہیں۔ خیر چھوڑیں۔ یہ بتائیں کہ آج رات کو کیا پکاؤں؟" اس نے موضوع بدل دیا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن آفس سے میری چھٹی تھی لہٰذا میں کمرے میں سوتا رہا۔ البتہ نویرہ نے مجھے رات کو ہی بتا دیا تھا کہ اس کو محلے کی خواتین کی بنائی گئی انجمن کی میٹنگ اٹینڈ کرنا ہے۔ جس وقت میری آنکھ کھلی گیارہ بج رہے تھے۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ نویرہ جا چکی تھی لیکن اس نے میرے خیال سے پردے نہیں ہٹائے تھے۔ اس لیے کمرہ رات ہی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ حسنہ اس وقت گھر کا کام کر رہی ہو گی اور نویرہ اسے میرے متعلق بتا گئی ہو گی۔ لہٰذا میں نے کمرے سے باہر نکلنا ضروری نہ سمجھا۔ اٹھ کر پردے ہٹائے اور منہ ہاتھ دھو کر واپس آ کر بستر پر لیٹ کر کتاب پڑھتا رہا۔ میں چاہ رہا تھا کہ نویرہ واپس آ جائے تو ہی میں باہر نکلوں۔ مجھے ناشتہ کی بھی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ اتنے میں فون کی بیل ہوئی۔ لاؤنج کے فون کا ایک کنکشن ہمارے بیڈ روم میں بھی تھا۔ دو گھنٹیوں کے بعد جب فون کی بیل ہونا بند ہو گئی تو میں نے ایسے ہی ریسیور اٹھا کر دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ لائن کٹ گئی ہو گی۔ لیکن دوسری طرف خاموشی تھی۔ میں نے ہیلو کہا تو دوسری طرف علی تھا میرا دوست۔

"یار! یہ کیا بات ہے؟ تمہارے آفس فون کرو تو کوئی اٹھاتا نہیں ہے۔ گھر فون کرو تو کوئی اٹھا کر سائیڈ پر رکھ دیتا ہے ریسیور۔ آخر مسئلہ کیا ہے؟" علی کی جھنجھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"بھابھی سے جھگڑا ہوا ہے کیا؟"

"گھر فون کرو تو کوئی ریسیور رہنا کر رکھ دیتا ہے البتہ بہو کی آوازیں آ رہی ہوتی ہیں۔" ابا جان کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

علی کی جھنجلاہٹ نے میری الجھن کو سلجھا دیا تھا۔ میں نے جلدی جلدی علی سے بات کر کے فون رکھا اور سلیپرز پیروں میں ڈال کر باہر نکلنے کو تھا جب لاؤنج سے شور کی آواز سنائی دی۔ میں تیزی سے باہر نکلا تو دیکھا کہ نویرہ حسنہ پر چیخ رہی تھی۔ وہ اتنے غصے میں تھی کہ صحیح سے لفظ بھی اس سے ادا نہیں ہو رہے تھے اور کوئی بھی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"خاموش ہو جاؤ خدا کے لیے۔ کیا مسئلہ ہو گیا ہے؟ کیوں اتنے زور زور سے چلا رہی ہو؟" میں نے اس کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔

ایک لمحے کے لیے لاؤنج میں خاموشی چھا گئی اور اگلے ہی لمحے نویرہ نے سختی سے حسنہ کا بازو پکڑا اور باہر کی طرف دھکیلا۔

"نکلو یہاں سے۔ میں کہتی ہوں نکلو یہاں سے۔" نویرہ غصے میں چلائی حسنہ نے جھٹکے سے بازو چھڑایا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

"آخر ہوا کیا ہے؟" میں نے نرمی سے نویرہ کو صوفے پر بٹھایا۔

"کیا ہوا ہے؟ میں نے آپ سے کہا تھا نا اس دن جب اس نے اپنے بال کاٹ لیے تھے کہ یہ مجھے مینٹل لگ رہی ہے۔ بس مجھے ہی سمجھ دیر سے آئی۔ وہاں میٹنگ میں سب مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ آخر میرے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ میں کیوں سب کے ہاں سے کچھ نہ کچھ منگواتی رہتی ہوں؟ میں تو اتنی حیران ہوئی کہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔" نویرہ کے لہجے میں تھکن تھی۔ "پھر راحیلہ ہی نے بتایا کہ تمہاری ماسی ہر ایک کے ہاں جا کر کبھی انڈے، کبھی نمک، کبھی ڈبل روٹی روزانہ ہی کچھ نہ کچھ مانگنے پہنچ جاتی ہے۔ اور ہر ایک سے یہی کہتی ہے کہ نویرہ باجی نے منگوایا ہے۔" اگر کچھ دیر پہلے فون والی بات نہ ہوئی ہوتی تو میں نویرہ کی یہ بات سن کر دل کھول کر ہنستا۔ لیکن اب تو مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ نویرہ کی بات سنتے سنتے میں فون والی بات پر حسنہ کی خبر لینا بھول ہی گیا تھا۔ اور وہ موقع پاتے ہی نکل بھی گئی۔

"اتنی بے عزتی ہوئی میری۔ مجھ سے تو اتنے پیسے لے کر جاتی تھی کہ کبھی انڈے ختم ہو گئے اور کبھی کچھ اور۔ اور دیکھیں ذرا سارے پیسے خود لے کر دوسروں کے ہاں سے سامان لاتی رہی۔ میں نے کہا کہ تم لوگوں نے پہلے مجھ سے کیوں نہیں پوچھا؟ تو کہنے لگیں کہ ہم نے اشاروں میں بات کرنے کی اتنی کوشش کی لیکن تم سمجھ ہی نہیں سکیں اسی لیے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اتنی انسلٹ ہوئی میری کہ آپ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔" نویرہ کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

"اچھا بس بھئی۔ کچھ نہیں ہوتا۔ بتا دینا اصل بات سب کو۔" میں نے نویرہ کو ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔ "اب میں تم کو حسنہ خاتون کا ایک اور کارنامہ سناتا ہوں۔" نویرہ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کو پوری کہانی من و عن سنا دی اور وہ حیرت سے منہ کھولے تکتی رہی۔

"اف اللہ۔ یہ حسنہ نالائق تو ہر جگہ مجھے بدنام کر گئی۔" نویرہ نے دانت کچکچائے "جبھی میں کہوں کہ سب مجھ سے کھنچے کھنچے کیوں ہیں؟ امی جان بھی جب بات کرتیں تو اس طرح بات کرتیں کہ جیسے زبردستی ریسیور تھما دیا ہو۔ پھر میں بھی خود ہی پیچھے ہٹ گئی۔" اب وہ پشیمانی سے اپنے دونوں ہاتھ مسل رہی تھی۔

"ممی کا تو آپ کو پتہ ہے کہ زیادہ تر رات کو ہی فون کرتی ہیں۔ باقی کسی سے میری فون پر زیادہ بات ہوتی ہی نہیں۔"

"اتنا کچھ تم نے محسوس کیا اور مجھے بتایا بھی نہیں۔" میں نے بھی خفگی کا اظہار ضروری سمجھا۔

"ہاں! جیسے آپ تو فوراً میری بات پر یقین کر لیتے۔ ایک لفظ تو آپ اپنی امی کے خلاف سن نہیں سکتے۔" اس نے بھی فوراً بدلہ لیا۔

"ہاں! غلط بات نہیں سن سکتا۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "لیکن یہ بات تو تم ہلکے پھلکے انداز میں مجھے بتا سکتی تھیں نا۔" مجھے یقین تھا کہ وہ اگر مجھے تھوڑا سا اشارہ دے دیتی تو میں خود ہی متوجہ ہو جاتا۔

"مجھے نہیں آتا ہلکے پھلکے انداز میں بات کرنا۔ آپ مجھ سے اتنی دانائیوں کی توقع مت رکھا کریں۔" وہ جس حوالے سے مجھ پر خفا ہو رہی تھی مجھے اچھی طرح وہ یاد تھا۔ اصل میں شادی کے بعد شروع شروع میں نویرہ نے اپنی کچھ کزنز اور دوستوں کی باتوں میں آ کر امی جان کے متعلق مجھ سے کچھ فضول قسم کی شکایتیں لگائیں۔ میں امی جان کو اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ ایسی بات نہیں کر سکتیں یا اس بات کے پیچھے ان کا یہ مطلب ہرگز نہ ہوگا۔ میں نے جواب میں نویرہ کو زبردست جھاڑ پلائی جس کے نتیجے میں وہ آدھی رات تک تکیے میں منہ چھپا کر روتی رہی۔ میں چاہتا تھا کہ جب امی جان مجھ سے نویرہ کی کوئی شکایت یا برائی نہیں کرتی ہیں تو وہ بھی یہ کام نہ کرے۔ اور پھر میں نویرہ کو بھی کافی حد تک سمجھ گیا تھا۔ وہ بہت سیدھی تھی اور اس طرح کی باتیں وہ خود سے نہیں کر سکتی تھی۔ اس رات پہلی مرتبہ میں اس پر اتنی بری طرح بگڑا تھا اور اب دوسرا موقع آتے آتے رہ گیا تھا۔

"کچھ جل رہا ہے۔" مجھے جلنے کی تیز بو آئی۔ اور نویرہ میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی تیر کی طرح کچن کی طرف لپکی۔ حسنہ کا چڑھایا ہوا سالن جل کر کوئلہ ہو چکا تھا ہمیں اپنے جھگڑے میں بالکل احساس نہیں ہوا کہ کچن میں کچھ جل رہا ہے۔

"میں سمجھا تمہارا دل جل رہا ہے حسنہ کی شاندار کارکردگی دیکھ کر۔" میں نے ماحول کو تھوڑا خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔

"واہ واہ! ایک ماسی نے سب کو انگلی کا ناچ نچوا دیا۔ آج ہم رات کا کھانا باہر کھا کر حسنہ کی کارکردگی کو خراج تحسین پیش کریں گے۔" میں نے با آواز بلند اعلان کیا۔

"اور ایوارڈ کے طور پر اس کا ٹرانسفر آپ کی امی جان کے ہاں کراویں گے بالکل جلیبی کی طرح سیدھی ہو کر آئے گی۔" نویرہ نے میرا موڈ اچھا دیکھ کر دل کے پھپھولے پھوڑے اور پھر خود ہی اپنے جملے پر محظوظ ہو کر کھلکھلا کر ہنسی۔

"اچھا اب زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اپنی مسکراہٹ چھپائی۔ "جلدی سے سامان کی لسٹ بناؤ۔ میں فارغ ہوں ابھی بازار سے لے آؤں گا۔ کیونکہ اب حسنہ تو ہے نہیں جو مانگ تانگ کر سامان لے آئے۔" میں نے نویرہ کو ستانے کی کوشش کی۔ اب میرا موڈ واقعی بہت اچھا ہو رہا تھا۔ دماغ سے ایک بوجھ جو ہٹ گیا تھا۔ اور پھر اس سارے واقعے سے میں نے اپنے لیے ایک اہم نقطہ لے لیا تھا کہ دیگر مصروفیات چاہے کتنی ہی ہوں۔ مجھے گھر کے حالات سے کسی بھی صورت غافل نہیں رہنا۔

"اور امی جان سے کس طرح معافی ملے گی؟" نویرہ نے متفکرانہ انداز میں بھویں سکیڑیں اس کی آواز مجھے دوبارہ حقیقی دنیا میں لے آئی۔

"بس ساری کہانی سنا دیں گے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"اور اگر انہیں یقین نہ آیا تو؟" میں نے گھور کر نویرہ کو دیکھا۔

"انہیں معلوم ہے کہ میں غلط بات نہیں کرتا۔" میں تھوڑا اترایا "بلکہ میرا تو خیال ہے کہ حسنہ کے نفسیاتی مریض ہونے کے انکشاف پر تو امی جان کی آنکھیں بھر آئیں گی۔" میں امی جان کی نرم دلی سے خوب واقف تھا۔ "اور اگر پھر بھی انہیں یقین نہ آیا تو۔" میں تھوڑا رکا "تو پھر تمہاری خواہش کے مطابق حسنہ کو کراچی امی جان کے پاس منتقل کر دیں گے۔" میں ہلکے سے مسکرایا۔

"ہم بھلا حسنہ کے بغیر کس طرح رہ سکیں گے۔ ہم بھی کراچی اس کے ساتھ چلے جائیں گے۔" اور ہم دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

❋

کرن شگفتہ

تالیوں کے بھرپور طوفان نے جہاں پورے ہال کو سر پہ اٹھالیا تھا' وہیں اس کی محویت کو بھی بری طرح جھنجھوڑ دیا تھا۔ اس نے چونک کر اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ پورا ہال طلبا و طالبات اور پروفیسرز سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس نے جدھر بھی دیکھا وہیں لڑکوں اور لڑکیوں کو اپنی سیٹوں سے ایک عالم بے خودی میں اٹھتے اور والہانہ انداز میں تالیاں پیٹتے پایا۔ ان سب کے چہرے خوشی و مسرت کے جذبات سے تمتما رہے تھے۔ جذبات صرف اسٹوڈنٹس تک ہی محدود نہ تھے' ٹیچرز کونسل کی اگلی نشستوں پر براجمان تمام پروفیسرز کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ بھی کم و بیش ایسی ہی مسرت اپنے دلوں میں محسوس کر رہے ہیں۔

ہال میں تالیوں کا اتنا شور تھا کہ ایک اسٹوڈنٹ کو اپنی بات پاس کھڑے اسٹوڈنٹ تک پہنچانے کے لیے باقاعدہ چلانا پڑتا تھا۔ کسی ایک مقرر کی چھ منٹ کی تقریر کے لیے اتنی زبردست پذیرائی..... اس کی آنکھوں میں بے پناہ حیرت ہچکولے لے رہی تھی۔ اس نے گردن سیدھی کر کے ایک بار پھر اسٹیج کی سیڑھیاں اتر کر نیچے

آنےوالے اس مقرر کی طرف دیکھا۔ کچھ لوگوں کے لیے بجا کہا جاتا ہے۔

''وہ آیا' اس نے دیکھا' اس نے فتح کرلیا۔''

اس مقرر کو دیکھ کر اس کے دماغ میں یہی تینوں فقرے گونجے تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے باوقار قدم اٹھاتے ہوئے اپنی نشست کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کی چال میں ایسی تمکنت اور ٹھہراؤ تھا' جو کسی فاتح کی چال میں خود بخود آجاتا ہے۔ جب وہ سیڑھیاں اتر کر اپنی نشست والی رو میں مڑنے کے لیے سب سے اگلی نشستوں کے سامنے سے گزرا تو اس نے کئی پروفیسرز کو اپنی نشستیں چھوڑ کر اٹھتے اور تعریفی انداز میں اس کا کندھا تھپتھپاتے دیکھا تھا۔

وہ یہ سب حیرت اور رشک کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

''سمعان علوی۔'' شاید یہی نام تھا اس ڈیبیٹر کا۔ وہ اپنے پیپرز سے ہزار دفعہ رٹی ہوئی تقریر کو پھر رٹنے میں مصروف تھی جب یہ نام پکارا گیا تھا' کچھ تو نام مختلف سا تھا اور کچھ کمپیئر کے پکارنے میں ایسی خاص بات تھی کہ اس نے چند لمحوں کے لیے اپنے پیپرز سے نگاہ اٹھا کر ڈائس کی طرف جاتے اس مقرر کو دیکھا۔

اس کے اردگرد تالیوں کے معمول سے زیادہ ہونے والے شور نے اسے احساس دلا دیا تھا کہ مذکورہ مقرر کوئی عام مقرر نہیں۔

سمعان علوی' کا نام پکارے جانے کے بعد تالیوں کا انداز' اور پھر حاضرین کا اپنی نشستوں پر سنبھل کر بیٹھنا ایک تبدیلی کی رونمائی کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس کی نشست سے اگلی رو میں بیٹھی لڑکیوں کا وہ گروپ جو پورے پروگرام کے دوران نہ جانے کس مسئلے کو اتنے زور و شور سے حل کرنے میں مصروف تھا کہ کمپیئرز اور انتظامیہ کی بار بار خاموش رہنے کی استدعا بھی ان کا تسلسل نہ توڑ سکی تھی۔ یہ نام سننے کے بعد ان سے آپس میں جڑے ہوئے سر تیزی سے علیحدہ ہوئے تھے گویا ان میں کوئی برقی رو دوڑ گئی ہو اور اب وہ ہاتھ کے اشارے سے اردگرد بیٹھی دوسری طالبات کو خاموش کروانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

اس نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے چار پانچ صفحات کو بے چینی سے الٹنا پلٹنا شروع کر دیا تھا۔

وہ تقریر' جو اس کی اپنی لکھی ہوئی تھی اور جسے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے لاتعداد دفعہ زبانی دہرایا تھا' اس وقت اسی تقریر کا ہر لفظ اور ہر جملہ اسے اجنبی دکھائی دے رہا تھا۔

ایک دو تین اور چوتھے جملے تک تقریر دہرانے کے بعد اسے پھر سے رک جانا پڑا' باوجود کوشش کے اسے کوئی لفظ بھی یاد نہ آ رہا تھا۔

''میں نہیں کرسکوں گی۔ میرا خیال ہے' میں کبھی بھی نہیں کرسکوں گی۔''

وہ اس وقت کو کوس رہی تھی جب اس نے اس ''تقریری مقابلے'' میں حصہ لینے کا تہیہ کیا تھا۔

''عائشہ کمال'' نے حال ہی میں گریجویشن کرنے کے بعد یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تھا۔ وہ انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کرنا چاہتی تھی۔ یہ یونیورسٹی میں اس کا پہلا سال تھا جب اس نے یونیورسٹی میں ہونے والے اردو مباحثے کا سنا۔ تقریروں سے اسے بچپن سے ہی دلچسپی تھی۔ اس نے وقتاً ''فوقتاً'' کئی مقابلوں میں حصہ بھی لیا تھا اور انعامات بھی جیتے تھے۔ مگر یہ صرف اسکول کے زمانے کی بات تھی۔ کالج میں یہ دلچسپی صرف دوسروں کے خیالات اور تقاریر سننے تک محدود ہو گئی۔ مگر یونیورسٹی میں مباحثے کا سن کر یہ شوق ایک بار پھر شدت سے جاگا تھا۔

جب اس نے اس خواہش کا اظہار عطیہ اور سلمیٰ سے کیا تو سلمیٰ بہت ایکسائیٹڈ ہو گئی تھی۔ عطیہ اور سلمیٰ دونوں انگلش ڈیپارٹمنٹ سے ہی تھیں اور پورے ڈیپارٹمنٹ میں صرف یہی دو لڑکیاں تھیں جن سے اس کی بہت گہری نہ سہی مگر دوستی ضرور تھی۔

''تم ضرور پارٹی سپیٹ Participate کرو۔ اس ٹاپک سے متعلقہ پوائنٹس ڈھونڈنے میں ہم تمہاری مدد کریں گے۔ مجھے لگتا ہے کہ تم تھوڑی سی کوشش کرو تو عدن شہزاد سے جیت سکتی ہو۔'' سلمیٰ آنکھوں میں ہلکی سی چمک لیے اس سے مخاطب تھی۔

''کیا صرف عدن شہزاد نے ہی اس مباحثے میں حصہ لینا ہے۔'' اس نے بے حد حیرت سے دریافت کیا تھا۔

''نہیں... عدن شہزاد تو ہمارے ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔ یہاں ہر ڈیپارٹمنٹ سے لاتعداد طالبات نے Participate کیا ہو گا مگر عدن شہزاد۔'' سلمیٰ بولتے بولتے کچھ سوچنے لگ گئی تھی جبکہ عطیہ نے مسکراتے ہوئے اس کی بات مکمل کی۔

''عدن شہزاد اینڈ سمعان علوی آر دو ونگ پرسنالیٹیز۔''

''مگر تم کوشش تو کرو۔ ہمیں تم سے اچھی توقعات ہیں۔'' عطیہ کی اس تسلی کے دوران ہی اس کا ذہن تقریر اور اس کے عنوان کے تجزیے میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ ان دو ناموں یا ان پر دیے گئے کمنٹس پہ دھیان نہ دے سکی۔ ورنہ وہ ضرور استفسار کرتی اور ان دونوں سے تھوڑی سی واقفیت بھی حاصل کرنے کے بعد حالات مختلف ہوتے۔ وہ کبھی بھی اس مباحثے میں شرکت نہ کرتی۔ وہ جانتی تھی کہ یہاں Mob Psychology کا رواج ہے۔ کسی ایک شخص کا فیصلہ سب کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ بغیر کسی تحقیق اور تجزیے کے۔ ایسا نہ ہوتا تو معاشرے میں غلط روایات اور غلط اقدار جنم ہی نہ لیتیں۔ جیسے کہ دو دفعہ انتخابات جیتنے والا تیسری دفعہ بھی ضرور جیتتا ہے' خواہ لوگ چاہیں یا نہ چاہیں۔ مگر وہ جیتے گا۔

چنانچہ وہ ڈیبیٹر جو دو تین بار جیت جائیں' ان کے جیتنے کی سامعین کو عادت پڑ جاتی ہے۔ اگر ججز وہی رہیں' آڈینس وہی ہو تو ان کا جیتنا لازمی امر ہوتا ہے۔

سمعان علوی اور عدن شہزاد کی جیت کی یونیورسٹی والوں کو عادت ہو چکی تھی۔ وہ جو سامعین کی دکھتی رگوں پہ یوں ہاتھ رکھتے تھے کہ تڑپنے والا تڑپنے کا فن بھول جاتا تھا۔ جو جانتے تھے کہ ان کی سامع ایک جذباتی قوم ہے' جس کا ہر فیصلہ دماغ کے بجائے دل سے ہوتا ہے۔

عائشہ کمال یہ سب جانتی تھی مگر ان دو ناموں سے واقفیت نہ حاصل کرسکی۔ جب عطیہ اسے ان کے بارے میں بتا رہی تھی تو وہ اپنی سوچوں میں گم تھی۔ چنانچہ جب وہ بولی تو بس یہی کہ۔

''آپ میری مدد کریں گی ناں! پوائنٹس جمع کرنے میں؟''

''او! وائے ناٹ... شیور۔'' دونوں نے خوش دلی سے ہامی بھری تھی۔

اور آج آرٹس کونسل کے اس وسیع و عریض ہال میں وہ اپنے فیصلے کا احتساب کر رہی تھی۔ وہ کوئی دھواں دھار قسم کی ڈیبیٹر نہ تھی۔ دھیما لہجہ رکھنے والی وہ دھیمے مزاج کی حامل مقررہ تھی۔ ایسی مقررہ جو مسائل کو ادھیڑنے کے بجائے ان کا حل پیش کرنے پر زیادہ یقین رکھتی تھی۔ مگر وائے بدقسمتی! اس کی تقریروں کا زیادہ تر وہی حال ہوتا تھا جو اس معاشرے میں کسی بھی مثبت سوچ کے حامل شخص کا ہوتا ہے۔

ایسا شخص جو کسی ہنگامے کے دوران کہتا ہے کہ ''بھائیو! یہ ایمبولینس جلانے کی بجائے اسی ایمبولینس میں زخمیوں کو ہسپتال لے چلیں'' یا جو کسی سانحے کے نتیجے میں ہونے والی ہڑتال کے بارے میں کہے ''کہ ہمیں ہڑتال نہیں کرنی چاہیے۔ کیوں نہ آج ہم دوگنا کام کریں اور سانحے کا شکار ہونے والے لوگوں کی مدد کریں۔'' ایسے لوگوں کے حصے میں اگر کچھ نہ آئے تو کم از کم ایک طنزیہ مسکراہٹ ضرور آتی ہے۔ اور یہی طنزیہ مسکراہٹ عائشہ کمال کے حصے میں بھی آیا کرتی تھی۔ جب وہ اپنے سادہ اور دھیمے لہجے میں مسائل کا حل پیش کرتی تو اکثر سامعین کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھرتی اور معدوم ہو جاتی اور اس کی تقریر کے دوران ججز کا یہ حال ہوتا گویا انہوں نے بمشکل

اپنی جمائیاں روک رکھی ہوں۔

اور آج پھر "سمعان علوی" کی زبردست پذیرائی ثابت کر رہی تھی کہ حالات ابھی تبدیل نہیں ہوئے۔ اس نے اپنی نشست کی پشت سے ٹیک لگالی۔ اس نے اپنے اعصاب بالکل ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔ وہ اب صرف سننا چاہتی تھی۔ سمعان علوی ڈائس کے پیچھے تن کر کھڑا تھا۔ اپنی تقریر کے آغاز میں اس نے ایک نہایت زبردست قسم کا شعر نہایت دل سوز انداز میں پڑھا تھا۔ ایک بار پھر تالیوں کا طوفان اٹھا۔ تالیوں کا شور تھمنے کے بعد اس نے رسمی انداز میں تقریر کی ابتدا کرنے کے بجائے تقریر کی ابتدا اک تازہ خبر سے کی۔ یہ کسی مشہور اخبار کی سرخی تھی جس کے مطابق اپنے حالات کی مفلسی سے تنگ آکر ایک شخص نے اپنے گھر کے چھ افراد کو قتل کرنے کے بعد خود بھی خود کشی کرلی۔

یہ ایک بہت بڑی تبدیلی تھی۔ تقریر کے روایتی انداز کو بدلنے کی نہایت دلکش کوشش۔ وہ کوئی ساحر لگتا تھا جس نے ایک لمحے کے لیے سب کو غافل کر دیا تھا۔ اس کا انداز اس کے لفظوں کا تانا بانا اور تسلسل اور اس کی فہم و فراست۔ سب نے مل کر اسے ناقابل تسخیر بنا دیا تھا۔ وہ ششدر سی اس کے انداز کو تکے جا رہی تھی۔ بے پناہ وجیہہ چہرے پہ سجی سنجیدگی، سیاہ باریک فریم والے گلاسز سے جھانکتی اس کی ذہین آنکھیں اور سب سے بڑھ کر اس کی ذہانت۔ وہ اس بازی گر کی طرح تھا جو اپنے لفظوں کی پٹاری سے ہر بار اک نیا آئیٹم پیش کر رہا تھا۔ اس نے مذکورہ موضوع کے کچھ ایسے پہلوؤں سے بخیے ادھیڑے تھے جو اس کے تو کیا کسی بھی فرد کے خواب و خیال سے نہ گزرے تھے۔ چھ منٹ کی تقریر پلک جھپکتے میں ختم ہوئی تھی اور پھر تالیوں کے طوفان نے اسے اس طلسم سے نکالا تھا۔

وہ غیر ارادی طور پر سمعان علوی کو ہی تکے جا رہی تھی جو سب کی پذیرائی سمیٹتا کچھ معتدل سا رویہ لیے اپنی نشست پہ آبیٹھا تھا۔ اب اس کے ارد گرد موجود اسٹوڈنٹس اس کا کندھا تھپتھپا کر اپنے جوش کا اظہار کر رہے تھے۔ لڑکیاں اپنی نشستوں سے اچک اچک کر اسے دیکھنے اور وش کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ عطیہ اور سلمٰی جو تقریر کے اختتام پر میکانکی انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں، اب تالیاں پیٹ کر بیٹھ چکی تھیں۔

"یہ تو تھے ہم سب کے ہردلعزیز "سمعان علوی" جو اپنے زریں خیالات کا اظہار کر رہے تھے اب میں دعوت خیال دیتا ہوں "عائشہ کمال" کو جن کا تعلق انگلش ڈیپارٹمنٹ سے ہے عائشہ کمال۔"

وہ ابھی اس تقریر کے سحر سے نہ نکلی تھی کہ کمپیئر کی آواز نے اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیے۔ عطیہ نے اسے ہلکی سی کہنی مار کر خبردار کیا۔

"بی کانفیڈنٹ اینڈ بریو۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔" اپنی سیٹ سے اٹھتے ہوئے اس نے سلمٰی کی آواز سنی تھی۔ پیپرز اس نے اپنی سیٹ پر رکھ دیے تھے اور ساتھ میں شاید اپنا اعتماد بھی وہیں بھول گئی تھی۔ اس کے غیر معروف نام کے لیے زبردستی پیٹی جانے والی تالیوں میں جوش نہ تھا اور نہ ہی اس کی چال میں اعتماد کی کوئی جھلک تھی۔ وہ ڈائس تک پہنچی تو تالیاں تھم چکی تھیں۔

تقریر شروع کرنے سے پہلے اس نے ایک نظر سامنے موجود سامعین پر ڈالی۔ ان سب کا جوش ابھی بھی ان کے چہروں سے ظاہر تھا۔

تقریر شروع کرتے ہوئے اس نے اپنی آواز میں لرزش واضح محسوس کی۔ وہ اپنی بہترین الفاظ سے مزین تقریر یوں پڑھ رہی تھی گویا سر سے بوجھ اتار رہی ہو۔ اس کے اس انداز پہ چند لمحے صبر کرنے کے بعد باقاعدہ ہوٹنگ شروع ہو گئی۔

"غریب اور نادار طبقے کے حقوق کو پامال کر کے قائم کی جانے والی خوشحالی ہماری طلب نہیں ہماری مانگ"

"نہیں سینڈوچ بھرنہ۔" ہال میں کسی نے بہت تیزی سے اس کا جملہ اچک لیا تھا۔

"اسیرو سوسہ کیوں ہو!"

وطن کے روز و شب سے۔

"کس لیے بیزار ہو اتنے۔"

اس نے اپنی تمام قوتیں مجتمع کر کے رفیع الدین راز کی یہ خوب صورت نظم پڑھنی شروع کردی اس نظم کو اس کی تقریر میں بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ مگر ہوٹنگ ختم نہ ہوئی تھی۔

ابھی تو اپنی مٹی میں نمو کا وصف زندہ ہے\
ابھی جھرنے سلامت ہیں\
ابھی دریا میں پانی ہے\
ابھی جھیلیں نہیں سوکھیں\
ابھی جنگل نہیں اجڑے\
فضاؤں میں ابھی تک بادلوں کا آنا جانا ہے

"محکمہ موسمیات کی تازہ رپورٹ۔" ایک اور بلند آواز ہال سے ابھری تھی اور پھر دبے دبے سے قہقہے۔ اس کے لیے اسٹیج پہ کھڑا ہونا دشوار ہو گیا۔ اپنی تقریر کا اختتامی پیراگراف حذف کرتے ہوئے اس نے اپنی تقریر کا اختتام یوں کیا۔

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے\
بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

اختتام پہ تالیوں کے بجائے قہقہوں کے شور نے اسے احساس دلا دیا تھا کہ وہ آخر میں بھی کچھ گڑبڑ کر چکی ہے۔ باقی اشعار پڑھنے کا ارادہ ترک کر کے وہ اسٹیج سے نیچے اتر آئی۔

"اے کاش! میں یہاں سے پلک جھپکتے میں غائب ہو سکتی۔ یا کم از کم زمین ہی پھٹتی تو میں بخوشی اس میں سما جاتی مگر مجھے یوں ان سب کے پاس سے گزر کر اپنی نشست تک نہ جانا پڑتا۔" اپنی نشست تک واپسی کے لیے ہر قدم اٹھانے پر اس کے دل سے یہی خواہش ابھری تھی۔ وہ سب کے مذاق کا بھرپور نشانہ بنی ہوئی تھی۔

"لافنگ اسٹاک۔" اسے یاد آیا ایک بار اس کی ٹیچر نے لافنگ اسٹاک کا مطلب یہی بتایا تھا کہ وہ شخص یا چیز جس پر سب ہنسیں اور بے تحاشہ ہنسیں۔" آج اسے اس کا مطلب سمجھ میں آگیا تھا۔

"تالیاں بجاؤ یار!" اس نے گزرتے گزرتے کسی نام نہاد خیر خواہ کی آواز سنی تھی اور پھر تھا اس کی تالی کی آواز وہ جانتی تھی کہ آواز میں ہمدردی سمو کر بولنے والے کی آنکھیں شرارت سے جگمگا رہی ہیں۔

"واہ واہ واہ یعنی کہ "بحر ظلمات میں گھوڑا دیے دوڑے ہم نے" بھئی کمال ہے کیا کہنے مکرر مکرر۔" وہ اب سمعان علوی کی نشست کے قریب سے گزر رہی تھی یہ آواز اس کی طرف سے آئی تھی۔

"شٹ اپ زین۔" سمعان کی ہلکی سی تنبیہی آواز پر بے ساختہ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سمعان کے لبوں پہ مسکراہٹ تھی جو مزید گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اگرچہ وہ اس کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا مگر اس کی مسکراہٹ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اس صورت حال سے خوب لطف اندوز ہو رہا ہے۔

بے تحاشا دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اس نے بمشکل اپنی نشست پہچانی۔ اپنا بیگ اٹھایا اور ہال سے واک آؤٹ کر گئی۔

☼ ☼ ☼

"ایکسکیوزمی خواتین و حضرات! آپ سب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مجھے فراہم کی جانے والی لسٹ میں موجود اشیاء خورد و نوش کے لیے مجھے فراہم کی جانے والی رقم کم پڑ چکی ہے۔ لہٰذا آپ سب سے درخواست ہے کہ اپنے اپنے والٹ کا بوجھ ہلکا کر کے ثواب دارین حاصل کریں۔"

یونیورسٹی کے سرسبز لان کے ایک گوشے میں چار لڑکیوں اور پانچ لڑکوں پر مشتمل وہ گروپ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا جب بلیک پینٹ اور جامنی شرٹ میں ملبوس ایک اسمارٹ سا لڑکا ان سب کے سروں پر جا کھڑا ہوا۔ ڈارک بلیک سن گلاسز بار بار اس کی ناک

سے پھسل رہے تھے اور گلاسز کے اوپر سے جھانکتی اس کی بڑی بڑی براؤن آنکھیں شرارت سے جگمگا رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں سنجیدگی شاذ و نادر ہی کسی کے نوٹس میں آئی تھی۔ اس وقت بھی جبکہ وہ نہایت سنجیدگی سے سینے پر ہاتھ باندھے گروپ کے افراد کو "مالی امداد" کے لیے راغب کر رہا تھا' اس کی آنکھیں اس کی شرارت کا واضح پتا دے رہی تھیں۔ اس کی بات سن کر اس خوش باش گروپ کے قہقہوں کو بریک سی لگ گئی۔

یہ یونیورسٹی کا وہ واحد گروپ تھا' جسے پروفیسرز سے لے کر مالی اور تمام چوکیدار تک جانتے تھے۔ یہ گروپ اگر اپنی ذہانت اور لیاقت کی وجہ سے پروفیسرز اور اسٹوڈنٹس میں مشہور تھا تو شرارتوں اور زندہ دلی کی وجہ سے یہ ان کا دوسرا ساں تھا۔

کوئی نصابی سرگرمی ہو یا غیر نصابی' سیاسی مسئلہ ہو یا علمی' اسٹوڈنٹس کا اجتماعی معاملہ ہو یا پروفیسر سے لے کر چوکیدار تک کا انفرادی معاملہ یہ گروپ ہر مسئلے کو ڈسکس کر کے حقائق سامنے لاتا اور پھر بھرپور طریقے سے حق کا ساتھ دیتا۔ اسی وجہ سے یونیورسٹی میں جہاں ان کے بہی خواہوں کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود تھی وہیں ان سے حسد کرنے والے لوگ بھی موجود تھے۔

اس گروپ میں ہیڈ کی حیثیت **سمعان** علوی اور عدن شہزاد کی تھی۔ باقی سات افراد' جن میں تین لڑکیاں اور چار لڑکے تھے' کسی نہ کسی طریقے سے ان دونوں شخصیات سے متاثر تھے۔ ان دونوں کی رضا ان سب کی رضا تھی۔ مادہ پرستی کے اس دور میں **سمعان** علوی اور عدن شہزاد سے ان کی بے لوث محبت کوئی زیادہ اچنبھے کی بات نہ تھی۔ پیار اور محبت' خلوص اور قربانی کی روایت اور بنیاد ڈالنے میں ان دونوں نے پہل کی تھی۔ بات حیرت کی تھی مگر درحقیقت اس گروپ کی بنیاد ہی محبت پر رکھی تھی۔ تلخیاں آتی ضرور تھیں۔ مگر محبت کا شیرازہ انہیں بکھرنے نہیں دیتا تھا۔

عدن شہزاد۔ ایک کامیاب مل اونر کی بیٹی تھی۔ اس کا شمار ان گنے چنے لوگوں میں ہوتا تھا جو نقدیر کا ریموٹ ہاتھوں میں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ جو ہمیشہ سب سے بہترین چیزوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں اور انہیں پا بھی لیتے ہیں۔ عدن شہزاد پانچ فٹ آٹھ انچ قد' گندمی رنگت اور تیکھے نقوش کے ساتھ دو چیزیں ایسی تھیں جو اپنے اندر بے پناہ طلسم کدہ رکھتی تھیں اس کی آنکھیں اور بال تھے۔ سیاہ لمبی چمکدار پلکوں کے نیچے لمبی سیاہ آنکھیں جن میں موتیوں کی سی جگمگاہٹ تھی اور کمر سے نیچے جاتے سیاہ ریشمی بال' اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کی تربیت نہایت شاندار بلکہ شاہانہ انداز میں ہوئی تھی۔ عدن جیسے لوگوں کو اگر تین الفاظ میں بیان کیا جائے تو یہ تین الفاظ اسٹریکٹو' ڈیسنٹ اور انٹیلی جنٹ ہی ہو سکتے ہیں۔

عدن کی صرف ایک ہی دوست تھی ثانیہ۔ ہائی کلاس سے تعلق رکھنے والی خوب صورت سی ثانیہ ذہین بھی تھی اور رکھ رکھاؤ والی بھی۔ **سمعان** علوی کی دوستی پری انجینئرنگ کے دو اسٹوڈنٹس "سعد خان اور سارہ" سے ہوئی تھی۔ ایڈمیشن کے پہلے دن سے لے کر آخری ملاقات تک **سمعان** نے ان دونوں کو اکٹھے ہی دیکھا تھا۔ وہ اکٹھے آتے' ساتھ لنچ کرتے' اکٹھے واپس جاتے۔ ایک دوسرے کے سوا انہیں کسی سے سروکار نہ تھا۔ **سمعان** کی خوب صورت پرسنالٹی نے ان دونوں کو امپریس کیا تھا۔ **سمعان** کو بھی سرخ سفید اور مضبوط سا سعد اور نازک بالکل گڑیا جیسی سارہ اچھے لگے تھے۔ رفتہ رفتہ ان میں دوستی ہو گئی تھی۔

سعد نے **سمعان** کو بتایا تھا کہ سارہ اس کی خالہ زاد ہے۔ سارہ کے والدین کا ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا جس کے بعد سے سارہ ان کے ساتھ رہتی تھی۔ سعد کے ابو ڈاکٹر تھے۔ سعد اور سارہ کا بچپن ایک ساتھ گزرا تھا۔

تھرڈ ایئر میں **سمعان**' عدن' ثانیہ' سعد اور سارہ بہترین دوست تصور کیے جانے لگے۔ اسی عرصے میں

عدن کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ان کے فرینڈز کا ایک گروپ ہونا چاہیے جو آپس میں بہت زیادہ مخلص ہوں۔

"میری خواہش ہے کہ ہم فرینڈز کا اک ایسا گروپ ہو جس میں ٹاپ کی پرسنالٹیز ہوں۔ مطلب یہ کہ بیسٹ اسٹوڈنٹس کا ایک گروپ ہو۔ بہت زیادہ ایکٹو' کانفیڈنٹ اور پاورفل گروپ ہم سب ہر ممکن وقت تک ساتھ رہیں۔ بلکہ میری خواہش تو یہ ہے کہ تا عمر ساتھ رہیں ہم ایک دوسرے کے ساتھ حد سے زیادہ مخلص ہوں اور اگر خدانخواستہ ہم پر ہم میں سے کسی پر کوئی برا وقت آئے تو یہ کنفرم ہونا چاہیے کہ گروپ کا ہر ممبر ہمارے ساتھ ہے۔" عدن نے کہا تھا۔

سمعان اور باقی سب نے بھرپور تائید کی تھی۔ **سمعان** نے "عبدالاحد" کو بھی گروپ میں شامل کرنے پر زور دیا تھا۔

عبدالاحد جنرل سائنس گروپ میں **سمعان** کا کلاس فیلو اور پڑھائی میں اس کا حریف تھا۔ مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والا سنجیدہ سا عبدالاحد اک دبلا پتلا سا لڑکا تھا۔ جس کی سیاہ بڑی بڑی آنکھوں میں ذہانت اور سنجیدگی دونوں ہی براجمان رہتی تھیں۔

"پتا نہیں اس کی شخصیت میں کیا ہے۔ یہ میرا اسکول فیلو بھی رہا ہے اور اب کلاس فیلو بھی ہے مگر جب کہیں بھی یہ میرے مقابلے پر آیا ہے۔ مجھے اپنی جیت کے لیے بے تحاشا محنت کرنا پڑی ہے۔ میں نے جب پہلی دفعہ تقریر کی تھی تو میں اس سے ہار گیا تھا' دوسری دفعہ بھی ایسا ہی ہوا اس کے بعد اس نے تقریر کرنا چھوڑ دی تھی۔ میں اس ہار کے بعد ہمیشہ جیتتا رہا ہوں مگر میں آج بھی اس سے خوفزدہ ہوں۔ شاید اسی لیے میں نے کبھی خواہش نہیں کی کہ میرا اس سے تقریر میں دوبارہ مقابلہ ہو۔" **سمعان** عبدالاحد کے بارے میں عدن کو بتا رہا تھا۔

"پڑھائی میں بھی میں اس کی ذہانت سے امپریس ہوں۔ اس کا میتھ بہت اچھا ہے' میتھ اور اسٹیٹ میں ہم اتنی جلدی کیلکولیٹر پہ کیلکولیٹ نہیں کر سکتے جتنی جلدی یہ ذہن میں کیلکولیٹ کر لیتا ہے۔"

"کیا آپ ہم سے دوستی کریں گے؟" اگلے دن یہ پانچوں عبدالاحد کے سامنے کھڑے اس سے پوچھ رہے تھے۔ عبدالاحد کے چہرے اور آنکھوں میں حیرت کی شدید لہر اٹھی تھی۔

"ہمارا مطلب ہے کہ ہم پانچ فرینڈز کا ایک گروپ ہے کیا آپ اس گروپ کے ممبر بنیں گے؟" **سمعان** نے وضاحت کی تھی۔

"یاہو!" اس کے لب بھینچ کر اثبات میں سر ہلانے پر سعد اور **سمعان** نے خوشی سے نعرہ لگایا تھا۔ اسی خوشی میں انہوں نے ایک پارٹی ارینج کی جس میں سب

نے ایک دوسرے کو گفٹ اور فرینڈشپ کارڈز دیے۔ تھرڈ ایئر کے اختتام سے ذرا پہلے سعد خان اور سارہ نے ان سب کو اپنی منگنی کی خوش خبری سنائی۔

منگنی کی تقریب ان سب کی یادوں کا اک خوب صورت اثاثہ تھی۔ سمعان نے پہلی دفعہ عدن کو یونیفارم کے علاوہ دیکھا تھا۔ اس کے آف وائیٹ سوٹ پر بہت نازک میرون کام کیا ہوا تھا۔ بے حد ڈیسنٹ انداز میں تیار عدن پوری پارٹی میں منفرد لگ رہی تھی۔ سمعان نے سفید کاٹن کا سوٹ پہن رکھا تھا اور عدن اپنی پسند پر فخر محسوس کر رہی تھی۔ سعد اور سارہ نے تو اچھا لگنا ہی تھا، ثانیہ اور عبدالاحد بھی تقریب میں شریک تھے۔ سچی خوشیوں نے ان سب کو بہت خوب صورت بنا دیا تھا۔ لیکن خوشیوں اور مسرتوں کے پل ٹھہرتے نہیں ہیں۔

فورتھ ایئر میں آ کر انہیں لگتا تھا کہ تین سال پر لگا کر اڑ گئے ہیں۔ اب سمعان نے بھی باقاعدہ عدن کو پرپوز کیا تھا، عدن نے سمعان کو اپنے والدین سے ملایا تھا۔ سمعان اپنے پیرنٹس کو لے کر عدن کے گھر گیا۔ دونوں گھرانوں کی باہمی رضامندی سے عدن اور سمعان کی منگنی بھی ہو گئی۔ گریجویشن کے بعد سب نے ایک ہی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کا سوچا تھا۔

اس گروپ کے باقی تین ممبر یونیورسٹی کے پہلے سال میں سلیکٹ ہوئے تھے۔ نایاب خان نے سمعان اور عدن کے ساتھ ہی پڑھا تھا۔ وہ بے حد حسن پرست تھی، اسی حسن پرستی نے اسے سمعان کی طرف متوجہ کیا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ وہ سمعان کی عدن میں دلچسپی سے واقف ہو گئی۔ وہ چاہنے کے باوجود بھی اس گروپ میں شمولیت حاصل نہ کر سکی تھی۔ اس کی شمولیت کی مخالفت عدن نے کی تھی۔ مگر جب نایاب کو پتہ چلا کہ وہ سب ایک ہی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے رہے ہیں تو اس نے بھی وہیں ایڈمیشن لیا۔ گریجویشن کے بعد نایاب کی منگنی اپنے کزن جنید سے ہو گئی تو اس نے سمعان کا خیال اپنے دل سے نکال دیا۔ مگر وہ ان سے تعلق نہ توڑنا چاہتی تھی۔ جنید بھی اسی یونیورسٹی میں تھا اور ان سے ایک سال سینئر تھا۔ جب ان سب نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تو اس نے سمعان وغیرہ کی ہر ممکن مدد کی۔ چنانچہ چند ابتدائی ماہ کی بے پناہ کوششوں اور بے ساختہ خلوص نے سمعان اور عدن کو مجبور کر دیا کہ وہ نایاب خان اور جنید کو بھی اپنے گروپ میں شامل کریں۔ گروپ کا نواں ممبر زین تھا۔ زین، اس گروپ سے ایک سال جونیئر تھا۔ سمعان وغیرہ کا یونیورسٹی میں دوسرا سال تھا جب زین یونیورسٹی میں آیا تھا۔ ان کے گروپ کی مقبولیت سن کر وہ بے اختیار ان کی طرف کھنچا چلا آیا تھا اور اپنی ذہانت، اپنے زبردست سینس آف ہیومر اور سوشل نیچر کی وجہ سے وہ ان کی ضرورت اور عادت بنتا چلا گیا۔

"زین آخری فرد ہو گا جس کو ہم نے اپنا گروپ ممبر بنایا ہے۔ اس کے بعد کوئی ہمارے گروپ میں نہیں آئے گا۔ کیونکہ اگر ہم نئے لوگوں کو شامل کر لیں گے تو اک بڑے گروپ کو ہینڈل کرنا مشکل ہو جائے گا اور ہمارے پرانے فرینڈز جو زیادہ اہمیت ڈیزرو کرتے ہیں، نئے لوگوں کے آنے کے بعد ان کی پوزیشن میں گڑبڑ ہو جائے گی۔" عدن نے حتمی انداز میں کہا تھا اور سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا تھا۔ یونیورسٹی میں بھی لگتا تھا کہ تقدیر دونوں ہاتھوں سے خوشیوں اور کامیابیوں کے تھال بھر بھر کر انہیں تھما رہی ہے۔

یونیورسٹی کے پہلے سال ثانیہ نے انہیں بتایا تھا کہ اس کے گھر والے اس کا رشتہ کہیں طے کر رہے ہیں۔ یہ خوشی کی بات تھی مگر ثانیہ کا رد عمل کچھ عجیب سا تھا۔ اس رشتے کی اطلاع اس نے کسی تاثر کے بغیر دی تھی۔ اس کے والد امریکہ میں بزنس چلا رہے تھے اور ماما کسی کالج کی پرنسپل ہونے کے ساتھ سوشل ورک میں بھی حصہ لیتی تھیں۔ دولت کی ریل پیل تھی۔ اس کا رشتہ بھی اس کے کسی فارن ریٹرن کزن سے کیا جا رہا تھا۔ مگر ثانیہ کا رویہ کسی کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔ رفتہ رفتہ عبدالاحد کی معمول سے زیادہ سنجیدگی اور ثانیہ کی بھیگی آنکھوں نے ان دلوں کا پول کھول دیا۔ وہ دونوں حتی الوسع ایک دوسرے سے کترا رہے تھے اور ان کی اسی بے نیازی نے ثابت کر دیا کہ ایک دوسرے کے بغیر جینے کی ان کی یہ کوشش بالکل ناکام ہو رہی ہے۔

"مجھے علم نہیں کہ یہ سب کیسے ہوا۔ مجھے کبھی بھی لگتا تھا کہ ثانیہ میرے لیے بہت اہم ہو چکی ہے مگر اس کو پانا ایک ایسا خواب تھا جس کو دیکھنے کی جرأت بھی میری آنکھوں نے نہیں کی سمعان!... میں ایک معمولی اکاؤنٹنٹ کا بیٹا ہوں، میں اتنے اعلیٰ درجے کی محبت افورڈ نہیں کر سکتا تھا اور آج سے قبل مجھے علم نہ تھا کہ ثانیہ بھی!... میں نے سوچا تھا کہ اپنی محبت دل کے کسی نہایت بلند درجے پر رکھ کر اس کو پوجتا رہوں گا، لیکن کسی کو دکھاؤں گا نہیں۔ مگر مجھے علم نہ تھا کہ میرے دل تک تم لوگوں کی رسائی ہے۔"

سمعان اور عدن نے حقیقت جاننے کے بعد جب احد کو سارے گروپ کے سامنے گھیرا تھا تو احد نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ ثانیہ کی پر شکوہ نگاہیں احد کو دیکھتے اور سنتے ہوئے کئی بار بھیگ چکی تھیں۔

"احد! دیکھو تم ہمت نہیں ہارو ایک دفعہ کوشش تو کرو۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ اپنے لیے نہیں تو ثانیہ کے لیے ہی۔ پورا گروپ تمہاری مدد کرے گا اور انشاءاللہ جیت ہماری ہی ہو گی۔"

سب نے احد اور ثانیہ کو بھرپور حوصلہ اور اعتماد دیا تھا۔ لیکن جب پروپوزل بھیجا گیا تو ثانیہ کی ممی نے عبدالاحد کے رشتے سے ایک دم انکار کر دیا تھا۔ ان کا رویہ بالکل بے لچک تھا۔ سمعان اور عدن نے ہر ممکن کوشش کی۔ سارا گروپ ثانیہ کے گھر جا کر اس کی ممی سے ملا، اس کے بڑے بھائی سے ملاقات کی اور انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن بے سود۔ پانچ چھ ماہ گزر گئے۔ یونیورسٹی کے دوسرے سال میں سمعان اور عدن نے ثانیہ کے ابو سے کانٹیکٹ کیا۔ انہوں نے توجہ سے پورا معاملہ سنا اور تسلی دی کہ وہ خود پاکستان آ کر یہ معاملہ سلجھائیں گے۔ وہ پاکستان آئے، عبدالاحد سے ملے اور اسے اوکے کر دیا۔ ان کی سرپرستی میں سمعان کے گروپ نے کوششیں کر کے ثانیہ کی امی اور بھائی کی مخالفت کو تقریباً ختم کر دیا اور آج...

آج کی گرینڈ پارٹی دو باتوں کی خوشی میں تھی۔ سمعان اور عدن کی ڈیبیٹ میں کامیابی کی خوشی میں بھی اور ثانیہ اور احد کا رشتہ طے ہونے کی خوشی میں بھی۔

"نہیں!... کیا کہا۔ وہ رقم کم پڑ رہی ہے۔" زین کے مزید رقم کے مطالبے پر عدن نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔

"ویسے یار! تم کھانے کے لیے کہاں لا رہے ہو... پورا اپی سی ہوٹل یا مرسڈیز۔ جو تمہیں مزید رقم درکار ہے۔" "لب کی" جنید کے استفسار پر زین سے صبر نہ ہوا۔

"خدا کا خوف کرو ظالمو! جو رقم تم لوگوں نے دی ہے وہ کسی بھی اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں دو انسانوں کے فرسٹ کلاس ڈنر کے لیے بھی ناکافی ہے اور تم لوگ تو خیر سے ماشاءاللہ ویسے ثانیہ بی بی۔ آج کے دن آپ ہی کچھ رحم کریں۔ احد صاحب تو حاتم طائی کی قبر کو لات مارنے سے رہے۔ میں نے تو ایسی لڑکیاں دیکھی ہیں جو اپنی پسند سے رشتہ ہو جانے پر دیگیں پکواتی ہیں اور..."

"اور ختم کرواتی ہیں پھر وظیفہ دیتی ہیں اور ہاں! چہلم ضرور کرواتی ہیں۔" زین کی تقریر کو جنید نے ایک بار پھر درمیان سے ہی اچک لیا۔ مگر زین کی توجہ سمعان، عدن اور ثانیہ کی طرف تھی جو اپنے اپنے والٹ اور پرس میں سے کڑکڑاتے نوٹ نکال رہے تھے۔

"یہ ہوئی نا بات! ویسے کیسی لگ رہی ہے۔" زین نے رقم جمع کرنے کے بعد سرخ رنگ کی گلاب کی نازک کلی کی طرف اشارہ کیا جو اس نے سمعان کے قریب پڑے بوکے سے نکال کر اپنی شرٹ کی جیب میں لگائی تھی۔ سمعان کی جونہی نظر پڑی اس نے اچک کر کلی اس کی جیب سے نکال لی۔

"ارے... ارے یہ کیا۔" زین نے جھپٹ کر کلی پکڑنے کی کوشش کی مگر بے سود۔

"جناب اس کلی پر آپ کا حق نہیں... یہ تو مجھے عدن نے دیا ہے۔" سمعان نے اک دلکش مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔ عدن بھی مسکرا رہی تھی۔ اک آسودہ سی فخریہ مسکراہٹ۔

"اوہو!... اسی لیے... کاش ہمیں بھی پھول دینے والی ہوتی کوئی۔" زین نے مصنوعی آہیں بھریں۔

"کیوں؟ کہاں گئیں تمہاری وہ فائزہ' سدرہ وغیرہ۔" سعد نے پوچھا۔

"ہاں بھئی۔ وہ فائزہ' سدرہ' رومانہ' شازیہ' پنکی اور آسیہ وغیرہ وغیرہ۔" سارہ نے باقاعدہ انگلیوں پر گنتی کی۔ زین حیرت سے سارے نام سنتا گیا پھر چہرے پر سنجیدگی سجا کر بولا۔

"تم نے مجھے اتنا فلرٹ سمجھ رکھا ہے؟" پھر معصومیت سے بولا۔ "ایک لڑکی کا نام تو کم کردو۔"

"اچھا بکواس نہ کرو۔ مجھے شدید بھوک لگی ہے اور گھر سے بھی ہم لوگ لیٹ ہو رہے ہیں۔" اب نایاب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ زین سر ہلاتے ہوئے چل دیا۔

"ویسے سمعان! تم نے تقریر بہت اچھی کی۔ عدن نے بھی بہترین نکات اٹھائے تھے۔ تم سے پہلے کچھ نیو کمرز بھی اچھا بولے تھے۔ مجھے ڈر تھا کہیں اس بار بازی وہ نہ لے جائیں مگر سمعان! انہیں مات دینا آسان کام نہیں۔" نایاب بہت پرجوش انداز میں سمعان کی تعریف کر رہی تھی۔ کھانے کے دوران بھی یہی موضوع زیر بحث رہا۔ زین عدم دلچسپی سے ان سب کی سنجیدہ ڈسکشن سن رہا تھا۔

"بھئی! تم باقی سب پر مٹی ڈالو۔ مجھے تو اس ڈیبیٹر نے امپریس کیا ہے' وہ کیا تھا۔ بحر ظلمات میں گھوڑا دیے دوڑے ہم نے" زین کی اس بات پر سب کا مشترکہ قہقہہ ابھرا۔ اس کے بعد عائشہ کمال کی تقریر اور اس کے انداز کے زین نے وہ بخیے ادھیڑے کہ سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ زین کا مشاہدہ بلا کا تیز تھا۔ وہ بالکل عائشہ کمال ہی کے انداز میں تقریر کر رہا تھا۔

"یہ سب ٹھیک ہے... لیکن میں تمہیں بتاؤں کہ وہ واحد ڈیبیٹر تھی جس کے دلائل بہت باوزن تھے۔ اس نے صرف اعتماد کی کمی کی وجہ سے مار کھائی ہے' ورنہ بصورت دیگر آئی ایم شیور کہ طالبات میں فرسٹ پرائز اس کو مل سکتا تھا۔" احد نے پہلی دفعہ گفتگو میں حصہ لیا تھا۔ اس کی یہ بات سن کر عدن کے چہرے کے تاثرات میں نمایاں فرق آیا تھا۔

"ہوں... مجھے بھی یہی محسوس ہوا تھا۔" نایاب نے پیپسی کا سپ لیتے ہوئے تائید میں گردن ہلائی۔

"ویسے میں آپ کو ایک بات بتاؤں' وہ ہماری یونیورسٹی کی خوب صورت ترین لڑکی ہے۔ جونیئرز میں اور سینئرز میں بھی میں نے اس کے مقابلے کی کوئی لڑکی نہیں دیکھی۔" نایاب کی یہ بات سن کر سب کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ سب اس کی حسن پرست فطرت سے واقف تھے۔

جنید شرارت سے کھانسا تھا مگر اب کی بار زین نے بھی نایاب کا ساتھ دیا۔

"نایاب بالکل ٹھیک کہتی ہے... وہ میری کلاس فیلو ہے اور میں نے کئی لوگوں سے اس کی خوب صورتی کے بارے میں سنا ہے۔" زین کی تائید پر نایاب اور بھی پرجوش ہو گئی۔

"واقعی میں نے جب اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو مجھے کسی بہت خوب صورت سی پینٹنگ کا گمان ہوا تھا۔ اتنے زیادہ سرخ و سفید پرکشش چہرے پہ موتی موتی ہیزل براؤن چمکدار آنکھیں... اس کے ہونٹ اور بال بھی ہیزل براؤن ہیں۔ سوٹ کرتے ہیں۔ اس پہ ہے ناں زین۔" نایاب اپنے تصور میں اس کا پیکر دہرا رہی تھی۔

"ہاں! آج بھی وہ بہت ڈیسنٹ لگ رہی تھی۔" اب جنید نے بھی نایاب کا ساتھ دیا۔ باقی سب دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔

ایک عدن ہی تھی۔ جو عدم دلچسپی سے اپنی بوتل کے اسٹرا سے کھیل رہی تھی۔ ایسا بہت کم ہوا تھا کہ ان

کے گروپ میں اس کے اور سمعان کے علاوہ کسی اور کی اتنی تعریف ہوئی ہو۔ یہ بات اس سے برداشت نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ بیگ لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے۔" اسے اٹھتا دیکھ کر باقی سب کو بھی اٹھنے کا خیال آیا۔ سب سے پہلے زین اٹھا' اس کی انگلیوں میں گھومتی موٹر بائیک کی چابی دیکھ کر احد کو کرنٹ لگا۔

"میری موٹر بائیک کی چابی تمہیں کہاں سے ملی؟"

"تمہاری جیب سے... تمہارے پاس بیٹھنے کا کوئی فائدہ تو ہونا چاہیے تھا۔ تمہارا کیا خیال تھا' تمہاری اتنی فضول سی تقریب اٹینڈ کرنے کے بعد میں پیدل گھر واپس جاتا۔ مجھے بیگانی شادی میں عبداللہ بننے کا شوق نہیں۔ ویسے بھی تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ میرے جیسے جینئس لوگ فائدہ کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔ آخر کو اکنامکس پڑھتے ہو۔" وہ سب ابھی حیرت سے بیٹھے اس کے زریں خیالات پر غور فرما رہے تھے کہ وہ جاتے جاتے مڑا۔

"ہاں سمعان! کل یاد سے کینٹین والے چچا کو پے منٹ کر کے اپنا آئی ڈی کارڈ واپس لے لینا۔ تم لوگوں کے دیے ہوئے پیسے میں اس کو دے تو دیتا مگر اچانک مجھے یاد آیا کہ مجھے تو فائزہ' سدرہ' رومانہ اور پنکی وغیرہ کو ڈنر کروانا ہے۔ سو میں نے پیسوں کی جگہ چچا کے پاس سمعان کا آئی ڈی کارڈ جمع کروا دیا... اچھا بائے۔"

سمعان کو تیزی سے اپنی جگہ چھوڑتے دیکھ کر زین نے چھلانگ لگائی تھی اور سمعان کے پہنچنے سے قبل ہی وہ گیٹ پار کر چکا تھا۔ سمعان اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے زین کو ریفرشمنٹ کا سامان لانے کے لیے رقم تھمائی تھی۔ زین کی تابعداری بھی اسے اب اس کی سمجھ میں آئی تھی۔

اپنے عقب سے اسے ملے جلے قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔ اس کا آئی ڈی کارڈ زین تک کیسے پہنچا؟ یہ سمجھنا مشکل نہ تھا۔ احد کے پاس بیٹھنے سے قبل زین اس کے ہی پاس بیٹھا ہوا تھا اور سب اپنے بیٹھنے کا فائدہ وہ ہمیشہ اٹھایا کرتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تو وہ سب فریب تھا۔" یونیورسٹی سے آنے کے بعد سے لے کر اب تک شاید چھ گھنٹے گزر چکے تھے مگر یہی وہ جملہ تھا جس پر ہر بار اس کے آنسو رک گئے تھے۔ وہ یہ جملہ سوچتے ہوئے آنسو پونچھ دیتی تھی مگر جونہی سوچ آگے بڑھتی' آنسو پھر بے لگام ہو جاتے۔

"تو پچھلے دو ڈھائی سال سے میں جس یقین کی گرفت میں تھی وہ محض الوژن تھا۔" آنسو پھر سے اس کے گالوں پہ بہنے لگے تھے' وہ بیڈ سے اٹھ کر اپنی رائٹنگ ٹیبل پہ آ گئی۔

"میرا خیال تھا... میں بہت کانفیڈنٹ ہو گئی ہوں۔" اس نے رائٹنگ ٹیبل پہ بکھرے بے شمار صفحات کو دیکھا۔ یہ وہ صفحات تھے جس پر اس کی تقریر نے بے شمار اشکال تبدیل کی تھیں۔

"مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں ایک مضبوط پرسنالٹی ڈیویلپ کر چکی ہوں۔ اب میرے اعتماد کو کوئی بھی متزلزل نہیں کر سکتا۔" اس کے آنسو تھم چکے تھے۔ سینے پہ ہاتھ باندھے وہ صرف رائٹنگ ٹیبل پہ بکھرے اپنے زہیر سارے تقریر کے صفحات دیکھ رہی تھی۔

"پچھلے دو سالوں میں مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں "تقدیر" اور "محبت" جیسی عفریتوں سے نجات حاصل کر چکی ہوں۔ "تقدیر" جو اٹل حقیقت ہے اور سب کے لیے ہوتی ہے اور "محبت" جس کا وجود دنیا کے لیے آکسیجن کا کام دیتا ہے۔ مگر یہ دونوں چیزیں میرے لیے کس قدر اذیت ناک رہی ہیں کوئی مجھ سے پوچھے!" اس سوچ کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں اذیت کے سائے لہرائے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر آرٹس کونسل کا منظر پوری شدت سے جاگا تھا۔

اس کی کپکپاتی بے اعتماد سی آواز اس کے اسٹیج سے اترتے لڑکھڑاتے قدم... اس پر ہونے والی ہوٹنگ' اس پر دیے جانے والے ریمارکس' سامعین کے لبوں پہ تمسخرانہ تبسم' طنز برساتی نگاہیں اور پھر یہ ساری

کوارٹرز نما سارے منظر دھندلا گئے تھے۔
اب اس کی آنکھوں کے سامنے صرف اس کی تقدیر تھی۔
وہ ہنس رہی تھی گویا کہہ رہی ہو۔
"میرے لکھے ہوئے کو مٹانا ممکن ہی نہیں۔ کیوں اس کوشش میں اپنا تماشا لگواتی ہو۔"
اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر سے آنسو امڈ آئے۔ پچھلے ڈھائی سال سے اس نے جس یقین کے سہارے کے کانفیڈنس کی بلند و بالا شاندار سی عمارت تعمیر کی تھی' آج اس کے دھڑام سے زمین پہ گرنے پر اسے پتہ چلا تھا کہ اس یقین کی تو بنیادیں ہی نہیں تھیں۔ اس کے اعتماد کی عمارت (بیس لیس Base less) ہی تھی تو گرنے پہ تعجب کیسا افسوس کی بات اور تھی۔ ہر اس چیز کے ختم ہونے پر افسوس ہوتا ہے جس پر آپ نے بے تحاشا محنت کی ہو مگر اس کا انجام بے ثمر ہو۔

☆ ☆ ☆

عائشہ کمال' نامور بزنس مین' احمد کمال کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کی ماں صبیحہ کمال اس وقت وفات پا گئی تھیں جب وہ صرف دس سال کی تھی۔ صبیحہ اپر مڈل کلاس سے تعلق رکھتی تھیں۔ مگر چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہونے کے ناتے ان کی پرورش نہایت ناز و نعم کے ساتھ ہوئی تھی۔ ان کی فیملی ایبٹ آباد میں رہائش پذیر تھی۔ صبیحہ ایم اے انگلش لٹریچر کرنے کے بعد فارغ تھیں کہ ان دنوں "امینہ بیگم" کی بیٹی کی شادی کا غلغلہ اٹھا۔ "امینہ بیگم" رشتے میں صبیحہ کی دور پار کی خالہ ہوتی تھیں اور بیاہ کر کراچی چلی گئی تھیں۔ سننے میں آیا تھا کہ ان کے شوہر انیسویں گریڈ کے بیورو کریٹ تھے لہٰذا دولت کی ریل پیل تھی۔ صبیحہ کے ماموں زاد سے امینہ بیگم کی بیٹی مضراب کا رشتہ طے ہوا تھا۔
امینہ بیگم اور ان کے شوہر کی متاثر کن پرسنالٹی' ان کا اپنی بیٹی کو دیا جانے والا جہیز' داماد کو تحفے میں دی جانے والی شاندار سی کرولا اور بیٹی کے نام کی جانے والی بڑی سی کوٹھی۔۔۔ الغرض ہر شے ان کے اسٹیٹس کو عیاں کر رہی تھی۔ صبیحہ کی فیملی تو یقیناً" ان کے اسٹیٹس سے ہی امپریس ہوئی تھی مگر صبیحہ خود "امینہ بیگم" کے بیٹے احمد کمال کی شاندار شخصیت سے بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ امینہ بیگم کے دو ہی بچے تھے۔ مضراب بڑی تھی اور اس سے چھوٹا "احمد کمال"۔ اور احمد کمال کے لیے انہوں نے مضراب کی شادی میں صبیحہ کو پسند کر لیا تھا۔ صبیحہ کی ذات اور شخصیت میں کوئی ایسی بات تھی کہ اسے نظر انداز کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ چنانچہ بخیر و خوبی یہ رشتہ انجام پایا۔ اور وہ "صبیحہ کمال" بن کر کراچی میں بنی اس نویلی کوٹھی میں آ گئی جو اس کے سسر نے ایک سال قبل ہی اپنے بیٹے کے نام سے خریدی تھی اور ابھی آباد تک اس کوٹھی کی وسعت اور خوب صورتی کے چرچے تھے۔
صبیحہ کمال کو لگتا تھا دنیا میں اس سے بڑھ کر خوش قسمت کوئی نہیں۔ سارے خاندان اس کی خوش قسمتی کے چرچے تھے۔ اس کے والدین بھی بہت خوش تھے مگر یہ خوشی اس وقت دھندلا گئی جب انہوں نے محسوس کیا کہ احمد کمال اور ان کے والدین کا رویہ ان کے ساتھ انتہائی سرد ہے۔ جب بھی صبیحہ کے والدین یا بھائی کراچی میں اس سے ملنے جاتے تو ان کے اندر اپنی کم مائیگی کا احساس شدت سے ابھرتا۔ وہ صبیحہ کے لیے اتنے بیش قیمت تحفے لانے کی استطاعت نہ رکھتے تھے جو احمد کمال کے لیے کشش کا باعث بنتے۔
صبیحہ کمال نے بھی جب تک تصویر کا ایک رخ دیکھا تھا' وہ خوش تھی مگر دوسرا رخ دیکھتے ہی اسے احساس ہوا کہ وہ اب تک خوابوں میں جیتی رہی جبکہ حقیقت خوابوں کے بالکل برعکس ہے۔ وہ نرم جذبات رکھنے والی' حساس سی لڑکی تھی جس کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے احمد کمال جیسے حس انسان کو چاہا تھا جس کے نزدیک محبت یا محسوسات

کچھ اہمیت نہ رکھتے تھے۔ کم از کم صبوحہ کمال کی محبت یا اس کے احساسات تو کسی بھی طرح سے کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے۔ اس کی تمام مصروفیات اور تمام تر توجہ اول روز سے اپنے بزنس اور اپنے سوشل سرکل کی طرف تھی۔ صبوحہ سے محبت تو کجا اسے اس نے اتنی اجازت تک نہ دی تھی کہ وہ اس جیسے ان پرست شخص کو چاہے۔ اس نے اپنی ذات کے گرد اتنی فصیلیں کھڑی کر رکھی تھیں کہ تمام عمر صبوحہ ان میں جھانک نہ سکی۔ وہ پہلے تو احمد کمال کی شخصیت سے متاثر تھی۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی ذہانت اور ملٹی ڈائیمنشنل Multidimensionall قسم کی ذات نے اسے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا۔ وہ خوب صورت تھی، تعلیم یافتہ تھی مگر۔ یہاں کسی نے بھی اس کی کسی صلاحیت کو اہمیت نہ دی تھی۔ اس کی تمام عمر اپنی کینس سیکھنے اور ہائی سوسائٹی میں موو کرنے کے گر جاننے میں گزر گئی۔ اس نے ہر وہ چیز ترک کر دی جو احمد کمال یا اس کی فیملی کو ناپسند تھی۔

مگر حالات پھر بھی ٹھیک نہ ہوئے۔ احمد کمال پتھر تھا، پتھر ہی رہا۔ شادی کے دوسرے برس عائشہ صبوحہ کی گود میں آئی اور تیسرے برس امینہ بیگم اور ان کے شوہر لاہور سے کراچی واپسی پر ایک حادثے کا شکار ہو گئے۔ اب بزنس کی ساری ذمہ داری احمد کمال پر تھی۔ ان کی سنجیدگی، مصروفیت اور صبوحہ سے لاتعلقی بڑھ گئی۔ صبوحہ یہ سب کچھ کمال ضبط سے برداشت کر رہی تھی، وجہ صرف احمد کمال کی محبت تھی۔ اولاد تو ایسا رشتہ ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا بے حس انسان بھی اس رشتے کی تمازت سے پگھل جاتا ہے، مگر احمد کا عائشہ کی طرف یہ سرد سا رویہ اسی بات کا عکاس ہے کہ یہ سرد مہری ان کی فطرت میں ہے اور فطرت بدلنا نہ تو انسان کے بس میں ہے اور نہ اس کو بدلنا۔ صبوحہ کا دل اکثر ایسے دلاسے اسے دیتا رہتا تھا۔

مگر قیامت اس دن آئی جب اسے مسز جنید نے احمد کمال کی دوسری شادی کی اطلاع دی۔

"سنا ہے احمد دوسری شادی کر رہے ہیں۔" اس دن مسز جنید نے فون کیا تو چند ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اصل موضوع کی طرف آ گئیں۔ جنید، رفیق احمد کمال کا بزنس پارٹنر تھا۔

صبوحہ کو لگا تھا کسی نے اس کے کانوں میں سیسہ انڈیل دیا ہو۔ مگر اس کے دماغ میں ایسی آندھیاں چل رہی تھیں کہ وہ اپنے منہ سے نکلنے والے جواب تک نہ سن پائی تھی۔ فون کریڈل پہ رکھ کر وہ کرسی پر ڈھے سی گئی۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا... سب کچھ۔

نہ جانے کتنے دیر وہ اسی کیفیت میں رہی، حواس بحال ہوئے تو مسز جنید کے الفاظ سماعتوں میں گونجنے لگے۔

"سنا ہے احمد دوسری شادی کر رہے ہیں۔"

"بہت عرصہ سے جانتے ہیں وہ ورده علی کو، دونوں نے غالباً ایم بی اے ایک ساتھ ہی کیا تھا۔"

"جنید بتا رہے تھے کہ احمد پہلے بھی ورده علی سے ہی شادی کرنا چاہتے تھے مگر احمد کی والدہ راضی نہ تھیں۔ کمال صاحب (احمد کے والد) کے بھی کچھ تنازعات تھے ورده علی کے فادر سے۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی، اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر سوئی ہوئی عائشہ نیند میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"ہاں! اب کمال صاحب ہی نہ رہے تو کیسے تنازعات... ویسے احمد یہ بھی کہہ رہے تھے کہ انہیں اپنے وسیع و عریض کاروبار کے لیے کوئی "وارث" چاہیے۔ اسی وجہ سے وہ دوسری شادی کر رہے ہیں۔" مسز جنید کی آواز اس کی سماعتوں پر کوڑے لگا رہی تھی۔ اندر ایک شور بپا تھا۔ اتنا شور کہ عائشہ کے چیخ چیخ کر رونے کی آواز بھی کانوں تک پہنچ نہیں پا رہی تھی۔

"تو احمد کمال! یہ وجہ تھی تمہارے اس بے رحم سلوک کی... تمہارے دل پہ کسی اور کی محبت کی مہر لگی ہوئی تھی۔ تم کسی اور سے وفا کے وعدے نبھا رہے تھے۔ تمہارے دل کے ارد گرد فصیلیں نہیں کھڑی تھیں بلکہ کسی اور کا "محل" تعمیر ہو چکا تھا۔ تم کسی اور کو چاہتے تھے اس طرح کہ میں اور میری بچی تمہاری نظروں میں بالکل بے وقعت رہیں۔" اپنی مٹھی میں

اپنے ہی بال جکڑ کے وہ کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

"اور میں... میں سمجھتی رہی کہ یہ تمہاری "نیچر" ہے یہ روکھا سوکھا رویہ تمہاری فطرت ہے۔" بالوں پر اس کی گرفت سخت ہو گئی۔

"یہ، یہ کیا کر دیا تم نے احمد کمال! یہ کیوں کیا تم نے؟" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

کتنا اذیت ناک ہوتا ہے گرنے کا سفر جب نیچے کسی زمین کے ہونے کا گمان بھی نہ ہو۔

روتے روتے اس کی اپنی آواز ذرا دھیمی ہوئی تو اسے محسوس ہوا وہ اکیلی نہیں رو رہی کوئی اور بھی ہے جو اس کے قدموں میں سر رکھے، اپنے ننھے منے ہاتھوں سے اس کے پاؤں کی پنڈلیاں تھامے زار و قطار رو رہا ہے۔ اس کے آنسو تھم گئے۔ بہت بے قرار ہو کر اس نے لپک کر عائشہ کو اٹھایا۔ وہ رو رو کر اتنا تھک چکی تھی کہ چند منٹوں میں صبوحہ کی بانہوں میں سو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ عائشہ کتنی حساس بچی ہے۔ ہیزل براؤن بڑی بڑی آنکھوں والی عائشہ ہر وقت صبوحہ کے ساتھ ساتھ رہتی۔ صبوحہ اکثر اسے دیکھ کے سوچا کرتی کہ وہ احمد اور اس کی شخصیت کا ایک زبردست امیج نیشن ہے۔ اس کی صورت بالکل احمد کمال جیسی تھی۔ ویسی ہی ہیزل براؤن بڑی بڑی چمکدار آنکھیں، ناک بھی بالکل ویسا ہی ستواں سا نکھرا نکھرا اور ویسے ہی بھرے بھرے ہونٹ۔ لیکن اس کا چھریرا جسم اور رنگت بالکل صبوحہ والی تھی۔

صبوحہ جانتی تھی کہ وہ کتنی "ذکی الحس" ہے۔ باپ کی توجہ اور شفقت سے تو وہ محروم تھی ہی، اس بات کے بعد صبوحہ کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ ماں کی توجہ سے بھی محروم ہوتی جا رہی ہے۔ سو جب احمد کمال نے اسے اپنی دوسری شادی کی اطلاع دی تو اس نے پھر بھی نہ کہا، کوئی واویلا نہ کیا۔ احمد کمال نے کہا تھا وہ ورده کے ساتھ دوسرے گھر میں رہے گا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ البتہ صبوحہ اور عائشہ کے تحفظ کے لیے چوکیداروں اور نوکروں کی تعداد بڑھا دی۔ امینہ بیگم والی کوٹھی سے رحمت خالہ کو بھی ادھر ہی

بھیج دیا۔

صبوحہ کے والدین کو پتا چلا تو وہ بہت برہم ہوئے، انہوں نے صبوحہ کو اپنے ساتھ ایبٹ آباد واپس چلنے کو کہا مگر اس نے انکار کر دیا۔ طرح طرح کی دلیلیں دے کر انہیں قائل کیا کہ دوسری شادی کی اجازت اس نے بذات خود احمد کمال کو دی ہے۔

"اماں جانی! ہمارا کوئی بیٹا نہیں ہے اور نہ ہی احمد کا کوئی بھائی۔ تو اتنا بڑا بزنس کون سنبھالے گا۔ کس کے لیے احمد اتنی محنت کر رہے ہیں۔ میں خود کافی عرصے سے اس بارے میں سوچ رہی تھی اور احمد کو میں نے بہت سوچ سمجھ کر اجازت دی ہے۔ آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں میں بہت خوش ہوں۔" صبوحہ نے اپنی ماں کے سامنے دس دفعہ یہ باتیں دہرائی تھیں۔ بالآخر صبوحہ کی ضد کے آگے سب نے ہار مان لی اور واپس چلے گئے۔ وہ تنہا اپنی بیٹی کی پرورش کرتی رہی۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی کب کینسر جیسے موذی مرض نے اس کے اندر ڈیرے ڈالے اور جب اسے خبر ہوئی تب بہت دیر ہو چکی تھی۔ عائشہ 6th میں تھی جب صبوحہ اسے روتا بلکتا چھوڑ کے اس دار فانی سے منہ موڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

یونیورسٹی سے غیر حاضر ہوئے اسے تیسرا روز تھا۔ اس دوران عطیہ اور سلمیٰ، دونوں نے اسے فون کیا تھا مگر اس نے شاداں سے کہلوا دیا تھا کہ وہ گھر پہ نہیں۔

"اگر کوئی زیادہ استفسار کرے شاداں تو کہہ دینا میں چند دنوں کے لیے ایبٹ آباد گئی ہوئی ہوں۔" اس نے شاداں کو تاکید کی تھی جو رحمت خالہ کی بیٹی تھی۔

اس وقت بھی عائشہ ٹیرس پہ کھڑی لان میں شاداں کے تینوں بچوں کو بیڈمنٹن کھیلتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہیں بظاہر ان پر جمی تھیں مگر دھیان از تا از تا پھر سے یونیورسٹی میں چلا گیا تھا۔

"میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اب کبھی یونیورسٹی واپس نہیں جاؤں گی... مگر یونیورسٹی تو مجھے جانا ہی پڑے گا۔" اس نے خود کلامی کی تھی اور پاس کھڑی تقدیر

مسکرا اٹھی تھی۔ ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ۔
"اف خدایا! میں ان سب کا سامنا کس طرح کروں گی؟ میرے ساتھ ہی ہمیشہ ایسا کیوں ہوتا ہے میری ماں اس وقت مجھ سے چھن گئی جب مجھے ان کی اشد ضرورت تھی۔
میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک بار ان سے پاپا کے بارے میں پوچھا تھا کہ وہ اتنے اتنے دنوں بعد گھر کیوں آتے ہیں اور میری باقی فرینڈز کے فادرز کی طرح مجھے پیار کیوں نہیں کرتے؟"
میرے یہ سوال سن کر ان کی آنکھوں میں ایک دم ہی نمی اتر آئی تھی۔ مگر انہوں نے فوراً ہی اپنے آنسو چھپا کے مجھے بتانا شروع کر دیا کہ وہ کتنے بزی رہتے ہیں۔
انہوں نے مجھے بہت سی دلیلیں دی تھیں تاکہ پاپا کا امیج میرے ذہن میں خراب نہ ہو۔ مگر ان کی دلیلوں سے قطع نظر میں یہ سوچ رہی تھی کہ مجھے آئندہ پاپا کے متعلق کوئی بات نہیں کرنی اگر پھر کبھی ایسی کسی بات پر ماما کی آنکھوں میں آنسو آتے تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔
جب مجھے ماما نے پاپا کی سیکنڈ میرج کے بارے میں بتایا تو مجھے کوئی دکھ نہیں ہوا۔ دکھ بھی ہوتا جب میں محسوس کرتی کہ اس بات نے ماما کو دکھ دیا ہے۔ مگر ماما نے مجھے اس ڈھنگ سے سب کچھ بتایا اور سمجھایا تھا

گویا یہ بہت خوشی کی بات ہو اور میں نے بھی بخوشی اس بات کو قبول کیا تھا کہ میرے فادر کافی عرصہ پہلے دوسری شادی کر چکے ہیں۔ میں اس وقت ماما کی ان فیلنگز سے بے خبر تھی جو ایک عورت ہونے کے ناتے اپنے شوہر کی بے اعتنائی پر ان کی ہو سکتی تھیں۔
بیڈ کراؤن سے اپنا سر ٹکاتے ہوئے اس نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔ دس سال پہلے کا منظر اس کی نگاہوں میں پوری شدت سے جاگا تھا۔ جب زندگی کی ہر خوشی اس سے روٹھ گئی تھی اسے ہر چہرہ اجنبی لگتا تھا۔ اپنے پاپا کا بھی۔
اسے مضراب پھوپھو کے الفاظ یاد آ گئے۔
"احمد کمال! میں تمہیں عائشہ کا سامان پیک کر دیتی ہوں' اب تم اسے بھی اپنے ساتھ دوسرے گھر لے جاؤ 'وہاں' تانیہ اور عثمان کے ساتھ اس کا دل بہل جائے گا۔ آخر وہ اس کے بہن بھائی ہیں۔ اکٹھے رہیں گے تو ان کے درمیان انڈر اسٹینڈنگ ڈویلپ ہو گی۔ ورنہ کو بھی تلقین کرنا کہ اس کا خیال رکھے۔"
پاپا ان کی یہ بات سن کر بے چینی سے ٹہلنے لگے پھر انہوں نے یکدم انکار کر دیا۔
"یہ ممکن نہیں ہے مضراب آپی' میں نے ورد سے بات کی تھی 'وہ' کسی صورت بھی اسے اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتی۔ تانیہ اور عثمان میری فرسٹ میرج کے بارے میں کچھ نہیں جانتے 'اگر میں اسے وہاں لے کر جاؤں گا تو میرے گھر کا ماحول بری طرح متاثر ہو جائے گا۔ نہ صرف ورد ڈسٹرب ہو گی بلکہ تانیہ اور عثمان کے لیے بھی یہ سب کسی شاک سے کم نہیں ہو گا۔ یہ یہیں رہے گی میں اس کے لیے کسی فل ٹائم گورنس کا بندوبست کر دوں گا' اس کے علاوہ رحمت بی ہیں' ان کی بیٹی بھی 'یہیں' آتی رہتی ہے۔ یہ سب مل کر اس کا خیال رکھیں گے۔" انہوں نے حتمی لہجے میں اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔
"احمد کمال! تم ہوش میں ہو۔۔۔ تم ہن ماں کی اپنی سگی بیٹی کے ساتھ کیا سلوک کرنے جا رہے ہو تمہیں اس کا اندازہ ہے؟ رشتہ داروں اور والدین کی موجودگی

میں 'وہ غیروں کے ہاتھوں میں پلے گی؟" مضراب پھوپھو بہت سخ ہو گئی تھیں۔
"اگر اس کا وجود تمہارے لیے اتنا ہی غیر اہم ہے تو ٹھیک ہے' عائشہ کو میں لے جاتی ہوں اپنے ساتھ ایبٹ آباد' وہاں کم از کم اس کے نانا' نانی اور ماموں تو ہوں گے۔ اس کا زیادہ بہتر طور پر خیال رکھیں گے۔ ویسے بھی کراچی سے جاتے ہوئے بڑے سالوں ان سب نے عائشہ کو اپنے ساتھ رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔"
یہ سنتے تھا کہ احمد کمال کا پارہ چڑھ گیا تھا۔ انہوں نے جھپٹ کر عائشہ کو مضراب پھوپھو کی گود سے نکال کر اپنے برابر کھڑا کر دیا۔ اس کا بازو مضبوطی سے جکڑے ہوئے بھی چلا اٹھے تھے۔
"وہ کون ہوتے ہیں عائشہ کو لے جانے والے 'ان کی جرأت کیسے ہوئی یہ بات سوچنے کی بھی' یہ میری بیٹی ہے اور یہ یہیں رہے گی اس گھر میں۔۔۔ آپ سب اپنے کام سے کام رکھیں 'آئندہ یہاں آنے کی اور اس کے بارے میں فکرمند ہونے کی آپ لوگوں کو ہرگز' کوئی ضرورت نہیں۔"
اس تذلیل پر سب اس قدر شاکڈ رہ گئے کہ پھر انہوں نے کبھی پلٹ کر احمد کمال کے گھر کا رخ نہ کیا۔ عائشہ کے لیے انہوں نے اسی گھر میں گورنس رکھ دی اور پھر اگلے چار سال وہ گورنس کے زیر سایہ زندگی کے آداب سیکھتی رہی۔
گورنس کا نام ذہن میں آتے ہی عائشہ کے ذہن کے پردے پر طاہرہ رحمٰن کا سراپا ابھرا۔ طاہرہ رحمٰن ایک بہت نفیس قابل خاتون تھیں۔
"ممّا کے بعد طاہرہ آنٹی وہ دوسری شخصیت تھیں جنہوں نے میری ذات کو متاثر کیا۔ انہوں نے کبھی میری ممّا کی جگہ لینے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے آتے ہی میرے سارے کام اپنے ذمے لے لیے۔ شروع میں وہ مجھے پسند نہ آئی تھیں۔ میں ان کا موازنہ ممّا سے کرتی' میرا خیال تھا وہ آتے ہی ممّا کی طرح مجھ سے پیار کرنے کی کوشش کریں گی تو میں انہیں جھلا دوں گی میں انہیں بتاؤں گی کہ وہ کبھی میری ممّا کی طرح

نہیں ہو سکتیں۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا' انہوں نے آتے ہی ہر کام اپنی ذمہ داری سمجھ کر سنبھال لیا۔ مجھے جلد ہی احساس ہو گیا کہ وہ یہاں مجھ پر اپنی ممتا لٹانے نہیں بلکہ صرف میری دیکھ بھال کرنے آئی ہیں۔ یہ جان کر نہ جانے کیوں مجھے بے حد دکھ ہوا تھا۔ میں ان سے اور بھی کھنچ گئی تھی۔
پھر میں نے ایک دن انہیں روتے ہوئے دیکھا تب انہیں ہمارے گھر آئے ہوئے ایک سال سے زیادہ ہو چکا تھا۔ چند ماہ پہلے انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے شوہر اور بچے لاہور سیٹل ہو چکے ہیں۔ ان کے شوہر نے وہاں کوئی کاروبار شروع کیا تھا۔ طاہرہ آنٹی میری وجہ سے یا بالفاظ دیگر اپنی جاب کی وجہ سے ہمارے ہی گھر میں رہتی تھیں۔ لیکن انہیں روتا دیکھ کر مجھے شدید حیرت ہوئی تھی۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ انہیں اپنے بچے یاد آ رہے ہیں۔
مجھے دیکھ کر انہیں اپنے بچے یاد آ رہے تھے اور انہیں روتا دیکھ کر مجھے اپنی ماں اور اس کے آنسو یاد آ رہے تھے۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ نہ میں انہیں اپنی ماں سمجھنے پہ تیار تھی نہ وہ مجھے اپنے بچوں جیسا مقام دینا چاہتی تھیں۔
ہم دونوں ہی اس دن خوب روئے تھے 'وہ اپنے بچوں کی باتیں کر کے اور میں اپنی ممّا کی باتیں کر کے۔ اور وہ دن ہماری دوستی کی ابتدا تھا۔ پھر مجھے طاہرہ آنٹی سے آہستہ آہستہ مگر بتدریج محبت ہونا شروع ہو گئی۔
اور پھر۔۔۔ پھر جب میری ان سے محبت پختہ ہوئی تو اس وقت تقدیر نے مجھ پر دوسرا وار کیا۔ دوسرا اکلوتی واپ۔ عائشہ بے چین ہو کر بیڈ سے اٹھ گئی تھی۔
کمرے کا دروازہ کھول کر وہ کوریڈور سے گزرتی ہوئی باہر لان میں آ گئی۔ اس نے پورچ میں کھڑی گاڑیوں کو دیکھا۔ احمد کمال کی گاڑی وہاں نہیں تھی۔
"اس کا مطلب ہے پاپا ابھی نہیں آئے۔" اس نے ایک لمحے وہیں کھڑے ہو کر سوچا پھر تیز تیز چلتی پورچ میں کھڑے ڈرائیور کے پاس آ گئی۔
"گل خان! مجھے گاڑی کی چابی دو۔" اس نے ہاتھ

آگے بڑھا کر کہا۔ گل خان نے حیرت سے اسے دیکھا۔
"بی بی جی! اگر کہیں جانا ہے تو ہم لے چلتا ہے آپ کو۔" وہ جانتا تھا وہ خود اکیلے جانا چاہتی ہے مگر احمد کمال سے ڈرتا تھا۔ اسے یقین تھا وہ اس بات پہ خفا ہوں گے دن میں دس بار وہ عائشہ کے بارے میں تمام ملازمین کو تاکید کیا کرتے تھے۔
"میں نے کہا ناں۔ مجھے گاڑی کی چابی دو۔ میں کہیں دور نہیں جا رہی۔ پارک تک جا رہی ہوں۔ تھوڑی دیر میں واپس آجاؤں گی۔۔۔ پاپا کے آنے سے پہلے۔" اس نے اپنے آخری الفاظ پہ زور دے کر کہا۔ وہ گل خان کی جھجک کی وجہ جانتی تھی۔ گل خان نے مجبوراً چابی اس کے حوالے کر دی۔ مگر گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بعد عائشہ جس اسپیڈ سے اسے گیٹ سے نکال کر لے گئی تھی۔ اس نے گل خان کو تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

پارک کے نسبتاً تنہا گوشے میں اس خالی بینچ پر بیٹھ کر اس نے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔ ہر جگہ زندگی متحرک تھی۔ پارک کے اطراف پھیلی سڑکوں پر بھی اور پارک کے اندر بھی لوگوں کے قہقہوں میں بھی اور ان کی آنکھوں میں بھی۔ عائشہ کی نظریں سامنے بیٹھے اس جوڑے پر ٹک گئیں جو خوش باش بیٹھے قہقہے لگا رہے تھے۔ پاس ہی ان کی پیاری سی کیوٹ سی بیٹی کھیل رہی تھی۔ وہ دونوں اپنی باتوں میں ہونے کے باوجود اپنی بیٹی پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی معصوم شرارتوں پہ ہنس رہے تھے۔ عائشہ بے دھیانی میں انہیں تکنے لگیں۔ اسے احساس ہی نہ ہوا کہ جس خیال اور ماضی سے پیچھا چھڑا کر وہ وہاں آئی تھی۔ اس ماضی کی فلم ایک بار پھر اس کے ذہن کے پردے پر رواں ہو چکی تھی۔
اسے ایک بار پھر اپنے ممی پاپا یاد آ گئے۔ صبینہ کمال اور احمد کمال۔ اسے وہ سب یاد آ گیا جو احمد کمال نے صبینہ کے ساتھ کیا اور پھر وہ سب بھی جو وردہ علی نے احمد کمال کے ساتھ کیا۔ وردہ نے اپنی ازدواجی زندگی ایک بڑے مقصد کے لیے صرف کر رکھی تھی۔ احمد کمال کے باپ نے وردہ علی کے باپ کے ساتھ مشترکہ بزنس شروع کیا تھا مگر بعد میں انہوں نے وردہ کے باپ کے شیئرز پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ وردہ کو اپنے باپ کا حق واپس لینا تھا۔ احمد کمال کے والدین کے حیات رہنے تک وہ ایسا نہ کر سکی تھی مگر بعد میں اس نے احمد کمال سے شادی کے بعد آہستہ آہستہ اس کی کوٹھی اپنے نام کروائی اور پھر اس کی پوری فیکٹری پہ اپنا اور اپنے بھائیوں کا تصرف جما لیا۔ اپنے بچوں ہانیہ اور حنان کو امریکہ تعلیم دلوانے کے لیے بھیجنے کے بعد اس نے احمد کمال کو صرف دکھ دیا تھا۔ وردہ کو طلاق دینے کے بعد سے وہ عائشہ کے ساتھ اپنے اس گھر میں رہنے لگے جہاں انہوں نے بہت عرصہ پہلے صبینہ کو کسی بے کار چیز کی طرح پھینک دیا تھا۔ عائشہ کو ان کی موجودگی سے کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ اس کی شخصیت اتنی مرتبہ توڑ پھوڑ کا شکار ہو چکی تھی کہ اس کے لیے خوشی اور غم کے مفہوم یکسر بدل چکے تھے۔
کافی دیر تک روتے رہنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس کے دل کا بوجھ کم ہو گیا ہے۔ اپنی آنکھیں پونچھنے کے بعد اس نے ارد گرد نگاہ دوڑائی سب اپنے آپ میں مگن تھے۔ کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ واپسی کے لیے گاڑی میں بیٹھ کر بے اختیار اس کا جی چاہا کہ وہ کچھ دیر اور اسی رونق میں رہے۔
اس نے گاڑی کا رخ مین مارکیٹ کی طرف کر دیا جو پارک سے زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔ گاڑی آہستہ آہستہ ڈرائیو کرتے ہوئے وہ غیر دانستہ ہی اپنے ارد گرد لوگوں کو اپنے معمولات میں مصروف محو حرکت دیکھ رہی تھی۔ جب اس کی نظر بلیک کرولا کے قریب کھڑے اس شخص پر پڑی۔ ایک لمحے کو اسے اس کا چہرہ شناسا سا لگا اور دوسرے ہی لمحے وہ اسے پہچان چکی تھی۔
اب وہ گردن موڑ کر "سمعان علوی" کا جائزہ لے رہی تھی۔ بلیک پینٹ پہ بلیک ہی سنگل کالر کوٹ پہنے وہ اپنے کسی دوست سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کے سیاہ بال گلاسز سے کچھ اوپر اس کی کشادہ سفید پیشانی پر

بکھرے ہوئے تھے کہ عائشہ کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آپ ہی آپ ٹھہر گئی۔
سمعان علوی کو دیکھ کر اسے اتنی خوشی کیوں ہو رہی ہے؟ اس نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد وہ اپنے دوست کو خدا حافظ کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ عائشہ نے اب اپنی گردن سیدھی کر لی تھی۔ اس کا خیال تھا ابھی سمعان کی گاڑی اس کے قریب سے گزرے گی۔ عائشہ نے دھیان نہ دیا تھا کہ پیچھے کھڑی بلیک کرولا مسلسل ہارن دے رہی ہے۔
"ایکسکیوزمی مس! آپ نے غلط پارکنگ کر کے راستہ بلاک کر دیا ہے۔ کیا آپ اپنی گاڑی ہٹانا پسند کریں گی؟" ان الفاظ پر عائشہ نے گردن موڑی تھی اور پھر گویا ساکت ہو گئی۔ کھڑکی کی طرف ذرا سا جھک کر قدرے سرد مگر شائستہ انداز میں یہ الفاظ دہرانے والا سمعان ہی تھا۔ اپنی بات کہہ کر وہ واپس اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔
عائشہ نے ہڑبڑا کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ لیکن گھر کی طرف واپس ڈرائیو کرتے ہوئے اسے یوں لگ رہا تھا گویا وہ کسی مہم میں آ چکی ہو۔ پہلے اس کا خیال تھا وہ یونیورسٹی میں ہونے والے اس دن کے واقعے سے متاثر ہوئی ہے۔ وہ واقعی متاثر ہوئی تھی مگر اس واقعے سے نہیں بلکہ سمعان علوی سے۔ اس کی شخصیت سے اس کی ذہانت سے اور آج آج وہ اس کی وجاہت اور خوب صورتی کے سحر میں جکڑی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

کچن میں کام کرتی شاداں نے حیرت سے ڈائننگ ہال میں ڈائننگ ٹیبل پہ بجائی جانے والی ڈھولک کو سنا۔ عائشہ کے لیے ناشتہ ٹرے میں رکھ دی تھی اور جانتی تھی کہ ڈائننگ ہال میں سوائے عائشہ کمال کے اور کوئی نہ تھا۔ اس نے جلدی سے ٹرے اٹھائی اور ڈائننگ ہال کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں جا کر اسے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ عائشہ نہ صرف چھری کانٹے سے ٹیبل بجا رہی تھی بلکہ ہلکا ہلکا مسکراتے ہوئے کچھ گنگنا بھی رہی تھی۔ اس کا یہ مشغلہ شاداں کے ٹیبل پر برتن رکھنے کے دوران بھی جاری رہا تھا۔ شاداں کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب اس نے عائشہ کو اس طرح خوش دیکھا تھا۔
ادھر ناشتہ کرتے ہوئے عائشہ کو لگ رہا تھا جیسے وہ ایک دم سے ہلکی پھلکی ہو گئی ہے۔ کل شام تک پیدا ہونے والی ساری فرسٹریشن اور ٹینشن کہیں غائب ہو چکی تھی۔
"آج میں اتنی خوش کیوں ہوں۔" اورنج جوس کا گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے اس نے بے اختیار سوچا۔
"بار بار میرا جی چاہ رہا ہے میں بے اختیار اونچے اونچے قہقہے لگاؤں خوب ہنسوں! امیزنگ۔" سوچتے ہوئے اچانک جھماکے کے ساتھ اسے اپنا رات کا خواب یاد آیا۔ اسے اپنے ہنسنے اور خوش ہونے کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔
اس نے خواب میں سمعان علوی کو دیکھا تھا۔
اس نے یونیورسٹی میں انگلش ڈیپارٹمنٹ کے سامنے موجود لان دیکھا تھا۔ مگر وہ لان حقیقتاً اتنا خوب صورت نہ تھا جتنا خوب صورت و سرسبز اس نے خواب میں دیکھا تھا۔
اس نے دیکھا وہ اور سمعان اس لان میں بیٹھے یوں بے تکلفی سے گفتگو کر رہے ہیں گویا ہمیشہ سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں! اس ہلکی پھلکی سادہ سی گفتگو میں وہ کئی بار سمعان کی کسی بات پر بے تحاشا ہنسی تھی۔ اس وقت بھی وہ خواب یاد کر کے مسکرا دی۔
"شاید میں نے کل سمعان سے ہونے والے اس عجیب سے تصادم کے بعد اسے بہت زیادہ سوچا تھا۔" وہ مسکراتے ہوئے سوچ رہی تھی۔
"مگر کیوں؟" اب وہ سنجیدگی سے تجزیہ کر رہی تھی۔
"کہیں وہ تمہیں اچھا تو نہیں لگنے لگا۔" اس خیال نے اس کی مسکراہٹ چھین لی تھی۔ ایک دم سے ہی

اس کا جسم اکڑ گیا تھا۔

"نہیں عائشہ کمال! تمہیں اب کسی انسان سے محبت نہیں کرنی۔ کیا تم اپنے پچھلے تمام تجربات فراموش کر چکی ہو؟

اسے اپنی ماضی میں ہونے والی تمام محبتیں یاد آنے لگیں اور ان کے اذیت ناک انجام بھی۔

اس وقت وہ میٹرک میں تھی جب طاہرہ آنٹی اسے چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ الفاظ آج بھی عائشہ کی سماعتوں میں محفوظ تھے۔

"عائشہ! میرا خیال ہے اب آپ اس حد تک میچور ہو چکی ہو کہ نہ صرف اپنا خیال رکھ سکتی ہو' بلکہ اپنے حالات و معاملات کو بھی سمجھ سکتی ہو' انہیں فیس کر سکتی ہو۔ دیکھو! آپ کو ہر چیز کا بہت بہادری سے مقابلہ کرنا ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا' وہ بچے بھی ہوتے ہیں' جن کے والدین میں سے کوئی بھی حیات نہیں ہوتا۔ ان کے پاس فائننشل سپورٹ بھی نہیں ہوتی لیکن وہ بچے بھی اپنی بقا کے لیے بہت کچھ کرتے ہیں۔ آپ تو اس معاملے میں بہت لکی ہیں۔ آپ کے فادر زندہ ہیں آپ کو کسی مالی مشکلات کا سامنا نہیں۔ سو آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ خوب اچھی طرح پڑھیں گی۔"

عائشہ کو یاد نہیں اس نے وعدہ کیا تھا یا نہیں مگر طاہرہ آنٹی کے اگلے الفاظ اسے اچھی طرح یاد تھے۔

"کچھ عرصے پہلے مجھے اور میری فیملی کو مالی طور پر کرائسس کا سامنا تھا۔ مگر اب خدا کا شکر ہے حالات بہت بہتر ہیں۔ اب میرے بچوں کو اور میرے گھر کو میری ضرورت ہے۔ میرا لاہور واپس جانا اب ناگزیر ہے۔" وہ واپس لاہور چلی گئیں تھیں اور عائشہ انہیں روک بھی نہ سکی۔ وہ کس رشتے سے انہیں روکتی؟

اس دوسری محبت سے محرومی کے بعد اس کے اندر تشنگی بڑھتی چلی گئی۔ اسے محبت ہوتی چلی گئی' کبھی کسی بہت ذہین اور قابل ٹیچر سے' کبھی کسی انتہائی پُراعتماد اور کامیاب اسٹوڈنٹ سے جس طرح ایک پیاسا پانی کی تلاش میں ہر اس جگہ کی طرف لپکتا ہے جو کنویں کی طرح دکھتی ہو بالکل اسی طرح وہ بھی محبت اور خلوص کی ہر جھلک پر لپکتی گئی مگر سوائے تشنہ پائی کے اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ وہ ان تمام باتوں سے بے خبر تھی جو کالج میں اس کے متعلق مشہور ہو چکی تھیں۔ اپنی ٹیچرز اور کلاس کی غیر معمولی طالبات میں اس کی ضرورت سے زیادہ دلچسپی دیکھ کر اسے "سائیکو کیس" جیسے القابات دیے جا چکے تھے۔

لیکن تھرڈ ایئر میں آ کر اس نے اپنی شخصیت اور عادات کا جائزہ لیا تو لرز اٹھی۔ کالج میں اپنے متعلق مشہور باتیں سن کر اسے یوں لگا تھا گویا کسی نے اس کے منہ پر طمانچہ رسید کر دیا ہو۔

"یہ کیا کر رہی ہوں میں؟ اور کیا کرتی رہی ہوں اب تک میں؟۔۔۔"

"ان کامیاب اور با اعتماد لوگوں کو دیکھ کر میرے اندر وہ کون سا جذبہ جنم لیتا ہے جو مجھے ہوش و خرد سے بیگانہ کر دیتا ہے؟ میری انا' میری خودداری اور میری عزت نفس ہر بار اسی جذبے کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے' اور مجھے احساس زیاں تک بھی نہیں ہوتا! کیا یہ محبت ہے۔۔۔

"شاید یہ میرے اندر کا "احساس کمتری" ہے کہ میں اپنے سے برتر شے کو دیکھ کر اس سے متاثر ہو جاتی ہوں۔ شاید اس طرح میں اپنی ذات کا دفاع کرتی ہوں۔" عائشہ اس معاملے میں جتنا سوچتی تھی اتنا الجھ جاتی تھی۔ اس نے دل میں عہد کر لیا کہ اب وہ کسی لڑکی سے متاثر نہیں ہو گی۔ اپنی انا اور عزت نفس پر حرف نہیں لگائے گی۔

چنانچہ اس نے بہت ریزرو ہو کر کالج جانا شروع کر دیا۔ ہر وہ کام ترک کر دیا جس سے اسے کسی لڑکی [illegible] تصور کیا جا سکتا تھا۔ مگر جلد ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کے اندر بے چینی اور اضطراب بڑھ گیا تھا۔

بیلا' تین سال سے اس کے ساتھ کالج میں تھی اور شاید پورے کالج میں اس کی واحد دوست تھی۔ عائشہ کے انداز میں تبدیلی اس سے چھپی نہ رہ سکی۔ عائشہ کمال کے ساتھ تین سال گزار کر بیلا کو یقین ہو چکا تھا کہ عائشہ کی شخصیت بے شمار پیچیدگیوں کا شکار ہے۔ مگر اس کا اچانک متحمل اور دل گرفتہ انداز پہلے اس کے ولی میں نہ آیا تھا۔ یوں لگتا تھا گویا وہ اندر ہی اندر کوئی جنگ لڑ رہی ہے۔ مگر استفسار کرنے پر جو کچھ عائشہ نے اسے بتایا تھا اس نے حقیقتاً "اسے چکرا کے رکھ دیا تھا۔

"میری بات کو مائنڈ نہیں کرنا عائشہ۔۔۔ یہ محبت نہیں ہے۔" بالآخر بیلا نے بہت سوچ سمجھ کر اسے حقیقت بتانے کا فیصلہ کیا تھا "یہ بے راہ روی ہے۔" بیلا کی اس بات نے عائشہ کو دم بخود کر دیا۔

"میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ تم کسی بہت اچھے سائیکاٹرسٹ سے کنسلٹ کرو۔" وہ اسے بہت سنجیدہ انداز میں مشورہ دے رہی تھی۔

"اور اگر ایسا نہیں کرنا چاہتیں تو نماز پڑھو۔ بہت باقاعدگی سے نہ بھی سہی تو بھی دن میں ایک یا دو نمازیں ضرور ادا کر لیا کرو۔ تمہیں سکون ملے گا۔"

بیلا سے یہ جان کر کہ وہ بے راہ روی کے راستے پر چل رہی ہے' وہ اپنی نظروں میں خود ہی گر گئی تھی۔ تھرڈ ایئر کے وہ دن اس کی زندگی کے اذیت ناک دن تھے۔ اسے اپنی شخصیت' اپنی ذات اور اپنی فطرت سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ اسے اپنے باپ احمد کمال سے بھی نفرت محسوس ہوتی جو "زہرہ علی" کو طلاق دینے کے بعد واپس اسی گھر میں آ گئے تھے۔ اپنے باپ کو دیکھ کر عائشہ کا احساس محرومی اور بڑھ جاتا۔ وہ ہر ممکن حد تک ان کے سامنے آنے سے گریز کرتی تھی۔ نہ جانے اس کی شخصیت اور کتنی توڑ پھوڑ کا شکار ہوتی کہ قدرت کو اس پر رحم آ گیا تھا۔

ایک دن مغرب کے وقت طبیعت پر بے چینی نے پھر حملہ کر دیا تھا' وہ پورے گھر میں بولائی ہوئی پھر رہی تھی۔ اس عالم میں اسے بیلا کے الفاظ یاد آ گئے۔

"بہت باقاعدگی سے نہ بھی سہی تو بھی دن میں ایک دو نمازیں ضرور ادا کر لیا کرو۔ تمہیں سکون ملے گا۔" سکون کی طلب ہی تھی کہ وہ وضو کر کے جائے نماز پہ آ کھڑی ہوئی۔

نماز پڑھنے کے دوران ہی آنسو اس کی آنکھوں سے پھسل پھسل کر گالوں سے ہوتے ہوئے اس کے اسکارف میں جذب ہوتے گئے۔ پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ رونے سے اس کے دل پر بوجھ بڑھنے کے بجائے گھٹ رہا ہے۔ نماز ختم کرنے کے بعد اس نے دعا کے لیے اپنے ہاتھ سامنے پھیلا لیے۔

"اللہ تعالیٰ۔۔۔" اس کے لب کپکپانے لگے تھے۔

"اللہ' میں آپ سے سکون قلب مانگتی ہوں۔ میرے دل کو سکون عطا کیجیے۔ مجھے اس طرح انسانوں کی محبت میں خوار ہونے سے بچا لیجیے۔ میں نے سنا ہے آپ انسان سے ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتے ہیں۔ کوئی آپ کی طرف ایک قدم آئے تو آپ دس قدم آتے ہیں۔ کوئی چل کر آپ کی طرف آئے تو آپ اس کی طرف دوڑ کر جاتے ہیں۔"

"اللہ' میرا دل اور روح اپنے علاوہ کسی اور کے تابع نہ کریں۔ میری خودی کو زندہ کر دیں' میری ذات کو اعتماد بخش دیں۔۔۔" اس نے خلوص دل سے دعا مانگی تھی جو اوپر کہیں' بہت غور سے سن لی گئی تھی۔ چنانچہ آنے والے دنوں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اسے بہت حد تک افاقہ ہوا ہے۔ اس کے اضطراب میں کمی آ گئی تھی اور شخصیت میں اعتماد آ گیا تھا۔ وہی کالج فیلوز جو کبھی اس کی سائیکی پہ شبہ کرتی تھیں' ان ہی کو اس نے خود اپنی تعریفوں میں رطب اللسان دیکھا۔

تھرڈ ایئر' فورتھ ایئر اور پھر یونیورسٹی کا یہ عرصہ۔۔۔ اس تمام عرصے میں اس نے بہت نارمل اور با اعتماد زندگی گزاری۔ اللہ نے اسے ہر آزمائش سے نکالا' ہر آسائش سے نوازا اور اپنا بے بہا اکرام اسے عطا کیا۔

جب یونیورسٹی میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تو اس نے اسے صرف اپنی شخصیت ہی کا اعجاز گردانا وہ اس "ذات عالی" کو فراموش کر گئی۔ جس نے اسے بے مول سے انمول کیا تھا۔

یونیورسٹی کے اس اردو مباحثے کی تیاری کے لیے اس نے دن رات ایک کیے تھے۔۔۔ تمام نمازیں ترک کر دی تھیں۔

اسے اپنی محنت پر اس قدر یقین تھا کہ اس نے ایک دفعہ بھی صدق دل سے اللہ سے مدد کی درخواست نہیں کی تھی۔ یہ ہے انسان کی حقیقت اور پھر اس مباحثے میں ناکامی کے بعد اس نے ایک بار پھر تقدیر کو قصوروار ٹھہرایا تھا (یہ ہے انسان کی سرشت)

جب تک معاملہ اللہ اور اس کے بندے کا ہو تقدیر بے بس ہوتی ہے۔ کیونکہ بندے کی کوئی سی بھی تدبیر اللہ کے ہاں شرفِ قبولیت پا کر تقدیر کو بدل سکتی ہے۔ مگر جب انسان اپنے معاملات خود سنبھال لے تو تقدیر کو کھل کر کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے۔

آج ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھے بیٹھے عائشہ نے اپنی ماضی کی تمام محبتیں اور ان کے انجام یاد کر لیے تھے۔

لیکن وہ اس محبت کو فراموش کر بیٹھی، جس نے اسے ان تمام محبتوں کے دام سے چھڑا دیا تھا۔ جس نے اسے اعتماد بخشا تھا، سکون عطا کیا تھا۔ اور یہیں اس نے غلطی کر دی تھی، اس غلطی نے گیند ایک بار پھر تقدیر کے کورٹ میں پھینک دی تھی۔

اب ڈائننگ ٹیبل کے اسطرف بیٹھی عائشہ کمال اپنے آپ کو باور کرا رہی تھی کہ "وہ کل سے یونیورسٹی جانا شروع کر دے گی۔"

"لیکن یاد رکھو تمہیں سمعان سے یا کسی بھی شخص سے محبت نہیں کرنی۔" اس نے اپنے آپ کو تنبیہہ کی تھی۔

اور ڈائننگ ٹیبل کے اس طرف عائشہ کمال کے بالمقابل بیٹھی ہوئی تقدیر کے لبوں پر ایک مختصر سی مسکراہٹ تھی کسی دلچسپ کھیل سے قبل امڈنے والی بے ساختہ مسکراہٹ۔

☼ ☼ ☼

"مجھے یونیورسٹی آنا اور پھر آکر ان لوگوں کا سامنا کرنا کس قدر مشکل کام لگ رہا تھا، میرا خیال تھا سب میری آمد ہی کا انتظار کر رہے ہوں گے اور مجھے دیکھتے ہی مجھ پر ایکبار پھر سے ہوٹنگ شروع کر دیں گے۔ حالانکہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ سب اپنے اپنے کاموں میں مگن ہیں، میری غیر حاضری کا کسی نے بھی نوٹس نہیں لیا، صرف سلمٰی اور عطیہ نے میری طبیعت کے بارے میں استفسار کیا لیکن انہوں نے بھی تقریر کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی ہمیں بھی بس خوامخواہ ہی۔۔۔"

پیریڈ اٹینڈ کرنے کے بعد وہ یہی سوچتی ہوئی کوریڈور سے گزری۔

کوریڈور عبور کر کے وہ بائیں ہاتھ کی طرف مڑی۔ سامنے سیڑھیاں تھیں۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں سیڑھیاں اتر رہی تھی، نظریں سامنے تھیں جب وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گئی۔ جو شخص نیچے سیڑھیوں سے اوپر کی جانب آ رہا تھا، اس کے سامنے سے بچنے کے لیے وہ صبح سے دانستہ کوشش کر رہی تھی۔

"تمہیں اس شخص کے سامنے نہیں آنا عائشہ! ہرگز نہیں۔" اس خیال کے دماغ میں آتے ہی وہ برق رفتاری سے سیڑھیاں اترنے لگی۔ مگر جب سمعان اور اس کے درمیان صرف دو سیڑھیوں کا فاصلہ رہ گیا تب وہ دھڑ سے جا کر ریلنگ سے ٹکرائی تھی۔ ہاتھوں میں موجود فائلز اور نوٹس کچھ ریلنگ سے نیچے جا گرے تھے اور کچھ اس کے اپنے اطراف میں۔ وہ بے جان سی ہو کر اسی سیڑھی پہ بیٹھ گئی۔

"آپ ٹھیک تو ہیں مس عائشہ! چوٹ تو نہیں لگی آپ کو۔" لہجہ تو وہی تھا مگر الفاظ، عائشہ کو اپنی سماعت پر دھوکا ہوا۔ اس نے سر اٹھا کے دیکھا اس سے قدرے فاصلے پر کھڑا وہ سمعان ہی تھا۔ سمعان علوی اور مخاطب بھی اس سے ہی تھا۔ عائشہ نے اپنا نام اس کے منہ سے سن کر حیرانی سے سر اٹھایا تھا اور پھر جھکانا بھول گئی تھی۔ اس کی آنکھیں گرے پینٹ اور وائٹ پنک شرٹ میں ملبوس سمعان پہ ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ جب سمعان نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا تو اس نے چونک کر اپنا سر جھکا لیا۔

"میں اس شخص سے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اگر ہم گر میں اس کوشش میں کامیاب ہو جاتی تو پتا نہیں

کتنا بڑا نقصان ہو جاتا میرا۔ ہاں سمعان علوی جیسے لوگوں کو قریب سے دیکھنا بھی اعزاز ہوتا ہے۔ کس نے دیکھی ہوں گی ایسی آنکھیں۔" عائشہ کی نظریں اپنے خون بہاتے دائیں پاؤں کے انگوٹھے سے ہٹ کر اس کی گرے پینٹ کے پائنچوں پہ ٹک گئی تھیں۔ شاید اسی کلر کی ہی ہیں اس کی آنکھیں مگر نہیں ان کی چمک اور کشش اس بے جان کپڑے میں کیسے ہو سکتی ہے اور ہونٹ اب اس کی نظریں اس کی شرٹ پہ جمی تھیں۔ بالکل نہیں ہونٹوں کی نسبت یہ شرٹ تو بہت لائیٹ ہے۔ اس نے بے اختیار نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

سمعان جو اس سے کسی رومال یا ٹشو پیپر کے بارے میں استفسار کر رہا تھا تاکہ وہ اپنے پاؤں پہ رکھ کر خون روکنے کی کوشش کرے، اس کے نفی میں سر ہلانے پر سیدھا ہوا۔

"یہ لیں!" اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "اسے اپنے انگوٹھے پر سختی سے باندھ لیں، خون بند ہو جائے گا۔" عائشہ کو رومال پکڑانے کے بعد اس نے سیڑھیوں پہ بکھری اس کی فائلز اکٹھی کر کے اس کے قریب رکھیں اور سیڑھیاں چڑھ گیا۔

سفید کاٹن کا خوشبو میں مہکا رومال ہاتھ میں لیے عائشہ ابھی تک اسی حالت میں بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے پاؤں کے انگوٹھے کو دیکھا۔ اس کا سارا جوتا خون سے بھر چکا تھا۔ اس نے پرس کھولا۔ اپنا رومال نکال کر سمعان کا رومال نہایت احتیاط سے پرس کے اندر رکھا اور پھر اپنے انگوٹھے کو اپنے رومال سے باندھنے لگی۔

حیرت کی بات تھی کہ اسے بالکل بھی درد نہیں ہو رہا تھا۔ اب وہ محسوس کر سکتی تھی کہ مصر کی عورتوں کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ انہیں اپنی انگلیاں کٹ لینے پر بھی تکلیف کا احساس کیوں نہ ہوا تھا۔ ہوتا ہے اک احساس، جو ہر حس پہ اس طرح قابض ہو جاتا ہے کہ اس کے بعد پھر کوئی تکلیف، تکلیف نہیں رہتی کوئی درد، درد نہیں رہتا۔

☼ ☼ ☼

"سمعان! پہلے تو مجھے صرف شبہ تھا کہ تمہاری پسند بس ایویں سی ہی ہے، مگر جب سے تمہیں یہ سیم اور تھور زدہ لان پسند آیا ہے، تب سے میرا شبہ یقین میں بدل گیا ہے۔" جنید نے اپنی فائل سمعان کے سامنے پٹختے ہوئے کہا۔ عبدالاحد اور جنید اکنامکس ڈیپارٹمنٹ کے وسیع و رنگین لان کو چھوڑ کر گروپ کے لیے اس لان میں آئے تھے جو خوب صورتی اور سبزے میں زیادہ خود کفیل نہ تھا۔

عدن سمجھ گئی تھی کہ جنید کا اشارہ اسی کی طرف ہے اس لیے وہ صرف مسکرا کر رہ گئی البتہ اس کی اس بات پہ سمعان نے بھنویں اچکا کے اسے دیکھا۔

"تم ہوتے کوئی شاعر کوئی ورڈزورتھ کوئی کیٹس وغیرہ تو تب تمہیں میری پسند کی خوب صورتی کا اندازہ ہوتا۔" سمعان اپنی بات مکمل کر کے مسکرایا تھا۔ کئی ممبرز کی آنکھیں خود بخود عدن کے چہرے پہ جا ٹکی تھیں، سیاہ آنکھیں جگمگا رہی تھیں، لیکن نایاب خان کی آنکھیں ابھی بھی سمعان ہی کے چہرے پہ ٹکی ہوئی تھیں۔ گرے آنکھوں کے نیچے شہری پھولے ہونٹوں کی سرخی اور دلکش ہونٹوں کی دلفریب مسکراہٹ۔ وہ چاہتے ہوئے بھی انہیں نظرانداز نہ کر سکتی تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے سر جھکا لیا، ایک ٹھنڈی آہ خود بخود ہی اس کے لبوں سے خارج ہو گئی تھی۔

"زین! عائشہ کمال آج آئی ہوئی ہے۔" نایاب خان نے اچانک زین سے پوچھا تھا۔

"مجھے کیا پتا۔ میں نے تو اس کی صورت اس دن کے بعد سے نہیں دیکھی۔" زین نے لاپرواہی سے کہا۔

"آئی ہوئی ہے۔۔۔ میں نے دیکھا تھا صبح۔" سمعان کی اس بات پر سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں عدن کی طرف آ رہا تھا یہاں سیڑھیوں پر میں نے دیکھا تھا اسے، اس کا پاؤں زخمی ہو گیا تھا شاید۔" سمعان تفصیل سے انہیں صبح کے واقعہ کے متعلق

بتارہا تھا۔

"اوہ! یہ تو بہت اچھا موقع ہے جان پہچان کا۔ ہم اس سے اس کے انگوٹھے کا احوال پوچھنے جائیں گے اور اسی بہانے سلام دعا ہو جائے گی۔" زین ساری بات سن کر سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

"کیم آن یو زین باز آجاؤ، وہ کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہے۔ وہ بہت ریزرو اور پراؤڈ ہے۔ ویسے جتنا مضبوط اس کا فیملی بیک گراؤنڈ ہے اور جتنی خوب صورت اس کی آؤٹ لک ہے 'اسے پراؤڈ ہونا بھی چاہیے۔" نایاب نے زین کے خیالات سن کر اسے ٹوکا تھا۔

"تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ وہ ایسی ویسی لڑکی ہے۔ بھئی میں اس سے مل کر اسے بتاؤں گا کہ میں اس کا کتنا بڑا فین ہوں۔ کتنا متاثر ہوں میں اس کی ایکسٹرا آرڈنری ڈریسنگ سے اور ہاں! میں اس سے گھونڈوں کو "گھوڑانے" کی ترکیب ضرور پوچھوں گا۔" سب بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔

"زین! تم نے ڈریسنگ کی خوب کہی۔ واقعی میں اس کی ڈریسنگ لاجواب ہوتی ہے۔" سارہ نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

"لو جی ایک اور فین برائے عائشہ کمال دریافت ہو گئی ہیں۔" جنید نے ہاتھ جھاڑے تھے۔

"اس کا ڈریس ایسٹ اور ویسٹ کا کمبی نیشن ہوتا ہے۔ اک خوب صورت کمبی نیشن ہر چیز مناسب حد تک ضرور ہوتی ہے اور سکارف اس کے لباس کا لازمی جز ہے جو ہمیشہ اس کے سر پر رہتا ہے۔" سارہ نے جنید کے تبصرے کے قطع نظر اپنی بات جاری رکھی۔

"اچھی لگتی ہے ایسی ڈریسنگ جو نہ بہت اوور ہو۔ نہ ہی بہت آؤٹ۔" ثانیہ نے بھی تائید کی تھی۔

"بس اتنی تعریفوں کے بعد اب تو میرا اس سے ملنا ضروری ہو گیا ہے۔" زین نے ہاتھ اٹھا کر حتمی لہجے میں کہا۔

"تو تم باز نہیں آؤ گے!" سارہ نے افسوس ناک لہجے میں کہا۔

"کیا ہو گا تمہاری فائزہ، سدرہ، رومانہ اور پنکی وغیرہ کا۔ تم کتنی جلدی بدل جاتے ہو زین!"

"میں! کیا کہا؟ میں بدل جاتا ہوں۔" زین نے انگلی اپنی طرف اٹھا کے بے یقینی سے پوچھا تھا۔

"تو اور کیا ایک دن تمہاری زبان پہ سدرہ کے قصے ہوتے ہیں تو دوسرے دن فائزہ کے 'تیسرے دن رومانہ کی باتیں ہوتی ہیں اور اب عائشہ کمال کی باری آگئی ہے۔" سارہ نے اسی لہجے میں جواب دیا تھا۔

"دیکھو ایک دن میری زبان پہ سدرہ کے قصے ہوتے ہیں۔ یعنی اس کی باتیں ہوتی ہیں۔ دوسرے دن میں فائزہ کی باتیں کرتا ہوں۔ تیسرے دن رومانہ کی' زین انگلیوں پہ گن رہا تھا۔

"تو سارہ ڈیئر تمہاری بات غلط ثابت ہو گئی۔ میں نہیں بدلتا۔ میں تو ہر روز وہی رہتا ہوں "لڑکیاں بدل جاتی ہیں۔" اس وضاحت پر سب ہنس پڑے تھے سوائے عدن کے اس کا ذہن عائشہ کمال کے متعلق ہونے والے تبصرے کو دہرا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

زین نے کلاس میں داخل ہو کر بے اختیار ہی کسی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں اور جلدی ہی اسے وہ نظر آگئی۔ زین نے دور ہی سے اس کا جائزہ لیا۔ لائیٹ اور ڈارک براؤن کمبی نیشن کی کوٹ نما شرٹ کے نیچے اس نے ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ اسی کمبی نیشن کے اسکارف نے اس کے آدھے سے زیادہ سر کو اور شانوں کو مکمل طور پر ڈھانپ رکھا تھا۔ زین نے بے اختیار ہی اسے دل میں سراہا تھا۔ سارہ اور ثانیہ کے عائشہ کے لباس کے بارے میں دیئے گئے کمنٹس سے وہ سو فیصد متفق ہو گیا تھا۔ ایک دم ہی اس لڑکی کی عزت اس کے دل میں بڑھ سی گئی۔

"ہیلو السلام علیکم۔" پیریڈ اٹینڈ کرنے کے بعد زین دانستہ طور پر عائشہ کے مقابل چل رہا تھا۔ اس کے سلام کرنے پر عائشہ نے چلتے چلتے اسے مڑ کر دیکھا اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"میرا نام زین سلطان ہے اور آپ کا غالباً" عائشہ کمال۔ ایم آئی رائیٹ۔" زین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ عائشہ نے اس کے سوال پر اثبات میں سر ہلایا۔ اسے "زین" نام جانا پہچانا لگا تھا۔

"آپ کو کوئی کام ہے مجھ سے؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ زین اس کی بات سن کر ایک بار پھر مسکرایا۔

"کام تو ہے۔ ایکچوئلی میں نے سنا ہے 'آپ کے نوٹس بہت زبردست ہیں 'میں نے سوچا آپ ہی سے لے لوں کیونکہ ہمارے سمسٹرز تو نزدیک ہیں لیکن میرے پاس نوٹس کی اے بی سی بھی موجود نہیں۔"

زین کی بات سن کر عائشہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑے نوٹس کو دیکھا۔ یہ سچ تھا۔ اس کے نوٹس اس کی کلاس میں بہت مشہور تھے وہ بہت محنت سے نوٹس بنایا کرتی تھی یا بالفاظ دیگر یہ اس کی واحد مصروفیت تھی۔

"آپ کو پتا ہے۔ اس دفعہ ایگزامز میں میرے فیل ہونے کے چانسز ننانوے فیصد ہیں۔" اس کے لہجے میں موجود تپش محسوس کر کے عائشہ کے لبوں پہ خود بخود ہی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"گویا آپ کو اپنے پاس ہونے کا یقین صرف ایک فیصد ہے۔" عائشہ نے مسکراتے ہوئے سوال کیا تھا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے لان کی طرف جا رہے تھے۔

"نہیں۔ ایک فیصد یقین تو مجھے اس بات کا ہے کہ میں پاس نہیں ہو سکوں گا۔" زین کی بات سن کر اسے اپنا قہقہہ ضبط کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ لیکن سامنے لان کی طرف نگاہ کرتے ہی وہ ہنسی بھول گئی تھی۔

دل میں کوئی مدھری موسیقی گونجنے لگی تھی۔ خوشی کا احساس اتنا شدید تھا کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ زین نے اس کے قدموں کو رکتے ہوئے دیکھا تو ایک دو قدم پلٹ کر واپس اس کے پاس چلا آیا۔

"آپ رک کیوں گئیں۔ آئیے نا۔ میں آپ کو اپنے گروپ سے ملاؤں۔ آپ میرے فرینڈز سے مل کر خوش ہوں گی۔" زین کے اصرار پر وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے ساتھ لان کے اس حصے میں آ گئی جہاں سات "آٹھ لڑکے اور لڑکیوں کا ایک بڑا سا گروپ بے فکری سے بیٹھا گپیں ہانک رہا تھا۔ زین اسے لیے ان کے سر پہ جا کھڑا ہوا۔

"ڈیئر فرینڈز۔ آج میں آپ کو اپنی یونیورسٹی کی ایک بہت نامور رائیٹر سے ملوانا چاہتا ہوں۔ آپ ہیں عائشہ کمال اور عائشہ یہ ہیں میرے فرینڈز۔" زین کے اس طرح دیے گئے تعارف کے اچانک حوالے پر عائشہ کا رنگ ایک دم فق ہو گیا۔ اس کے گروپ کے تقریباً" سارے ممبرز کھڑے ہو چکے تھے 'سوائے عدن کے وہ مسکراتے ہوئے عائشہ سے مل رہے تھے۔ زین تعارف کے مراحل طے کرنے میں ان کی مدد کر رہا تھا۔ عائشہ سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ ان سب سے مل رہی تھی۔ اسے یہ تک علم نہ تھا کہ اس کے منہ سے 'ان سب کے خیر سگالی میں کہے گئے جملوں کے جواب میں 'کیا الفاظ نکل رہے ہیں۔

"اور جناب! یہ ہیں ہری ون اینڈ اونلی سمعان علوی۔" زین نے عائشہ کی پشت کی طرف کھڑے سمعان کی طرف اشارہ کیا۔ عائشہ نے دانستہ اس طرف پشت کر رکھی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا سامنا کرنے پر وہ اپنی ذات سے اختیار کھو دے گی۔ لیکن زین کی بات سن کر اسے اس طرف مڑنا پڑا تھا۔ سمعان نے بھی باقی سب کی طرح اس سے خوش دلی سے ہیلو ہائے کی تھی۔

ان سب سے کچھ فاصلے پہ بیٹھی عدن کی سیاہ آنکھیں سب کچھ بہت غور سے دیکھ رہی تھیں اور دماغ ان کا تجزیہ کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے عائشہ کی آمد پر اپنے گروپ ممبرز کو میکانکی انداز میں کھڑا ہوتے دیکھا تھا۔ پھر اس کی آنکھیں عائشہ کی شخصیت اور چہرے کو کھوجتی رہی تھیں۔ اس کی نظروں نے عائشہ کے چہرے کے تمام تاثرات نوٹ کیے تھے۔

"تو کیا واقعی اس کی شخصیت اتنی پاور فل ہے کہ وہ میرا وجود تک فراموش کر گئے ہیں۔" اس کی نظریں سمعان کے چہرے پہ جا ٹکی تھیں۔ زین نے عائشہ کا تعارف سب سے کروایا تھا مگر وہ بھی عدن کو بھول گیا

تھا۔ عدن کی پُرسوچ نگاہیں کچھ دیر تک اپنے ہنستے مسکراتے گروپ پہ جمی رہیں۔ پھر وہ کچھ سوچ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہیلو عائشہ! آئی ایم عدن شہزاد' میرا خیال ہے' آپ مجھے جانتی ہوں گی۔ مزید تعارف کی ضرورت نہیں۔"

عائشہ کو اپنے پہلو کے قریب سے آواز آئی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ لمبے قد کی ' گندمی سی رنگت والی لڑکی اس سے مخاطب تھی۔ اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی لیکن آنکھیں اس مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔

"ہیلو۔" عائشہ نے بھی اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔

"او سوری عدن! میں تمہارا تعارف کروانا بھول ہی گیا۔" زین نے کھسیا کر اپنے سر پہ ہاتھ مارا۔

"خیر ہے' کوئی بات نہیں۔" عدن کی مسکراہٹ قائم تھی۔ "مجھے اپنا تعارف کروانا آتا ہے۔" اب اس کی آنکھوں نے بھی اس کی مسکراہٹ کا ساتھ دیا تھا۔

وہ سب وہیں لان میں بیٹھ کر ایک بار پھر سے باتوں میں مشغول ہو گئے۔ عائشہ کو بھی انہوں نے بعد اصرار وہیں بٹھا لیا تھا۔ عدن نے اس کے بیٹھنے کے انداز کو بغور دیکھا۔ عائشہ نے اپنا پرس زمین پہ رکھا تھا اور پھر بہت دھیرے سے گھٹنے زمین پر ٹکا کر بیٹھ گئی۔ عدن جانتی تھی یہ انداز ایزی ہو کر بیٹھنے کا نہیں بلکہ کسی کے سامنے نہایت تعظیم سے بیٹھنے کا ہے۔"

"ہوں!" عائشہ کے بالکل سامنے بیٹھے **سمعان** کو دیکھ کر عدن نے پرخیال انداز میں سر ہلایا۔

عدن کی آنکھیں ایک بار پھر ان ہیزل براؤن ساحروں جیسی آنکھوں پر جم گئی تھیں جو اردگرد سے بے خبر **سمعان** کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ **سمعان**' احد اور زین وغیرہ کے ساتھ باتوں میں مشغول تھا۔ عدن' بھی نایاب کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئی مگر اس کی نظریں وقتاً" فوقتاً" مراقبے کی سی حالت میں بیٹھی عائشہ پر پڑ رہی تھیں۔ اسے پہلی بار اپنا وجود کسی خوف میں جکڑا ہوا محسوس ہوا۔

☆ ☆ ☆

چار ماہ بیت گئے۔

بظاہر تو یونیورسٹی میں کچھ بھی نہ بدلا تھا۔ لیکن کچھ بدل چکا تھا۔

یونیورسٹی کے تقریباً" تمام ڈیپارٹمنٹس کے سمسٹرز ہو چکے تھے۔ لیکن یونیورسٹی کی رونقوں میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ انگلش ڈیپارٹمنٹ کا لان اب بھی ویسے ہی آباد تھا۔ عدن شہزاد گھاس پہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں جنرل نالج کی کوئی کتاب تھی جبکہ دائیں ہاتھ میں دبے ہوئے قلم سے وہ نیچے رکھی ہوئی فائل پہ تیزی سے اہم نوعیت کے سوال اور ان کے جواب نوٹ کر رہی تھی۔

اسلام آباد میں آل پاکستان بین الجامعاتی مقابلہ ہو رہا تھا۔ جس میں پاکستان کی تمام یونیورسٹیز کے تین تین طلبہ و طالبات نے شرکت کرنا تھی۔ مقابلے کے لیے جو پروگرام ترتیب دیا گیا تھا۔ اس کا فارمیٹ کچھ اس طرح کا تھا کہ اس میں کوئز' بیت بازی سے متعلق سوالات سے لے کر فی البدیہہ تقریر تک' ہر شے شامل تھی۔ یہ پروگرام باقاعدہ پی ٹی وی سے دکھایا جانا تھا۔ **سمعان**' عدن اور عبدالاحد کو اپنی یونیورسٹی کی طرف سے اس پروگرام میں شرکت کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ ٹائم کم تھا اور مقابلہ سخت لہٰذا ان کا سارا گروپ دھڑا دھڑ اس پروگرام کی تیاری میں مصروف تھا۔

ان کے گروپ نے فیصلہ یہ کیا تھا کہ پورا گروپ اسلام آباد جائے گا۔

عدن بھی بہت خوش تھی۔ پچھلے چار ماہ اس کی زندگی کے بدترین دن تھے۔ وہ مسلسل ٹینشن میں رہی تھی۔ چار ماہ پہلے اسے اچانک محسوس ہوا تھا کہ حالات اس کی مرضی کے مخالف موڑ مڑنے والے ہیں۔ یہ محسوس کرتے ہی وہ حالات اپنے حق میں ایک بار پھر سے سازگار بنانے میں جُت گئی تھی اور بالآخر کامیاب ہو گئی۔ اپنے مقصد میں کامیابی کے بعد اس نے اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ وہ ان لوگوں میں سے

تھی جو لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگانے کا ہنر جانتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے مخالف کو ہمیشہ غفلت کی مار مارتے ہیں کیونکہ وہ خود کسی بھی لمحے اپنے مقصد سے کوتاہی نہیں برتتے۔ مسلسل اور لگاتار محنت ہی ایسے لوگوں کی کامیابی کا راز ہے۔

نایاب کی آواز نے اسے چونکایا تھا' وہ شاید ثانیہ سے مخاطب تھی۔

"کتنی جلدی اثر لیا ہے عائشہ کمال نے یونیورسٹی کا She is Totally changed۔" (وہ بالکل بدل گئی ہے) اس نے ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔

سامنے کی روش سے آتی ہوئی بلیک سلیولیس شارٹ فٹ سی شرٹ اور ٹائیٹ ٹراؤزر میں ملبوس وہ لڑکی عائشہ کمال ہی تھی۔ وہی عائشہ کمال جس نے پچھلے چار ماہ عدن کو ذہنی عذاب میں جکڑ رکھا تھا۔ وہی عائشہ جس کی اپنے گروپ میں آمد پر عدن سوچتی ہی رہ جاتی کہ کس طرح اپنے گروپ ممبرز کو اس کی شخصیت سے متاثر ہونے سے بچائے۔ مگر اب اسے ایسی کوئی فکر نہ تھی' اس نے بہت پہلے عائشہ کی شخصیت میں سے ان تمام چیزوں کو نکال دیا تھا جو سب کو متاثر کرتی تھیں۔

"شولڈر کٹ براؤن بال اس پر کس قدر سوٹ کیا کرتے تھے مگر جب سے اس نے ہیئر کٹ کروا کے بال ڈائی کیے ہیں۔ یقین مانو مجھے زہر لگتے ہیں۔" سارہ نے بھی اپنے پیپرز سے سر اٹھا کر عائشہ کی طرف دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا تھا۔

"اور جو ڈریسز یہ پہن کر آتی ہے ان میں بہت ڈل اور چیپ سی لگتی ہے۔ حالانکہ ویسے' بلکہ ان سے بھی زیادہ ماڈ اور ویسٹرن ڈریسز اس یونیورسٹی میں عام ہیں۔ لیکن وہ ڈریسز پہننے والی لڑکیاں اتنی بری نہیں لگتیں' جتنی یہ لگتی ہے۔" نایاب نے عائشہ کمال کے لباس کا بغور جائزہ لے کر نفرت سے ہونٹ سکوڑ کر تبصرہ کیا تھا۔ عدن بس مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک بہت بڑھ گئی تھی۔ یہی سب کچھ

تو وہ عائشہ کمال کے لیے ان سب سے سننا چاہتی تھی۔

"شاید اس لیے کہ ان لڑکیوں کو ہم نے ہمیشہ ایسے ہی ڈریسز میں دیکھا ہے اس لیے عادی ہو جانے کی وجہ سے وہ ہمیں چیپ نہیں لگتیں مگر عائشہ شروع شروع میں بہت ڈیسنٹ رہی تھی۔ اس لیے اس روپ میں یہ ہمیں زیادہ ناقابل قبول لگتی ہے۔" ثانیہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ عائشہ نے دور ہی سے انہیں دیکھ لیا تھا' اسی لیے وہ تیز تیز چلتے ہوئے ان کی طرف آ گئی۔ نایاب' ثانیہ اور سارہ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر انجان بن کر پھر سے کام میں مشغول ہو گئیں۔ عدن بھی بظاہر کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی مگر اس کی سماعتیں عائشہ کی طرف مبذول تھیں۔

"ہیلو ایوری باڈی! کیا ہو رہا ہے۔" عائشہ کی مصنوعی تازگی سے بھری کھوکھلی سی آواز ابھری۔ وہ جب پریشان ہوتی تھی تو اس کی یونہی گلے میں پھنسی پھنسی آواز نکلا کرتی تھی۔ عدن یہ بات جانتی تھی' بلکہ وہ تو اس کی پریشانی کی وجہ بھی جانتی تھی۔

"ہیلو عائشہ! کیسی ہو تم!" سارہ نے بناوٹی خوش دلی سے اس کا احوال دریافت کیا تھا' عدن' ثانیہ اور نایاب بھی اسی انداز میں سرسری ہیلو ہائے کر کے پھر سے اپنے کام میں مشغول ہو گئی تھیں۔ کسی نے اسے رسماً" بھی بیٹھنے کو نہیں کہا تھا۔ وہ چند لمحے ان کے پاس کھڑی انگلیاں چٹخاتی رہی پھر خود ہی نیچے' ان کے برابر بیٹھ گئی۔ عدن نے اس کے چہرے پہ نظریں جما دیں۔ اس کے بال بے ترتیب ہو رہے تھے' یوں جیسے پریشانی میں بار بار ان میں انگلیاں چلائی گئی ہوں۔ آنکھوں کے نیچے حلقے اور چہرے کی زردی اس کی جذباتی ابتری کا واضح عکاس تھیں۔ اس کی نظریں بار بار بے چینی کے عالم میں ادھر ادھر اٹھتی تھیں۔ جیسے کوئی پیاسا' پیاس کی شدت حلق میں چھپائے' پانی کی تلاش میں نگاہیں دوڑاتا ہے۔ عدن کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"کوئی کام تھا تمہیں عائشہ؟" اس نے ایک دم سے عائشہ کو مخاطب کیا۔ اس کی آواز پہ وہ گڑبڑا سی گئی

تھی۔

"نہیں... نہیں تو۔ میں تو یونہی ملنے چلی آئی تھی۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی تھی مگر عدن نے دیکھا تھا کہ مسکراہٹ کے بجائے اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔

"اچھا زین سے ملنے آئی ہو مگر وہ تو یہاں نہیں بلکہ میرا خیال ہے وہ آج آیا ہی نہیں۔" عدن کی اس بات پہ نایاب اور نامیہ وغیرہ کے چہروں پہ معنی خیز مسکراہٹ ابھری۔ عائشہ کے چہرے پہ حیرت کے تاثرات ابھرے تھے پھر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"میرا خیال ہے میں چلوں... مجھے کچھ کام یاد آ گیا ہے۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور اس سے قبل کوئی اسے ٹوکتا یا روکنے کی کوشش کرتا' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی چلی گئی۔

"اسے کیا ہوا؟" نایاب نے حیرت سے اسے جاتے دیکھا تھا۔

"طبیعت ٹھیک نہیں تھی شاید' اس کے چہرے سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔" سارہ نے کندھے اچکا کر تبصرہ کیا تھا۔

عدن اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی لیکن دل میں اسی سے مخاطب تھی۔

"تمہارا بوم پیریڈ Boom Period اب ختم ہو چکا ہے عائشہ کمال' گیم از اوور ناؤ' اینڈ یو آر اے لوزر۔ تم کھیل ہار چکی ہو۔ تم تو اس قابل ہی نہ تھیں کہ میرا مقابلہ کر سکتیں مگر میرے فرینڈز نادانستگی میں تمہیں میرے مقابلے میں لے آئے تاہم تم نے مجھے بہت ٹف ٹائم دیا ہے۔ پچھلے چار مہینوں سے تم نے مجھے کس ٹینشن میں رکھا ہے میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔"

سمعان' میری زندگی میں میری سب سے بڑی اچیومنٹ Achievement ہے سمعان' وہ اعزاز ہے جسے پانا تو شاید زیادہ مشکل نہ ہو مگر اسے برقرار رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میں جانتی ہوں کالج سے لے کر یونیورسٹی تک کتنی لڑکیاں اس کے عشق میں گرفتار ہوئی ہیں۔ مگر میری ذات اور میرا اعتماد ایسی لڑکیوں سے سمعان کو کوسوں دور رکھتا تھا۔ میرا یہ تعارف کہ میں سمعان علوی کی فیانسی ہوں' ان کے سارے حوصلے توڑ دیتا تھا۔ میں جانتی تھی کہ کوئی لڑکی شخصیت' خوب صورتی اور اعتماد میں میرا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ میں نے ہمیشہ سب کی نظروں میں اپنے لیے رشک دیکھا تھا۔ میری اتنی پذیرائی دیکھ کر سمعان بھی مجھ پر رشک کرتا تھا یہ میرا کمال نہیں تو اور کیا تھا کہ جس کی ذات نے مجھے سب میں مقبول کیا تھا' وہ بذاتِ خود میری شہرت سے متاثر تھا۔

اور پھر تمہاری آمد نے عائشہ کمال! سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ میرے وہ تمام فرینڈز جو ہر بات میں میری پسند ناپسند کا خیال رکھتے تھے' انہوں نے مجھے ہی فراموش کرنا شروع کر دیا۔ مجھے تین ماہ پہلے کے وہ دن کبھی نہیں بھول سکتے جب تم میرے گروپ میں بے پناہ مقبول تھیں۔ جہاں تم موجود ہوتیں وہیں میرے سارے فرینڈز پائے جاتے۔ میری ذات کہیں بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ اور پھر جب میں نے تمہاری آنکھوں میں سمعان کے لیے وہ جذبے دیکھے تو میں واقعی میں دہل گئی۔

جو میری طرح کے انا پرست لوگ ہوتے ہیں' ان کی چاہت اتنی پر کشش نہیں ہوتی جتنی پر کشش تم جیسے لوگوں کی چاہت ہوتی ہے۔ تم جیسے لوگ محبت نہیں کرتے... عشق کرتے ہیں۔ اپنا تن من دھن سب کچھ لٹا دیتے ہیں۔ جو جذبے میں نے تمہاری ذات میں سمعان کے حوالے سے پنہاں دیکھے تھے انہوں نے مجھے ہولا کر رکھ دیا تھا' میری قوت مشاہدہ بہت تیز ہے جب ہی میں نے سب سے پہلے تمہارے دل کی بات جان لی تھی۔ تمہارے یہ جذبے اگر مجھے ہولا سکتے تھے تو یقیناً "سمعان کو بھی کمزور کر سکتے تھے۔ اوروں کو بھی متاثر کر سکتے تھے۔ مجھے ایک ہی وقت کئی چیلنج درپیش تھے۔ مجھے اپنے گروپ میں اپنے مقام کو قائم رکھنے کے لیے بھی جدوجہد کرنا تھی۔ مجھے ان سب کی نظروں اور دلوں سے تمہارا مقام بھی کم کرنا تھا

اور مجھے تمہارے جذبات سمعان تک پہنچنے سے بھی بچانا تھا۔

کوئی عام سی لڑکی ہوتی تو میرے یہ پانچ الفاظ ہی اس کا حوصلہ توڑ سکتے تھے' اسے ہرا سکتے تھے کہ "میں سمعان کی منگیتر ہوں" لیکن تم کوئی عام لڑکی نہیں تھیں۔ میرے یہ پانچ الفاظ تمہیں میرے مقابل لا سکتے تھے اور اگر تم میرے مقابل آ جاتیں' تو تمہیں ہرانا زیادہ مشکل ہو جاتا۔ تم جیسے لوگوں کو صرف غفلت ہی میں رکھ کر ہرایا جا سکتا ہے' سو میں نے تمہیں کبھی بھی کسی سے بھی یہ جاننے نہ دیا کہ سمعان اور میرے درمیان کیا تعلق ہے۔ ابھی میں تمہارے بارے میں لائحہ عمل ترتیب ہی دے رہی تھی کہ سمعان کی امی کی ڈیتھ پر تمہارے ری ایکشن نے مجھے ششدر کر دیا۔

سمعان کی امی کی ڈیتھ دو ماہ قبل ہوئی تھی۔ انہیں معدے کا کینسر تھا مگر بروقت تشخیص نہ ہو سکنے پر ان کی موت کا سبب بن گیا۔ یہ ایک بالکل اچانک افتاد تھی۔ ہم سب گروپ ممبرز ابھی یونیورسٹی پہنچے ہی تھے کہ ہمیں اطلاع ملی۔ ہم سب وہیں سے ایک ساتھ سمعان کے گھر کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ سب سے پہلے اطلاع ہمیں دی گئی ہے لیکن سمعان کے گھر پہنچ کر ہی میرے خیال کی تردید ہو گئی تھی۔ مجھ سے بھی پہلے وہاں تم موجود تھیں زین کے ساتھ۔ میں جاننے کے باوجود بھی ایک آنسو تک نہ بہا سکی تھی مگر میں نے دیکھا تھا' رو رو کر تمہاری آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ اس بکھرے بکھرے حلیے میں بھی تم غضب ڈھا رہی تھیں۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ تمہاری والدہ کی ڈیتھ بھی اسی طرح ہوئی تھی اسی وجہ سے تم اتنی دکھی ہو رہی ہو۔ میں دیکھ رہی تھی سب تمہیں تسلیاں دے رہے تھے حتیٰ کہ سمعان بھی اور میرے دل پہ سانپ لوٹ رہے تھے۔

اگلے دن میں زین پہ برس پڑی کہ کیا ضرورت تھی تمہیں اس طرح وہاں لے کر جانے کی اور زین کے جواب نے میرے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔

"میں اسے وہاں نہیں لے کر گیا بلکہ وہ مجھے لے کر گئی تھی۔ کل صبح سویرے ہی' جب میں سویا ہوا تھا' عائشہ نے مجھے فون کیا تھا' وہ رو رہی تھی' اس نے مجھے بتایا کہ سمعان کی مدر کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ اس نے مجھ سے ریکویسٹ کی تھی کہ میں اسے سمعان کا ایڈریس سمجھا دوں' میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ میرے گھر آ کر مجھے پک کر لے۔ راستے میں میں نے پوچھا تھا اسے کس نے اطلاع دی' سمعان کی مدر کی ڈیتھ کی... تو اس نے جواب دیا کہ میں نے خود صبح اسے فون کیا تھا۔"

"کیا؟ اس نے سمعان کو فون کیا تھا۔ سمعان کا فون نمبر ہے اس کے پاس۔" میں نے بے یقینی سے پوچھا تھا۔

"پتا نہیں..." زین نے کندھے اچکائے تھے۔ "لیکن اس نے یہی کہا تھا کہ صبح میرا دل گھبرا رہا تھا' مجھے لگ رہا تھا کہ سمعان کسی مصیبت میں ہیں تو میں نے انہیں فون کر لیا خیریت دریافت کرنے کے لیے۔"

میرے پیروں تلے زمین نہیں رہی تھی یہ سب سن کر۔ مجھے بھی سمعان سے محبت کا دعوا ہے مگر میرے دل کا اس سے اتنا رابطہ نہیں ہوا کہ اس کی مصیبتیں بن کہے جان سکے۔

میں نے سوچ لیا کہ مجھے جو کرنا ہے۔ بہت جلد کرنا ہے۔

میں نے تمہاری شخصیت کے پلس اور ویک پوائنٹس ڈھونڈ نکالے' مجھے علم ہو گیا کہ تمہارے اندر کانفیڈنس نہیں تم احساس کمتری میں مبتلا ہو۔ میں نے تمہاری اسی خامی کو پکڑ کر تمہیں اپنے گروپ کے لیے باعث تفریح بنا دیا۔ میں تم پر ناک مارک کروار کیا کرتی تھی۔

میری کسی بات کا جواب دیتے ہوئے تمہاری آواز کپکپا جاتی۔ میں اس سچویشن کو انجوائے کرتی اور تمہاری بے اعتماد شخصیت کے بخیے تمہاری غیر موجودگی میں بھی ادھیڑا کرتی۔ مجھے علم تھا کہ تمہاری غیر

معمولی ڈریسنگ تمہیں بہت منفرد بناتی ہے' سو میں نے تمہیں ماڈرن ڈریسز کی طرف راغب کیا۔ اس طرح کہ تمہیں احساس بھی نہ ہوا کہ تم سب کچھ میرے اشارے پر کر رہی ہو۔ میں سمعان کی پسند کے حوالے سے یہ سب چیزیں تمہارے کانوں میں انڈیلا کرتی اور تم اتنی بے وقوف تھیں کہ ہر وہ کام کرنے چل پڑتیں جس میں سمعان کی پسند کا ذکر آجاتا۔

تم نے مجھ سے سنا سمعان کو ماڈرن ڈریسز پسند ہیں' تو تم نے جینز' ٹراؤزر اور سلیولیس شرٹس پہننا شروع کردیں۔

تم نے سنا کہ سمعان کو باب کٹ پسند ہے' تم نے اسی طرز میں بال کٹوا لیے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اس طرح کے بال بھی تمہاری شخصیت کو سوٹ کرتے ہیں۔ تو میں نے تمہیں بتایا کہ سمعان کو گولڈن بال کس قدر پسند ہیں۔ اگلے ہی دن تمہارے بال گولڈن کلر میں ڈائی ہو چکے تھے۔

الغرض میں نے تمہاری ذات سے ہر وہ چیز نکال پھینکی تھی جو سمعان سمیت میرے کسی بھی گروپ ممبر کو متاثر کرسکتی تھی۔ یہی نہیں سمعان کو تم سے بچانے کے لیے میں نے سمعان کے اور باقی سب کے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ تم اور زین ایک دوسرے میں انٹرسٹڈ ہو اور بعد میں تمہارے اور زین کے اکٹھے نظر آنے اور زین کے اکثر تمہاری تائید کرنے پر سب نے میری اس بات کا برملا یقین کرلیا تھا۔

اب عائشہ کمال! تم اسی جگہ پر کھڑی ہو' جہاں میں تمہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ میں ہر لحاظ سے کامیاب رہی ہوں اور رہاں' آج سے قبل میں تمہاری خوب صورتی سے بھی خائف تھی مگر آج تمہاری اندر کو دھنستی آنکھوں اور زرد پڑتے چہرے نے میرے دل سے آخری کانٹا بھی نکال دیا۔"

"ہیلو ینگ لیڈیز! کیا ہو رہا ہے۔" زین کی چہکتی آواز عدن کو خیالوں کی دنیا سے باہر لے آئی تھی۔

"او اچھا۔ اسلام آباد جانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔" زین نے ان کے پاس بکھری کتابیں دیکھ کر کہا۔

"میں تو شدت سے اس دن کا انتظار کر رہا ہوں جب ہم سب اسلام آباد کی طرف محو سفر ہوں گے۔" زین کے لہجے سے ہی اس کی بے تابی کا اندازہ ہو سکتا تھا۔

"ہاں یار آہا' یہ عائشہ کمال نظر نہیں آتی کئی دنوں سے' کہاں ہیں موصوفہ۔" زین کی اس بات پہ ثانیہ کھنکاری تھی۔

"آئی تھیں ابھی موصوفہ تمہارا پوچھنے۔ تم نہیں تھے تو واپس چلی گئیں۔" نایاب نے الفاظ پہ زور دے دے کر زین کو بتایا تھا۔

"میرا پوچھنے۔ حیرت ہے' مجھ سے کیا کام پڑ گیا اسے۔" نایاب کی بات سن کر زین کو کافی حیرت ہوئی تھی۔ "ویسے تم لوگوں نے اسے اسلام آباد چلنے کو کہا ہے یا نہیں۔" زین کی بات سن کر عدن کی بھنویں کھنچ گئیں۔

"نہیں اور وہ ہماری گروپ ممبر نہیں ہے کہ ہم اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہیں اگر اسے جانا ہوا تو خود بخود پہنچ جائے گی ہمارے پہنچنے سے بھی پہلے اور ویسے بھی وہ اب کون سا ہمارے کہنے پہ کہیں آتی جاتی ہے۔" زین کی بات کا جواب عدن نے کافی تلخ ہو کر دیا تھا۔ زین نے حیرت سے اسے دیکھا' پھر کندھے اچکا کر بولا۔

"ہم بھی نہیں لے جانا تو نہ لے جاؤ مجھے کیوں کاٹ کھانے کو دوڑ رہی ہو۔" عدن نے زین کے ری ایکشن سے محسوس کیا کہ عائشہ سے متاثر ہونے کا بھوت اس کے سر سے بھی اتر چکا ہے۔ وہ بے ساختہ ہی مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

جمعرات کا دن تھا۔

عائشہ صبح چھ بجے سے ہی ٹی وی آن کر کے اس کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔ آج ٹی وی پر اس پروگرام نے آن ایئر ہونا تھا جس میں اس کی یونیورسٹی کی طرف سے سمعان' عبدالاحد اور عدن نے شرکت کی تھی۔ وہاں

پروگرام جیت چکے تھے۔ اسے کسی یونیورسٹی فیلو نے بتایا تھا۔ جس تاریخ کو اسلام آباد میں انہوں نے اس مقابلے میں شرکت کرنا تھی اس تاریخ کے اگلے دن سے ہی عائشہ باقاعدگی سے یونیورسٹی گئی تھی۔ وہ ہر روز اسی آس پر جاتی تھی کہ شاید وہ لوٹ آئے ہوں مگر ہر روز اس کی آس کا شیشہ بھاری ضرب لگا کے ٹوٹتا تھا۔ ایک ہفتہ وہ انتظار کی صلیب پر لٹکی رہی پھر ایم بی اے کے کسی اسٹوڈنٹ نے اسے بتایا تھا۔

"سمعان اور اس کا گروپ تو اتنی جلدی واپس نہیں آئیں گے آپ کو پتا ہے انہوں نے وہاں کمپی ٹیشن سب سے زیادہ اسکور کے ساتھ جیتا ہے۔ انہوں نے ہفتہ پہلے یونیورسٹی فون کر کے ڈین اور پروفیسرز کو اپنی کامیابی کا بتایا تھا وہ سب بہت خوش تھے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ان کا ارادہ ہے اسلام آباد مری اور راولپنڈی وغیرہ کی سیر کا اگر واقعی میں ایسا ہے پھر تو انہیں ابھی کافی دن لگیں گے آنے میں۔"

یہ سن کر عائشہ ڈھے سی گئی تھی۔ یہ تو صرف وہی جانتی تھی کہ اتنے دن اس نے سمعان علوی کو دیکھے بنا کس اذیت میں کاٹے ہیں۔ لیکن ابھی اسے یہ اذیت اور بھی برداشت کرنا تھی۔ ابھی اسے کچھ دن اور بھی سمعان دیکھے بنا نہ نکالنے تھے۔ اسی اسٹوڈنٹ نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ جمعرات ساڑھے سات بجے ان کا پروگرام پی ٹی وی سے نشر ہوگا۔

اور جمعرات کو چھ بجے سے ہی عائشہ نے ٹی وی آن کر لیا تھا۔ پروگرام شروع ہوتے ہی وہ ٹی وی کے قریب بالکل سامنے کشن رکھ کر بیٹھ گئی۔ پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ کمپیئر نے ٹیموں سے تعارف کروایا تھا۔

چار ٹیمیں تھیں۔ چاروں مختلف یونیورسٹیز سے تھیں ہر ٹیم میں تین تین امیدوار تھے۔ پہلا راؤنڈ شروع ہوا وہ جنرل نالج کا تھا۔ عدن احد اور سمعان نے ہر سوال کا جواب بہت اعتماد اور بالکل درست دیا تھا۔ راؤنڈ کے اختتام پر ان کے اسکور سب سے زیادہ تھے۔

دوسرا راؤنڈ Visual clipping کا تیسرا بیت بازی کا اور چوتھا سپورٹس کا تھا۔ ہر راؤنڈ کے اختتام پر بازی ان ہی کے ہاتھ میں رہی تھی۔ آخری راؤنڈ فی البدیہہ تقریر کا تھا۔ باقی تینوں ٹیموں کے مقرروں نے موضوع بہت عام سے منتخب کیے تھے۔

پھر ان کی ٹیم کی باری آئی تھی۔ جو موضوع انہوں نے منتخب کیا وہ بہت گنجلک سا تھا۔ باقی ٹیموں نے اس سے چشم پوشی اختیار کی تھی مگر سمعان نے مسکراتے ہوئے وہی موضوع منتخب کیا تھا۔ کمپیئر نے ابرو اچکا کر اس کے انتخاب پر حیرت کا اظہار کیا تھا اور پھر اسے ڈائس پر آنے کی دعوت دی تھی۔ عائشہ بے چین سی ہو گئی اسے لاتعداد خدشوں نے گھیر لیا۔ اسے تو موضوع صحیح طریقے سے سمجھ میں بھی نہ آیا تھا۔

سمعان تقریر شروع کر چکا تھا۔ اپنے مخصوص ساحرانہ انداز میں اس کی تقریر سن کر عائشہ کو اندازہ ہو رہا تھا کہ موضوع کتنا بامفہوم اور گہرا ہے۔ سمعان نے سامعین کی دکھتی رگوں پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔ کمپیئر کی لبوں میں دبی مسکراہٹ اور دھیرے دھیرے ہلتا ہوا سر اس بات کا غماز تھا کہ سمعان کا ایک ایک لفظ کس طرح اسے متاثر کر رہا ہے۔

"ونڈرز! میں نے تین منٹ میں کبھی اس قدر جامع پُر مغز اور برجستہ تقریر نہیں سُنی۔ یقین مانئے اس نوجوان نے مجھے حیران کر کے رکھ دیا ہے۔ ویل ڈن ینگ مین ویلڈن۔" تقریر کے اختتام پر جب تالیوں کا طوفان قدرے کم ہوا تو کمپیئرز نے سمعان کے کندھے کو تھپکتے ہوئے اسے بے حد سراہا تھا۔ تقریر ختم ہو گئی تھی مگر اس کا سحر ختم نہیں ہوا تھا۔ عدن اور عبدالاحد بھی سمعان کا کندھا تھپک کے اسے سراہ رہے تھے اور وہ صرف مسکرا رہا تھا بالکل ایک فاتح کی طرح۔ عائشہ کو اس کی بہت پہلے کے تقریری مقابلے کی مسکراہٹ یاد آگئی تھی۔ پروگرام ختم ہو چکا تھا۔ انہوں نے یہ پروگرام ریکارڈ سکور کے ساتھ جیتا تھا۔ اسی وجہ سے انہیں باقی انعامات کے ساتھ کیش پرائز بھی دیے گئے تھے۔ عائشہ کی گود میں دھرے

ہاتھوں کی پشت اس کے آنسوؤں سے بھیگ چکی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ آنسو کس لیے اس کی آنکھوں میں آئے تھے شاید سمعان پہ پہلی نظر پڑتے ہی اور پھر اس کے بعد لگاتار سے گرتے چلے گئے تھے۔

آج وہ بہت عرصے بعد روئی تھی تقریباً تین چار ماہ بعد اور یہ تین چار ماہ اس کے لیے بے حد خوب صورت تھے اس کی زندگی کے خوب صورت ترین اور ناقابل فراموش دن۔ وہ کبھی اتنی خوش نہیں رہی تھی جتنی خوش وہ ان تین ماہ میں ہوئی تھی۔ زین کی وساطت سے سمعان اور اس کے گروپ سے ملاقات کے بعد اس کی زندگی یکسر بدل گئی تھی۔ انہوں نے اسے بہت عزت اور محبت دی تھی اتنی کہ وہ دنگ رہ گئی۔ وہ آئے دن کوئی نہ کوئی پارٹی دیا کرتے اور اس میں عائشہ کو بعد اصرار شامل کرتے۔ ان کا ریفرشمنٹ کا انداز ہلکا پھلکا مذاق سب کچھ اسے بہت اچھا لگتا۔ رفتہ رفتہ وہ ان میں گھل مل گئی۔ اس قدر کہ اس کے لیے گھر میں وقت گزارنا بہت ہی مشکل ہوتا۔ اسے یقین ہو گیا کہ ان سب نے اسے اپنے گروپ میں شامل کر لیا ہے۔ سمعان سے تو اسے عشق تھا مگر باقی گروپ ممبرز سے بھی اسے محبت ہو گئی۔ وہ ان سب کی شخصیت سے تو پہلے سے ہی متاثر تھی ان کے خلوص کو دیکھ کر ان کی گرویدہ ہو گئی۔ وہ دنیا کو ان کی نظر سے دیکھنے لگی بلکہ اسے تو دنیا میں ان کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔

سارا دن اس کا سمعان کو محسوس کرتے گزرتا اور رات اس کے خواب بھی سمعان کے محور کے گرد ہی گھومتے۔ اس کے خواب سمعان کے لحاظ سے کس قدر سچے ہوتے ہیں اس بات کا اندازہ اسے اس دن ہوا تھا جب رات خواب میں اس نے سمعان کو افسردہ دیکھا تھا۔ وہ رو رہا تھا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ صبح وہ جاگی تو اس کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی سمعان کے گھر فون کیا تھا۔ اس کے پاس ان سب کے فون نمبرز تھے۔ فون سمعان نے ہی ریسیور کیا تھا۔ اس نے عائشہ کو بتایا کہ فجر سے دو گھنٹے

قبل اس کی والدہ وفات پا گئی ہیں۔ عائشہ کو محسوس ہوا تھا کہ سمعان کی آواز بھیگی ہوئی ہے۔ اس احساس نے اسے بری طرح رلا کے رکھ دیا تھا۔

پھر اس نے ہر ممکن کوشش کی تھی اس کی دلجوئی کی۔ وہ اس کی ذات کے گرد نادیدہ حصار بن گئی تھی۔ سب گروپ ممبرز ہی سمعان کا بہت خیال رکھتے مگر سمعان اس واقعے کے بعد بہت ریزرو سا ہو گیا تھا۔ عائشہ نے ہر وہ کام کیا تھا جس کے عوض سمعان کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آ سکتی تھی۔ اس کا مقصد بے غرض ہو کر پوری دلجمعی سے اس سانچے میں ڈھلنا تھا جو سمعان کی پسند کے نام پر اسے تھمایا گیا تھا یہ جانے بغیر کہ تھمانے والا کون ہے اور اس میں حقیقت کتنی ہے۔

لیکن پچھلے کچھ دنوں سے عائشہ نے گروپ کے رویے میں واضح تبدیلی محسوس کی تھی۔ سمعان کے ریزرو انداز کو تو اس نے اس کی والدہ کی وفات کا رسپانس سمجھ کر قبول کیا تھا مگر باقی گروپ والوں کا رویہ اس کے لیے ناقابل فہم تھا۔

"میں جو ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور مذاق پہ اپنا اعتماد کھو بیٹھتی تھی اور سرخ ہو جاتی تھی شاید اسی بات نے میرا امیج ان کی نظروں میں خراب کر دیا ہو۔" وہ یہی بات سوچ سوچ کر کڑھتی رہتی۔ جب ان سب نے اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا تھا تو وہ لاشعوری طور پر منتظر تھی کہ وہ لوگ اسے بھی ساتھ جانے کی دعوت دیں گے۔

"مجھے یقین ہے پاپا اعتراض نہیں کریں گے اور اگر ایسا ہوا بھی تو میں ان سے اجازت لے لوں گی۔ آخر ساری زندگی میں نے ان سے کچھ نہیں مانگا۔ وہ کیوں میری اتنی سی خواہش کو رد کریں گے۔" مگر پھر اس نے دیکھا کہ چھوٹی چھوٹی پارٹیز میں اس کو یاد رکھنے والے اتنے بڑے معاملے میں اسے فراموش کر گئے تھے۔

"یہ کیوں کر رہے ہیں ایسا میرے ساتھ؟ کیا یہ نہیں جانتے کہ میں جو ایک ایک پل ان کے ساتھ بتانے کی عادی ہو چکی ہوں اتنے دن ان کے بغیر کیسے

گزاروں گی۔ میں سمعان کو اتنے دن دیکھوں گی نہیں تو زندہ کیسے رہوں گی؟ یہ کیوں نہیں سمجھتے۔" وہ جانتی تھی کہ اب گروپ میں اس کی آمد پر اسے دانستہ نظرانداز کیا جاتا ہے مگر پھر بھی وہ عزت نفس اور انا کے لاشوں پر سے گزر کر روز ان کے پاس اسی آس پہ جاتی رہی کہ شاید وہ اس کی طلب سمجھ کر اس پر رحم کھائیں لیکن لگتا تھا تقدیر نے اپنے داؤ کھیلنا شروع کر دیے تھے۔ وہ سمعان کو دیکھنے کے لیے روز یونیورسٹی جاتی تھی مگر وہ اسے کہیں دکھائی نہ دیتا۔ پھر وہ سب اسلام آباد چلے گئے تھے' انہوں نے "تکلفاً" بھی اسے ساتھ چلنے کو نہ کہا تھا۔ اب ان سب کو ٹیلی ویژن پہ ہنستے مسکراتے دیکھ کر اس کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔

"یہ سب واپس آئیں تو میں پوچھوں گی ان سے کہ کیوں کر رہے ہیں میرے ساتھ ایسا اور اگر ایسا ہی کرنا تھا تو پھر مجھے اس عزت اور محبت سے روشناس کیوں کرایا تھا۔ میری تشنگی کو اس حد تک بڑھا کر وہ میرے تڑپنے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں کیوں؟ ... میں ان سے کہوں گی کہ خدارا میرے ساتھ ایسا نہ کریں۔ میری زندگی میں آپ لوگوں کے سوا کچھ بھی نہیں میں عدن سے کہوں گی وہ ہی سب کو سمجھائے' میری بہت اچھی فرینڈشپ ہے اس کے ساتھ' بے شک اس کا رویہ ریزرو اور پراؤڈ رہا ہے مگر اس نے پہلے بھی میری بہت مدد کی ہے' میری پرسنالٹی کی کئی خامیاں اس نے دور کی ہیں۔ شاید وہ سمعان سے متعلق میری فیلنگز بھی جانتی ہے' اسی لیے وہ میرے سامنے اکثر ہی سمعان کی باتیں کیا کرتی تھی۔ میں اس سے ریکویسٹ کروں گی ان سب سے کہ پلیز میرے ساتھ اس طرح نہ کریں' مجھ میں ان کا یہ بی ہیویئر برداشت کرنے کا بالکل حوصلہ نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔" وہ گھٹنوں پہ سر ٹکائے بلک بلک کر رو پڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

گروپ کے سارے ممبر وہی تھے۔ نیم دائرے کی شکل میں بیٹھنے کا انداز بھی وہی تھا۔ ہنسی مذاق بھی حسب معمول ویسا ہی تھا' صرف لان تبدیل ہو چکا تھا۔ اب وہ سب اکنامکس ڈیپارٹمنٹ کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ تبدیلی عدن کی خواہش پر لائی گئی تھی' جس پر باقی سب نے کلمہ شکر ادا کیا تھا۔ سب کو یہ ہرا بھرا' پھولوں سے سجا لان بہت بھایا تھا۔ وہ سب کل صبح ہی اسلام آباد میں دو ہفتے گزار کر لوٹے تھے۔ تب ہی ان سب نے عائشہ کو آتے ہوئے دیکھا تھا۔ بلیک جینز' ریڈش پنک ٹی شرٹ اور گلے میں اسکارف لیے' ہاتھوں میں دو تین بُکے اٹھائے وہ انہی کی جانب رہی تھی۔ اس کا چہرہ اس بات کی بھرپور عکاسی کر رہا تھا کہ وہ انہیں پوری یونیورسٹی میں ڈھونڈنے میں کافی زیادہ خوار ہو چکی ہے۔ وہ سب سے مسکرا کر ملی تھی۔ سمعان' عدن اور احد کو بُکے دیتے ہوئے اس نے انہیں کامیاب ہونے پر مبارکباد دی۔ احد نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ آہستگی سے بیٹھ گئی' اپنے مخصوص انداز میں گھٹنے ٹکا کے۔

عدن نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے' اسی سے بچنے کے لیے اس نے انگلش ڈیپارٹمنٹ کا لان چھوڑ دیا تھا مگر وہ وہاں بھی چلی آئی تھی۔

"عائشہ! ایک بات تو بتاؤ۔ تمہارے اس ٹریڈ مارک' میرا مطلب ہے اسکارف کا تمہارے ہر لباس میں موجود ہونا ضروری ہے کیا' پہلے اس کا مقام سر پہ تھا' اب یہ تمہارے گلے میں جھولتا ہے۔ پھر تم اسے اپنی کمر پہ باندھنا شروع کر دو گی۔ تم اس کی خطا بخش کیوں نہیں دیتیں۔" عدن نے اپنے ترکش کا یہ رخ حسب عادت عائشہ کی طرف موڑ دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اب سب کی طنزیہ مسکراہٹ اس کا چہرہ سرخ کر دے گی' وہ اپنی کپکپاتی آواز میں اپنا دفاع نہ کر سکے گی اور کچھ دیر بعد اٹھ کے چل دے گی مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔

عائشہ نہ سرخ ہوئی نہ اس نے جواب میں کچھ کہا۔ اس نے صرف نظر اٹھا کے عدن کی طرف دیکھا تھا۔ ان نظروں میں التجا تھی۔ اتنی دردناک کہ عدن نگاہیں چرانے پہ مجبور ہو گئی تھی۔

"بھئی۔ فضول باتیں چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ سعد اور سارہ کے ویڈنگ ڈریسز کہاں سے خریدے جائیں۔ میں چاہتی ہوں یہ ڈریسز ذرا ڈیفرنٹ قسم کے ہوں۔ تاکہ ذرا ڈیسنٹ اور جدا سا تاثر دیں۔" ثانیہ نے گفتگو کا موضوع ایک بار پھر سے سعد اور سارہ کی طرف موڑ دیا تھا۔

عائشہ کچھ دیر خاموشی سے ساری گفتگو سنتی رہی۔ پھر جب بات اس کی سمجھ میں آئی تو اس نے بے اختیار ہی سعد اور سارہ کو مبارکباد دی۔

"آپ دونوں آپس میں انگیجڈ تھے اور مجھے کبھی بتا ہی نہ چلا۔" وہ شرمندگی سے کہہ رہی تھی۔ سعد اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔

"ہیں' مس عائشہ! کیا آپ کو واقعی علم نہیں تھا۔" زنیرا کو کافی حیرت ہوئی تھی یہ سن کر بلکہ اس نے تو یہ سن کر بے ہوش ہو جانے کی ایکٹنگ بھی کی۔

"بھئی کیا' یہاں تو سارے ہی انگیجڈ ہیں' سوائے میرے' ابھی سعد اور سارہ کی شادی ہو رہی ہے۔ کل کو نایاب' جنید کے ساتھ اپنے گھر سدھاریں گی' پھر عبدالاحد بھی ثانیہ کو رخصت کروا کر دم لیں گے اور ہاں مسٹر سمعان! آپ کتنا عرصہ لیں گے مس عدن شہزاد کو مسز عدن سمعان' میں تبدیل کرنے میں؟ ویسے تم لوگوں کی منگنی کو تو اچھا خاصا عرصہ گزر چکا ہے۔" زین کی آواز عائشہ کے لیے کسی توپ سے کم نہ تھی۔ زین کی بات پر سب کی نظریں تو سمعان پہ جا ٹکی تھیں لیکن عدن' عائشہ کو دیکھ رہی تھی۔

اس نے کئی مردہ لوگوں کے چہرے دیکھے تھے مگر ان کے چہروں پہ اتنی سپیدی نہ تھی جتنی عائشہ کے چہرے پہ چھا رہی تھی۔ البتہ اس نے کسی مردے کی آنکھیں نہ دیکھی تھیں۔ ورنہ اسے عائشہ کی آنکھوں سے اتنا خوف محسوس نہ ہوتا۔ اس کی آنکھیں بالکل خالی تھیں۔ بالکل ویران' ان میں سوائے عدن کے عکس کے اور کچھ بھی نہ تھا اور وہ عکس اتنا مکروہ تھا کہ اسے بے اختیار خود ہی اپنی نظروں کا زاویہ تبدیل کرنا پڑا تھا۔

جنید اور سعد' عدن کو سمعان کے حوالے سے چھیڑ رہے تھے۔ عائشہ نے اسے مسکراتے دیکھا تھا۔ اسے لگا تھا کہ اس کی مسکراہٹ نے آکٹوپس کی طرح اسے جکڑ لیا ہے اور وہ بے دم سی بیٹھی لمحہ بہ لمحہ اپنی رگوں میں اترنے والے اس مسکراہٹ کے زہر کو محسوس کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

یونیورسٹی میں کچھ ڈیپارٹمنٹس کے طلباء نے انتظامیہ سے اپنے مطالبات منوانے کے لیے ہڑتال کر رکھی تھی۔ ان کی آئے دن کی توڑ پھوڑ اور مظاہروں سے تنگ آکر انتظامیہ نے پولیس فورس کو بلوا لیا تھا۔ پولیس کی لاٹھی چارج اور آنسو گیس سے مشتعل ہو کر کچھ طلباء نے فائرنگ کی تھی۔ پولیس نے انہیں حراست میں لے لیا تھا۔ اس خراب صورتحال کے مدنظر انتظامیہ نے زیادہ تر طلباء خصوصاً طالبات کو کچھ عرصہ کے لیے یونیورسٹی نہ آنے کی تاکید کی تھی۔ عائشہ اس تمام صورتحال سے واقف تھی لیکن اس نے پھر بھی سمعان کو فون کر کے یونیورسٹی آنے کو کہا تھا۔ سمعان اس کی بات سن کر بہت حیران ہوا تھا جب ہی اس نے عائشہ کو صورت حال کی نزاکت سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"عائشہ! حالات بہت خراب ہیں۔ ایسے حالات میں تو کوئی لڑکا بھی یونیورسٹی جانے کی جرات نہیں کر سکتا' دیکھیں! میری بات غور سے سنیں' ان حالات میں یونیورسٹی اور اس کا ارد گرد کا علاقہ ہرگز بھی محفوظ نہیں ہے۔ یہ کسی بھی وقت کسی بھی تخریبی کارروائی کا شکار بن سکتے ہیں۔ آپ پلیز حالات کی نزاکت پر غور کریں۔" عائشہ ریسیور کان سے لگائے کھڑی تھی۔

وہ سمعان کو کیسے سمجھاتی کہ اس کے لیے حالات اس سے زیادہ نازک صورت اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ اس کا اور عدن کا تعلق جاننے کے بعد پچھلے ایک ہفتے سے وہ کس حالت میں ہے۔ اسے لگتا تھا وہ فضا میں معلق ہے' کہیں خلا میں بھٹک رہی ہے۔ خلا میں انسان بے وزن ہو جاتا ہے' وہ بے حس

ہو گئی تھی' بالکل بے حس۔ اس نے سمعان کی ایک دفعہ پھر منت کی تھی یونیورسٹی آنے کے لیے اور اس نے ہامی بھر لی تھی۔

گل خان نے گاڑی یونیورسٹی کے سامنے روک دی' اسے ایک گھنٹے کے بعد آنے کی تاکید کرتے ہوئے وہ باہر نکلی۔ ہلکے ہلکے بادل تو پچھلے ایک دو دنوں سے آسمان پر چھائے ہوئے تھے مگر اس وقت ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ اس نے کانوں کو ڈھانپنے کے لیے سر پہ موجود اسکارف درست کیا اور اندر داخل ہو گئی۔ وہ یونیورسٹی جو پہلے اسٹوڈنٹس سے بھری رہتی تھی اب وہاں اکا دکا طلباء ہی نظر آ رہے تھے۔ وہ بھی شاید اپنے کسی ضروری کام سے ہی آئے تھے۔

اپنی کلاس کے سامنے بینچ پر بیٹھ کر اس نے سامنے موجود لان پہ نگاہیں ٹکا دیں۔ بے شمار خوشگوار یادوں نے اس کا حصار کر لیا تھا احساسِ زیاں پھر سے شدید ہونے لگا۔

کچھ دیر بعد اسے بینچ پر خود سے کچھ فاصلے پر کسی اور کی موجودگی کا بھی احساس ہوا۔ وہ دیکھے بغیر جان گئی تھی کہ وہ کون ہے۔

"کیا ضروری کام تھا آپ کو مجھ سے عائشہ؟" اس نے سمعان کی طرف رخ موڑا۔ اس کی نظریں سمعان کی نظروں سے ٹکرائی تھیں لیکن زیادہ دیر ان کا سامنا نہ کر سکی تھیں۔ نظریں جھکاتے ہوئے اسے بے اختیار ہی احساس ہوا تھا کہ وہ اپنے سارے الفاظ کھو چکی ہے۔ پھر بہت ہمت اور بہت حوصلے سے' اٹک اٹک کر اس نے سمعان کو سب کچھ بتا دیا' وہ سارے جذبات جو اس کے دل میں سمعان کے لیے تھے۔ وہ سب سوچیں جو اس کے دماغ میں سمعان کے حوالے سے آئی تھیں۔ اس نے دیکھا تھا یہ سب سن کر سمعان کے چہرے پر اور آنکھوں میں شدید حیرت کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ پھر یکدم ہی ان کی جگہ گہری سنجیدگی نے لے لی تھی۔ عائشہ کے چہرے کی بے بسی اور آنکھوں سے نکلتے مسلسل آنسوؤں نے اسے احساس دلا دیا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی۔

"آپ جانتی ہیں نا کہ میری کمٹمنٹ ہے عدن کے ساتھ؟" اس نے سرد' بے تاثر آواز میں پوچھا تھا۔ وہ جواب میں صرف سر جھکا سکی تھی۔

"اب جبکہ میں منگنی کر چکا ہوں اور کچھ عرصے بعد میری شادی ہونے والی ہے' آپ کیا چاہتی ہیں مجھ سے؟" وہ اپنی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی سرد اور بے گانگی سے بھری آواز عائشہ سن رہی تھی۔ وہ بے چین ہو کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"سمعان! آپ یقین کریں' آپ کے لیے یہ فیلنگز میرے دل میں پہلے دن سے ہیں۔

مجھے آپ کی منگنی کے بارے میں بہت دیر سے علم ہوا۔ تب اس وقت جب کچھ بھی میرے اختیار میں باقی نہیں بچا۔ اگر مجھے پہلے علم ہو جاتا تو میں اپنے آپ کو روک لیتی۔ کبھی آپ کے پاس نہ آتی۔ یہاں سے ہی چلی جاتی مگر ایسی نوبت نہ آنے دیتی۔ مگر اب تو میرے پاس کچھ نہیں بچا' یقین کریں سمعان' میں آپ کے بغیر مر جاؤں گی۔"

بارش تیز ہو چکی تھی۔ سمعان جو برستی بوندوں پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ اس کے آخری جملے سن کر اس کی طرف مڑا تھا' اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے تنقیدی نظروں سے اپنے سامنے کھڑی لڑکی کا جائزہ لیا۔ ڈھیلے ڈھالے سوٹ میں ملبوس' سر پر اسکارف ٹکائے وہ لڑکی اسے بہت عام سی لگی تھی۔ اس کے چہرے سے سرخی اور تازگی سرے سے مفقود تھی۔ ہونٹ ضبط کی کڑی کوششوں کے نتیجے میں لرز رہے تھے۔ آنکھوں میں اتنے آنسو جمع تھے کہ انہیں پڑھنا تقریباً ناممکن تھا۔

اس کی آنکھوں میں عدن شہزاد کا پرکشش اور دلکش سراپا لہرایا تھا۔ وہ اتنا احمق نہ تھا کہ عائشہ کمال جیسی عام سی لڑکی کے لیے عدن شہزاد جیسی لڑکی کو چھوڑ دیتا۔ اس صورت میں کہ وہ تین چار سال تک اس کی منگیتر بھی رہی ہو۔

"آپ جانتی ہیں کہ عدن کیا ہے میرے لیے؟" اس نے تیکھے انداز میں پوچھا تھا۔

"آپ جانتے ہیں کہ آپ کیا ہیں میرے لیے؟" اس نے جواب دیا تھا۔ آواز میں احتجاج تھا "میں نے ہر اس رستے پہ اندھا دھند سفر کیا ہے' جس کے بارے میں مجھے ذرا سا بھی شائبہ تھا کہ اس کی منزل آپ ہیں۔ آپ کی خاطر صرف آپ کی خاطر میں نے اپنی ذات' اپنی شخصیت اور اپنی صورت تک بدل کر رکھ دی۔ میں وہ بن گئی' جو میں نہیں تھی۔ میں اندھی ہو گئی ہوں آپ کی محبت میں اور اس مقام تک آ چکی ہوں۔ جہاں سے واپسی کا کوئی رستہ ہی نہیں آپ یوں مجھے بیچ منجدھار کے چھوڑ کر نہیں جا سکتے سمعان! آپ ایسا نہیں کر سکتے۔" دکھ کی شدت سے اس کی آواز پھٹنے لگی تھی۔

"شٹ اپ' جسٹ شٹ اپ۔" سمعان نے ہاتھ اٹھا کے اسے مزید بولنے سے منع کیا۔ اس کے چلانے پر اس کے ماتھے پہ بے شمار شکنیں نمودار ہو گئی تھیں۔

"عائشہ کمال! آپ نے اب تک جو کیا ہے' اس میں میرا کوئی کردار نہیں' میں نے آپ کو کبھی بھی کچھ بھی کرنے کے لیے نہیں کہا۔ پہلے آپ کی منزل زین تھا۔ پھر آپ نے کب اور کیسے اپنا روٹ چینج کیا' میں نہیں جانتا' آپ کی شخصیت اور آپ کی ذات کی کسی تبدیلی میں میری مرضی یا پسند شامل نہیں رہی اقدام کے لیے مجھے بلیم نہیں کر سکتیں۔" اس نے بہت مشکل سے اپنے لہجے کی تلخی پر قابو پایا تھا مگر اس کی آنکھوں سے جھلکتی نفرت اور بیزاری نے عائشہ کو سن کر دیا تھا۔

"آئی ایم ساری۔ میں آپ کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا' مجھے عدن سے محبت ہے اور میں اس سے کسی قیمت پر بھی دستبردار نہیں ہو سکتا۔" بادل بہت زور سے گرج رہے تھے بجلی چمک رہی تھی۔

عائشہ بے دم ہو کر بینچ پر بیٹھ چکی تھی۔ آنسو بہنا بند ہو چکے تھے۔ اس نے خالی خالی نظروں سے بارش کی بوچھاڑ میں سامنے روش پر تیز تیز جاتے ہوئے سمعان کو دیکھا۔

وہ لمحہ بہ لمحہ اس سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

دور بہت دور۔ اس کی دسترس سے بہت زیادہ دور۔ عائشہ نے اپنی ہتھیلیاں دیکھیں۔ وہ بالکل خالی تھیں' اس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ لان میں چیئر پہ بیٹھی دھوپ سینک رہی تھی جب مضطرب پھوپھو کی آواز پر اس نے بے ساختہ آنکھیں کھول دیں۔ "عائشہ بیٹا! آپ کا فون ہے کراچی سے۔" انہوں نے اس کے پاس آکر شفقت سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"آپ کے کسی کلاس فیلو کا ہے۔ غالباً" زین نام بتایا ہے اس نے۔" اس کی آنکھوں میں سوال دیکھ کر انہوں نے فوراً" ہی اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔ عائشہ کے اٹھ کر اندر جانے کے بعد وہ اسی کرسی پر بیٹھ گئیں جہاں کچھ لمحے قبل عائشہ بیٹھی ہوئی تھی۔

اپنی اس بھتیجی کے لیے انہوں نے اپنے دل میں ہمیشہ ہی بہت زیادہ محبت اور ہمدردی محسوس کی تھی۔ مگر احمد کمال کے خود غرضانہ رویے نے انہیں بدظن کر دیا تھا۔ مگر چار ماہ قبل جب وہ اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی کا دعوت نامہ دینے احمد کمال کے پاس کراچی گئیں تو وہاں کے حالات نے انہیں دنگ کر دیا۔ اتنے عرصے کے بعد وہ بھائی کے گھر پہنچیں تو وہاں نوکروں کے سوا کوئی موجود نہ تھا۔ نوکروں نے انہیں بتایا کہ احمد کمال' عائشہ کو لے کر ہاسپٹل گئے ہیں۔"

"وہ جی کل عائشہ بی بی بارش میں یونیورسٹی سے آئی تھیں تو ان کی طبیعت بہت خراب تھی۔ انہوں نے مجھے منع کر دیا تھا کہ صاحب جی کو ان کی طبیعت کے بارے میں نہ بتاؤں۔ مگر صبح جب میں انہیں جگانے گئی تو جی وہ بے ہوش پڑی تھیں۔ صاحب جی انہیں فوراً ہسپتال لے گئے تھے' جی اب وہ خود ادھر ہی ہیں۔" شادوال سے عائشہ کی بے ہوشی کا سن کر وہ افراتفری کے عالم میں ہاسپٹل پہنچیں۔ ڈاکٹرز نے جو کچھ بتایا تھا اس نے واقعی میں انہیں ہولا کر رکھ دیا۔

"دراصل پیشنٹ کسی صدمے یا خوف کے زیر اثر ہیں لیکن یہ صدمہ یا خوف انتہائی نوعیت کا ہے۔ ان کا دماغ اس کیفیت سے نجات حاصل نہیں کرپارہا۔ آپ دعا کریں کہ وہ ہوش میں آجائیں ورنہ بصورت دیگر برین ہیمبرج کا خطرہ ہے۔"

ڈاکٹرز کی رپورٹ اور عائشہ کی حالت دیکھنے کے بعد انہیں احمد کمال سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ وہ جان گئی تھیں کہ ان کا بھائی اپنی بیٹی کی پرورش کے معاملے میں بالکل ناکام رہا ہے۔

دکھ اور پچھتاوا احمد کمال کے چہرے پر بکھرا پڑا تھا۔ وہ چپ چاپ محو دعا ہوگئیں۔

احمد کمال کی دعائیں قبولیت کا شرف پاگئی تھیں۔ عائشہ کو ہوش آگیا تھا۔ مضراب پھوپھو نے اس کی دلجوئی کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی مگر وہ اس کا دکھ سمجھنے میں ناکام رہی تھیں۔ انہوں نے دیکھا تھا کہ عائشہ روئی نہیں تھی۔ بیٹھے بیٹھے کھوئی رہتی پھر اچانک اس کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار پیدا ہو جاتے۔ وہ بے چینی سے ادھر ادھر پھرتی گویا کوئی گمشدہ چیز ڈھونڈ رہی ہو۔

"پھوپھو! مجھے اپنے ساتھ ایبٹ آباد لے چلیے۔ پلیز میں یہاں رہنا نہیں چاہتی' خدا کے واسطے مجھے یہاں سے لے چلیں پلیز پھوپھو پلیز۔ ایک دن اسی کیفیت میں اس نے مضراب کے سامنے التجا کی تھی۔ اس کے دکھ سے بھرے لہجے پر مضراب کا دل کٹ کے رہ گیا تھا۔ انہوں نے احمد کمال سے بات کی تھی انہوں نے کسی مزاحمت کے بغیر انہیں اجازت دے دی تھی۔

ایبٹ آباد آکر انہوں نے عائشہ کا دل بہلانے کا ہر سامان مہیا کیا تھا۔ اسے اس کے نانا' نانی اور چاروں ماموؤں سے ملوایا تھا۔ ان سب نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ عائشہ کے تمام کزنز اس سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے' وہ بہت حد تک بہل گئی تھی مگر اس کی ذات پہ چھایا جمود نہیں ٹوٹ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

عائشہ کا جمود زین کا فون سن کر ٹوٹا تھا۔ زین نے احمد کمال سے ایبٹ آباد میں عائشہ کا کونٹیکٹ نمبر لیا تھا۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں عائشہ کو بتایا کہ عنقریب سمعان اور عدن کی شادی ہو رہی ہے۔ سعد اور ساجد کی شادی اٹینڈ کرنے کے بعد وہ سب سمعان کی شادی کے پروگرامز ارینج کر رہے ہیں۔ اس نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا مگر اس سے آگے عائشہ میں سننے کی سکت نہ تھی۔

اس نے ایبٹ آباد آنے کے بعد چار مہینوں میں سمعان علوی کے تصور اور اس کے خیال پر جو بند باندھ رکھے تھے' وہ چار سیکنڈ میں ٹوٹ گئے تھے۔ اسے کھونے کا احساس پوری شدت سے کروٹ لے کر بیدار ہوچکا تھا۔ اب ہر جگہ سمعان علوی تھا۔ سوچ میں' ذہن میں' تصور میں' دل میں' اندر باہر ہر جگہ وہی تھا۔ وہ اس سے فرار چاہتی تھی۔ اس کی سوچوں سے اس کی محبت سے نجات چاہتی تھی لیکن اس کا دل اس کا ذہن اور اس کا جسم اس کا ساتھ دینے سے انکاری تھے۔

"یا اللہ' رحم فرما اس بچی کے حال پر۔" بے شمار قرآنی سورتیں پڑھ کر اس پر پھونکتے ہوئے انہوں نے آواز بلند اللہ سے رحم کی اپیل کی تھی۔ عائشہ نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔

"اللہ" اس نے آہستگی سے دہرایا تھا۔ پھر اسے کچھ یاد آیا اور جو اسے یاد آیا وہ صرف کچھ نہیں تھا وہ بہت کچھ تھا' وہ کچھ جو وہ عرصہ پہلے فراموش کرچکی تھی۔

"اللہ! میں نے مایوس ہو کر اپنا رخ آپ کی طرف موڑا ہے۔ میں نے آپ کے راستے میں پہلا قدم اٹھایا ہے۔ میری مدد فرمائیں۔ مجھے اتنی توفیق عطا کریں کہ میں آپ سے محبت کرسکوں۔" اس نے اپنی ہی آواز سنی تھی۔

"آپ سے عشق نہ سہی محبت تو کر سکتی ہوں میں' انسانوں سے محبت کرنے سے بدرجہا بہتر ہے کہ آپ سے محبت کی جائے۔ انسانوں سے محبت بہت خوار کراتی ہے۔" اسے وہ ساری دعا یاد آگئی تھی جو اس نے کبھی مانگی تھی اور جو قبول ہوئی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"پھوپھو! میں نماز پڑھنا چاہتی ہوں۔"

وہ وضو کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ نماز عصر کا وقت تھا۔ وضو کرنے کے بعد اس نے جائے نماز بچھائی نیت باندھی اور نماز شروع کردی۔

نماز شروع کرتے ہی اس کے اندر جنگ سی چھڑ گئی۔ سمعان علوی کا تصور اس کے ذہن پہ ایک بار پھر سے چھانے لگا تھا' اس کا ذہن دفاع کر رہا تھا مگر یہ دفاع کمزور پڑتا گیا۔ اس کے تصور نے پورے ذہن کو اپنے قبضے میں کرلیا۔ وہ ثنا کے بعد سورۂ فاتحہ کی تلاوت کر رہی تھی' رک گئی۔

اس نے ذہن کو جھٹک کر دوبارہ سے ثنا پڑھی۔ لیکن کچھ ہی پڑھنے کے بعد اسے ثنا بھی بھول گئی۔ وہ پوری قوت سے اپنا دھیان اللہ کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کر رہی تھی' کوئی دیگر قوت سے سمعان علوی کا تصور اس کے ذہن میں دخیل رہا تھا۔

اس نے پھر سے نیت باندھ کر نماز شروع کرنا چاہی مگر ناکام ہوگئی۔ اب اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ وہ جائے نماز پہ بیٹھ گئی' اپنے ہاتھ سامنے پھیلا لیے اس کے انداز میں شکست خوردگی تھی۔

"مجھے علم ہے اللہ کہ تو مجھ سے خفا ہے۔ تو میری حاضری اپنی بارگاہ میں قبول نہیں کر رہا۔ مجھے علم ہے میں نے خود اپنی ذات پہ کتنا بڑا ظلم ڈھایا ہے۔ تجھے بھلا دیا اور انسانوں کو معبود بنالیا۔ اللہ تجھے معبود مان کر تجھے پوجا جائے تو تو سکون عطا کرتا ہے' انسانوں کو خدا سمجھ کر ان کی پرستش کی جائے تو وہ سکون چھین لیتے ہیں۔"

اللہ تیرے سامنے سر جھکایا جائے تو تو جھکانے والے کا سر ساری دنیا میں بلند کر دیتا ہے۔ انسانوں کے سامنے سر جھکایا جائے تو پھر وہ ساری عمر سر اٹھانے نہیں دیتے۔

اللہ تیرے سہارے کے لیے کوئی آگے بڑھے تو تو بڑھ کر تھام لیتا ہے۔ انسانوں کے سہارے کے لیے آگے بڑھا جائے تو وہ گرا دیتے ہیں۔ بھاگنے لگتے ہیں۔

اللہ میں نے بے شمار غلطیاں کی ہیں۔ مجھے سمعان علوی کے تصور سے' اس کی محبت سے نجات دلا دے۔ مجھے اس کی آگ میں جھلسنے سے بچا۔"

اس دعا کے دوران اسے محسوس ہوا کہ اس کے آنسوؤں پہ پچھلے چار ماہ سے بندھے ہوئے بند کھل چکے ہیں۔ وہ روئی تھی۔ تڑپ تڑپ کے روئی تھی۔ یہ آنسو پشیمانی کے تھے' یہ آنسو ندامت کے تھے۔ یہ آنسو اپنے گناہوں پر شرمندگی کے تھے۔ تو پھر اللہ سے بڑھ کر کون ہے ان آنسوؤں کا چاہنے والا کون ہے جو اس سے بڑھ کر ان آنسوؤں کی قدر و قیمت جان سکے۔ یقیناً کوئی نہیں!

☼ ☼ ☼

"مما! عائشہ یہاں ہل سے ماسٹرز کر رہی ہے ناں۔" مضراب کی بیٹی شفق نے ان سے پوچھا تھا وہ کچھ دنوں کے لیے میکے آئی ہوئی تھی۔

"ہاں بیٹا' دو سال پہلے جب میں تمہاری شادی کر رہی تھی تو تمہارے بعد تنہائی کا احساس مجھے بہت تکلیف دیتا تھا مگر پھر اللہ نے عائشہ کی شکل میں مجھے دوسری بیٹی دے دی۔" وہ مسکراتے ہوئے شفق کو بتا

رہی تھیں۔

"میں نے ہی احمد سے کہا تھا کہ عائشہ کا مائیگریشن کراچی سے پشاور یونیورسٹی میں کروا دے کیونکہ وہ کسی صورت بھی کراچی واپس نہیں جانا چاہتی تھی۔ اب تو میں اس کی اتنی عادی ہو گئی ہوں کہ اس کے کراچی واپس جانے کا خیال ہی مجھے بہت افسردہ کر دیتا ہے۔" ان کے لہجے میں ہلکی سی افسردگی در آئی تھی۔

"مما! آپ نے احمد انکل کو ان پرپوزلز کے بارے میں بتایا تھا جو عائشہ کے لیے یہاں آپ کے پاس آئے تھے۔" شفق نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں' میں نے پچھلی بار فون پر احمد سے بات کی تھی۔ اسے بتایا تھا کہ یہاں اس کی بیٹی کے لیے کس قدر رشتے آ رہے ہیں۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ شفق کی ساس تو عائشہ کی دیوانی ہیں' انہوں نے اپنے دوسرے بیٹے کے لیے عائشہ کا کہا ہے۔ لیکن وہ بتا رہا تھا کہ وہاں کراچی میں بھی عائشہ کے لیے کئی پرپوزلز موجود ہیں۔ وہ اپنی فرم کے ایم ڈی کے بیٹے کا بھی بتا رہا تھا کہ بہت قابل لڑکا ہے۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ احمد کا انٹرسٹ ہے اس پرپوزل میں۔"

"اچھا۔" شفق نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔ "آپ نے عائشہ سے بات کی ہے اس سلسلے میں؟"

"نہیں ..... ابھی کوئی ایسا مناسب موقع نہیں ملا بات کرنے کا۔" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

اسی وقت عائشہ اندر داخل ہوئی۔ شفق کی نظریں بے اختیار ہی اس پر جم گئی تھیں۔ عائشہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سلام کیا تھا۔

بالکل سفید یونیفارم پہ نیوی بلیو کوٹ اور سفید سکارف میں ملبوس وہ بہت پاکیزہ سی' بہت پرنور دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے شفق نے ایک بار پھر اعتراف کیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں بہت چمک ہے۔ بہت پراسرار سی' بہت پارعب سی چمک' وہ ہر بار اس کی آنکھوں میں دیکھ کر دل ہی دل میں یہ اعتراف کیا کرتی تھی۔ شفق نے اپنی شادی کے موقع پر پہلی بار جس عائشہ کمال کو دیکھا تھا' وہ اتنی پرکشش شخصیت کی مالک نہ تھی۔

وہ ایک الجھی ہوئی بے ترتیب شخصیت والی لڑکی تھی' جس کی آنکھوں میں ویرانی اور افسردگی تھی۔ لیکن پچھلے کچھ عرصے سے جس عائشہ سے روشناس ہوئی تھی۔ وہ قطعی مختلف تھی۔ اس نئی عائشہ کی آنکھوں میں بہت سکون اور بہت زیادہ چمک تھی' اتنی زیادہ کہ شفق زیادہ دیر تک اس کی آنکھوں میں دیکھ نہیں سکتی تھی۔ وہ عائشہ کی حد سے زیادہ عبادات میں دلچسپی کو بھی حیرت سے دیکھا کرتی۔ خود تو اسے دل میں تین چار نمازیں پڑھنا بھی مشکل ترین کام محسوس ہوتا' لیکن عائشہ کا اپنی نیندیں قربان کر کے تہجد پڑھنا اسے حیرت میں مبتلا کر دیتا۔

"عبادات' قرآن مجید کی تعلیم اور لٹریچر جیسے مضمون میں فرسٹ پوزیشن' کتنی کامیابی سے یہ لڑکی دین اور دنیا کو ساتھ لے کر چل رہی ہے' بہت کم ہوتے ہیں ایسے کامیاب لوگ' بہت ہی کم۔"

اس نے سوچتے ہوئے سامنے بیٹھی لنچ میں مصروف عائشہ کو دیکھا۔ وہ کپڑے بدل چکی تھی۔ چہرے پہ ہلکی ہلکی نمی ظاہر کر رہی تھی کہ کچھ دیر قبل اس نے چہرہ دھویا ہے۔ شفق نے اکثر اس کے چہرے پہ دھیمی دھیمی مسکراہٹ دیکھی تھی۔ پرسکون سے چہرے پہ یہ مسکراہٹ اس کے چہرے کو کتنا پرکشش بنا دیتی ہے۔

"عائشہ! احمد کی خواہش ہے کہ وہ تمہارے ماسٹرز کے بعد تمہاری شادی کر دے۔" ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد مضراب (ممانی) اصل موضوع کی طرف لے کر آ گئیں۔ شفق نے دیکھا کہ عائشہ کے ہاتھ میں پکڑی سلاد کی پلیٹ بری طرح ڈگمگائی تھی۔

"تمہارا کیا خیال ہے اس بارے میں۔" انہوں نے اس کی مرضی پوچھی۔ شفق کی نظریں ابھی بھی اس پہ جمی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پہ ابھرتے والے تاثرات شفق کو حیرت میں مبتلا کر گئے۔

"جو بابا مناسب سمجھیں' ان ہی کی رضا میں میری رضا ہو گی۔" کافی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے بہت ٹھہر ٹھہر کے یہ بات بہ مشکل کہی۔ کھانے سے فیر محسوس طریقے سے اس موضوع پر بات شروع ہوتے ہی ہاتھ کھینچ چکی تھی۔ یہ بات کرنے کے بعد وہ آہستگی سے کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اسے ڈائننگ روم سے باہر جاتا دیکھتے ہوئے شفق حیرت سے سوچ رہی تھی کہ پتا نہیں یہ سچ تھا یا صرف اس کا وہم کہ بولتے وقت عائشہ کی صرف آواز میں نہیں بلکہ آنکھوں میں بھی نمی گھلی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پہ اس طرح کے تاثرات تھے گویا اس موضوع پہ بات کرنا اس کے لیے بے حد اذیت ناک ہو۔

☼ ☼ ☼

اس کے فائنل ایگزامز ہو چکے تھے۔ اب اسے کچھ ہی دنوں میں کراچی لوٹ جانا تھا۔ جس دن اس کا آخری پیپر تھا' اس سے اگلے دن مضراب بہت خوش خوش اس کے کمرے میں آئی تھیں۔

"مبارک ہو عائشہ اللہ نے تمہارے لیے وسیلہ بنا دیا۔" انہوں نے بے اختیار ہی عائشہ کو گلے لگایا۔

"تم عمرہ کرنا چاہتی تھی نا' اب تم جتنے بھی چاہے عمرے ادا کرنا' بلکہ اگر چاہو تو حج بھی کر لینا۔" اس کے بے پناہ حیرت سے دیکھنے پر وہ خود ہی اسے بتانے لگی تھیں۔

"ابھی احمد نے مجھے فون کر کے بتایا ہے کہ تمہارے لیے کسی ایسے لڑکے کا پرپوزل آیا ہے جو فی الحال تو ایک ملٹی نیشنل فرم میں صرف منیجر ہے لیکن وہ تین ماہ بعد اپنی کمپنی کی طرف سے دو سال کے لیے کسی کورس پر سعودیہ چلا جائے گا۔ اس لڑکے نے بذات خود یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ ان ہی دو ماہ میں شادی کر کے اپنی وائف کو اپنے ساتھ سعودیہ لے جانا چاہتا ہے۔ احمد بتا رہے تھے کہ لڑکا بہت جینئس ہے اور انہیں یقین ہے کہ وہ بہت ترقی کرے گا۔ میں نے تو کہہ دیا کہ اللہ نے معجزہ ہی کیا ہے۔ تم ذرا دیکھ بھال کر فوراً ہاں کر دے۔ تم اپنے ایگزامز کے بعد کراچی جا کر خود بھی اس سے مل لینا' مجھے یقین ہے تمہاری اس کے ساتھ انڈرسٹینڈنگ ہو جائے گی۔"

انہوں نے بہت خوشی سے اسے ساری تفصیل بتائی تھی۔ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی سب کچھ سنتی رہی۔ ان کے جانے کے بعد اس نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"میں نے سنا تھا کہ خانہ کعبہ پہ پہلی نگاہ ڈالتے ہی جو مانگا جائے ملتا ہے۔" وہ دل میں کسی سے مخاطب تھی۔ "میں نے سوچا تھا کہ میں عمرہ کے وقت طواف کعبہ کے دوران خانہ کعبہ کو دیکھتے ہوئے پہلی دعا یہ مانگوں گی کہ میرے دل اور میرے ذہن میں سے سمعان علوی نامی شخص کے لیے موجود ہر طرح کے جذبات' ہر طرح کے خیالات اور ہر طرح کے محسوسات کو ختم کر دے۔"

اب اسے کچھ ہی دنوں میں کراچی پلٹ جانا تھا۔ وہ یہاں اپنے تمام ضروری کام نبٹا رہی تھی۔ ایسے ہی کسی کام کے لیے وہ اس دن برلن ہال چلی گئی۔

جب صبح وہ گھر سے نکلی تھی تو موسم خوشگوار تھا۔ لیکن ایک بجے کے قریب جب وہ کالج گیٹ سے باہر نکلی تو بادلوں نے پورے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ کہیں کہیں دھوپ کا عکس پڑنے کے باوجود ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ اس نے سر اٹھا کے آسمان کی طرف دیکھا۔ صبح کے سفید بادلوں کے برعکس اب آسمان پہ جا بجا سرمئی رنگ کے بادل تھے' جو اس بات کے عکاس تھے کہ یہ رِم جھم برستی بارش' موسلا دھار بھی ہو سکتی ہے۔ یہ صورت حال دیکھ کر اس نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔ کالج سے مضراب پھوپھو کا گھر تقریباً" واکنگ ڈسٹنس پر ہی تھا۔ گھر میں صرف ایک گاڑی تھی جو ان کے شوہر آفس لے کر جاتے تھے۔ انہیں کسی زحمت سے بچانے کے لیے' ان کے لاکھ اصرار کے باوجود بھی وہ اکثر پیدل آنے جانے کو ترجیح دیتی۔ ایبٹ آباد کی سرسبز حاشیے میں گھری اور دونوں اطراف پھولوں سے مزین سڑکوں پہ چلنا اسے واقعی میں اچھا لگتا تھا۔

ابھی بھی چلتے چلتے وہ اپنے اطراف میں بکھرے اس دھلے دھلائے سبزے کے دلکش مناظر اپنی نظروں میں سمو رہی تھی۔ اس نے دانستہ ہی اپنی رفتار پھر سے کم کر

دی۔ بارش اتنی تیز نہ تھی کہ اسے بھگو سکتی۔ چلتے چلتے اس نے بے اختیار ہی اپنی سویٹر کی جیب سے ہاتھ باہر نکال کر سامنے پھیلا لیا۔ اپنی ہتھیلی پہ گرتی نازک سی بوندوں کو دیکھتے ہوئے ایک دم ہی اسے کراچی کی وہ تیز موسلادھار بارش یاد آئی۔

جب اس کے ہاتھ ہر چیز گنوا چکے تھے 'پیار' محبت' خلوص' انا اور عزتِ نفس سے لے کر اعتماد تک۔

جب اس کی ہتھیلیاں بالکل خالی رہ گئی تھیں۔

بجلی کی سی سرعت سے اس نے اپنا ہاتھ واپس جیب میں ڈال لیا۔ اس کے قدموں میں تیزی آگئی۔

کنٹونمنٹ ہاسپٹل کے قریب سے موڑ مڑ کر وہ سڑک کے کنارے کنارے سر جھکائے چل رہی تھی۔ جب اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے پکارا ہو۔ آواز کو جس حوالے سے اس کے دل نے پہچانا تھا اس کا احساس ہوتے ہی اس کے لمحہ بھر کو ساکت ہوئے قدموں میں پھر سے تیزی آگئی۔

"عائشہ' عائشہ۔" کوئی اسے پکارتے ہوئے تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کے برابر آن پہنچا تھا۔

"عائشہ!... رکو' میری بات سنو پلیز۔" کسی نے اس کا بازو پکڑ کے رک جانے کی اپیل کی تھی۔ اس نے تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ پیچھے مڑ کے دیکھا اور پھر حقیقی معنوں میں اپنی جگہ منجمد ہو گئی۔ جسے وہ اپنا گمان سمجھ رہی تھی' وہ حقیقت تھی وہ واقعی میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔

اگر وہ دو سال پہلے والی عائشہ ہوتی تو اس وقت اسے دیکھ کر یقیناً اس کا دل دھڑکنا بھول چکا ہوتا۔ مگر اب ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اب اس کا دل سامنے کھڑے شخص کے نام پہ نہیں دھڑکتا تھا۔ بلکہ وہ تو اب تک اپنی پچھلی دھڑکنوں کا خمیازہ بھگت رہا تھا۔

"میں پچھلے دو دنوں سے مسلسل تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔ میں یہاں آیا بھی اسی یقین کے ساتھ تھا کہ تمہیں ضرور تلاش کر لوں گا۔" وہ اس کا بازو چھوڑ کر اس سے کہہ رہا تھا۔

اور اس کے سامنے کھڑی وہ اب تک اسی شش و پنج میں تھی کہ یہ خواب ہے یا حقیقت۔ "عائشہ!... تم شادی کرو گی مجھ سے؟" کچھ لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد اس نے ایک دم ہی سوال کر دیا تھا۔ عائشہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا یوں گویا سمجھ نہ سکی ہو کہ اس نے کیا کہا ہے۔ وہ بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سمعان نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"نہیں۔" اس نے پوری قوت جمع کر کے حلق سے آواز کھینچی تھی۔ "میرا رشتہ طے ہو چکا ہے۔" اپنی بات کہہ کے وہ مڑی اور تیز تیز قدموں سے چلتی سڑک کی انتہا پہ پہنچ کر اگلا موڑ مڑنے سے قبل اس نے لاشعوری طور پر پیچھے مڑ کر دیکھا۔

وہ کسی اسٹیچو کی مانند ساکت کھڑا تھا۔ تیز ہوتی بارش نے اس کے گرم کپڑے سے بنے گھٹنوں تک لمبے براؤن اوور کوٹ کو بری طرح بھگو دیا تھا۔ مگر وہ ہر چیز سے بے نیاز سر جھکائے کھڑا تھا۔

عائشہ نے صرف ایک نظر اسے دیکھا اور پھر موڑ مڑ گئی۔ اس کے تیزی سے چلتے قدموں میں اب آہستگی آگئی تھی۔

"کیوں آیا ہے یہ دوبارہ پھر سے میرا سکون برباد کرنے کے لیے۔" اس کی نظروں میں اس کا بارش میں بھیگتا سراپا جم گیا تھا۔ وہ بے چین ہو کر الٹے قدموں واپس لوٹی۔

وہ اس کے بائیں ہاتھ پہ سڑک کے کنارے بنی ہوئی شہتوت کے پیچھے موجود سیمنٹ کے بنچ پہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا سر بنچ کی پشت پہ ٹکا ہوا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ اس کے پاس پہنچ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے عائشہ کو شدت سے یہ احساس ہوا کہ دو سال قبل ایسے ہی موقع پر اس کے اپنے چہرے کے تاثرات کیسے ہوں گے' جب سمعان اسے ایسی حالت میں چھوڑ کر گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس نے اپنے آنسو ضبط نہیں کیے تھے مگر سمعان کے چہرے پہ موجود ہلکی ہلکی سرخی اور ماتھے پہ ڈوبتی اور ابھرتی نیلی رگیں اس بات کی غماز تھیں کہ وہ اپنے

مسلسل آنسو کا ضبط کر رہا ہے۔

"کیوں کرتے ہیں آپ میرے ساتھ ایسا۔ ہر دفعہ میری کوششوں کو' میری محنت کو خاک میں ملا کر رکھ دیتے ہیں۔ جب میں آپ کی محبت پانا چاہتی تھی' تب آپ نے مجھے بری طرح دھتکار دیا۔ اب میں اس سے دستبردار ہونا چاہتی ہوں تو آپ نے یہ لا کر مجھے تھما دی۔" وہ اس کے سامنے والے بنچ پہ بے دم ہو کر بیٹھ گئی۔ باوجود کوشش کے اس کی آواز ایک سرگوشی سے بلند نہ ہو سکی تھی۔ حلق میں شاید پھندا سا پڑ گیا تھا۔ سمعان نے اس کی آواز سن لی تھی مگر آنکھیں پھر بھی نہیں کھولیں۔

"مجھے بہت دیر لگی محبت کو سمجھنے میں۔" اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ اس کے شکستہ لہجے پہ عائشہ نے سر اٹھایا۔ وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا عائشہ کے سر اٹھاتے ہی اس نے پھر سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"بہت زیادہ دیر لگی مجھے یہ سمجھنے میں کہ محبت کیا ہوتی ہے۔" وہ ایک بار پھر گویا ہوا۔

"بہت پہلے لڑکپن میں میں عدن سے متاثر ہو گیا تھا۔ میرا خیال تھا یہی محبت ہوتی ہے۔ پھر جلد ہی عدن کی انا پرستی اور خود پسندی نے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ کب اور کیسے؟ یہ مجھے علم نہ ہو سکا۔ میں اس سے شدید متاثر تھا' اس کی خوب صورتی اور کشش سے' اس کی ذہانت اور رکھ رکھاؤ سے اور وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ میں ہمیشہ اس سے متاثر رہوں۔ میری اس کے ساتھ کمٹ منٹ ہو گئی۔ ہم بہت اچھے دوست بن گئے۔ مگر ہمارے سارے تعلقات کے بیچ شاید محبت پھر بھی جنم نہ لے سکی۔

میں نے پہلی دفعہ تمہیں اس وقت دیکھا تھا جب تم سپیچ speech کر رہی تھیں۔ اس وقت بیٹھا میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ میں نے تمہیں پہلے کہاں دیکھا ہے۔ اس کے کافی دن بعد میں نے یونیورسٹی میں تمہیں دیکھا۔ سب تم پر ہوٹنگ کر رہے تھے پھر ایک دن میں نے تمہیں مارکیٹ میں دیکھا جب تم نے غلط پارکنگ کی تھی۔ اس کے کچھ دنوں بعد تم یونیورسٹی آنا شروع ہو گئیں۔ ہر دفعہ تم سے ملنے کے بعد مجھے یہی احساس ہوتا کہ میں تمہیں پہلے سے جانتا ہوں۔

پھر میں نے سنا کہ تم بہت تبدیل ہو گئی ہو۔ میں نے اپنے گروپ والوں سے تمہاری فیشن پرستی اور زین میں انٹرسٹڈ ہونے کے متعلق سنا' یہ سب کچھ جان کر بھی میں تم سے نفرت نہ کر سکا۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ تم خوش رہو۔ میرے دل پر عدن کی چھاپ اتنی گہری تھی کہ میں کبھی اسے قبول نہ کر سکا۔ جب تم نے مجھ سے اظہار محبت کیا تو مجھے شدید قسم کا شاک لگا تھا۔ میں تمہیں بہت کچھ کہہ کے پلٹ آیا مگر اپنا سکون تمہارے پاس ہی کہیں بھول آیا تھا۔ تم اس دن کے بعد یونیورسٹی نہیں آئیں مگر میں ہر روز نادانستہ ہی تمہیں تلاش کرتا۔ پھر زین نے مجھے بتایا کہ تم ایبٹ آباد چلی گئی ہو۔

یہ جان کر ایک بے چینی سی میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔ میں نے زین سے تمہارے بارے میں بات کی۔ اس نے مجھے بتایا کہ تمہارے اور اس کے درمیان کبھی بھی کچھ نہیں رہا۔ اس کے بعد میرے اندر جنگ سی چھڑ گئی' میں نے تنگ آ کر جلد از جلد شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابھی میری شادی کی تیاریاں ہو ہی رہی تھیں کہ حالات نے پلٹا کھایا۔ ایک طرف میری شادی کے انتظامات مکمل تھے اور دوسری طرف ان ہی دنوں میرے فادر کا کسی مشہور ماڈل کے ساتھ سکینڈل اخبارات کی زینت بننے لگا۔ یہ نہ صرف میرے لیے باعث شرمندگی تھا بلکہ عدن اور اس کی فیملی کے لیے بھی بدنامی کا باعث تھا کہ آخر کو میرے فادر عدن کے ہونے والے سسر تھے۔ عدن اور اس کی فیملی کی باتوں نے مجھے اتنا مشتعل کیا کہ میں اپنے فادر سے لڑ پڑا۔ میں نے ان سے بہت تلخ کلامی کی کیونکہ وہ واقعی اس ماڈل میں انٹرسٹڈ تھے اور انہوں نے غصے میں آ کر مجھے جائیداد سے عاق کر دیا۔

میں حالات کے بدلنے پہ ششدر رہ گیا۔ پھر میں نے ایک فرم میں ملازمت شروع کر دی۔ عدن اور اس کے والدین بھی ان حالات پہ ہکا بکا رہ گئے۔ عدن کے

قادر نے مجھے اپنی مل میں کام کرنے کو کہا مگر مجھے ایسا کرنا انسلٹنگ لگتا تھا۔ ہماری شادی ملتوی ہو گئی تھی۔ ایک سال گزر گیا میں ایک عام سی پوسٹ سے منیجر کے عہدے تک پہنچ گیا مگر عدن اور اس کے فادر کی نظر میں یہ عہدہ بھی کچھ نہ تھا۔

عدن اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اور ہمیشہ بہترین چیز حاصل کرنا اپنا حق سمجھتی تھی چنانچہ وہ کیسے میرے ان دگرگوں حالات سے سمجھوتا کرتی۔ اس ایک سال نے اس کی آنکھوں سے محبت کی پٹی کھول دی تھی۔ پھر ایک دن تمام دوستوں کی موجودگی میں اس نے مجھے منگنی کی انگوٹھی واپس کردی۔ اس نے کہا تھا کہ "اس کی محبت وہ سمعان تھا جو کامیاب اور خوشحال تھا' حالات کے بے رحم سمندر میں اپنے بچاؤ کے لیے بے بسی سے ہاتھ پیر مارتے اس سمعان سے اسے کوئی سروکار نہیں۔"

میرے سارے دوستوں کا خیال تھا کہ تب میں چیخنے چلانے لگوں گا' اسے محبت کے واسطے دے کر منگنی توڑنے سے باز رکھوں گا۔ مگر ان سب کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے یہ کہہ کر اسے بھی منگنی کی انگوٹھی واپس لوٹا دی کہ ان حالات میں اس سے بہتر کوئی فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ سب دیکھ کر باقی سب تو حیران ہوئے ہی تھے مگر مجھے آج بھی عدن کی حیرت سے پھیلی وہ آنکھیں یاد ہیں۔ وہ کتنی دیر بے یقینی سے مجھے دیکھتی رہی تھی۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ میں گڑگڑانے کے موڈ میں نہیں تو وہ واپس چلی گئی۔

اپنے گروپ کی شیرازہ بندی میں نے اور عدن نے ہی کی تھی۔ ہمارے جدا ہوتے ہی وہ گروپ بھی بکھر گیا۔ سعد اور سارہ تو شادی کے بعد ہی پشاور شفٹ ہو گئے تھے۔ منگنی ٹوٹنے کے تین ماہ بعد عدن کی شادی اپنے کسی امریکہ میں مقیم کزن کے ساتھ ہو گئی اور وہ امریکہ چلی گئی۔ احد کو اپنی جاب کے سلسلے میں اسلام آباد جانا پڑا۔ عدن اور احد کے جانے کے بعد ثانیہ دوبارہ مجھ سے کبھی نہیں ملی اور اب کچھ عرصہ پہلے نایاب اور جنید کی بھی شادی ہو گئی ہے جنید اور زرین کراچی کے دو مختلف کالجز میں بطور لیکچرر تعینات ہو گئے ہیں۔ زرین نے اپنی منگنی پر مجھے انوائیٹ کیا تھا۔ وہیں میں نے اس سے تمہارے فادر کا فون نمبر لیا اور تمہارے بارے میں اور معلومات بھی حاصل کی تھیں۔"

وہ مسلسل بولتے بولتے ایک دم رک گیا۔ تھکا تھکا سا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ اس نے بھی ان دو سالوں میں لمبی مسافت کاٹی ہے۔ اس کے سفر میں بھی بہت سے کٹھن موڑ آئے ہیں۔

"اس آبلہ پائی کے سفر میں میں اکیلی تو نہیں رہی۔ کوئی اور بھی اس راستے پر برہنہ پا چلا ہے۔ صرف مجھے ہی زندگی نے اس انداز میں نہیں برتا' کسی اور کے دامن سے بھی بہت کچھ چھینا ہے لیکن شکوہ تو پھر بھی نہیں اس کے لبوں پہ۔" اس نے اپنی انگلیاں چٹخاتے ہوئے سوچا۔

سمعان کے انداز میں پھیلی بے چینی ظاہر کر رہی تھی کہ ابھی وہ بہت کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں پا رہا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر چلا جانا چاہتا تھا مگر اس کی ٹانگیں اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد وہ پھر گویا ہوا۔

"میں اپنی زندگی میں کبھی مایوس نہیں ہوا۔ میں نے اپنا ہر کام اللہ کے سپرد کر رکھا تھا۔ میرا اللہ کی ذات پر موجود یقین کبھی متزلزل نہیں ہوا جب سب کچھ میرے پاس تھا تب بھی یہ یقین میرے ساتھ رہا اور جب سب کچھ چھن گیا اس وقت بھی اسی یقین کی بدولت میں مایوس نہیں ہوا۔

میری عزیز از جان ماں کی وفات ہوئی میں مایوس یا بد دل نہیں ہوا کیونکہ میرے دامن میں بہت کچھ تھا۔

میرے فادر نے مجھے عاق کردیا' مجھ سے ہر تعلق توڑ دیا مجھے دکھ تو ہوا مگر میں پھر بھی مایوس نہیں ہوا۔

عدن نے مجھے بیچ منجدھار میں اکیلا چھوڑ دیا میں نے صبر سے یہ بھی جھیل لیا۔ میرے دامن سے ایک کے بعد ایک چیز غائب ہوتی گئی میں نے پروا نہیں کی میں نے صرف ایک چیز کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا اور وہ یہ یقین تھا کہ اللہ جو کرے گا بہتر کرے گا۔

میرے دوستوں نے رفتہ رفتہ مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ عدن امریکہ چلی گئی' سعد اور سارہ پشاور میں اپنی زندگی میں مگن ہو گئے۔ صرف نایاب اور جنید کے گھر میرا آنا جانا تھا۔ زرین تو کبھی کبھار ہی ملتا' چنانچہ میں اپنا فارغ وقت اکثر نایاب اور جنید کے ساتھ گزارتا۔ مجھے اکثر یہ محسوس ہوتا کہ نایاب کچھ ڈسٹرب ہے۔

ایک دن جنید کی غیر موجودگی میں میں نے ازراہ مذاق اس سے پوچھ لیا کہ اگر گھرداری ہی کرنی تھی تو ایم بی اے کس کے لیے کیا تھا؟ میری بات سن کر وہ پھٹ پڑی۔

"اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ کس کے لیے کیا ہے میں نے ایم بی اے۔" وہ رو رہی تھی پھر اس نے ایک دم ہی میرے آگے ہاتھ جوڑ لیے۔

"پلیز سمعان! یہاں سے چلے جاؤ اور آئندہ کبھی میرے گھر نہ آنا۔ مجھے اپنی پوری توجہ گھر اور شوہر کی جانب مبذول کرنے دو پلیز۔"

اس کی یہ بات سن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ یقین کرو عائشہ! اپنے بہت قریبی دوستوں کا ایسا سلوک برداشت کرنا بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔ میں نے یہ بھی کیا۔ صرف اس یقین کے سہارے کہ ابھی میں بالکل تہی دامن نہیں ہوا' ابھی کچھ ہے جو صرف میرا ہے۔

اک سال لگا تھا مجھے یہ جاننے میں کہ مجھے عدن سے محبت نہیں ہے۔ محبت وہ نہیں ہوتی جو آپ کو کسی کی خوبیوں سے ہو۔ محبت وہ ہوتی ہے جو خوبیوں اور خامیوں دونوں سے ہو۔ جو ہر رنگ میں باقی رہے ہر سال میں زندہ ہو وہی محبت ہوتی ہے۔

محبت وہ نہیں ہوتی جو کسی کے قریب ہونے پر محسوس ہو محبت وہ ہوتی ہے جو کسی کے بچھڑ جانے کے بعد اپنے وجود کا احساس دلائے۔

اور پھر ایک سال لگا مجھے یہ سمجھنے میں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔

میں نے پہلی فرصت میں تمہارے فادر کے پاس تمہارے لیے پرپوزل بھیجا تھا۔

میری فرم مجھے دو سال کی ٹریننگ کے لیے سعودیہ بھجوانا چاہ رہی تھی مگر میں نے ان سے دو' تین ماہ کی مہلت لے لی۔ تمہارے فادر نے کہا تھا کہ اس رشتے سے متعلق حتمی فیصلہ عائشہ خود کرے گی۔ یہ سن کر میں پریشان ہو گیا۔ میرا دل کہتا تھا کہ تم انکار کردو گی۔ میں تمہیں اسی انکار سے روکنے کے لیے ایبٹ آباد چلا آیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں حقیقت بتا کر تمہیں راضی کرلوں گا۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ میں نے ایک بار پھر دیر کردی ہے۔"

تشکر کے جذبات سے عائشہ کے آنسو نکل پڑے تھے۔ اللہ نے اسے ہر اس شے سے نواز دیا جس کی اس نے کبھی خواہش کی تھی۔

میرے اختیار میں کیا نہیں' مجھے اس طرح سے نواز دے یوں دعائیں میری قبول ہوں کہ میرے لب پہ کوئی دعا نہ ہو

اس نے دھیرے سے آنکھیں کھول کے دور جاتے ہوئے اس شخص کو دیکھا جو اپنی دانست میں سب کچھ ہار کے جا رہا تھا۔ اس کی تھکی تھکی سی چال دیکھ کر وہ بے ساختہ ہی مسکرائی۔

ابھی اسے بھاگ کر اس شخص کے پیچھے جانا تھا۔ اسے تنہا سفر سے بچانا تھا۔ اسے یہ بتانا تھا کہ اللہ نے تمہارے یقین کی لاج رکھ لی ہے' اس نے تمہیں وہ دے دیا جس کی تم نے سچے دل سے خواہش کی اور جو کچھ مجھے اس نے دیا ہے وہ تو بتایا یا سمجھایا نہیں جا سکتا۔

وہ اپنا پرس اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ سمعان کے پیچھے چلتے ہوئے اسے اپنے اردگرد کچھ دکھائی نہ دیا تھا۔

لیکن اگر وہ دو سال پہلے والی عائشہ ہوتی تو یقیناً اپنے پیچھے کھڑی تقدیر کو دیکھ لیتی' جس کے لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔ صرف مسکراہٹ۔

❋

سکینہ رئیل

میں نے جلدی جلدی میاں صاحب کے لانڈری سے دھلے کپڑوں پر دوبارہ استری کی' ادھر ادھر پڑی ادر سلہ اور شمائل کی چیزیں سمیٹیں اور باہر کی راہ لی کہ ابھی کچن میں بہت سے کام باقی تھے۔ گھر کی صفائی سے تو میں علی الصبح ہی نمٹ گئی تھی۔ اماں جان کے بڑے کمرے میں سفید چاندنی بچھا کر گاؤ تکیوں اور کشنوں پر مخملیں غلاف چڑھا دیے تھے اور ایک طرف ایرانی قالین کو بطور مسند بچھوا دیا تھا۔ اگر دان میں اگر بتیاں بھی لگا دی تھیں البتہ انہیں سلگایا نہ تھا ماچس بھی ڈبیا ان کے قریب دھر دیا تھا تاکہ عین وقت پر جلدی سے اگر بتیاں سلگا دوں۔ پانی کا جگ جگ پوش سے ڈھک کر ٹرے میں دو عدد گلاسوں کے ساتھ وہیں سیپاروں کے پاس میز کے قریب رکھ دیا تھا اور کمرے کا دروازہ مضبوطی سے بند کر دیا تھا کہ بچے وغیرہ گھس کر خراب نہ کریں۔

باہر دالان کی صفائی کے بعد وہاں کرسیاں ترتیب سے رکھ دی تھیں تاکہ جو کوئی بیٹھنا چاہے ان پر بیٹھ جائے۔ ساتھ ساتھ کچن سے ملحق چھوٹے کمرے میں ناشتے پانی کا بندوبست کرنے کے واسطے وہاں کی بھی صفائی کروا دی تھی۔ اب صرف کچن کو دیکھنا تھا۔ برتن نکالنے تھے۔ سموسے' دہی بڑے' کیلے' ٹکی اور پھولوں کی چاٹ کا پہلے سے بندوبست کر رکھا تھا۔ سب سامان تیار رکھا تھا صرف مجھے دہی بڑوں کی پھلکیاں تلنا تھیں اسی لیے لشتم پشتم باورچی خانے میں چلی آئی۔ یہ سارا اہتمام اس لیے تھا کہ آج اماں جان نے گھر میں درس کا اہتمام کیا تھا اور محلے داروں کے علاوہ عزیز و اقارب کو بھی مدعو کیا تھا سال میں ایک بار وہ ضرور درس کا اہتمام کیا کرتی تھیں اور ہر بار یہ قصد کرتی تھیں کہ اب ہر مہینے ہی اس کا اہتمام کریں گی مگر یہ ارادہ محض ارادہ ہی رہ جاتا تھا۔

دوپہر کا ایک بج گیا تھا مہمان آنے ہی والے تھے میں نے دہی بڑوں کی پھلکیوں کے آمیزے کو ہاتھ سے اچھی طرح پھینٹ کر تلنے کی ابتدا کرنا چاہی مگر اسی وقت میاں صاحب کی پکار نے روک دیا۔ ہاتھوں کو پیالے کے کناروں سے رگڑ کر صاف کر کے میں یونہی اندر چلی آئی۔

"ارے بھئی! کہاں غائب ہو' یہ کپڑے دیکھ رہی ہو بٹن بھی ٹوٹا ہوا ہے اور شلوار میں کمربند بھی نہیں ہے۔" اپنی کوتاہی پر میں شرمسار ہو گئی۔

"میں ابھی کر دیتی ہوں دراصل وقت کم رہ گیا ہے نا' ابھی خواتین آتی ہی ہوں گی اس لیے۔" میں وضاحت پورے طور پر نہ دے پائی۔

"نہ جانے یہ کیا سوجھتی ہے اماں جان کو' درس کی محفل ہوتی ہے یا فیشن شو' ہر عورت میک اپ سے لپی پتی ایک سے ایک کپڑے پہن کر خود کو نمایاں کر رہی ہوتی ہے۔" انہوں نے کلف زدہ کرتا پہنتے ہوئے تبصرہ کیا اور ان کے تبصرے سے میں انکاری نہیں ہو سکتی تھی کہ اس میں کچھ غلط بھی نہ تھا۔ عورتیں بہت تیار ہو کر آتی تھیں اور پھر میری یہ عادت ہے کہ میں بہت جلدی اپنی غلطی تسلیم کر لیتی ہوں اور اس کا اعتراف بھی کر لیتی ہوں۔ بعض ہٹ دھرم ذہنیت کی طرح اپنی غلط بات پر اڑیل گھوڑے کی طرح نہیں اڑی رہتی

جیسا کہ آج کل عام ہو گیا ہے اپنے آپ کو منوانے کے لیے جانے کہاں کہاں کا فلسفہ گھڑا جاتا ہے کون کون سی مثالیں دی جاتی ہیں کہ بندہ قائل نہیں ہوتا تو کم از کم بدظن ضرور ہو جاتا ہے۔

"رہنے دو' تمہارے ہاتھ بھی خراب ہیں میں خود کر لوں گا۔" از راہ عنایت انہوں نے میری جاں بخشی کی۔

"درس لینے سب آ جاتے ہیں اور عمل' عمل سے دور دور تک کا بھی واسطہ نہیں ہوتا' خالی خولی کلاس اٹینڈ کی جاتی ہے' ضیافت اڑائی جاتی ہے مگر اپنی حرکتوں سے کوئی باز نہیں آتا۔" وہ بڑبڑا رہے تھے وہ خانم آنٹی آئیں گی۔ اپنی وہی وضع قطع وہی حرکتیں اسی طرح بے پردہ' بے مہار ہو کر گھر سے نکل جائیں گی' یہ نہیں معلوم کہ درس کی محفل میں آنے کا مقصد کیا ہے بھئی! یہی ہے کہ سیکھو مگر یہاں سیکھنا تو در کنار سمجھتا ہی کوئی نہیں۔" وہ تو بھرے بیٹھے تھے جبکہ سب جانتے ہیں کہ عورت پر پردہ لازم ہے مگر پھر بھی نصیر ماموں کی بیٹیاں تو ہر حد پار کر رہی ہیں۔" انہیں سخت غصہ آ رہا تھا میں فرمانبردار بیوی کی طرح وہیں کھڑی تھی۔ "تم جاؤ' اپنا کام کرو خوامخواہ میرا وقت خراب ہوا' اتنی دیر ہو گئی ان کی فضول قسم کی ناشتے کی خریداری پر۔" انہوں نے مزید غصے سے کنگھے کو جھٹک کر نکالا۔ "کم از کم بال تو نکال دیا کرو بھئی!" وہ جھنجھلا کر بولے مگر میں دروازے سے باہر نکل چکی تھی اس لیے وضاحت نہ کی کہ ابھی کچھ دیر پہلے آپ کی بہن نوشابہ کنگھا کر کے گئی ہے۔

❋ ❋ ❋

شادی کے بعد سے میں بہت پُرسکون زندگی گزار رہی ہوں میرے بڑوں نے نصیحتوں کا جو پلندہ میرے ساتھ کیا تھا اس پر میں جی جان سے عمل کر رہی تھی۔ یعنی میاں صاحب کی "جی حضوری" کر رہی تھی اور اسی میں عافیت بھی ہے۔

شروع دنوں میں تو چین کی بانسری بجی کہ میں بہت فرض شناس تھی۔ امور خانہ داری میں نے خوش دلی سے قبول کیے اور بنا ماتھے پر شکن لائے ہر کام سرانجام دینے لگی' ساس نے جو یہ جان فشانی کا مظاہرہ دیکھا تو فوراً ہی کھٹیا پر چڑھ کر بیٹھ گئیں اور ہر آئے گئے سے بہو کی تعریفوں کے پل باندھ دیے میں بھی خوشی سے پھولی نہ سمائی اتنی زبردست پذیرائی جو ملی تھی نندیں تھیں تو وہ بھی مجھ پر پروانہ وار نثار تھیں۔ ہر دو دن بعد "بھائی کی محبت" میں دوڑی چلی آتیں اور میرے ہاتھ کے کھانے تو انہیں اتنے پسند تھے کہ دونوں چٹوریوں ندیدیوں کی طرح ٹوٹ پڑتیں اور یوں معلوم ہوتا کہ اب رکابی نوالی کہ ٹوٹی میں بھی ان کی محبتوں میں سرشار تندہی سے کام میں جتی رہتی۔ ابھی چھولوں کی چاٹ بنا کر کھلا رہی ہوتی تو ابھی سموسے تل کر مزے کروا رہی ہوتی پھر روز کی ہانڈی کو بھی الگ سے دیکھنا ہوتا تھا۔ خیال تھا کہ اس جان فشانی اور لگن کے بڑے اچھے اثرات مرتب ہوں گے اور پھر سنا بھی یہی ہے کہ جیسا کرو ویسا بھرو۔ لیکن شاید یہ بات عام لوگوں پر تو صادق آتی ہو مگر سسرال والوں پر یہ مقولہ صادق نہیں آتا۔ سسرال کے لیے اسے ہم ایسے کہہ سکتے ہیں کہ "جیسا کرو الٹا بھرو۔" سو یہی کچھ میرے ساتھ ہوا۔ جب خود پر پڑی اور ارسلہ کی آمد آمد ہوئی تو برے حال کے باوجود مجھ غریب ہی کو کچن میں جھانکنا پڑتا۔ روز مرہ کے کام اسی طرح نمٹانے پڑتے اور نندیں مزے سے بیٹھی فلمیں دیکھتیں یا سلائی مشین سنبھال لیتیں تب اندر ہی اندر غصہ کا لاوا ابلنے لگتا مگر دل کو یہی کہہ کر تسلی دیتی کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔

ادھر میاں صاحب تھے کہ جن کے نخرے ہی ختم نہ ہو رہے تھے۔ بھلا اتنی ذمہ داریوں اور ناتواں حالت میں ان کی دل داری اور خدمت کے فرائض میں کیسے انجام دیتی۔ ادھر ارسلہ کی آمد ہوئی اور پھر اگلے سال شمائل بھی چلی آئی۔ گھربار اور بچوں کو سنبھالنے میں' میں ادھ موئی ہو گئی مگر میاں صاحب چاہتے تھے کہ میں اب بھی ایک پیر پر کھڑی ان کی خدمت کرتی رہوں لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ بس اسی بات پر جھڑپ ہو گئی۔

"میرے سامنے زبان نہ چلاؤ۔ شوہر سے بدتمیزی کرو گی تو دوہرا گناہ ملے گا۔" انہوں نے مجھے ڈانٹا اور میری زبان کو بریک لگ گئے کیونکہ وہ صحیح کہہ رہے تھے اور ویسے بھی میں بلا تامل اپنی غلطی تسلیم کر لیتی تھی سو چپ ہو گئی مگر ساتھ ساتھ آنسو رواں ہو گئے۔

"بات سنو ان حربوں سے میں گھائل نہیں ہوں گا۔" انہوں نے مجھے ٹھیک ٹھاک طریقے سے سنا دیا۔ مجھے سخت صدمہ ہوا پچھلے کئی سالوں کی رفاقت' اطاعت اور خدمت کا یہ انعام؟ بہت ملال ہوا مگر پھر اچھی بی بی کی طرح یہ غم بھی پی گئی۔

حضرت' جمعہ کی نماز کا بہت اہتمام کرتے تھے۔ سفید کلف دار کپڑے پہن کر' خصوصی کڑھائی والی ٹوپی پہن کر اور خوشبویات میں خود کو بسا کر نماز پڑھنے جاتے تھے۔ اس دن شامت کی مار کہ جلدی میں' میں نے سرمئی رنگ کا سوٹ نکال کر استری کر دیا۔ ساتھ ساتھ تمام اشیائے ضرورت بھی رکھ دیں ٹوپی' رومال' عطر وغیرہ وغیرہ مگر اس دن گھر میں وہ بھونچال آیا کہ میرا دل لرز لرز اٹھا۔

"ارے کم عقل عورت! یہ کپڑے کیوں نکالے۔" وہ طیش میں تھے۔

"یہ بھی تو کپڑے ہی ہیں اور دھلے ہوئے پاک صاف کپڑے ہیں۔" میں نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

"سفید کپڑے پہن کر نماز جمعہ ادا کرنا اور پھر عطر وغیرہ لگانا یہ سب سنت ہے سنت۔" انہوں نے دانت پیس کر مجھے جتایا جھٹکے سے الماری کھولی اور سفید کپڑے میرے آگے ڈال دیے۔

"ذرا جلدی جلدی ہاتھ چلا کر استری کر دو مجھے نادر شاہی حکم ملا اور خود ناخن تراش سے ناخن تراشنے شروع کر دیے۔ میں جل کر خاک ہو گئی۔

"میں تو اماں جان کے لیے چولہے پر دلیہ رکھ کر آئی ہوں' جل جائے گا" اور شمائل بھی گود سے نہیں اتر رہی۔" میں اپنی جان تک سے بیزار تھی۔

"پھر جواب دیا تم نے شوہر کی نافرمانی سے جانتی ہو کتنا عذاب ہوتا ہے' قیامت کے دن زیادہ عورتیں دوزخ میں اسی لیے ہوں گی کہ وہ شوہر کی نافرمان اور

ناشکری ہوتی ہیں۔" انہوں نے ڈانٹنے کے انداز میں سبق پڑھایا۔ میں ایک بار پھر قائل ہو گئی۔ بسورتی شمائل کو نیچے اتارا اور خود لگ گئی سرتاج کی اطاعت گزاری میں۔

ان ہی دنوں ایک غلغلہ سا اٹھا۔ ان کی فرم کے چوکیدار نے دوسری شادی کی ٹھانی اماں جان کی معاملہ فہمی اور نیک اطوار کا دور دور تک شہرہ تھا اس کی بیوی روتی دھوتی ان کے پیروں میں آپڑی۔

"اسے منع کر دیں اماں جی! نہ کرے وہ شادی اب میں اس کا ہر کہنا مانوں گی۔ اماں جی اسے منع کر دیں۔" وہ دہائی دے رہی تھی اماں جان نے اسی شام "ان" کی خبر لے لی۔

"یہ کیا تماشا ہو رہا ہے؟ وہ بے چاری یہاں تک پہنچ گئی روتے دھوتے' تم کچھ کرو اس چوکیدار کی خبر لو اسے ڈراؤ دھمکاؤ تاکہ وہ اس عمل سے باز رہے" اماں جان نے مشورہ دیا۔

"کیا کروں مذہب کا معاملہ ہے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔" حد درجہ عاجزی سے بولے۔

"اس کیا مطلب؟" وہ سمجھی نہیں۔

"بھئی! وہ کوئی غلط کام تو نہیں کر رہا نا۔ صرف دوسری شادی کر رہا ہے۔ سنت کے مطابق کام کر رہا ہے جائز طریقے سے۔" وہ سمجھانے لگے۔

"ہائے نوج! اس کے وسائل ہوں یا نہ ہوں شادی کی پڑی ہے۔ کل کو دوسری بیوی روتی پیٹتی یہاں آئی کہ گزارا نہیں ہو رہا تنخواہ بڑھاؤ پھر کیا کرو گے؟" اماں جان نے لے لیے اور وہ سوچ میں پڑ گئے بعد میں معلوم ہوا کہ چوکیدار کی دوسری شادی ٹل گئی مگر کیسے؟ یہ نہ معلوم ہو سکا مارے تجسس کے ان ہی سے دریافت کر لیا جواب میں بڑی کڑی نظروں سے گھورا۔

"یہ جو تم عورتوں کی کھوج لگانے کی ٹوہ لینے کی عادت ہے یہ بہت بری ہے' ہر ایک کی ذاتی زندگی میں گھستے ہوئے انہوں نے مجھے تنبیہ کی اور میں ہمیشہ کی طرح شرمندہ ہو گئی۔

اس دن شمائل کو بہت تیز بخار تھا اماں جان پڑوس میں گئی ہوئی تھیں کھانا تو جیسے تیسے کر کے پکایا مگر نہ صفائی ہو سکی اور نہ سرتاج کے روزمرہ کے کام نمٹائے نہ ان کے نہانے کے لیے پانی گرم کر سکی' کپڑے نکالے نہ تولیہ لٹکایا اور نہ ہی جوتے پالش کر کے رکھے۔ اس بے ترتیبی پر بڑے ناراض ہوئے۔

"بھئی' شمائل نے بہت تنگ کیا ہوا ہے آپ خود ہی اپنے جوتے پالش کر لیں۔" میں سخت بیزار تھی پچھلے ایک گھنٹہ سے میں اس کے سر پر پٹیاں رکھ رہی تھی۔

"کیا مذاق ہے یہ۔ میں جوتے پالش کروں؟" وہ بے یقینی سے بولے۔

"ظاہر ہے! اب کوئی اور تو کرنے سے رہا۔ میں اسی لاپروا انداز میں بولی۔

"بہت خوب دن بہ دن نافرمان ہوتی جا رہی ہو۔ اب اتنا بھی نہیں جانتیں کہ شوہر کے کسی کام کو انکار کرنے کی کیا سزا ہوتی ہے۔" وہ حسب عادت شروع ہو گئے۔

"اچھا ذرا الماری سے اپنے کپڑے تو نکال لیں۔" میں شمائل کی طرف سے بہت پریشان تھی اس لیے بے اختیار ان سے کہہ دیا۔

"کیا کہا میں کپڑے نکالوں؟" وہ بے یقینی سے بولے "تم میری بیوی ہو اور میرا ہر کام کرنا تمہارا فرض ہے سمجھیں۔" انہوں نے سخت غصے سے کہا۔

"مگر ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنا ہر کام خود کر لیتے تھے۔ اپنے جوتے خود گانٹھتے تھے' اپنے کپڑے خود مرمت کرتے تھے اور دوسروں کی مدد بھی آگے بڑھ کر کرتے تھے میں تو پھر بھی آپ کی بیوی ہوں۔ اب آپ کی سنت کہاں گئی؟" کتنے برسوں کا لاوا بے اختیار ابل کر باہر آ گیا اور زبان سے سچ پھسل گیا۔ انہوں نے بہت کینہ توز نظروں سے مجھے دیکھا مگر اس کا کوئی جواب ان کے پاس نہ تھا سو کھسیا کر باہر کو چل دیے مگر اب مجھے ذرا بھی شرمندگی نہ ہوئی کہ اتنا کہنا تو میرا حق بنتا تھا۔ جب وہ اپنے سارے کام مذہب کو سامنے رکھ کر سیدھے کر سکتے تھے تو میں بھی تو انہیں آئینہ دکھا سکتی تھی۔

✿

فائزہ افتخار

نصرت آرا المعروف نصرت آپا سبزی کی ٹوکری اٹھائے ڈھیلے قدموں کے ساتھ اپنے گھر کے پرانے سے زنگ آلود گیٹ کی جانب بڑھ رہی تھیں ویسے وہ خاصی چاق وچوبند خاتون تھیں مگر شدت کی سردی نے ان کے جوڑوں کی تکلیف کو بڑھا دیا تھا اور وہ ایسے موسم میں چلنے پھرنے میں خاصی دشواری محسوس کیا کرتی تھیں مگر کیا کیا جائے برسوں پرانی عادت کا' ہمیشہ سے گھر کی معمولی سے معمولی خریداری خود کرنے کی عادی تھیں اب اگرچہ گھر کے مکینوں کے ساتھ ساتھ ان کی ذمہ داریاں بھی رخصت ہو چکی تھیں اس کے باوجود ان کی اکیلی جان کے بھی کچھ تقاضے تو بہرحال تھے ہی جن کو پورا کرنے کے لیے انہیں ہفتہ میں ایک بار گھر کے نزدیک والی مارکیٹ تک جانا پڑتا تھا۔ اور ان کے کرائے دار اعظم بھائی کی بیگم بڑی خوش اخلاق سے ان کی تکلیف کے پیش نظر انہیں آفر بھی کر دیتی تھیں۔

"آپا مجھے بتا دیجئے کیا لانا ہے۔ اپنی خریداری کے ساتھ آپ کی بھی کر لوں گی۔"

مگر وہ منع کر دیتیں بھلے چلنے پھرنے میں کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو ہفتے میں ایک بار اس خریداری سے انہیں یہ احساس تو ہوتا تھا کہ وہ اب بھی گھر بار والی ہیں۔

"آج بھی وہ اعظم بھائی اور ان کی بیگم کے ساتھ ان کی پرانی ٹوکسی میں بیٹھ کے گئی تھیں وہ بھرے پرے کنبے والے تھے ماشاء اللہ لمبی چوڑی خریداری

مکمل ناول

تھی۔ ان کے سبزیوں کے بھاؤ تاؤ کرنے میں ہی نصرت تایا اپنی لکھی فہرست میں سے تمام خرید چکی تھیں۔

نصرت آپا نے ان کا انتظار کرنے کے بجائے خود ہی گھر کی راہ لی۔ یہاں سے گھر کا فاصلہ اتنا کم بھی نہ تھا کہ وہ با آسانی پیدل چل سکتیں اور اتنا زیادہ بھی نہ تھا کہ وہ اسٹاپ سے ویگن پکڑ لیتیں۔

ناچار وہ پیدل ہی چلنے لگیں۔ وہ تو اللہ بھلا کرے مقصود صاحب کا چھوٹا لڑکا اسکوٹر سے گزرتا دکھائی دیا تو انہوں نے ہاتھ دے کر روک لیا۔ مقصود صاحب کا گھر ان سے پہلے والی گلی کے آخری نکڑ پر ہی تھا۔ یوں وہ بغیر کسی تکلیف کے وہاں تک تو پہنچ گئیں۔ سبزی کی ٹوکری اور تھیلا اٹھائے جس میں مختلف دالیں، چاول، چینی، تیل وغیرہ تھا۔

گیٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر خود ہی لاک کھولا اور زنگ آلود زنگ زدہ گیٹ چیں چیں کی زبردست آواز کے ساتھ دھکیل کے اندر داخل ہونے کو تھیں کہ گیٹ کے ساتھ لگے مختصر سے لیٹر بکس میں سے کچھ جھلک نظر آنے پہ تھم گئیں۔ سبزی کی ٹوکری اور تھیلا زمین پہ رکھتے ہوئے بے تابی سے انہوں نے لیٹر بکس میں ہاتھ ڈالا۔ تین لفافوں میں سے دو پہ ان کا نام لکھا تھا۔

"گڈو بیٹے! یہ تھیلا اور ٹوکری تو ذرا اندر رکھتے جاؤ۔"

اعظم بھائی کے سب سے چھوٹے بیٹے کو انہوں نے آواز دے کر بلایا جو گلی میں کرکٹ کھیل رہا تھا۔

"اور یہ خط بھی اندر اپنے کسی بڑے کو دے دو، تمہارے ابا کے نام ہے۔"

تیسرا لفافہ اسے تھماتے ہوئے وہ اپنے نام آئے دونوں خط الٹ پلٹ کر دیکھنے لگیں۔ حالانکہ جانتی تھیں کہ یہ کس نے بھیجے ہوں گے۔ ایک کے پیچھے رضوانہ بشیر سرگودھا اور دوسرے کے پیچھے کلثوم علی ابو لکھا تھا۔ رضوانہ کا خط تو دوسرے تیسرے مہینے آ ہی جایا کرتا تھا مگر کلثوم نے ان آٹھ سالوں میں گنے چنے خط ہی لکھے تھے۔ وہ ہر مہینے ایک فون کر لیا کرتی تھی یا پھر عید پر اپنے اور میاں کی جانب سے مشترکہ کارڈ اور چند گنے چنے خط بھی خاص مواقع پہ آئے تھے۔ جالی کا دروازہ کھول کر اندر جاتے ہوئے ان کا بس نہ چل رہا تھا دونوں لفافے ابھی کھول ڈالیں۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ دونوں بہنوں کے خط انہیں اکٹھے موصول ہوئے تھے۔

"تایا! دودھ والا دودھ دے گیا تھا، میں نے ابال دے کر دھیمی آنچ پہ چڑھا رکھا ہے ذرا دیکھ لیجئے گا۔"

اعظم بھائی کی بڑی لڑکی نے ہاتھ میں کپڑوں کا ڈھیر اٹھائے گزرتے ہوئے اندر جھانک کر اطلاع دی۔

نصرت آپا نے کلثوم کی شادی کے فوراً بعد مکان کا اوپر والا حصہ کرائے پہ اٹھا دیا تھا۔ تب سے اعظم بھائی اور ان کا گھرانہ ان کا خیال رکھتا تھا۔ خود آپا بھی انہیں ہر ممکن سہولت دیتی تھیں۔ ان کے بچے بلا روک ٹوک نیچے مختصر سے صحن میں کھیلتے اور سائیکل چلاتے رہتے۔ ان کے گھر ڈرائیر نہیں تھا۔ آپا کے کہنے پہ ہی سردیوں میں اعظم بھائی کی بیگم یا بیٹی کپڑے دھونے کے بعد نیچے برآمدے میں رکھے ان کے ڈرائیر میں سکھانے لے جاتی تھیں۔ شاید اس وقت بھی رفعت یہی کام کر رہی تھی۔

"شکریہ بیٹی!"

وہ واقعی ممنون ہو گئیں۔ جانتی تھیں کہ رفعت اگر دودھ ابالنے ان کے کچن تک گئی ہو گی تو ضرور چند اور کام بھی سنوار آئی ہو گی۔ وہ ایسی ہی تیز دست، سمجھ دار اور احساس کرنے والی تھی۔ ان کا اندازہ درست تھا۔ ناشتے کے چند برتن جو وہ منگل بازار جانے کی جلدی میں یونہی چھوڑ گئی تھیں۔ انڈے والی پلیٹ، فرائی پین، چائے کا کپ اور کیتلی سب دھلے رکھے تھے۔ چولہا صاف کیا گیا تھا اور دو تین روز کا آٹا بھی رفعت گوندھ گئی تھی۔

سردی میں باہر سے ہو کر آنے کے بعد چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ انہوں نے کیتلی میں پانی ڈال کر چولہے پہ چڑھایا اور ٹوکری میں سے پیاز، آلو، مٹر، ٹماٹر، گاجر اور گوبھی کا پھول نکال کر فریج میں رکھنے لگیں۔ ایک پاؤ قیمہ اور آدھ کلو مرغی کے بھی دو حصے کر کے فریزر کے [illegible] ڈبے میں انہیں ایک اور خیال آیا۔

"سردیوں کی چھٹیوں میں ہو سکتا ہے رضوانہ نے بچوں سمیت لاہور آنے کا پروگرام بنایا ہو۔ اسی کی اطلاع دینے کو خط لکھا ہو۔ اور میں یہ پاؤ بھر قیمہ اور ذرا سی سبزی اٹھا لائی۔ اب کہیں دوبارہ نہ چکر لگانا پڑے بازار کا۔"

وہ ایک بار پھر خط پڑھنے کو بے چین ہو گئیں۔ دیگر سامان والا تھیلا انہوں نے جوں کا توں رہنے دیا۔ چائے مگ میں ڈال کر اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگیں۔

"آپا! امی کہہ رہی ہیں۔ آج دوپہر میں مولی کے پراٹھے بنیں گے، آپ کچھ نہ پکائیں، بالکل بھیج دیں گی۔"

اتنے میں گڈو رفعت کا پیغام دے گیا تو وہ اور ہلکی پھلکی ہو گئیں کہ اب اپنی اکیلی جان کے لیے دوپہر کے کھانے کے تردد سے بھی بے فکر ہو کے سکون سے خط پڑھیں گی اور جواب لکھیں گی۔

* * *

نصرت آپا یوں تو سب ہی کے لیے آپا تھیں مگر رضوانہ اور کلثوم کی وہ سچ مچ کی آپا جان تھیں۔ بارہ برس کی تھیں نصرت آرا اور رضوانہ سات برس کی جب اماں کلثوم کو جنم دیتے ہی گزر گئیں۔ ابا کے معاشی حالات اس قدر دگرگوں تھے کہ لوگوں کے دباؤ ڈالنے کے باوجود وہ دوسری شادی پہ تیار نہ ہوئے۔

"یہ تین بچیاں ہی پڑھا لکھا کے بیاہ دوں تو بڑی بات ہے، دوسری شادی کر کے ایک اور عورت اور مزید بچوں کا خرچا اٹھانے کی مجھ میں سکت نہیں۔ ویسے بھی نصرت بڑی ہو رہی ہے، وہ کیا سوچے گی؟ رہی منی کو سنبھالنے کی بات تو اماں ابھی موجود ہیں، نصرت بھی سیانی ہے، سنبھال لے گی بہن کو۔"

انہوں نے اتنے یقین سے کہا کہ نصرت آرا نے اس یقین کو پورا کرنے کے لیے کمر کس لی۔ کچھ یہ احساس تشکر بھی تھا کہ ابا نے انہیں سوتیلی ماں کے شر سے محفوظ رکھا سو وہ ہر ممکن کوشش کرنے لگیں ابا کو سکون پہنچانے کی۔ دادی کا نحیف و نزار وجود بس پلنگ پہ بیٹھے بیٹھے ہدایتیں دینے کے قابل تھا۔ نصرت نے ان ہدایتوں سے مقدور بھر فائدہ اٹھایا اور گھر کا بوجھ اپنے ناتواں کندھوں پہ اٹھا لیا۔ جیسے تیسے آٹھویں پاس کی اور گھر بیٹھ گئیں۔

رضوانہ پہ البتہ خوب سختی رکھی کہ وہ پڑھائی کے معاملے میں لاپروا تھی۔ پھر بھی کھینچ تان کے اسے میٹرک تک ہی پڑھا سکیں۔ کلثوم پڑھائی میں تیز تھی۔ ہر سال نمایاں نمبروں سے پاس ہوتی۔ نصرت نے رضوانہ کو سلائی کڑھائی سکھانے والے ادارے میں ڈال دیا تاکہ کسی ہنر میں تو وہ طاق ہو۔

یہ وہ دن تھے جب نصرت آرا کے لیے خاندان اور خاندان سے باہر رشتوں کی بھرمار تھی۔ شکل و صورت کی تینوں بہنیں اچھی تھیں اور نصرت کے سلیقے سگھڑاپے کا تو یوں بھی شہرہ تھا کہ چھوٹی عمر میں گھربار سنبھالے بیٹھی تھی۔ ابا کے حالات بھی اب بہتر تھے۔ اب تو ان کا ذاتی مکان بھی تھا۔ ابا نے اس کی شادی کا ارادہ کر لیا۔

دادی کو گزرے کئی سال ہو چکے تھے مگر ان کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے نصرت آرا نے سیانی بچیوں کی طرح خود ہی بڑے والے ٹرنک میں اپنے جہیز کے لیے کئی چھوٹی بڑی چیزیں تیار کر رکھی تھیں۔ ہاتھ سے کڑھے بیڈ کور، ٹمکرائے گئے پردے، رضائی کے غلاف، چند قیمتی ریشمی جوڑے وغیرہ۔ رضوانہ کی پڑھائی ختم ہونے کے بعد اس نے رفتہ رفتہ اسے گھر کے کاموں میں فعال کر دیا تھا اور اب اگر وہ بیاہ کر رخصت ہو جاتیں تو ان کی جگہ وہ با آسانی سنبھال سکتی

تھی۔ لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے' ایک حادثے میں ابا جان گنوا بیٹھے۔ وہ تینوں بھری دنیا میں اکیلی رہ گئیں۔

چند مطلب پرست رشتے دار مکان اور دکان کے لالچ میں ان کے سر پہ ہاتھ رکھنے کو آگے بڑھے مگر بہت کم عمری میں دنیاداری سیکھ جانے والی نصرت آرا ان کی نیت بھانپ گئیں اور طریقے سبھاؤ سے معاملہ نمٹایا۔ جانتی تھیں ایسے وقت میں ان طوطا چشم رشتے داروں کا سہارا ابھی غنیمت ہے بجائے اس کے کہ ان سے لڑ جھگڑ کے اس سہارے کو بھی گنوایا جائے' یہ بہتر ہوگا کہ کوئی محفوظ حکمت عملی اپنائی جائے' نصرت آرا نے دکان کرائے پہ اٹھادی۔ ابا کا اسکوٹر بیچ دیا' اس رقم سے کچھ شیئرز خرید لیے۔ خود رضوانہ کے ساتھ مل کر گھر پہ کڑھائی سلائی کا کام کرنے لگیں۔ اگرچہ دکان کا کرایہ گزارے کے لیے کافی تھا مگر نصرت آرا جانتی تھیں کہ تین لڑکیوں والے گھر میں کیا کیا انتظامات ہونے چاہئیں سو ہر ممکن طریقے سے بچت کی جاتی اور کفایت شعاری سے بچائی جانے والی رقم سے وہ زیور اور جہیز کا دوسرا سامان بنا بنا کے رکھنے لگیں۔

ابا کی وفات کے تین ساڑھے تین برس بعد ہی انھوں نے رضوانہ کی شادی سرگودھا کے ایک زمین دار گھرانے میں کردی۔

اس رشتے کا قصہ بھی عجیب تھا۔ تایا کے قرابت دار لوگ تھے یعنی ایک ہی ذات برادری تھی۔ ابا کی زندگی میں ہی ان کے ہاں سے نصرت آرا کے لیے پیام آیا اور وہ جانتی تھیں کہ ابا اس بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں خاندان کے دیگر بزرگوں سے مشورہ ہوچکا تھا بس باضابطہ ہاں' ہونے کی دیر تھی۔ ان کے بعد نصرت نے خود ہی تایا کے ذریعے انکار کہلوا بھیجا۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کی شادی کے بعد الہڑ اور سادہ سی رضوانہ چھوٹی بہن اور گھر کی ذمہ داری تنہا نہیں اٹھا پائے گی۔ انھوں نے خاندان میں ہی کہیں اور رشتہ طے کروا لیکن شاید یہ گھرانہ اور خود نصرت کے اطوار ان لوگوں کو زیادہ ہی بھائے تھے اس لیے تین سال بعد وہ اپنے دوسرے بیٹے کے لیے پھر دست سوال دراز کر بیٹھے۔

اب خاندان والوں کی طرف سے بھی دباؤ پڑنے لگا لیکن نصرت کبھی سادہ مزاج اور قدرے احمق سی رضوانہ کو دیکھتیں اور کبھی نویں جماعت میں پڑھنے والی کم سن کلثوم کو جسے ڈاکٹر بننے کی خواہش تھی۔ کچھ سوچ کر انھوں نے رضوانہ کا نام لے دیا' ویسے بھی اب اس کی بھی تو شادی کی عمر تھی۔ اکیسواں پار کررہی تھی۔

رضوانہ کی شادی کے بعد نصرت آرا پہ اخراجات کا بوجھ مزید بڑھا۔ رضوانہ کی شادی ہوجانے کے بعد اب سلائی کڑھائی کا کام بھی ان اکیلی جان کو کرنا پڑتا تھا۔ گھر کی ذمہ داری بھی وہ تنہا ہی اٹھائے ہوئے تھیں۔ ایک کام بھی کلثوم کو نہ کہتیں کہ اس کی پڑھائی کا حرج نہ ہو۔ ان کی نظر بھی کمزور ہوچکی تھی۔

آخر ایک طریقہ سوچا جس میں محنت کم اور آمدنی زیادہ تھی۔ انھوں نے گھر کا صرف ایک کمرہ اور اسٹور اپنے استعمال کے لیے رکھ لیا تھا' دونوں کمروں کو سلائی کڑھائی سکھانے والے ادارے کی شکل دے دی۔ وہ پورے علاقے میں عزت و احترام سے جانی جاتی تھیں۔ لوگ ان کے ہنر کے بھی معترف تھے' فیس بھی کم تھی اس لیے لوگ اپنی بیٹیاں جوق در جوق بھیجنے لگے۔

کلثوم کو انھوں نے اکیڈمی میں ٹیوشن بھی لگوا کے دی۔ کالج کے لیے بھی وہ اسٹاپ تک اسے چڑھا کے آتیں اور بس کے آنے سے پہلے ہی اسٹاپ پر جا کھڑی ہوتیں وہ کلثوم کے حسن سے بھی خائف تھیں اور زمانے سے بھی خوفزدہ۔ شام کو خود رکشے میں جاکر اکیڈمی چھوڑ کے آتیں اور واپس بھی لاتیں۔ اس کا خرچا الگ۔ مگر اس کے باوجود ایف ایس سی کے رزلٹ میں چند نمبروں کے فرق سے وہ میڈیکل میں داخلہ نہ لے سکی۔

نصرت آرا نے بہت سمجھایا کہ وہ اگلے سال پھر امتحان دے سکتی ہے یا بی ایس سی کرلے۔ مگر وہ ایک اور ضد پہ اڑ گئی۔ اس کی ایک دوست کے نمبر اس سے

بھی کم تھے مگر اسے ایبٹ آباد میں داخلہ مل گیا تھا۔ کلثوم بھی وہاں پڑھائی کرنا چاہتی تھی مگر نصرت اس کے ہوسٹل میں رہنے کے حق میں نہیں تھیں۔ اتنی دور کے شہر میں اسے اکیلا بھیجنے کا ان میں ذرا حوصلہ نہیں تھا۔ لیکن کلثوم نے اس بات کو دل سے لگالیا اور احتجاجاً پڑھائی چھوڑ کے گھر بیٹھ گئی۔ یہ ڈیڑھ سال نصرت آرا پر بہت مشکل گزرا سب سے چھوٹی اور لاڈلی بہن کو مناتے مناتے وہ ہارنے لگیں۔ نہ اس کی ضد پوری کرسکتی تھیں نہ اس کی ناراضی سہہ سکتی تھیں۔

ڈیڑھ دو سال تک ضد باندھے رکھنے کے بعد اچانک اس کے دل میں انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کرنے کا سودا سمایا۔ اب وہ ڈاکٹر کے بجائے لیکچرر بننا چاہتی تھی اور یوں اس نے بی ایس سی کے بجائے بی اے میں داخلہ لے لیا۔ نصرت آرا بہت جھنجلائیں کہ ایسے ہی فضول میں دو سال ضائع ہوگئے۔

اب نصرت اپنی عمر کی تین دہائیاں ختم کرکے چوتھی پر گامزن تھیں۔ اگرچہ چونتیس پینتیس سال اتنی زیادہ عمر بھی نہیں مگر وقت سے پہلے ذمہ داریوں کا بوجھ' کڑی مشقت اور پریشانیوں نے انھیں تیس سال کی عمر میں ہی چالیس کا ظاہر کرنا شروع کردیا۔ نظر کی عینک تو کب ہی لگ چکی تھی اور رہے بال تو وہ بھی نظر کی کمزوری کی وجہ سے چھبیس سال کی عمر میں ہی ڈائی کرنے شروع کردیے تھے اور اب تو تنگ آکر کتنا کتنا عرصہ ایسے ہی چھوڑے رکھتیں۔ ایسے میں اگر ان کے بجائے بیس اکیس سالہ کلثوم کے لیے رشتہ آنے شروع ہوگئے تو ایسی تعجب کی بات بھی نہیں تھی۔

بی اے نمایاں کامیابی سے پاس کرنے کے بعد کلثوم نے ابھی ابھی یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔

ایم اے کا پہلا سال تھا اور وہ پوری تندہی کے ساتھ پڑھائی میں مگن تھی جب اس کے لیے آئے ایک رشتے پہ نصرت آرا بری طرح مچل گئیں۔ لڑکا باہر تھا۔ نہ صرف وہ بلکہ اس کا بڑا بھائی بھی اپنی فیملی کے ساتھ برسوں سے وہاں مقیم تھا اور آج ملی کل چھوٹنے والی بے اعتباری ملازمتوں کے بجائے دونوں بھائی وہاں اپنا ذاتی کاروبار برابر کی شراکت داری میں چلا رہے تھے' ابوظہبی میں ہی ذاتی مکان بھی تھا۔ لڑکا خوبرو بھی تھا۔ نصرت آرا نے جس لاڈ اور پیار سے پرورش کرکے کلثوم کے اندر ضد اور ہٹ دھرمی کے جراثیم پروان چڑھائے تھے' ان کے پیش نظر یہ رشتہ ہر لحاظ سے بہت اچھا تھا۔ یوں بھی کلثوم کو شادی کے بعد احمد علی کے ساتھ ابوظہبی جانا تھا' اس لیے جہیز کی لمبی چوڑی تیاری بھی کرنا ضروری نہ تھا۔

اس نے لاکھ احتجاج کیا' ہاتھ پیر پٹخے مگر اس معاملے میں نصرت آرا نے اس کی ایک نہ سنی اور اس کی شادی احمد علی سے کردی۔ وہ جانتی تھیں کہ ایم اے کرنا کلثوم کا جنون بن چکا ہے لیکن وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ ایسے رشتے روز روز نہیں ملتے۔ رضوانہ کے مشورے سے ہی انھوں نے کلثوم کی شادی کی تاریخ پکی کرتے ہی اوپر

کی منزل پر کمرے بنوانے شروع کردیے' یہ وہ رقم تھی جو وہ سالوں سے پائی پائی جمع کرکے کلثوم کے جہیز کے فرنیچر' کراکری اور مشینری کے لیے الگ کررہی تھیں اللہ کے فضل سے ایسا رشتہ مل گیا تو انہوں نے اس رقم کو مکان کے اوپر والے پورشن کی تعمیر میں لگوادیا۔ اور کلثوم کی شادی کے فوراً" بعد اس پورشن کو کرائے پہ اٹھوادیا۔

اعظم بھائی شریف النفس درمیانے درجے کے سرکاری افسر تھے۔ دیانت داری سے فرائض ادا کرتے ہوئے سفید پوشی سے کنبہ پال رہے تھے جن میں ان کی خوش مزاج شریک حیات شکیلہ کے علاوہ پانچ بچے تھے۔ سب سے بڑی بیٹی رفعت تھی۔ پھر دو بیٹے' ایک بیٹی اور سب سے چھوٹا گڈو جو اس وقت گود میں تھا۔ اب تو ماشاء اللہ نو دس برس کا ہورہا تھا۔ رفعت بی۔ اے کے بعد گھر بیٹھی تھی' اس سے چھوٹے دونوں اب بالترتیب ایف ایس سی اور میٹرک کے اسٹوڈنٹس تھے اور ان سے چھوٹی دوسری بہن ربیعہ آٹھویں کلاس میں تھی' اسے دیکھ کر اکثر نصرت آرا کو کلثوم کا لڑکپن یاد آجاتا۔

* * *

گرم گرم چائے کا مگ سائیڈ ٹیبل پہ رکھ کے نصرت آرا نے کمبل ٹانگوں تک پھیلایا اور بیڈ پہ نیم دراز ہو کے عینک درست کرتے ہوئے خط پڑھنے لگیں' پہلا خط رضوانہ کا تھا اس کی مخصوص بے ڈھب اور جلدی جلدی لکھی گئی تحریر سے سجا۔ وہ خط کے اوراق گن کر مسکرادیں۔ پورے نو صفحے تھے۔

پیاری آپا!

السلام علیکم!

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ یہاں بھی آپ کی دعاؤں سے خیریت ہی ہے۔

انیلا ماشاء اللہ سے کالج میں آگئی ہے اس کی فکر ذرا کم ہوئی تو اب زعیم کی فکر لگ گئی ہے۔ اس سال اس نے میٹرک کا امتحان دینا ہے۔ انیلا تو پھر خاصی ہوشیار تھی' بس اتنا دھیان رکھنا پڑتا تھا کہ میں غیر ضروری طور پہ گھر سے باہر نہ رہوں تاکہ اس پہ کسی کام کا بوجھ نہ پڑے اور اس کی پڑھائی کا حرج نہ ہو۔ اور پھر آپ کو تو پتہ ہے کہ ہمارے گھر میں ماشاء اللہ سے لوگوں کا کتنا آنا جانا ہے' ہر وقت مہمان داری' کوئی نہ کوئی تقریب' کسی کا عقیقہ' کسی کی منگنی' کسی کا چہلم یہ لمبی چوڑی برادری بھی کبھی کبھی رحمت کے بجائے زحمت لگنے لگتی ہے۔ بندہ تعلقات نبھائے یا بچوں پہ توجہ دے؟ اور زعیم تو ہے بھی کھلنڈرا اور لاپروا۔ باپ کی سختی سے مارے باندھے پڑھ لیتا ہے ورنہ میری ڈانٹ ڈپٹ کو تو کسی خاطر میں نہیں لاتا۔ دادی اور پھوپھیوں کے لاڈ نے بگاڑ کر کے رکھ دیا ہے۔ بھئی اکلوتا ہے تو کیا ہمیں ماں باپ ہو کر احساس نہیں' ظاہر ہے میری بھی آنکھ کا تارا اور باپ کے دل کی ٹھنڈک ہے' لیکن کیا لاڈ کر کر کے تباہ کروا لیں؟

میں نے بشیر صاحب سے کہہ دیا کہ بس بہت ہوگیا اماں کا احترام اپنی جگہ مگر لاڈ کے حوالے سے ان پہ اور بھی فرائض ہیں' ملک کے لیے تاؤ میں بیٹے کو بے لگام مت کریں۔ سو آج کل خاصی سختی جاری ہے زعیم پہ' میرا تو گھر سے نکلنا محال ہے کہ کہیں زعیم ٹیوٹر کے آنے سے پہلے گھر سے غائب نہ ہوجائے' چھت پہ پتنگیں لے کر نہ چڑھ جائے یا بیٹ تھام کے گلی میں نہ نکل جائے۔

ایک تو یہاں کا ماحول۔ توبہ۔ بشیر صاحب سے کب سے کہہ رہی ہوں کہ سرگودھا نہیں چھوڑنا نہ سہی کم از کم یہ محلہ تو چھوڑیں۔ ایک سے ایک اجڈ اور جاہل رہتا ہے یہاں۔ لیکن وہ ان مردوں میں سے ہیں جو بیوی کے معقول مشوروں پہ بھی عمل کرنا مردانگی کی توہین جانتے ہیں' وہ بھی کیا کریں ان کی تربیت ہی ایسے اصولوں پہ ہوئی ہے۔ بس آپا! کچھ نہ پوچھیں یہ زمینداروں' جاگیرداروں کی بیوی بن کے ان چھوٹے پسماندہ قصبوں میں زندگی گزارنا اور وہ بھی بھرے پرے سسرال میں۔ کس قدر مشکل ہے۔

ارادہ تھا اس سال بقرعید آپ کے ساتھ کروں گی مگر زعیم کی وجہ سے ایک بار پھر یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔ اب تو وہ خیریت کے ساتھ میٹرک پاس کرلے تو پھر آؤں گی۔ آپ دعا کیجئے گا آپا!

دونوں چھوٹیاں بھی بہن کی طرح پڑھائی میں تیز ہیں میں تو سب میں بیٹھ کے صاف کہتی ہوں کہ میری لڑکیاں اپنی خالہ پہ گئی ہیں' ابھی اپنی کلثوم پہ ورنہ ان کے ددھیال میں بھلا کہاں ایسا ذوق شوق ہے پڑھائی کا۔ لڑکیاں تو خیر مڈل تک نہیں کرپاتیں۔ میری انیلا پہلی ہے جو کالج تک گئی ہے۔ لیکن کیا فائدہ آپا جب بیٹا ہی نکما ہو۔ زعیم کے رنگ ڈھنگ دیکھ کے مجھے ذرا امید نہیں۔ خیر اللہ سبب کرے گا۔ دعا تو بہت کرتی ہوں' پہلوانیلا کی طرح فرسٹ ڈویژن نہ سہی' ایسی پاس ہی کرلے' خالی بی۔ اے بھی کسی طرح کرلیا تو شکر ادا کروں گی۔

بیٹیاں کتنی بھی لائق فائق کیوں نہ ہوں' آپ ان کی کامیابی پہ خوش ضرور ہوسکتے ہیں' فخر نہیں کرسکتے۔ یہ تو بیٹے ہوتے ہیں جو فخر سے سر اونچا کرسکتے ہیں جیسا کہ آج کل ہمارے جیٹھ صاحب کا ہوا ہے۔ ان کا راحیل خیر سے ڈاکٹری پاس کرگیا ہے۔ آپ نے تو دیکھا ہوا ہے۔ وہیں لاہور میں ہاسٹل میں رہتا تھا میں آپ کی طرف وہنے گئی تھی تو مجھ سے ملنے گھر بھی آیا تھا۔ اب تو اس کی ہاؤس جاب بھی ختم ہوگئی ہے اور ساتھ ہی نوکری بھی مل گئی ہے۔ بس یہی بات کرنے کے لیے آپ کو خط لکھا ہے۔ دراصل آپ سے پہلے مشورہ لیے بغیر میں نے یہ بات اپنے جیٹھ صاحب سے کرلی۔ اس لیے ذرا ہچکچا رہی تھی کہ نجانے آپ کیا سوچیں' کیا فیصلہ کریں۔ لیکن اب تو آپ ہی میرا میکہ ہیں' میری عزت ہیں۔

اپنے میکے کا مان کرتے ہوئے ہی میں نے سب کے درمیان بیٹھ کے راحیل سے کہہ دیا کہ ابھی اسے کرائے کا گھر لینے کی ضرورت نہیں' نوکری کرے گا یا گھر کی ذمہ داری نبھائے گا' وہیں میری آپا کے ہاں رہ لینا' دراصل آپا میں آپ سے پوچھے بغیر کبھی اس سے یہ نہ کہتی مگر میری بڑی والی نند نے اس روز میرا خاصا جی جلایا ہوا تھا۔ آپ کو تو پتہ ہے کہ ان کے گھرانے میں برادری میں رشتہ کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے خصوصاً" بیٹیاں تو اپنوں کو ہی دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے مجھے اپنی انیلا کے لیے پورے خاندان میں راحیل کے علاوہ اور کوئی مناسب لڑکا نظر نہیں آتا۔ کب سے دل میں یہی خیال لیے بیٹھی ہوں اس لیے اپنی جٹھانی کے انتقال کے بعد میں نے راحیل کو خاص توجہ سے پالا ہے۔ اور اب جب وہ ڈاکٹر بن گیا ہے تو میری چاروں نندوں نے اس پہ حق جتانا شروع کردیا ہے۔ تب کہاں تھیں یہ چار کی چار پھوپھیاں جب بن ماں کا بچہ راتوں کو سسکتا رہتا تھا اور میں اپنے ننھے ننھے بچے چھوڑ کے اسے بہلانے جاتی تھی۔

اس روز بھی بڑھ چڑھ کے لاڈ جتا رہی تھیں جیسے اس کے اکیلے رہنے کی فکر سے ان کی نیندیں حرام ہورہی ہوں۔ بس میں نے بھی فوراً" کہہ دیا کہ اپنی چاچی کے ہوتے ہوئے وہ کیوں کسی پریشانی کا شکار ہونے لگا۔ میں نے سارا انتظام کر رکھا ہے۔ آپا سے کہہ کر اس کے ٹھہرنے کا سارا بندوبست کرادیا ہے۔ اسے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس آرام سے اپنا کام کرے۔ میں نے ٹھیک کہا نا آپا؟

اب ڈاکٹری کرنا آسان کام تو نہیں اور نئی نئی نوکری میں تو محنت بھی زیادہ کرنی پڑتی ہے وہ بے چارہ کرائے کا گھر لے تو لیتا پھر ملازم بھی رکھنے پڑتے۔ خرچا ہی بڑھتا۔ ہاں خرچا تو آپ کا بھی بڑھے گا اور یقیناً" کام بھی۔ آپ کو اکیلے رہنے کی عادت ہوچکی ہے ایسے میں ایک اور جان کی ذمہ داری مگر پیاری آپا! میری خاطر کچھ عرصہ یہ برداشت کرلیں۔ ابھی تو میری انیلا محض سولہ برس کی ہے۔ اور تین سالوں تک اسے بیاہ دوں گی پھر راحیل کو الگ گھر لینا ہی پڑے گا تب تک آپ میری خاطر آپا! تین سال گزرتے بھلا کیا دیر لگے گی۔

رہا کھانا کاج اور خرچے کا سوال تو خیر خرچے کی آپ کو پروا کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ہر ماہ آپ کو کچھ رقم چپکے سے بھجوادیا کروں گی' آپ کسی کو پتہ نہ لگنے دیجئے گا بس یہ ظاہر ہونا چاہیے کہ آپ کھلے دل سے

راحیل کی مہمانداری کر رہی ہیں۔ سسرال میں میرے میکے کا رعب پڑنا چاہیے۔ ایک کل وقتی ملازمہ بھی رکھ لیجئے گا۔ پندرہ سو یا دو ہزار تک میں آسانی سے مل جائے گی' راحیل کے کمرے کی صفائی اور کپڑوں کی دھلائی وغیرہ کرلے گی۔

ویسے راحیل بہت سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ آپ کے لیے کسی پریشانی کا باعث نہیں بنے گا۔ آپ نے بھی مل کر اندازہ تو لگایا ہوگا۔ اب اسے کسی اور نظر سے دیکھئے گا یعنی آپ انیلا کے ہونے والے شوہر کی حیثیت سے اور ویسا ہی برتاؤ بھی رکھیے گا جیسا کہ دامادوں کے ساتھ رکھتے ہیں۔ آخر انیلا آپ کی بھی بیٹی ہے۔

اور سنائیے' آپ کے جوڑوں کا درد کیسا ہے؟ علاج باقاعدگی سے کرواتی رہیے۔ اب اس عمر میں کوئی نہ کوئی روگ تو لگا ہی رہتا ہے۔ مجھے دیکھئے عمر میں آپ سے پانچ چھ سال چھوٹی ہوں مگر بلڈ پریشر نے زندگی کا ہر مزا ختم کرکے رکھ دیا ہے۔ پرہیزوں نے جان عذاب میں ڈال رکھی ہے۔ نمک کم کھاتا ہے' تلی ہوئی چیز نہیں کھا سکتی' اچار چکھ نہیں سکتی۔ اس سال بھی رمضان میں ساری افطاری رو کھی گزاریں' اپنے بہتر کے لیے کڑاہیاں بھر بھر پکوڑے اور جلیبیاں تلیں مگر خود پہ حرام تھیں۔

ہائے کیا بتائیں کہتی ہوں کس کام کا اتنا پیسہ کہ انسان ٹیپ ٹاپ سے رہ نہ سکے۔ لاہور اور کراچی جیسے بڑے شہروں میں رہتے تو ہم بھی ٹھاٹھ سے خانساماں رکھتے حالانکہ یہاں سرگودھا میں بھی بعض جاننے والوں کے ہاں تو ذرا ذرا سے کام کے لیے نوکر رکھے دیکھے ہیں لیکن میرے سسرال کا وہی لگا بندھا ماحول' اپنا پینڈو پن چھوڑنے کو تیار نہیں۔ صفائی' دھلائی وغیرہ کے لیے تو نوکرانیاں ہیں' تندور پہ روٹی لگانے کے لیے مائی بھی ہے لیکن پھر بھی دن کے اٹھارہ گھنٹے چولہے کے آگے گزرتے ہیں' یہ بھی ہماری ساس کا فرمان ہے کہ آٹا گھر کی عورت کے ہاتھ سے گندھے تو برکت رہتی ہے۔ اتنے بڑے سائز کی پیتل کی پرات میں دن میں دو بار کئی کئی سیر آٹا خود گوندھتی ہوں۔ چائے کا تو پوچھو ہی مت' کوئی حساب کتاب نہیں۔ ہر وقت دیگچہ کڑھتا رہتا ہے۔ پوری پوری دیگیں سالن کی چڑھتی ہیں۔

اب تو برداشت کا مادہ ہی نہیں رہا۔ شروع کے کئی سال اس آس میں گزار دیے کہ کبھی تو وقت بدلے گا' کبھی تو نئے تقاضوں کے تحت اس گھر کا ماحول بھی تبدیل ہوگا مگر اب تو یہ امید بھی نہیں رہی۔ پتہ نہیں آپا' آپ نے کیا سوچ کر میری شادی کی۔ اب شادی کے سترہ سالوں بعد یہ بحث کرنا بھی عجیب لگتا ہے' جو ہونا تھا ہو گیا' مگر میں انیلا کے معاملے میں ایسا نہیں کروں گی۔ سب جانچ پرکھ کے ہی اتنی منصوبہ بندی کر رہی ہوں۔

جیٹھ صاحب کئی سالوں سے تنہا ہیں یعنی راحیل کی کوئی ماں تو بیٹھی نہیں (ہماری ساس کی طرح) جس کی جذباتی دھمکیوں میں اگر وہ اس قصبہ نما شہر کے اس بوسیدہ مکان سے چمٹا رہے۔ ماشاء اللہ پڑھا لکھا ہے' ڈاکٹر ہے' ایک عمر لاہور میں گزاری ہے' نوکری بھی وہیں ہے' ظاہر ہے شادی کے بعد بیوی کو بھی وہیں رکھے گا۔ نہ ساس' نہ نند' نہ دیورانی' نہ جٹھانی' الگ گھر میں میری انیلا کا راج ہوگا۔ ماں کی طرح سارا سارا دن ڈوئی نہ چھیلنی پڑے گی نہ ہی بارات بھر لوگوں کے لیے آٹا گوندھنا پڑے گا۔

اور کیا کہوں' دل تو میرا اتنا بہت کرتا ہے آپ سے ملنے کو مگر گھرداری کے یہ مستقل عذاب جان چھوڑیں تو نکل پاؤں۔ سوچا تھا بچے بڑے ہو جائیں گے تو ہفتہ ہفتہ بھر رہنے جایا کروں گی آپا کے پاس۔ بچوں کا تو مسئلہ نہیں' جتنا بڑا مسئلہ بچوں کے ابا اور خود ان کی اماں ہیں۔ اماں کے پاس تو مجھے میکے جانے سے روکنے کے ایک سے ایک مضبوط بہانے ہیں جو سترہ سالوں سے کم ہی نہیں ہو پا رہے۔ کبھی اناج تلوانا ہے' کبھی کسی نہ کسی نند کی زچگی متوقع ہوتی ہے اس کے لیے پنجیری بنانا ہے' کبھی گیہوں پسوا کے گودام میں رکھوانا ہے تو کبھی اپنی نگرانی میں آنے والے جاڑے کے لیے لحافوں اور گدوں میں روئی دھنکوا کے بھروانی ہے۔ زمینداری کیا خاک ہوں' نگران ہوں اس سبلن زدہ کمروں والی حویلی کی۔ جس کے صدیوں پرانے طور طریقے ابھی جان نہیں بخش رہے۔

اتنی کوشش کرتی ہوں کہ ذرا جدید اور نئے ڈھنگ سے واقفیت کراؤں ان کی مگر یہ اپنا پینڈو پن ترک کرنے پہ تیار نہیں ہوتے۔ پھوپھیاں آتی ہیں تو میری ابا اور شہلا وغیرہ کے کپڑے دیکھ دیکھ حیران ہوتی ہیں تو میں خود درزن کو پاس بٹھا کے سلوائی ہوں۔ پچھلے سب میں نے بیٹھک میں شہر کے سلے سلائے پردے لگائے تو بڑی باتیں کیں سب نے اب سب ہی اپنے کمروں میں یہ پردے لگوا رہے ہیں۔

میں نے جبتر صاحب سے کمرہ کرائے پہ لگوایا تو سب نے اسے میرا نخرہ اور پیسے کی بربادی کہا' وہ کر میاں گزری نہیں کہ اب ان ہی تک کے کمرے میں اے سی لگ گیا ہے۔ دل سے بھلے معترف ہوں گے مگر زبان سے ہمیشہ اختلاف کرتے ہیں سارے کے سارے۔ بل میں اندر سے احساس کمتری کے مارے ہوئے ہیں۔ خود اپنے چک سے نکل کر زیادہ سے زیادہ سرگودھا' جھنگ وغیرہ تک ہو آتے ہیں' بھولا لاہور ان کی تو کھلا گئے۔

راحیل کو کہیں ان جیسا نہ سمجھئے گا' وہ آٹھ سال لاہور کے کالج پڑھا ہے۔ ذرا کمرے کو ٹھیک ٹھاک حالت میں کروا دیجئے گا اور کھانے وغیرہ پہ بھی اہتمام رکھیے گا۔ پردے بھی نئے لگوا دیجئے گا۔ آپ بھلا اس عمر میں اپنی بہو کہاں دیکھتی ہوں گی' وہ بھی اسی کے کمرے میں رکھوا لیجئے گا۔ یہ نہ ہو کہ بوریت کا بہانہ بنا کر وہ جلدی کہیں اور چل دے۔ سمجھا کریں' زمانہ نازک ہے' ادھر ادھر کرائے کے مکانوں میں بے روک ٹوک آزادانہ رہنے سے کوئی اور نظر میں نہ آجائے۔ اکیلے لڑکے کا کیا بھروسا اور آج کل تو لوگ بھی تاک لگائے بیٹھے ہوتے ہیں لڑکا گھیرنے کو۔ دوسری بات یہ کہ میں اپنے سسرال والوں کو رعب میں رکھنا چاہتی ہوں' اس لیے جیٹھ صاحب کو زیر بار کرکے تاکہ وہ خود انیلا کے لیے بات کریں۔

راحیل کے ہاتھ عمدہ کرنل باسمتی چاولوں کی ایک بوری بجھوا رہی ہوں۔ ہر سال اناج آنے پہ سوچتی ہوں بھیجنے کے بارے میں پھر خیال آتا ہے آپ اکیلی جان چاولوں کی من بوری کا آخر کیا کریں گی۔ چلو اب بھیج دیتی ہوں۔ راحیل بھی شوق سے کھاتا ہے۔ کافی عرصہ نکل جائے گا۔ دیسی گھی کا کنستر' پنیاں اور میوے والا گڑ بھی بجھواؤں گی۔ اپنا خیال رکھیے گا۔ اور راحیل کا بھی۔ اس ہفتے تک وہ انشاء اللہ لاہور آجائے گا۔

اور سنائیے' کلثوم کی کوئی خیر خبر ہے؟ مجھے تو وہ بھول کر بھی کبھی خط یا فون میں نہیں یاد کرتی۔ آپ کو تو پھر کبھی کبھی فون کرلیتی ہے اور کرنا بھی چاہیے' آپ نے اس کے لیے جو کیا وہ کم تو نہیں۔ ایسا اچھا رشتہ ڈھونڈا' آج اپنے گھر میں عیش کر رہی ہے۔ مزے سے ہر جھنجھٹ سے آزاد باہر کبھی ریالوں اور درہموں میں کھیل رہی ہے۔ اللہ سے دعا ہے' ہمیشہ خوش رہے' اس سے بھی زیادہ خوشحالی دیکھے۔

مگر اس سے بات ہو تو اتنا ضرور کہیے گا کہ دولت آنے پہ کوئی اس طرح اپنوں کو نہیں بھلا دیتا۔ آٹھ سال ہونے کو آئے' تم نے مڑ کے وطن کی جانب نہیں دیکھا جیسے ماں باپ کے ساتھ ساتھ بہنوں پہ بھی فاتحہ پڑھ کے گئی ہو۔ چلو تمہارے میاں کا تو یہاں کوئی پیچھے نہ رہا' ایک ہی بھائی وہ بھی ساتھ ہے' مگر تمہاری تو دو بہنیں ہیں' کبھی دولت کمانے کے چکر سے نکل کر ذرا ہمیں بھی مل جائے۔ ہم تو اس کے بچوں کو دیکھنے کو ترس گئے۔

ویسے سچ کہہ رہی ہوں' برا لگے گا۔ آپ کو بھی فون دو دن کرتی ہے یا آپ ایسے ہی بھرم رکھنے کو کہہ دیتی ہیں کہ عید شب برات پہ آپ کو فون کرلیتی ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو سچ بڑی بے مروت نکلی یہ کلثوم' ایسی بہن کے تو پیر دھو دھو کے پینے چاہئیں' اب مجھے دیکھ لیں' اگرچہ جلد بازی میں آپ نے بغیر سوچے سمجھے میری زندگی کا فیصلہ کر ڈالا صرف اور صرف اپنا بوجھ ہلکا کرنے کی خاطر پھر بھی میں نے ہزار ملال کے باوجود دل میں آپ کے لیے بغض نہیں رکھا اور اب بھی آپ کی عزت کرتی ہوں۔

خط کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا۔ اچھا اب اجازت دیجیے۔
آپ کی اپنی
رضوانہ بشیر۔"

خط تہ کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے نصرت آرا نے گہری سانس لی۔ ان کا دل عجیب سے احساسات میں گھرا ہوا تھا۔ خط میں اگرچہ ایسی کوئی خاص دل آزاری والی بات بھی نہ تھی، وہی سب تھا جو اکثر رضوانہ کے خطوں میں اور اس کی باتوں میں ہوا کرتا تھا، وہی اپنی زندگی سے بے اطمینانی اور ناشکری کا اظہار، ان سب کا الزام بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پہ آپا کو دینا اور کلثوم کے بارے میں رشک و حسد کا اظہار وغیرہ وغیرہ۔

ہمیشہ اپنے سسرالی ماحول اور بندشوں سے نالاں رہتی تھی۔ اسے اپنے شہری ہونے اور میٹرک پاس ہونے کا بڑا زعم تھا۔ اور اپنی بچیوں کی ذہانت و قابلیت پر غرور بھی۔ اگرچہ خوشحالی کی اس کے سسرال میں کمی نہ تھی۔ سب ہی زمین جائیداد والے تھے مگر سادہ طرزِ زندگی والے روایتی دیہاتی ذہنیت رکھنے والے لوگ۔ اتنے برسوں کے بعد بھی رضوانہ ان سے سمجھوتا کرنے میں ناکام تھی اور اس کی ذمہ دار وہ اپنی آپا کو ٹھہراتی تھی، جنھوں نے اپنے لیے آیا رشتہ اپنی جان چھڑانے کے لیے اس کے سر منڈھ دیا۔ حالانکہ اگر وہ چاہتی تو گزارا کرنا اتنا مشکل بھی نہیں تھا۔ کون سا وہ بہت ماڈرن یا کالج یونیورسٹی کی پڑھی ہوئی لڑکی تھی۔

اس کو اس پہ بھی شکر ادا کرنا چاہیے تھا کہ کہاں شادی سے پہلے ابا کے ساتھ مل کے لوگوں کے کپڑے سی کر اور چادریں کاڑھ کے گزارا کرنا پڑتا تھا اور اب کہاں اناج کے بورے کے بورے سمیٹتی اور چار چار ملازماؤں پہ حکم چلاتی۔ اتنے بڑے خاندان کی عملاً سربراہ ہے۔ میاں سونا ہے، بچوں کے نام جائیداد ہے، شوہر ذرا اکھڑ اور مزاج دار سہی مگر روپے پیسے کی کبھی کمی نہیں ہونے دی، فطرتاً بھی شریف ہے۔

ساس پرانے زمانوں کی عورتوں کی طرح نکتہ چیں اور حاکمیت پسند ضرور ہے مگر اسے خانہ دار عورت اور اکلوتی بہو (بڑی والی کو گزرے تو سالوں ہوئے) ہونے کے تمام تر اختیارات بھی سونپ دیے گئے ہیں۔

یہ باتیں جب بھی نصرت آرا کو موقع ملتا وہ رضوانہ کو ضرور سمجھاتیں مگر وہ اکتاہٹ بھرے انداز میں انھیں ٹوک دیتی۔

"بس کیجیے آپا! جس پہ گزرتی ہے اسے ہی پتہ ہوتا ہے اور آپ یہ سب نہیں کہیں گی تو اور کون کہے گا۔ ظاہر ہے آپ نے یہ رشتہ کرایا ہے آپ تو ضرور اسی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائیں گی مگر کیا فائدہ ان سب باتوں کا۔ میں بچی تو نہیں ہوں — جو بہل جاؤں گی۔ اور آپ کو فکر کس بات کی، کہا تو رہی ہوں کوئی سب چھوڑ چھاڑ آپ کے در پہ تو نہیں آ بیٹھوں گی۔ جانتی ہوں یتیم ہوں، نہ باپ نہ بھائی، اسی لیے سب سہہ رہی ہوں۔ صبر کے گھونٹ پی رہی ہوں۔"

اب تو نصرت آرا نے بھی اس سے سر پھوڑنا کم کر دیا تھا۔ ویسے بھی اس کا آنا کم کم ہی ہوتا۔ نند وغیرہ کے ساتھ خاندان کی کسی اہم تقریب، منگنی وغیرہ کی شاپنگ کے سلسلے میں سال دو سال بعد لاہور کا چکر لگتا۔ سوہا بازار (جیولر مارکیٹ)، انتی مارکیٹ اور گلی کے بانو بازار میں ہزاروں اڑاتے ہوئے وہ بھی زندگی کے رونے روتی رہتی اور نصرت ہر بار شرمندہ سی ہو جاتیں جیسے انھوں نے اس کی شادی کر کے کوئی جرم کر دیا ہو۔

"دو چار دن کی بات نہیں، پتہ نہیں کب تک یہ ہو گا۔ رضوانہ نے اپنے منہ سے تین سال کہا ہے۔ عجیب ہے یہ رضوانہ بھی۔ خود ہی فیصلہ کر لیا، مجھ سے پوچھتی تو سہی۔ بہن کے سسرال کا معاملہ ہے۔ حیثیت سے بڑھ کے مہمان داری کرنا ہو گی۔"

وہ ایسی الجھیں کہ وقتی طور پر کلثوم کا خط پڑھنا بھول گئیں۔ دل ہی دل میں خرچے اور اخراجات، حساب کتاب لگانے لگیں۔ بیس تاریخ تھی۔ ابھی مکمل گزارا کرائے کی کل رقم یعنی پانچ ہزار میں ہوتا تھا جو ان کے اخراجات کے لحاظ سے کافی زیادہ تھی۔ بھائی تنخواہ دار آدمی تھے اس لیے کرائے کی رقم میں کبھی دیر سویر نہ ہوئی تھی۔ مہینے کے آغاز میں ہی جب انھیں تنخواہ ملتی وہ آپا کو کرایہ ادا کر دیتے۔ بل وغیرہ ادا کرنے کی ذمہ داری بھی ان کی تھی۔

تنہائی کا شکار نصرت آرا کے دن کا ایک بڑا حصہ برآمدے میں بچھی چارپائی پہ بیٹھ کے تسبیح پڑھتے، محلے کی کسی نہ کسی بچی کو سلائی سکھاتے، سبزی بناتے یا یونہی بیٹھے گزرتا۔ جہاں ٹیوب لائٹ یا بلب کی مصنوعی روشنی کی قطعی ضرورت نہ تھی۔ چمکیلی دھوپ مغرب سے ذرا پہلے تک سارے برآمدے کو روشن رکھا کرتی۔ نصرت آرا اب باقاعدہ طور پہ سلائی نہیں کرتی تھیں، البتہ اگر آس پڑوس کی کوئی بچی شوق کے مارے آ جاتی تو وہ انکار نہ کرتیں مگر معاوضہ بھی نہ لیتیں۔

بلوں کی ادائیگی اور مہینے بھر کا سودا سلف خرید لانے کے بعد بھی ان کے پاس کچھ رقم بچ جاتی تھی۔ ابا کی وفات کے بعد جب نصرت آرا نے معاشی بوجھ اپنے کندھوں پہ اٹھایا، تب سے ہی انھیں رقم جوڑنے اور کمیٹیاں ڈالنے کی عادت پڑ گئی تھی، اب اس کی ضرورت تو نہ تھی مگر عادت سے مجبور وہ ایک ہزار اور پانچ سو والی دو کمیٹیاں ڈالے ہوئے تھیں۔ جن میں سے پانچ سو والی دو بار نکل چکی تھی، دونوں بار وہ بیس ہزار روپیہ انھوں نے بینک میں رکھوا دیا۔ وقتاً فوقتاً وہ اس میں سے ہزار ڈیڑھ نکال لیا کرتیں۔

ہمیشہ سے رضوانہ اور اس کے بچوں کے لیے عید کے جوڑے بھجوانا ان کا معمول تھا۔ کوئی ابو ظہبی سے آتا تو اس کے ہاتھ کلثوم اور اس کے بچوں کے لیے بھی کچھ سوغاتیں بھجوا دیتیں۔

بہت سی باتیں تھیں جن کو سوچ سوچ کر انھیں اب گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ ایک تو یہ کہ عرصہ ہوا تنہا رہنے کی عادی تھیں، اب ایک انجان بچے کے ساتھ برسوں رہنا انھیں پریشان کر رہا تھا کہ کہیں اس کی وجہ سے ان کے یا ان کی وجہ سے اس کے معمولات میں خلل نہ پیدا ہو۔ یہ خدشہ بھی تھا کہ رضوانہ جو امیدیں راحیل سے وابستہ کیے ہوئے ہے اگر خدانخواستہ وہ پوری نہ ہوئیں تو اس کا الزام ان پہ نہ آ جائے۔ دراز میں جائزہ لیا، سات آٹھ سو روپے پڑے تھے۔

ابھی کے لیے تو گزارا ہو جائے گا۔ اگلے مہینے دیکھوں گی اگر بہت ضرورت پڑی تو بینک سے نکال لوں گی ورنہ امید تو ہے اس میں گزارا ہو جائے گا۔ آخر اکیلا لڑکا ہے، کتنا کھا جائے گا؟ اور پھر رضوانہ بھی کچھ سامان بھیج تو رہی ہے، حلوہ، لڈو، پنجیری وغیرہ یعنی کچھ دن تک میٹھا تو بنانے سے چھٹی۔ چاول کا تھیلا بھی آ جائے گا۔ اس رقم سے کچھ پھل، گوشت، جیم، انڈے، بسکٹ اور ہاں آٹا بھی لے آؤں گی۔"

وہ شوگر کی مریضہ تھیں، جو بیسن اور باجرے کا ملا جلا خاص آٹا استعمال کرتی تھیں۔ کوئی آتا تو اس کے لیے خاص طور پہ گندم کا آٹا منگوا لیا جاتا۔ سارا حساب کتاب لگا کر وہ اب اسٹور میں رکھے بڑے ٹرنک سے نئی بیڈ شیٹ نکالنے جا رہی تھیں کہ بیڈ پہ رکھے دوسرے لفافے پر نظر پڑی۔ وہ ماتھے پہ ہاتھ مار کے رہ گئیں۔ کلثوم کا خط کھولنا تو وہ یکسر بھول ہی گئی تھیں۔ اسٹور جانے کا خیال مؤخر کرتے ہوئے وہ خط پڑھنے پھر سے بیٹھ گئیں۔

پیاری آپا!
السلام علیکم!

آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ عرصہ ہوا آپ نے کوئی خط نہیں لکھا، فکر مند ہو گئی تھی۔ ٹھیک ہے کہ میں بھی خط مہینوں بعد لکھ پاتی ہوں مگر ہر مہینے آپ کا خط پڑھنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ شاید آپ نے ناراضی میں خط نہ لکھا ہو کہ آپ کے پچھلے تین چار خطوں کا میں جواب نہیں دے سکی۔

کیا کرتی آپا، مصروفیت ہی اس قدر ہے، خط لکھنے کا وقت نہیں ملتا البتہ آپ کے خطوں کا انتظار لگا رہتا ہے۔ آپ تو فارغ ہی ہوتی ہیں، فرصت ہی فرصت، چاہیں تو ہر ہفتے خط لکھ بھیجیں مگر آپ نے بھی گزشتہ تین ماہ سے نہیں لکھا، شاید آپ کو اب یہ آخری ذمہ داری نبھانا بھی مشکل محسوس ہوتا ہے خیر آپ کی

مرضی۔ میرا فرض تھا کہ میں آپ کو اس کا احساس دلاؤں' سو کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر یہ خط لکھ رہی ہوں۔ سارا گھر سو رہا ہے' خود میں بھی دن بھر کی تھکی ہاری' صبح منہ اندھیرے کی جاگی ہوئی۔ اس وقت نیند سے بند ہوتی آنکھوں اور جوڑ جوڑ دکھتے ہاتھ پیروں کے ساتھ آپ کو خط لکھ رہی ہوں کہ دن کو تو میرے اپنے لیے منٹ بھر کا وقت ملنا دشوار ہوتا ہے' خط کیسے لکھتی۔

آپ کو اتنا کہا ہے کہ فون ہی لگوالیں' سہولت ہو جائے گی' آپ بے شک مت کریں (اگر خرچہ بڑھنے کا ڈر ہے) میں ہی کر لیا کروں گی لیکن آپ وہ بھی نہیں کرتیں' ہر مہینے ڈھائی سو روپے تک خرچنے آپ تیار نہیں۔ پتہ نہیں پیسے بچا کر آپ نے کیا کرنا ہے خود پہ بھی خرچ کرتی ہیں یا نہیں؟ پچھلی بار رضوانہ آپا کو فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ کچھ دن پہلے آپ سے مل کے آئی تھیں' یہ پچھلی عید کی بات ہے' اور ان سے پتہ چلا کہ آپ بے حد کمزور ہو گئی ہیں' شوگر بڑھ گئی ہے' بلڈ پریشر کم رہتا ہے اور ان سردیوں میں ایک نیا روگ بھی لگا لیا ہے' جوڑوں کی تکلیف کا ارے آپا! کوئی علاج وغیرہ بھی کرتی ہیں یا نہیں؟ کسی قابل ڈاکٹر کو دکھائیے گا' حکیموں وغیرہ کے چکر میں مت پھنسیے گا' پیسہ بچانے کی خاطر۔

رضوانہ آپا کہہ رہی تھیں کہ وہ آپ کو کسی نامی گرامی حکیم کا پتہ دے آئی ہیں۔ میں ان کے منہ پہ تو نہ کہہ سکی' بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے والی بات تھی مگر اسی وقت سوچ لیا تھا کہ آپا کو خط لکھوں گی تو صاف منع کر دوں گی' حکیموں کے پاس جانے کی قطعی ضرورت نہیں' دس روگ اور لگیں گے بس اتفاق کہ اس کے بعد خط لکھنے کا موقع ہی نہ ملا۔

اور سنائیے رضوانہ آپا کا اس کے بعد کوئی اور چکر لگا لاہور کا؟ ہاں بھئی ان کے مزے ہیں' لاہور کے ہمسائے میں رہتی ہیں' جب جی چاہا اپنی راحت بھائی تفریح کرنے آ گئیں' دل بھرا تو واپس اپنی حویلی میں چوہدرانی جی بن کے ٹھاٹھ کرنے چل پڑیں۔ ایک ہم ہیں جنہیں آپ نے اٹھا کے سات سمندر پار دے مارا۔ تاکہ خیر خبر پوچھنے تک کی زحمت سے بھی نجات ملے۔ بیمار ہوں' مر رہی ہوں' دکھی ہوں' کیسی حالت میں ہوں' کسی کو خبر نہیں ملتی۔ دکھ سکھ بانٹنا دور کنار حال پوچھنے والا بھی کوئی میسر نہیں۔ پردیس میں بچے پیدا کیے تو اکیلی نے ہی سنبھالے' ہاسپٹل سے ایک دن کا بچہ ساتھ لائی تھی اور ایک گھنٹہ بھی آرام نصیب نہیں ہوتا تھا۔ کون تھا جو کہتا تم لیٹو' آرام کرو' تکلیف میں ہو' گھر اور بچے کو میں دیکھ لیتی ہوں۔ سسرال نہ میکہ۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ شادی کے بعد میں قید بامشقت کاٹ رہی ہوں جس کی مدت نجانے کتنی باقی ہے۔

آپ نے کبھی نہ دیکھا نہ بھالا' نہ پوچھا نہ گچھا' سر سے ایک بوجھ کی طرح اتار پھینکا۔ دو ہی میرے خواب ٹوٹے۔ پہلے ڈاکٹر نہ بن سکی صرف آپ کی ضد کی وجہ سے' ہزاروں لڑکیاں ہاسٹلوں میں رہتی ہیں' آپ کی وہی بلکہ شکی طبیعت اب گھر میں بن باپ کی بچی تھی' بھائی نہ تھا تو کیا یہ میرا قصور تھا کہ مجھے تعلیم کا حق نہ ملا؟ ڈاکٹر نہ سہی' ماسٹرز کی ڈگری ہی لی ہوتی' آج اپنے پیروں پہ تو کھڑی ہوتی بجائے رات برتن جیسی گھس کر مانجھنے اور چولہے کے آگے کھڑے ہو کر کمر تختہ کرنے کے' چند گھنٹے کہیں پڑھا کے رقم کما رہی ہوتی۔ ایک سال رہتا تھا' کیا ہو جاتا آپ ایک اور سال مجھے جھیل لیتیں' میری زندگی بن جاتی۔ مگر افسوس۔

کبھی کبھی خیال آتا ہے' میں نے ناحق آپ کی بات مانی کر سنوی۔ خدا احترام اور عزت بھی کبھی کبھی آزار بن جاتا ہے۔ کرتی اپنی مرضی تو آج سکھی ہوتی۔ لیکن نہیں تو آپا آپ مجھے ایک سال اور آزادی کا دے کر بعد میں کہیں بھی بیاہ دیتیں' چاہے یہیں' مگر زندگی اتنی مشکل تو نہ ہوتی جس قدر آج ہے۔ علی کو تو بس پیسے سے غرض ہے' وہ میں پڑھا کر یا کوئی اور ملازمت کر کے لا دیتی' ہمارا تعلق نبھ ہی جاتا جیسے اب نبھ رہا ہے مگر اس نبھانے کے لیے میں کس طرح خود کو گلا سڑا رہی ہوں

اس کا تصور بھی آپ نہیں کر سکتیں۔

یہاں ابوظہبی میں ورکنگ عورتوں کے لیے بڑا باوقار اور منافع بخش روزگار سمجھا جاتا ہے۔ کاش میرے پاس ڈگری ہوتی تو صرف چند گھنٹے میں اس سے دگنا کما لیتی جتنا اب دن رات کی مشقت کے بعد کما پاتی ہوں۔ علی تو پھر غنیمت ہیں' ان کے بڑے بھائی جاوید تو مہا کنجوس ہیں' نوکروں کی تنخواہ بچانے کی خاطر معمولی سے معمولی کام بھی چاہتے ہیں کہ ہم ہی کر لیں۔ پچھلے کچھ سالوں سے ہوٹل کا کام بڑھتا جا رہا ہے' آمدنی بھی بڑھ گئی ہے اس کے باوجود مکمل اسٹاف نہیں رکھتے۔

جب سے میری جٹھانی کو ٹی بی ہوئی ہے' کام کا بوجھ مجھ پہ اور بھی بڑھ گیا ہے۔ اتنا نہیں ہوا کسی سے کہ ایک باورچی اور رکھ دیں۔ مجھ پر بڑا احسان کرتے ہوئے ہوٹل کے تندور پہ ایک پٹھان نان بائی رکھ دیا ہے' وہ بھی صرف اس لیے کہ مجھے نان لگانا نہیں آتے ورنہ بھابی کی گدی بھی مجھے سنبھالنا پڑتی۔

ہمارا گھر جس علاقے میں ہے وہاں زیادہ تر انڈین اور پاکستانی رہتے ہیں۔ پنجابی اور پٹھان پاکستانی تو کھانے پینے کے شوقین ہی ہوتے ہیں یہی حال سکھوں کا ہے۔ زیادہ تر چھڑے چھانٹ ہیں' یعنی ہوٹلوں پر گزارا کرنے والے۔ ایسے میں پاکستانی کھانے والا ہوٹل تو چلے گا ہی۔ اس ایریا میں دو تین اور ایسے ہوٹل ہیں جو سستے بھی ہیں اور اس کے باوجود کسی کا کام کم نہیں ہوتا۔ سب سے زیادہ رش صبح ہوتا ہے ناشتے پر مجھے صبح صبح اٹھ کر چھولے پکانا پڑتے ہیں' ایک کڑاہی میں حلوہ بھونتی ہوں' پائے کا دیگچہ تو ساری رات چولہے پہ ہوتا ہے۔ کئی کلو میدہ پوریوں کے لیے گوندھتی ہوں جو جاوید بھائی جان تلتے ہیں۔ علی کے ذمے حساب کتاب اور ہوٹل کی مینجمنٹ ہے' وہ ان کاموں سے بچے رہتے ہیں' لیکن جاوید بھائی جان بھی کبھی کبھی ان سے بھی بیگار لینے سے نہیں چوکتے۔

ناشتے سے ساڑھے دس تک فارغ ہوتی ہوں تو برتن دھونے کے لیے ملازم چھوکرے کے ساتھ خود لگنا پڑتا ہے۔ وہ اکیلا دس بارہ سال کا بچہ اور ڈھیر سے برتن۔ دوپہر کے کھانے پہ ہمارے ہوٹل میں خاص پاکستانی ڈشیں جیسے کڑھی' دال ماش فرائی' مکس سبزی' بھنڈی کی بھجیا اور چکن یا مٹن کا قورمہ ہوتا ہے' ساتھ ساتھ ان کی تیاری ہوتی ہے۔

کڑھی اور دال ہمیشہ جاوید بھائی جان تیار کرتے ہیں' ملتانی جو ہوئے اور وہاں کے خاص پکوان ہیں یہ۔ ان کے اور ان کی بیگم کے ہاتھ میں خالص سرائیکی ذائقہ ہے جو اچھا ہوا کہ علی کے ہاتھ میں نہیں اترا' اسی لیے ان کے بھائی انہیں چولہے سے دور ہی رکھتے ہیں۔ ایک لحاظ سے اچھا ہے کہ مجھے ایپرن باندھ کے ڈوئی اور چمچے ہلاتے مرد زہر لگتے ہیں۔ اپنے شوہر کو کڑھی کے پکوڑے تلتے یا دال کو تڑکا لگاتے دیکھ کر میں ہر روز صدمے سے فوت ہوا کرتی۔

ایک لحاظ سے برا ہے کہ ان کے حصے کا کام بھی مجھے کرنا پڑتا ہے۔ رات کی خاص ڈش سندھی بریانی جسے دم میں دیتی ہوں۔ البتہ گوشت میں دہی اور مسالے بھائی جان مکس کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ چپلی کباب ہیں جن کے لیے ایک افغانی رکھا ہوا ہے' وہ بس رات کو دو گھنٹے کے لیے آتا ہے اور حلیم ہے جسے طبیعت کی خرابی کے باوجود بھابی ہی پکایا کرتی ہیں۔ میں نے ایک آدھ بار پکائی مگر کئی دن بیمار رہی۔

مجھے تو ڈر ہے آپا کہ کسی دن میں بھی ٹی بی کا شکار نہ ہو جاؤں۔ گدھوں جتنی مشقت کرنا پڑتی ہے اور گھر کے کاموں اور بچوں کی ذمہ داری الگ۔ جو شخص اچھے بھلے چلتے کاروبار کے لیے دو ملازم اضافی رکھنے کا روادار نہ ہو اس سے یہ امید کیا رکھتی کہ وہ گھر کے کاموں میں مدد کے لیے نوکر رکھ کے دے گا۔ آپ مجھے دیکھیں تو پہچان نہ پائیں' اسی لیے پچھلے دو سال سے صرف بچوں کی تصویریں بھیج رہی ہوں۔ اپنی شکل ہی اس قابل نہیں رہی کہ فوٹو کھنچوا لوں۔ پیاز لہسن کاٹ کاٹ کر ہاتھ بھدے ہو چکے ہیں۔ دھواں کھا کھا کر رنگ دھوئیں جیسا ٹیالا ہو گیا ہے۔ نیند کی کمی سے آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے ہیں اور پریشانیوں اور بے سکونی نے ساری چربی گھلا دی ہے۔

وہ دن دور نہیں جب میں بھی بی بی کی بیماری سے لے کر بستر پہ پڑی ہوں گی اور جاوید بھائی جان کی طرح علی بھی دوسری شادی کے منصوبے بنا رہے ہوں گے۔ جی ہاں' آج کل ہمارے جیٹھ پہ دوسری شادی کا بھوت سوار ہے۔ پہلی سے اولاد تو ہے نہیں' سونے۔ سہاگہ پچھلے کچھ عرصے سے ویسے ہی عضو معطل ہو کر رہ گئی ہیں۔ اب یہ چاہتے ہیں کہ ایک اور کار آمد رکن کا اضافہ ہو۔ گھر میں بھی اور ان کے ہوٹل نما ڈھابے یا ڈھابے نما ہوٹل کے کچن میں بھی۔ یہاں جو اکا دکا پاکستانی فیملیز رہتی ہیں' وہ خاصی امیر کبیر ہیں' باقی چھڑے چھانٹ مزدور ٹائپ ہیں۔

ان کا ارادہ ہے کوئی غریب افغانی یا بنگالی لڑکی مل جائے تو اچھا ہے جو کام کاج والی ہو۔ پاکستانی گھرانے والے تو چھان بین بہت کرتے ہیں۔ بھابھی تو ان کے خاندان کی تھیں' خود ان کا باپ ریڑھی پہ لڈو پیٹھی بیچا کرتا تھا اور لوگ تو سن کر ہی بدک جائیں گے کہ ان کا خاندانی پیشہ ہی نسلوں سے نان پکوڑے اور حلیم ریڑھیوں پہ رکھ کے بیچنے کا ہے اور کون ہے جو لڑکی چولہے پہ صدقے واری کرنے پہ تیار ہو۔

ایک ہماری آپا سیدھی ملی تھیں انہیں' جنھیں یہ تک تفتیش کرانے کی توفیق نہ ہوئی کہ لڑکے اور اس کے بھائی کا کاروبار کیا ہے۔ چلو ہوٹل کی حد تک تو ٹھیک ہے مگر یہ تو ظلم ہے کہ چند دن کی بیاہی بیوی کو بھی بے تنخواہ کی باورچن بنا کر کھڑا کر ڈالا۔ بس قسمت کی بات ہے ورنہ رضوانہ آپا کا رشتہ کرانے والی بھی تو آپ تھیں۔ کیا اونچا زمیندار گھرانہ ڈھونڈا۔ عیش کر رہی ہیں جاگیر دارنی بن کے۔ وہاں تو ملازمائیں ہوں گی نل کے پانی نہ پینا پڑتا ہو گا۔ مجھے بھی گھر کا سکھ مل جاتا تو تعلیم ادھوری رہ جانے کا دکھ بھول جاتی۔

علی کے ماموں زاد بھائی کا سالا اگلے ماہ ابو ظہبی لوٹنے والا ہے۔ اس کو آپ کا پتہ دیا ہے۔ پچیس یا چھبیس تاریخ تک آپ کی طرف آئے گا۔ ریما کے لیے اچھا سا لہنگا سوٹ اور کرتا پاجامہ بھجوا دیجئے اور موموکے لیے پشاوری چپل' ریما کے لیے بھی سنہری تلے والا کھسہ یا چپل بھجوا دیں۔ دونوں کا سائز بھیج رہی ہوں۔ عید وغیرہ پہ بچوں کا دل کرتا ہے ایسے کپڑے پہننے کو مگر یہاں پاکستانی روایتی لباس والی دکانیں بہت مہنگی ہیں۔ میرے لیے اچھی سی دو گرم شالیں۔ رنگ ایسے ہوں جو سبھی کپڑوں کے ساتھ چل جائیں۔

اور ہاں آپا! پچاس ہزار کا ڈرافٹ بھیج رہی ہوں۔ پلاٹ کی اگلی اکھٹی کئی قسطیں بھر دیں۔ پتہ نہیں کب وہ دن آئے گا جب یہاں میرا اپنا گھر ہو گا۔ علی بھی بھائی سے چھپ چھپا کے پس انداز کر رہے ہیں' اپنا الگ کام شروع کرنے کے لیے مگر میں نے اپنی بچت اور منصوبے کی ہوا بھی انہیں نہیں لگنے دی۔ جیسے ہی وہ اپنا الگ کام کرنے کا ارادہ کریں گے' میں انہیں پاکستان چلنے کا مشورہ دوں گی اور سرپرائز کے طور پہ یہ بنا بنایا گھر بھی دکھا دوں گی۔ میرا خیال ہے ان پچپن ہزار کے بعد کوئی اور قسط نہیں رہتی پلاٹ کی۔ رجسٹری میرے نام ہو جائے تو آپ تعمیر کا کام شروع کرا دیں۔ میں نے یہاں چپکے چپکے کچھ سونا جمع کیا ہوا ہے۔ بیچ کر بھجوا دوں گی۔ دو چار لاکھ پاکستانی روپے کا تو ہو گا۔ اس سے کام شروع ہو تو اگلے دو سالوں تک اتنا ہی اور بچا کے بھیج دوں گی۔

ریما اور مومو آپ کو سلام کہہ رہے ہیں۔ اپنا خیال رکھیے گا۔ علاج باقاعدگی سے کروائیں اور خط کا جواب ضرور لکھیے گا۔ یہ دھیان رہے کہ خط میں پلاٹ اور رقم کا کوئی ذکر نہ ہو۔ علی کو عادت ہے میرے خطوط پڑھنے کی۔

آپ کی بہن
کلثوم علی

❁ ❁ ❁

"جی آپا! آپ نے بلوایا' کوئی کام تھا؟"

گلزو کے ہاتھ پیغام بھجواتے ہی رفعت نیچے آ گئی۔ رات سے نصرت آرا کا بی پی خاصا لو تھا۔ سر بھاری آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔ رفعت ان کے نزدیک

بیٹھتے ہوئے بغور انہیں دیکھنے لگی۔

"آپا آپ۔ آپ رو رہی تھیں۔" کچھ ہچکچاتے ہوئے اس نے سوال کیا۔ نصرت آرا افسردگی سے مسکرا دیں۔

"نہیں بیٹا! بس طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" انہوں نے بتایا کہ کس طرح ساری رات لو بلڈ پریشر کی وجہ سے ہونے والے سر درد کے ساتھ تڑپ کے گزاری ہے۔

"شاید درد کی وجہ سے ہی آپ روتی رہی ہوں گی۔" اسے ان کی سرخ اور متورم آنکھوں اور بھاری بھاری نم آواز سے شک گزرا۔

"اب ہم نے رو کے کسے دکھانا ہے۔" انہوں نے سرد آہ بھری۔

"وہ وقت اور تھا جب ذرا سی تکلیف پہ سسکی بھرتے تھے اور اماں سب کام کاج چھوڑ کے اپنی گود میں سر لے کر بیٹھ جاتی تھیں۔ کبھی کبھی تو صرف اماں اور ابا سے لاڈ اٹھوانے کی خاطر میں جھوٹ موٹ بھی سر درد یا پیٹ کی تکلیف کا بہانہ کر دیا کرتی تھی۔ اب تو بڑی سے بڑی تکلیف بھی ہنستے ہوئے جھیل لیتی ہوں۔ تکلیف کی شدت ظاہر کرنے کے لیے آنسو بہاؤں بھی تو کس کے لیے۔" وہ دھیمی آواز میں جیسے خود کلامی کرتی رہیں۔

"تمہیں اس لیے بلایا تھا کہ ذرا بیٹھک کو ٹھیک ٹھاک کر دو۔ میری طبیعت تو ایسی نہیں کہ کچھ کر سکوں۔"

"کیا کوئی آ رہا ہے آپا! سرگودھا سے مہمان آ رہے ہیں؟"

"آنا تو اس کے ہاں سے ہی ہے مگر رضوانہ خود نہیں بلکہ اس کے جیٹھ کا لڑکا آ رہا ہے اور کچھ عرصہ یہاں ہی رہے گا۔ اسے یہاں ملازمت مل گئی ہے۔ کل ہی رضوانہ کا خط آیا تھا۔ آج کل میں اس کی آمد متوقع ہے۔ سوچا تھا بازار جا کر سودا لے آؤں گی کمرہ بھی سیٹ کر دوں گی مگر رت جگے کی وجہ سے حکنی ہو رہی ہے۔ سر درد بھی چین نہیں لینے دے رہا۔"

"آپ مجھے بتایئے آپا! میں سب کر دیتی ہوں۔ سودے کی لسٹ بھی بنا دیں۔ انیق کالج سے آتا ہے تو منگوا دیتی ہوں۔" وہ مستعدی سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کام سے ذرا نہ گھبراتی تھی۔

"جیتی رہو بیٹی! خاص کام نہیں۔ ابھی کچھ دن پہلے جمعدارنی کو پچاس روپے دے کر سارے جالے اتروائے تھے۔ تم قالین کو ذرا برش سے صاف کر دو۔ گدو کو ساتھ لگا کر وہ پلنگ اندر ایک طرف ڈال دو جو برآمدے میں دھرا ہے۔ صوفوں کے کشن کے لیے نئے کور اور دھلی ہوئی بیڈ شیٹ میں نے کل ہی نکال دی تھی۔ وہ بچھا کے بس ذرا اوپر کی جھاڑ پونچھ کر لینا۔"

وہ سر تھامتے ہوئے پھر سے لیٹ گئیں۔ رفعت کام میں جت گئی اور انہیں پھر سے رہ رہ کر کلثوم کے خط کے مندرجات یاد آنے لگے۔ ان کی پلکوں کے گوشے نم ہو گئے۔ سر میں ٹیسیں پھر سے تیز تر ہو کے ابھرنے لگیں۔ تکلیف کی شدت سے انہوں نے آنکھیں زور سے موند لیں تو چند گرم گرم آنسو ان کے چہرے پہ پھیل گئے۔ یہ آنسو انہوں نے اپنی تکلیف سے بے حال ہو کر نہیں بہائے بلکہ کلثوم کے درد میں بہائے تھے۔

کلثوم کا خط کبھی کبھار آتا مگر جب بھی آتا نصرت آرا کا یہی حال ہوتا۔ انہیں رہ رہ کے پچھتاوے ڈسنے لگتے۔ وہ بھی اپنے کسی خط میں یہ تمام تذکرے تفصیل سے دہرانا نہیں بھولتی تھی۔ انہیں اپنے اس حال کے لیے مورد الزام ٹھہرانا اس کی عادت تھی اور وہ بھی ہمیشہ کی طرح اس الزام کو دل پہ لے لیتی تھیں۔

رضوانہ کی شادی بھرے پرے کنبے میں کر کے وہ پچھتا رہی تھیں۔ اس کے رونے ہی بند نہ ہوتے تھے کہ "آپا! آپ نے اتنی لمبی چوڑی سسرال میں بیاہ کر پھنسا ڈالا۔" اس تجربے کے بعد انہیں بہتر یہی لگا کہ کلثوم کی شادی مختصر گھرانے میں کریں۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ ان کا اپنا کنبہ مختصر ہے اور اماں ابا کی وفات کے بعد بہنوں کو زیادہ میل جول کی عادت بھی نہیں رہی اس لیے ان کا گزارا زیادہ لوگوں میں مشکل ہوگا۔

رشتہ طے ہونے کے کچھ عرصے بعد انہوں نے اڑتے اڑتے سنی تھی کہ ان لڑکوں کا باپ اندرون شہر میں ریڑھے پہ حلیم بیچا کرتا تھا اور دلوا اسٹیشن پہ نان پکوڑے کا اسٹال لگاتا تھا مگر نصرت آرا نے سن کر بھی نظر انداز کر دیا۔ وہ اتنی تنگ ذہنیت کی نہ تھیں کہ ایسی اونچ نیچ کو اہمیت دیتیں۔ یہی بہت تھا کہ لڑکا شریف اور مناسب حد تک تعلیم یافتہ تھا اچھا خاصا کھاتا کماتا تھا۔ اگر اس کے باپ دلوا اس پیشے سے وابستہ رہ چکے تھے تو یہ اتنا بڑا جرم نہیں تھا۔ کون سا کلثوم نے یہاں عمر گزارنا تھی۔ اسے تو شادی کے فوراً بعد ہو جانا تھا۔

کلثوم نے وہاں جاتے ہی اطلاع بھیجی کہ اس کا شوہر اور جیٹھ وہاں ریسٹورنٹ نہیں بلکہ ایک سستا سا نچلے درجے کا ڈھابے نما ہوٹل چلاتے ہیں۔ گھر بے شک اپنا ہے مگر اس کے اوپر والے پورشن میں بنے تین کمرے ہی رہائش کے لیے ہیں۔ نیچے ہوٹل کھولا ہوا ہے۔ نصرت آرا کو دھچکا سا لگا مگر انہوں نے کلثوم کو سمجھانے بجھانے والا خط لکھا کہ کوئی بھی کام برا یا نیچ نہیں ہوتا۔ اللہ تمہارے کاروبار میں برکت ڈالے گا تو اسی کام سے علی عزت اور دولت دونوں حاصل کرے گا۔

مگر یہ جاننے کے بعد تو انہیں چپ ہی لگ گئی کہ علی نے ان کی لاڈلی اور نازک مزاج بہن کو تقریباً "باورچن" بنا ڈالا ہے۔

لاڈوں میں پلی ہوئی بہن کے بارے میں یہ علم ہونا کہ دن رات مشقت کی چکی میں پس رہی ہے۔ ان کے دل کو چیر کے رکھ دیتا۔

دونوں بار جب وہ امید سے ہوئی نصرت آرا نے لاکھ کوشش کی کہ علی اسے پاکستان بھیجنے پر تیار ہو جائے مگر وہ مان کے ہی نہ دیا بلکہ یہ کہا کہ اس کا خیال رکھنے کے لیے بھابھی یہاں موجود ہیں۔ وہ تو بعد میں کلثوم نے بتایا کہ وہ ڈلیوری سے ایک دن پہلے تک بھی اپنے معمولات انجام دیتی رہی ہے اور بچہ کو گھر لانے کے اگلے ہی روز وہ پھر سے کچن میں تھی۔ اس بے رحمانہ اور غیر انسانی سلوک پہ نصرت آرا کا دل تڑپ گیا اور وہ دونوں روتی، کلستی رہی تھیں۔

لو بلڈ پریشر کی مصیبت ان ہی دنوں کی پیداوار تھی، وہ دن اور آج کا دن اس مصیبت سے وہ نجات حاصل نہیں کر پائی تھیں۔ رہا شوگر کا عارضہ تو وہ موروثی تھا۔ دادی اور ابا دونوں ہی ذیابیطس کے مریض تھے۔ سو نصرت آرا کو عین نوجوانی میں ہی یہ مرض لگ گیا۔ البتہ پرہیز اور احتیاط کی وجہ سے وہ اسے کنٹرول میں رکھے ہوئے تھیں۔ جانتی تھیں کہ اگر حالت زیادہ خراب ہو گئی تو یہاں کون بیٹھا ہے سنبھالنے یا خیال کرنے والا۔ البتہ بلڈ پریشر پہ بس نہ تھا اس کے آگے ان کے سارے پرہیز دھری کی دھری رہ جاتیں۔ محض کلثوم کے سلسلے میں کی گئی اپنی جلد بازی کے بارے میں سوچ کر یا پردیس میں اس کی صعوبتوں کا تصور کر کے ہی وہ اپنا بی پی خطرناک حد تک لو کر لیا کرتیں۔

❁ ❁ ❁

"کچھ پتہ بھی نہیں بچہ کیا پسند کرتا ہے کیا نہیں۔ مرچ مسالے تیز کھاتا ہے یا پھیکے کھانا گھی میں پکاؤں یا آئل میں۔ میں تو بہن! آئل استعمال کرتی ہوں، وہ بھی برائے نام۔ رضوانہ بتاتی ہے اس کے سسرال میں عموماً "خالص دیسی گھی" استعمال ہوتا ہے۔" نصرت آرا فکر مند تھیں۔ شکیلہ بھابھی نے ان کی تشویش کم کی۔

"ارے آپا! کچھ بھی پکائیں۔ آخر پہلی بار کی بات ہے پھر اسے یہیں رہنا ہے۔ اس سے پوچھ لیجیے گا کہ بے تکلفی سے بتا دے کیا کچھ پسند کرتا ہے۔ ویسے میرا اندازہ ہے "آپ کی بہن کی سسرال میں بھلے مکھن اور دیسی گھی استعمال ہوتا ہو" لڑکا ڈاکٹر ہے اور لاہور کے ہاسٹلوں میں رہتا آیا ہے۔ مشکل ہی ہوگا کہ وہ ایسے ثقیل کھانے کھاتا ہوگا۔"

"ہاں ٹھیک کہتی ہو بھابھی! پلاؤ بناؤں یا بریانی۔ بریانی میں تو تیز مسالے پڑتے ہیں کہیں کم نمک مرچ کا عادی نہ ہو۔ مجھے تو بریانی کے مسالوں کا تناسب بھی بھول گیا ہے کب سے نہیں بنائی۔"

"آپا! اب تو ڈبوں میں مسالے عام ملتے ہیں، ڈبہ

کھولو وہی میں چھینٹو اور بریانی' قورمہ... کچھ بھی تیار کرلو پھر بھی جس دن پکانا ہو' رفعت سے کہہ دینا۔ میری مانو تو آج پہلے ہی دن اتنا اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں۔ کوئی ایک دن کی میزبانی نہیں' کیوں خود کو زیر بار کرتی ہو۔ چاول پکانا ضروری ہے تو مٹر یا کالی چنے ڈال لو۔ گوشت یا مرغی کا سالن بنالو۔ بس کافی ہے۔"

"ساتھ میں کباب ضرور ہونے چاہئیں بھابھی! آپ نہیں سمجھ سکتیں' بہن کے سسرال کا معاملہ ہے اور پھر راحیل تو..."

وہ دوسری بات بتاتے بتاتے رک گئیں۔ اس کا ذکر کرنا قبل از وقت ہوتا۔ بہرحال انہوں نے شکیلہ بھابھی کے مشورے پہ کچھ کچھ عمل تو کرلیا' رفعت نے شاہی کباب بھی بنادیے اور کچے قیمے کی ٹکیاں بھی فریز کردیں۔ یہ بھی اس کی امی کا مشورہ تھا۔

"آپا! ہفتے کے ساتوں دن قورمے' بھنا قیمہ بنانے کی ضرورت نہیں۔ لڑکے تو ہوتے ہی چٹورے ہیں۔ ہفتے میں کم از کم دو تین دن دال چاول یا کوئی سبزی وغیرہ بنالیا کرو' ساتھ میں دو تین کباب تل دیا کرنا۔ تمہارے بھلے کو کہہ رہی ہوں' ورنہ خود ہی چار ہفتوں میں تنگ آجاؤ گی۔"

چھوٹی عمر سے گھر بار اور کنبے کی ذمہ داریاں اٹھانے والی' تن تنہا اپنی بہنوں کو بیاہنے والی' چوالیس سالہ نصرت آرا کو اب اپنی قوت فیصلہ پہ کوئی اعتماد نہ رہا تھا۔ ان کے اپنے خیال میں وہ ایک ناسمجھ عورت تھیں۔ عرصہ ہوا انہوں نے اپنے دل کی رائے پہ عمل کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ عموماً وہی کیا کرتیں جس کا مشورہ انہیں ان کے خیر خواہ دیتے۔ چھوٹے سے چھوٹے معاملے پر گھبرا کے وہ اعظم بھائی یا شکیلہ بھابھی سے مشورہ کرنے چل پڑتیں۔ وہ نہ ملتے تو رفعت جیسی کل کی بچی سے بھی مدد مانگ لیتیں۔ اس وقت بھی وہ وہی کررہی تھیں جو شکیلہ بھابھی کہہ رہی تھیں۔

جس روز راحیل کو آنا تھا' اسی شام کو کلثوم کی سسرال سے اس شخص نے سامان لینے بھی آنا تھا جسے کچھ دن بعد ابوظہبی جانا تھا۔ نصرت آرا عرصے بعد بازار گئیں' وہ بھی شکیلہ بھابھی کے ساتھ۔ ریما اور مومو' جنہیں انہوں نے صرف تصویروں میں دیکھ رکھا تھا۔ ان کے لیے کپڑے خریدے' بندیا' جھومر' پازیب وغیرہ۔ مومو کے لیے پشاوری چپل' منڈ ممی' واسکٹ اور ٹوپی' راسلک کا ریڈی میڈ کرتا شلوار' کلثوم کے لیے دو قیمتی گرم شالیں۔ جدید انداز کے دو ریڈی میڈ سوٹ۔ ایک شال اس کی بھابھی کے لیے۔ علی اور اس کے بھائی کے لیے بھی ایک ایک مردانہ سوٹ لے لیا۔

ان کے خدشات کے برعکس راحیل واقعی بہت سادہ فطرت اور باادب بچہ تھا۔ بس بولتا بہت تھا۔ کھانے کے دوران بھی وہ اس قدر بولتا رہا کہ انہیں حیرت ہوئی وہ کھا کیسے رہا ہے۔ وہ تو ایک وقت میں اپنے منہ سے ایک ہی کام لے سکتی تھیں یا کھانے کا یا بے تکان بولنے کا۔ گھبرا کر وہ شکیلہ بھابھی کے بڑے والے لڑکے انیق کو بلانے پہ مجبور ہوگئیں جو خود بھی ایف ایس سی کا اسٹوڈنٹ تھا اور اسی طرح بے تحاشا اور بے تکی گفتگو کرنے کا عادی تھا۔ راحیل نے ان کے ہاتھ کے بنے کھانوں کی بے حد تعریف کی۔

"قورمہ کمال کا ہے چچی جان! گھر کا بنا تو لگ ہی نہیں رہا۔ دیگ کا لگ رہا ہے۔ ہاں بھئی شادی کا کھانا کھائے ہوئے بھی تو مدت گزر گئی۔ چنے کا پلاؤ میں شوق سے نہیں کھاتا لیکن آج دو بار پلیٹ بھری۔ اگر چنے کا پلاؤ ایسا پکتا ہے تو واقعی مزے کی چیز ہے۔ کباب بھی زبردست بنے ہیں۔ ہمارے گھر جو شاہی کباب بنتے ہیں' ان میں دو ذائقے نمایاں ہوتے ہیں۔ ایک تو لونگ کا' دوسرے چنے کی دال کا جو وافر مقدار میں ڈالی جاتی ہے مگر ان کبابوں میں تو..."

"کباب انیق کی بہن نے بنوائے تھے۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں کہ قیمہ چننے بیٹھتی۔" وہ پتہ نہیں کب تک تعریفیں کرتا رہتا کہ نصرت آرا نے ٹوک دیا۔ وہ کسی دوسرے کی کارکردگی کا کریڈٹ لینے کی عادی نہیں تھیں۔

"قورمہ بھی بازار کے پیکٹ سے بنایا ہے' اس لیے ذائقہ تمہیں دیگ جیسے کھانے کا لگ رہا ہوگا۔ گھر پہ قورمہ بناؤ تو ظاہر ہے کسی ایک آدھ مسالے کی کمی بیشی رہ جاتی ہے۔ البتہ پلاؤ میرے ہاتھ کا پکا ہے۔ تمہیں پسند آیا' شکر ہے۔ ورنہ میں سوچ رہی تھی' پتا نہیں تم کیسے کھانے پسند کرتے ہوگے۔"

"چچی جان! میں سب ہی کچھ کھالیتا ہوں مگر ایک عادت ہے اور وہ یہ کہ ایک وقت میں ایک ہی چیز کھانے کا عادی ہوں۔ ایک تو یہ تینوں ڈشز زبردست ہیں' دوسرا میں کسی ایک کو بھی نہ کھا کر آپ کا دل برا نہیں کرنا چاہتا تھا کہ آپ نے اتنا اہتمام کیا اور میں... لیکن پلیز آئندہ اتنا تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ناشتہ بہت لائٹ لیتا ہوں' چائے اور آملیٹ تو میں خود بھی بہت اچھا بنالیتا ہوں' آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"کیسی بات کررہے ہو بیٹا! میرے ہوتے ہوئے کیا تم خود اپنا ناشتہ بناؤ گے۔"

"کیا فرق پڑتا ہے۔ کئی سال یہ ڈیوٹی خود ہی انجام دیتا رہا ہوں۔ سچ پہ تو میں گھر پہ ہوں گا ہی نہیں' رات کا کھانا بھی کھالوں تو نیند نہیں آتی۔ سارا دن ایک وارڈ سے دوسرے وارڈ تک پریڈ کرنے کے بعد اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ کھانے کے بعد مزید واک کی جائے' اس لیے ہلکی پھلکی چیز ہی کھاتا ہوں۔ رات کے کھانے کے لیے میری فیورٹ چیز دال چاول ہے۔ دالیں اور چنے مجھے سب ہی پسند ہیں مگر صرف اور صرف چاول کے ساتھ۔"

اپنی طرف سے اس نے اپنائیت اور بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تفصیل سے بتایا مگر نصرت آرا کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ان کی کم مائیگی کے احساس سے کہہ رہا ہو۔ اگرچہ وہ اتنی گئی گزری بھی نہ تھیں مگر گھر کی سادگی دوسروں پہ ایسا ہی تاثر قائم کرتی تھی۔ ان کے چہرے سے راحیل کو اندازہ ہوا کہ شاید اس کی باتوں سے انہوں نے کوئی غلط مطلب اخذ کرلیا ہو' اس لیے فوراً ہی بولا۔

"مگر سنا ہے' اتوار کی چھٹی میں مکمل عیاشی کرتا ہوں۔ زبردست سا ناشتہ' پوری چنے یا پراٹھے کا۔ چچی جان! آپ کو مولی کے پراٹھے پکانے تو آتے ہوں گے اور وہ میتھی کے ہرے ہرے پراٹھے۔ رضوانہ چچی بہت مزے کے بناتی ہیں۔ دوپہر کے کھانے کی چھٹی اور شام کو میں فرمائش کرکے بنوایا کروں گا اپنی پسند کی چیز۔ آپ میری فرمائش پوری کریں گی نا؟"

نصرت آرا رندھے گلے کی وجہ سے ایک لفظ تک نہ ادا کرسکیں۔ صرف بھیگی پلکیں جھپک کے اثبات میں سر ہلادیا۔ فرمائش کی بات پہ انہیں بے ساختہ کلثوم کی یاد آگئی تھی۔ ایک وہی تو تھی جو لاڈ سے فرمائشیں کیا کرتی تھی اور وہ جی جان سے پوری بھی کرتی تھیں۔ کھانے کے بعد وہ چائے بنارہی تھیں' جب شکیلہ بھابھی بھی نیچے آگئیں۔ راحیل منٹوں میں ان سے بھی بے تکلف ہوگیا۔

"ارے چچی جان! چائے تو آپ بھی مزے کی بناتی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اب مجھے اپنے ہاتھ کی بنی چائے اچھی ہی نہ لگے۔"

"بیٹا! یہ تم نصرت آپا کو چچی جان کیوں کہتے ہو؟"

یہ بات نصرت آرا کو بھی عجیب انداز میں کھٹک رہی تھی مگر انہیں بلاوجہ سوال کرنے کی عادت نہ تھی' اس لیے نظر انداز کرگئیں مگر شکیلہ بھابھی چوکنے والوں میں سے نہ تھیں' اس لیے ایک بار سنتے ہی اعتراض جڑ دیا۔

"کیونکہ یہ چچی کی بہن ہیں۔"

"تو اس طرح تمہاری چچی تو نہیں بن جاتیں۔"

"مگر میں تو اور بہت سی خواتین کو بھی چچی کہہ کر پکارتا ہوں۔ آپ کو بھی کہہ سکتا ہوں' اس میں بری بات کیا ہے؟"

"مجھے تو سو بار چچی کہو مگر بیٹا! یہ رشتے جیسے چچی ممانی وغیرہ۔ یہ رشتے جس حوالے سے قائم کیے جاتے ہیں' چاہے وہ حقیقی ہوں یا منہ بولے۔ وہ تو... میرا مطلب ہے کہ..." وہ نصرت آپا کی وجہ سے کھل کر اس "حوالے" کے بارے میں کہہ نہیں پارہی تھیں پھر دبے الفاظ میں فقط اتنا کہا۔

"آپا غیر شادی شدہ ہیں' ایسے رشتے سے انہیں

پکارنا ذرا معیوب لگتا ہے بیٹا!"

"اوہ۔۔۔ سوری، مجھے اتنی باریکی میں سوچنے کی عادت نہیں۔" وہ خجل سا ہوا۔ "چلیں میں زعیم اور اینلا کی طرح آپ کو خالہ جان کہہ کر پکار لیتا ہوں۔"

کچھ ہی دیر بعد گڈو نے آکر پیغام دیا۔

"آپا! باہر کوئی عبدالحمید صاحب آئے ہیں، آپ کا پوچھ رہے ہیں۔"

"ارے ہاں، وہ علی کا رشتہ دار ہوگا۔ لاؤ بیٹا! انہیں یہاں لاکر بٹھاؤ۔" وہ جلدی سے اٹھ کر سامان لانے چل دیں۔ واپس آئیں تو راحیل ان صاحب سے سنجیدگی کے ساتھ محوِ گفتگو تھا جبکہ شکیلہ بھابھی چائے گرم کرکے کباب اور بسکٹ کے ساتھ حقِ میزبانی ادا کرتے ہوئے پیش کر چکی تھیں۔ آپا نے بڑا سا شاپر آگے بڑھایا تو راحیل نے ہاتھ بڑھا کے تھام لیا اور ان صاحب کو دینے سے پہلے خود کھول کے بیٹھ گیا۔ جیب سے قلم نکال کر وہ سامنے رکھی کاپی سے ایک ورق نکال کر ان اشیاء کی لسٹ بنانے لگا۔ آپا نے کچھ تعجب سے اس کی حرکت دیکھی۔

"اور یہ تین عدد شالیں، ایک اسکن کلر کی، ڈو بلیک، ایک براؤن بارڈر والی، ایک فیروزی بارڈر والی۔ لیجیے سر! یہ آپ رکھ لیجیے تاکہ وہاں جاکر آپ کو یاد رہے کہ کیا کیا سامان تھا۔ ظاہر ہے، آپ کے پاس آپ کا ذاتی سامان تو ہوگا ہی اور لوگوں نے بھی کافی کچھ اپنے عزیزوں کو پہنچانے کے لیے دیا ہوگا۔ یہ آپ کی سہولت کے لیے ہے تاکہ کہیں کا سامان غلطی سے کہیں اور نہ پہنچ جائے۔" اس نے لسٹ انہیں تھمائی اور اگلے ورق پہ پھر سے کچھ لکھنے لگا۔

"اور یہ لسٹ خالہ جان کی سہولت کے لیے، جب آپ کی بہن کا فون آئے تو یاد سے انہیں یہ لسٹ دہرا دیجیے گا تاکہ ان کے علم میں ہو آپ نے کیا کچھ بھجوایا ہے۔"

نصرت آرا دیکھ رہی تھیں کہ راحیل کی باتوں پہ عبدالحمید صاحب خاصے جزبز ہو رہے تھے۔ انہوں نے اپنے مہمان کے متوقع تاثرات کے بارے میں سوچ کر خجالت محسوس کی۔ البتہ شکیلہ بھابھی خاصی مطمئن نظر آرہی تھیں۔

"اور بہن جی! یہ طاقت کی دوائیں بھابھی صاحبہ نے آپ کے لیے بھجوائی ہیں۔" انہوں نے اٹھنے کی تیاری کی اور کوٹ کی جیب سے ایک سیرپ اور چند کیپسولز نکال کر سامنے رکھے۔

"خالہ جان! اور وہ خط لائے گا، دواؤں کے نام وہی ہیں نا۔" راحیل کے کہنے پہ نصرت آرا نے ہکا بکا ہوکے اس کی صورت دیکھی۔

"اوہ۔۔۔ اوہو۔۔۔ میں تو بھول ہی گیا۔" عبدالحمید صاحب نے کچھ یاد آجانے پر اچانک کہا۔

"وہ گھڑی اور جائے نماز تو ٹیکسی میں ہی رہ گئی۔ میں نے دوائیں جیب میں ڈال لی تھیں اور ان دونوں اشیاء کا شاپر سیٹ پہ رکھا تھا۔ ٹیکسی میں نے باہر ہی رکوائی ہوئی ہے۔ مجھے اجازت دیجیے، میں اس بچے کے ہاتھ آپ کے باقی دونوں تحفے بھی بھجوا دیتا ہوں۔"

وہ گڈو کو لے کر باہر نکلے تو شکیلہ بھابھی نے جتانے والی نظروں سے آپا کو دیکھا۔

"دیکھا۔۔۔ کتنا بے ایمان شخص ہے۔ وہ تو اچھا ہوا راحیل نے ہوشیاری دکھائی۔ جب احساس ہوا کہ پکڑا نہ جاؤں تو فوراً گھڑی بھی یاد آگئی اور جائے نماز بھی۔ اس نے وہاں جاکر کی چال چلنی تھی۔ تم نے کل اکٹھے چار ہزار خرچ کروا لیے اور یہ دو چیزیں وہاں دے کر بالی ہڑپ کر جاتا۔ اب کلثوم کا فون آئے تو یاد سے ساری لسٹ دہرا دینا۔"

"برابر والوں کا نمبر دیا ہوا ہے مگر فون تو سال میں ایک آدھ بار کرتی ہے اور ہمیشہ یہی کہتی ہے کہ گھر پہ فون لگوا لیں۔ ہمسائیوں کے گھر فون کرکے آپ کو بلوانا عجیب سا لگتا ہے۔"

"ٹھیک ہی تو کہتی ہیں۔ کمال ہے خالہ جان! اتنی اہم چیز آپ کے گھر میں نہیں۔ آپ اکیلی رہتی ہیں، یہ آپ کے لیے بہت بہتر ہوگا کہ فون کی سہولت ہر وقت آپ کے پاس ہو تاکہ سب کو آپ کی اور آپ کو سب کی خیر خبر ملتی رہے۔"

اتنے میں گڈو ایک شاپر اٹھائے اندر آگیا۔

"عجیب انکل ہیں، کہہ رہے تھے، شاپر گاڑی کی سیٹ پہ بھول آیا ہوں مگر ٹیکسی کی ڈگی میں سے اپنی کیس نکلوا کر کھلوا کر ڈھیروں سامان کے نیچے سے یہ نکال کر دیا۔"

"جائے نماز بڑی خوبصورت ہے اور کتنی دبیز بھی۔" شکیلہ کھول کے دیکھنے لگیں۔ "اور گھڑی بھی بہت نفیس اور مہنگی والی لگ رہی ہے۔ آپا! آپ آتے جاتے ہوئے پہن لیا کریں۔" مگر نصرت آرا نے اس گولڈن اور بلیک ڈائل والی نازک سی رسٹ واچ کو دیکھتے ہی سوچ لیا کہ وہ اسے اینلا کو گفٹ کردیں گی۔ اینلا کے میٹرک کے رزلٹ کے بعد رضوانہ کا لاہور کا کوئی چکر ہی نہیں لگا اور اس کے شاندار نمبروں سے پاس ہونے کا گفٹ ان پہ ادھار تھا۔

❊ ❊ ❊

وہ اپنے دھیان میں مگن بیٹھی بڑے انہماک سے چاول چُن رہی تھیں کہ فون کی بیل نے انہیں ہڑبڑانے پہ مجبور کردیا۔ دو ماہ سے اوپر ہو رہا تھا اس گھر میں فون کا اضافہ ہوئے مگر وہ تھیں کہ اب تک ان وقت بے وقت بجنے والی کرخت گھنٹیوں کی عادی نہ ہو پا رہی تھیں۔ تیسری بیل پہ فون راحیل نے اٹھا لیا تھا۔ وہ ہاتھ روک کر سننے کی کوشش کرتے ہوئے اندازہ لگانے لگیں۔ جب راحیل کی سنجیدہ فکری آواز میں "اور سناؤ یار۔۔۔" سنا تو اطمینان بھرا سانس بھرتے ہوئے سر جھٹکا اور پھر سے چاول چننے لگیں۔

راحیل کو ان کے ساتھ رہتے پانچ ماہ ہو رہے تھے۔ وہ اب اس کے ساتھ کی عادی ہو چلی تھیں۔ وہ جو اک موہوم سا اندیشہ تھا کہ سالوں تک تنہا رہنے کی عادت کہیں ایک اور وجود کے ساتھ کی وجہ سے مشکل نہ پیدا کردے۔ اب اس کا دور دور تک گزر نہ تھا۔ سو وہ تو ایک طرح سے رضوانہ کی شکر گزار تھیں جس نے ان کی تنہائی کے مداوے کے لیے راحیل کے یہاں ٹھہرنے کا انتظام کردیا تھا۔ اس نے اپنے اپنائیت بھرے رویے سے کہیں یہ احساس نہ ہونے دیا کہ وہ ان کے لیے غیر ہے۔ وہ ایسا ہی سمجھ رہی تھیں جیسے زعیم۔ ان کا اپنا بھانجا، ان کی ماں جائی کی اولاد ان کے پاس ہے۔ وہ اس کے لاڈ بھی ایسے ہی اٹھایا کرتیں اور وہ ناز سے ٹیون سے اٹھوایا بھی کرتا۔ جب ہی تو ضد کرکے یہ فون لگوایا۔ حالانکہ نصرت آپا کو اعتراض تھا۔

"بیٹا! تمہارے پاس یہ دوسرا فون ہے تو سہی۔" ان کا اشارہ اس کے موبائل فون کی طرف تھا۔ "پھر یہ گھر پہ الگ لگوانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہر وقت تمہاری جیب میں کھلونے کی طرح پڑا رہتا ہے اور گھڑی گھڑی بجتا بھی رہتا ہے۔"

"ہاں۔ مجھے تو ہر ضروری کال موصول ہوجاتی ہے لیکن خالہ جان! اگر مجھے باہر سے آپ کو فون کرنا ہو تو پھر۔۔۔؟ اپنی دیر سویر کی اطلاع دینی ہو تو کیسے دوں؟ میرا کام ہی ایسا ہے۔ آپ کے سامنے ابھی آکر بیٹھتا ہوں کہ کال آجاتی ہے، اسی طرح اکثر ایسا ہوتا ہے کہ راستے سے ہی واپس پلٹنا پڑتا ہے یا کسی ایمرجنسی کی صورت مزید کچھ گھنٹے رکنا پڑ جاتا ہے۔ آپ کی پریشانی کے خیال سے لے رہا ہوں تاکہ آپ کو خبر کردیا کروں۔"

وہ چپ ہو رہیں۔ فون لگنے کی اطلاع دینے کی خاطر سرگودھا کے ساتھ ساتھ ابوظہبی بھی کال کی گئی۔ یہاں کا نمبر بھی دیا گیا۔ کلثوم کو واقعی گھر میں فون لگنے کی بے حد خوشی ہوئی۔ وہ اب ہر ہفتے فون کرنے لگی۔ دو تین بار اس سے تفصیل اور سکون سے بات کرنے کے بعد اب نصرت آپا کو بھی فون کی افادیت کا احساس ہونے لگا۔

"ہیلو۔۔۔ یس ڈاکٹر راحیل اسپیکنگ۔" اب وہ کسی اور سے بات کر رہا تھا۔ چھٹی کا دن ہو تو سارا دن یہی چلتا رہتا تھا۔ منٹ منٹ بعد اس کے فون آیا کرتے۔ وہ بھی ایسا ہی ایک چھٹی کا دن تھا۔ صبح صبح پہلے کلثوم کا فون آیا، ربا اور مومو سے بات کرکے وہ کتنی سرشار تھیں۔ ناشتے سے فارغ ہوئیں تو رضوانہ کا فون آگیا۔ راحیل سے بات کرنے کے بعد اس نے

آپا سے بھی تفصیلی بات کی' وہ اب خاصی مطمئن نظر آرہی تھی کہ اس کی آپا اس کے سسرالی عزیز اور متوقع والد کی خاطر داری اور مہمان نوازی ٹھیک ٹھاک طریقے سے کررہی ہیں۔ اس کا فون بند ہوتے ہی شکیلہ بھابھی کی امی کا فون آگیا۔ وہ فون رکھ کے ابھی پلٹی ہی تھیں کہ بیل دوبارہ بج اٹھی۔

"لگتا ہے آج تو فون کو ذرا آرام نہیں۔" نصرت آپا نے ہنس کے کہا۔ شکیلہ بھابھی جاتے جاتے رک گئیں۔

"لیکن آپا! سہولت بھی تو کتنی ہوگئی ہے۔ یہی بات ابھی امی بھی کہہ رہی تھیں کہ تمہارے گھر نہ سہی نچلو تمہارے نیچے والوں کے ہاں تو فون لگ گیا۔ وقت پہ ضروری بات آسانی سے ہوجاتی ہے۔" مگر نصرت آپا الجھن بھرے انداز میں راحیل کو دیکھ رہی تھیں جو فون پہ بے حد دھیمی آواز میں بات کررہا تھا مگر اس کے چہرے سے فکرمندی اور اضطراب نمایاں تھا۔ ریسیور رکھ کے وہ پلٹا۔

"ہاسپٹل سے فون تھا۔" اتنا کہہ کر وہ رک گیا۔ ہاسپٹل سے اس کے لیے فون آتے ہی رہتے تھے' یہ فقرہ بھی وہ جانے سے پہلے ان سے کہتا ہی رہتا تھا مگر آج اس کے لہجے اور انداز میں کچھ ایسا تھا کہ وہ ٹھٹک گئیں۔

"آپ میرے ساتھ ہی چلیں اور آنٹی! آپ بھی۔" وہ نظریں چرا کر کہہ رہا تھا۔ نصرت آپا کے ہولے ہولے دل کو ایک اندیشہ لرزانے لگا۔ شکیلہ بھی متوحش ہوگئیں۔

"مگر میں کیوں؟"

"اعظم انکل کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔" بالآخر وہ بتانے پر مجبور ہوا۔

اعظم عموماً چھٹی کے روز گھر پہ ہی رہا کرتے تھے۔ بہت ہوا تو بیوی کے ساتھ ناشتے کے بعد اتوار بازار ہو آیا کرتے لیکن اس روز انہیں ایک دوست کی عیادت کے لیے جانا تھا۔ شکیلہ نے روکا بھی کہ اتوار بازار ہفتہ وار خریداری کے لیے نکلنا ان دونوں کا معمول تھا مگر وہ کہنے لگے۔

"تعلق داری بھی کوئی چیز ہے شکیلہ! دفتر سے شام کو گھر آنے کے بعد اتنی ہمت نہیں رہتی کہ کہیں اور جایا جاسکے اور بیمار کی عیادت کرنا تو سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں لوٹ آؤں گا پھر چلے چلیں گے۔"

"دوپہر کے وقت اس قدر گرمی میں کوئی رفت ہے اتوار بازار میں خوار ہونے کا اور سبزیاں بھی بچی کھچی رہ جاتی ہیں۔ ایسا کریں' پہلے بازار ہو آتے ہیں پھر آپ چلے جائیں۔"

"نہیں بھئی کھانے کے وقت عیادت کے لیے جانا سخت جہالت ہے۔ میں گاڑی چھوڑے جارہا ہوں' تم انیق کے ساتھ ہو آؤ۔ بیچے آپا سے بھی پوچھ کر ان کی لسٹ لے لینا۔ میں ویگن پہ ہو آتا ہوں۔" اور یوں وہ بیوی کے روکنے کے باوجود گھر سے نکل گئے۔ ویگن پہ سفر کرنے کا خاص تجربہ نہ تھا' اس لیے پیر سڑک پہ رکھنے سے پہلے ہی ویگن والے ویگن آگے بڑھا لی تھی۔ وہ لڑکھڑا کے گرے اور پیچھے سے آنے والی تیز رفتار ویگن سے ٹکرا کر اچھل کے فٹ پاتھ پہ گرے۔ کمر' بازو اور ٹانگ کے فریکچر کے ساتھ ساتھ اندرونی چوٹیں بھی آئی تھیں۔ چند راہ گیر اٹھا کے ہسپتال لے آئے۔ ان کے کاغذات اور ڈائری سے فون نمبر ڈھونڈ کے اطلاع کی گئی۔ راحیل اور دوسرے ڈاکٹروں کی سر توڑ کوششوں کے باوجود بھی وہ جانبر نہ ہوسکے اور آپریشن سے پہلے ہی اسی شام زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے انتقال کرگئے۔

یہ ناگہانی آفت شکیلہ اور ان کے بچوں کے ساتھ ساتھ نصرت آپا کے لیے بھی بہت بڑا صدمہ ثابت ہوئی۔ کتنے دن لگ گئے انہیں سنبھلنے میں۔ خود سنبھلیں تو ان بے وقت یتیم ہونے والے بچوں کو سنبھالنے لگیں۔ سب سے بڑی رفعت تھی' بیس سال کی تھی بمشکل اور سب سے بڑا لڑکا انیق اٹھارہویں برس میں لگا تھا۔ ابھی ایف ایس سی کے امتحان دیے تھے۔ آج کل میں رزلٹ نکلنے والا تھا۔ کچھ ہفتے پہلے انیق کا میٹرک کا رزلٹ نکلا تھا۔ اس نے

نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ ربیعہ اور گڈو ابھی اسکول میں تھے۔

ایسے وقت میں نصرت آرا نے اپنی ہمت اور استعداد سے بڑھ کے اس صدمے سے نڈھال کنبے کو سہارا دیا۔ اعظم بھائی کا ایک ہی بھائی تھا جو بیرون ملک عرصے سے مقیم تھا۔ اس نے فون پہ تعزیت کرنے کی ہی زحمت کی۔ روتی پیٹتی تو بہت مگر بھابھی اور بچوں کے لیے اور کیا کرسکتی تھیں' البتہ شکیلہ کا میکہ کھرا پڑا تھا۔ افسوس اور حیرت کا مقام تو یہ تھا کہ ان میں سے بھی کوئی اپنا فرض تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ کسی بھائی نے بیوہ بہن کی دکھوں کی تھکی کے اس ڈر سے نہ کی کہ یہ ہمدردی مہنگی نہ پڑ جائے اور چھ افراد کی ذمہ داری مستقلاً نہ سنبھالنی پڑ جائے۔ ایسے میں شکیلہ کو صبر آتا بھی تو کیسے۔ ماتم کرتے رہنے کے لیے کوئی ایک وجہ تو نہ تھی۔ عمر بھر ساتھ نبھانے والے کا اچانک ہاتھ چھڑا لینا ایک الگ صدمہ۔

وہ رو رو کے چپ ہوتیں اور پھر رونا شروع کردیتیں۔ ان کی نسبت بچوں نے خود کو جلد ہی سنبھال لیا۔ ان کی نانی بھی برسوں چالیسواں ہونے کے بعد واپس اپنے بیٹوں کے پاس چلی گئیں۔

آج کا دن ہمیشہ کی طرح اداس تھا۔ پچھلے ڈیڑھ ماہ میں جتنی بھی اتواریں آئیں' ایسی ہی اداس اور یاسیت بھری تھیں۔ زندگی کے روز مرہ کام کسی کے جانے سے نہیں رکتے۔ شکیلہ بھابھی نے کرائے کی رقم ان کے ہاتھ پہ رکھتے ہوئے کپکپاتے لہجے میں کہا۔

"معاف کرنا آپا! ان کی زندگی میں کبھی ایک دن کی دیر سویر نہ ہوئی تھی۔ اس بار تو بس اپنے غم میں دھیان ہی نہ رہا کہ کیا تاریخ ہوگئی۔ یہ سب خیال تو وہی رکھتے تھے۔ اب سر پہ پڑی ہے تو آہستہ آہستہ سیکھ جاؤں گی۔"

"مگر شکیلہ بھابھی! اس بار تو دفتر والوں نے پوری تنخواہ ادا کردی ہوگی اعظم بھائی کی۔ اگلی بار تو تمہیں صرف پنشن پہ ہی گزارا کرنا پڑے گا۔ ایسے میں یہ ہزاروں روپے کرائے کے نام پہ کیسے ادا کروگی۔"

"یہ خیال تو میرے دل میں بھی آیا تھا۔ اماں سے مشورہ کیا تو کہنے لگیں۔ کسی سستے علاقے میں چھوٹا پورشن دیکھ لو جس کا کرایہ دو ڈھائی ہزار تک ہو تاکہ آسانی سے ادا ہوجائے۔ بس ذرا ہوش آئے تو ادھر ادھر دیکھتی ہوں۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو بھابھی! میں بھلا تمہیں یہاں سے جانے دوں گی۔ اب اعظم بھائی نہیں رہے تو ان کی آپا ہونے کے ناتے تم اور بچے میرے اور قریب آگئے ہو۔ میں تمہیں دور کیسے جانے دوں گی بلکہ میرا فرض بنتا ہے کہ اس رشتے کو ایمان داری سے نبھاؤں۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے' تم اس میں حق کے ساتھ رہ سکتی ہو۔"

ان کی مخلصانہ پیشکش پہ شکیلہ کے آنسو پھر بہہ نکلے۔

"آپ کی محبت اور خلوص اپنی جگہ آپا! لیکن اپنے بچوں کو یتیمی کے دکھ کے ساتھ ساتھ محتاجی کی ذلت سے دوچار نہیں کرنا چاہتی۔ آپ جانتی ہیں کہ وہ ایک غیور باپ کی اولاد ہیں۔ یہ مجھ سے گوارا نہ ہوگا۔"

"آنٹی! میں بھی تو یہاں رہتا ہوں' پورے حق اور دھڑلے کے ساتھ۔" راحیل نے مداخلت کی۔

"اور آپ کا خالہ جان کے ساتھ رشتہ کہیں زیادہ پرانا اور مضبوط ہے۔ مجھے تو جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ محبتوں سے اتنی بدگمانی ناشکری ہوتی ہے آنٹی! جہاں سے بے لوث محبت ملے' ہاتھ بڑھا کر سمیٹ لینی چاہیے۔ کسی کی محبت اور شفقت کی چھاؤں میں بیٹھنا محتاجی سے بالکل الگ بات ہے۔"

وہ کچھ نہ کہہ سکیں۔ چپ چاپ دوپٹے سے آنسو صاف کرنے لگیں' البتہ انداز میں اب تک تذبذب اور ہچکچاہٹ تھی۔

"اچھا چلو' ایسا کرو تم سارے بل وغیرہ پہلے کی طرح ادا کرتی رہنا۔ بس کرایہ بھول جاؤ' وہ بھی تب تک جب تک کہ انیق اپنے پیروں پہ کھڑا نہیں ہوجاتا۔ اب دیر ہی کتنی رہ گئی ہے اس کی تعلیم مکمل ہونے میں۔"

"مجھے تو آثار نہیں لگ رہے۔ بھلا چار چار کی فیس

پنشن کی رقم سے کیسے ادا ہوگی۔"

"آپ اس بارے میں فکر مند نہ ہوں۔ انیق کی تعلیم بھی جاری رہے گی اور انشاءاللہ باقی سب کی بھی اور اس کے لیے آپ کو زیر بار بھی نہ ہونا پڑے گا۔ میں نے انیق سے بات کی ہے۔ میرے ہاسپٹل کی فارمیسی میں جگہ خالی ہے۔ کل وہ میرے ساتھ جائے گا۔ شام تین بجے سے لے کر رات آٹھ بجے تک کی پارٹ ٹائم جاب ہے۔ تنخواہ زیادہ تو نہیں' البتہ اس کی کالج کی فیس اور کتابوں وغیرہ کا خرچا' آنے جانے کا کرایہ نکل آیا کرے گا۔ محنت تو ظاہر ہے کرنی پڑے گی لیکن تعلیم ادھوری چھوڑ دینے سے یہ کہیں بہتر ہے۔ بغیر تعلیم کے آگے بڑھنے کے مواقع نہیں ملتے۔ فارمیسی کے ہیلپر تک ہی محدود رہے گا جبکہ میں چاہتا ہوں کہ بی ایس سی کے بعد فارمیسی کے تجربے کی بنیاد پہ اسے کسی فارماسوٹیکل کمپنی میں جاب مل جائے۔ اس میں خاصا اسکوپ ہے۔ سہیل بھی چاہے تو کالج کے بعد محلے کے دو تین بچوں کو شام میں ٹیوشن پڑھا کے اپنا جیب خرچ اور فیس نکال سکتا ہے۔ آپ کے بچے کسی پہ بوجھ نہیں بنیں گے۔"

اس نے کچھ اس طرح انہیں مطمئن کیا کہ وہ دعائیں دیتی واپس اوپر چلی گئیں۔ نصرت آپا کے تصور میں ہنستی کھلکھلاتی' چہکتی' بکھیرتی بے فکر سی شکیلہ بھابھی آگئیں جو گزرے کل کی یاد بن کے رہ گئی تھیں۔ یہ تو ایک تھکی ہاری' اداس' ملول چہرے والی عورت تھی۔ وہ بے دلی سے چاول چننے لگیں۔ کچن میں چولہے پہ رکھے گوشت کی یخنی کا دھیان آیا تو چاول رکھ کے اٹھیں۔ اتنے میں فون کی بیل نے انہیں ایک بار پھر چونکا دیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی رک کے سننے لگیں کہ کس کا فون ہو سکتا ہے۔ یہ ان کی عادت بن چکی تھی۔ ہر بیل پہ "الٰہی خیر" کہتے ہوئے سنتیں اور جب تک اطمینان نہ ہو جاتا کہ کوئی بری خبر نہیں ہے' وہیں کھڑی رہتیں۔

"خالہ جان! ابوظہبی سے فون ہے چھوٹی خالہ کا۔"

اگرچہ راحیل کبھی کلثوم سے ملا نہ تھا مگر اپنی بے تکلفانہ طبیعت کی وجہ سے فون پہ ہی کلثوم سے بھی خاصے روابط بڑھا لیے تھے۔

کتنے اداس اور اجاڑ دنوں کے بعد یہ پہلی اچھی خبر تھی جو انہوں نے سنی۔ کلثوم نے اپنے اور بچوں کے پاکستان آنے کی خبر سنائی تھی۔ کتنی ہی دیر تک تو انہیں یقین نہ آیا۔

"ہاں آپا! بڑی مشکل سے دو ہفتے کا پروگرام سیٹ کیا ہے۔ بچے پہلی بار پاکستان آرہے ہیں۔ ظاہر ہے گھومنے پھرنے کا بھی جی چاہے گا اور میں تو صرف اور صرف تھکن اتارنے آرہی ہوں۔ جی بھر کے آرام کروں گی۔ مشکل یہی ہے کہ کہیں اور جانے کا سوچا جائے۔ میں ابھی رضوانہ آپا کو فون کر کے جانے والی ہوں۔ آپ بھی اپنی طرف سے فون کر کے بلوا لیجیے۔ ایک دو دن کے لیے ان سے ملنے چلی بھی جاؤں تو کیا فائدہ۔ اس سے بہتر ہے کہ وہ بھی یہاں آجائیں۔ تینوں بہنیں مل کے وقت گزاریں گی۔"

وہ بھی اس تجویز پہ متفق ہو گئیں۔ بعد میں رضوانہ کو فون کیا۔ کچھ پس و پیش کے بعد وہ بھی مان گئی مگر صرف پانچ چھ روز کے لیے۔ اس سے زیادہ اس کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ گھر بار چھوڑ کے آسکتی۔ بچے بھی پڑھ رہے تھے' وہ اسی پہ مطمئن ہو گئیں۔

❁ ❁ ❁

اس نے اگلے ماہ کے پہلے ہفتے آنے کا بتایا تھا۔ ابھی تقریباً اٹھارہ بیس روز تھے تیاری کے لیے کافی تھے پھر وہ حسب عادت بوکھلا گئیں۔ راحیل نے کہا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ روز کے لیے اپنے دوست کے پاس ہاسٹل شفٹ ہو جاؤں۔ چھوٹی خالہ کو رہنے میں دشواری نہ ہو۔ آخر آپ ایک کمرے میں کیسے ایڈجسٹ کریں گی۔"

بات درست تھی مگر انہیں یہ بھی مناسب نہ لگ رہا تھا کہ وہ یوں بوریا بستر سمیٹ کر چلا جائے۔ وہی ان کی پرانی مروت اور لحاظ والی عادت۔ انہیں متذبذب دیکھ کے وہ مزید گویا ہوا۔

"اب آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں مہمانوں سے گھبرا کے کھسک رہا ہوں تاکہ آپ کوئی کام سر پہ نہ ڈال دیں۔ روز آؤں گا اور میرے لائق جو بھی خدمت ہو ضرور بتایئے گا۔"

"آپا! ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ اسٹور میں سے فالتو کاٹھ کباڑ نکلوا دیں یا بہت ضروری ہے تو اوپر میرے اسٹور میں رکھوا دیں۔ وہ کمرہ بچوں کے لیے سیٹ کروا دیں' کلثوم تو آپ کے کمرے میں بھی رہ لے گی۔ بے کار اتنے بڑے کمرے کو اسٹور روم بنا رکھا ہے۔" شکیلہ بھابھی نے مشورہ دیا

"ہاں اس میں بہت کچھ ایسا ہے جو میرے کام کا نہیں مگر کسی نہ کسی کے کام تو آجاتا ہے۔ جیسے بستروں سے بھری پیٹی جو اب کام آئے گی۔ دس مہمان بھی آجائیں تو تکیے' چادریں' کھیس' لحاف بہت۔ اس کے علاوہ کلثوم کے جہیز اور اپنے لیے بنا کر رکھی کڑھائی والی چادریں' کمبل اور برتن وغیرہ۔ وہ تو دوسرے ملک گئی' ساتھ کچھ نہ لے جا سکی' خاندان میں کوئی شادی بیاہ ہو تو بچی کے لیے تحفہ گھر سے نکل لیتی ہوں اور اماں کی یادیں' کچھ تانبے اور پیتل کے پرانے برتن' مسہری وغیرہ۔"

"چلیں اس میں جگہ نکال کر میں شفٹ ہو جاتا ہوں' ڈرائنگ روم آپ ان کی فیملی کے لیے سیٹ کر دیں۔ ساتھ واش روم کی سہولت بھی ہے۔ میرا کیا ہے ایک طرح سے رات ہی گزارنا ہوتی ہے۔"

اسٹور میں رکھی ایک پیٹی چند لڑکوں کی مدد سے اوپر منتقل ہو گئی۔ بان کی تینوں چارپائیاں بھی اوپر گئیں۔ دوسری پیٹی ایک طرف لگا کے اسٹور میں راحیل کا سنگل بیڈ لایا گیا جبکہ ڈرائنگ روم میں اس کی جگہ نصرت آرا کا پرانی طرز کا بنا بڑا سا بیڈ رکھ دیا گیا' جو کلثوم اور دونوں بچوں کے لیے کافی تھا۔ اپنے لیے انہوں نے اماں کی مسہری مرمت کروا کے رکھوا لی۔ ڈرائنگ روم اب مہمانوں کی رہائش کے لیے تیار تھا۔

کچن میں دو ہفتے کی مہمان داری کے لحاظ سے ہر ممکن اہتمام کا سامان رکھوا لیا۔ رفعت برابر ان کے ساتھ لگی رہی۔ شکیلہ بھابی نے اسے خاص ہدایت کی تھی کہ جب تک مہمان رہیں' وہ نیچے آپا کے پاس رہا کرے تاکہ انہیں کم سے کم کام کرنا پڑے حالانکہ پہلے کی نسبت اب نصرت آرا کی صحت ٹھیک رہتی تھی۔ سردیاں جاتے ہی جوڑوں کا درد تو ویسے بھی بھاگ جاتا تھا۔ اب گھر میں راحیل جیسے ڈاکٹر کے ہوتے ان کا بلڈ پریشر اور شوگر دونوں کنٹرول میں رہنے لگے تھے۔ پہلے کی نسبت اب وہ زیادہ چاق و چوبند اور چست رہنے لگی تھیں۔ اس کے باوجود رفعت نے خوش دلی سے کچن کی تمام تر ذمہ داری اپنے سر لے لی۔

ایک دن رہ گیا تھا کلثوم کے آنے میں۔ شکیلہ بھابھی جو اب خاصی سنبھلی ہوئی لگتی تھیں مہندی کا پیالہ لیے نیچے اتریں۔

"لائیں آپا! آپ کے سر پہ مہندی لگا دوں۔ بال کتنے روکھے ہو رہے ہیں اور بد رنگ بھی۔ آپ نے اب باقاعدگی سے رنگنا چھوڑ دیا ہے۔"

"کس کے لیے رنگوں بھابی۔" وہ ہنس پڑیں۔

"اب تو عجیب سا لگتا ہے۔"

"اپنے لیے آپا اور کس کے لیے؟ اب وہ نہیں رہے تو کیا میں جینا چھوڑ دوں' یہ آپ نے ہی کہا تھا مجھے۔ اور سچ بھی ہے بچوں کے لیے' دنیا کے لیے جینا تو پڑتا ہے اور وہ بھی زندہ لوگوں کی طرح مردہ لوگوں کی طرح جینے کا کیا فائدہ۔ میری بچی نے مہندی گھولی اور میرے بال کھول کے لگانے لگی تو میں اسے منع نہ کر سکی۔ اب کہاں تک انہیں بات بات پہ یہ احساس دلاؤں کہ زندگی وہ نہیں رہی۔ لائیں آپ بھی بال رنگوا ہی لیں اپنے لیے نہ سہی' کل آنے والے مہمانوں کے لیے ہی سہی۔ بھانجا بھانجی یہ نہ سمجھیں' خالہ سے ملنے آئے ہیں یا نانی سے۔"

"بیٹی کی طرح ہی پالا ہے میں نے کلثوم کو میں۔ ان بچوں کی نانی ہوں۔ جب بارہ سال کی عمر میں کلثوم کی ماں بن سکتی ہوں تو چوالیس' پینتالیس سال کی عمر میں اس کے بچوں کی نانی کیوں نہیں۔"

"بچے بھی آج کل ماڈرن نانیاں دادیاں پسند کرتے ہیں اور کلثوم کیا سوچے گی اس طرح آپ کو دیکھ کے۔ اداس ہوگی کہ کوئی آپ کا خیال رکھنے والا نہیں' اس لیے آپ خود سے غافل ہیں۔ میں نے رفعت سے کہہ کر آپ کے سنبھال کے رکھے جوڑے سلوا دیے ہیں۔"

مگر وہ مہندی لگواتے ہوئے کچھ اور ہی سوچ رہی تھیں۔ رہ رہ کے کلثوم کے بھیجے دردناک خطوط کے مندرجات یاد آتے رہے۔

"وہ آپ مجھے دیکھیں تو پہچان نہ سکیں آپا۔"

"ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کے رہ گئی ہوں۔"

"بچوں کی اوپر تلے کی پیدائش' پریگننسی اور زچگی کے بعد کسی کے خیال نہ رکھنے کی وجہ سے میری صحت کا حشر ہو کے رہ گیا ہے۔"

"سارا دن کام سے فرصت نہیں ملتی۔ تھکن' بے آرامی' نیند کی کمی اور کام کے بوجھ نے لوہ موا کر چھوڑا ہے۔"

اور وہ واقعی اسے دیکھ کے پہلی نظر میں بالکل نہ پہچان سکیں۔ وہ سچ کہہ رہی تھی' اس کا واقعی "حشر" ہو کے رہ گیا تھا۔

آٹھ نو سال پہلے جس کلثوم کو بیاہ کے رخصت کیا تھا' وہ تیئس سال کی کانچ سی گڑیا سی چھوٹی موٹی لڑکی تھی۔ اور اس وقت جو زیورات میں لدی' مہندی لگے ہوئے بالوں اور بے تحاشا پھیلے ہوئے جسم والی سرخ و سفید عورت ان کے سامنے کھڑی تھی وہ اسے پہچاننے سے قاصر تھیں۔ وہ تو جب کلثوم نے اپنے تھل تھل کرتے وجود کو سنبھال کر انہیں گلے لگایا تو اپنے خون کی مہک نے اس کی پہچان کرائی۔

"یہ تم نے اتنا وزن کیسے بڑھا لیا؟" زیادہ دیر رہ نہ سکیں تو رات کے کھانے پہ سوال کر ہی ڈالا۔

"ہائے آپا! کیا بتاؤں؟ فکروں اور پریشانیوں نے یہ حال کر دیا ہے۔"

اس بات پہ انیق کی زبان پہ کھجلی ہوئی۔

"فکروں اور پریشانیوں سے انسان کو آدھا ہوتے تو دیکھا ہے' دگنا ہونے کا ذکر پہلی بار سنا ہے۔ کیوں راحیل بھائی! آپ تو ڈاکٹرز ہیں' ہے کوئی ایسا واقعہ تجربے یا مشاہدے میں؟"

راحیل نے مسکرانے پہ اکتفا کیا' جبکہ شکیلہ نے نظروں ہی نظروں میں بیٹے کو سرزنش کی۔

"یہاں کے ڈاکٹروں کی بات ہی نہ کرو۔ مجھے وہاں ابوظہبی کے ایک بڑے ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ ڈپریشن کی وجہ سے وزن مسلسل بڑھنے لگتا ہے۔ چھوٹا' ہاتھ پیر سوجے سوجے رہتے ہیں۔"

نصرت آپا کا تو جی نہ بھر رہا تھا' سات سالہ ریحا اور چار سالہ موموکو پیار کر کر کے۔

"کھانا تو بڑا لذیذ بنا ہے آپا' عرصے بعد گھر کا ذائقہ ملا ہے۔ ورنہ اپنے لیے الگ سے پکانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ جو ہوٹل کے لیے پکا' دوئی خود بھی دو وقت کھالیا۔ تیز مسالے' بازاری ذائقہ' گھی اور آئل کا کھلا استعمال۔" وہ خود ہی اپنے مٹاپے کا اصل راز اگل گئی۔ یعنی بے تحاشا مرغن غذاؤں کا استعمال۔

"لیکن آپ نے ناحق اتنی زحمت کی۔ پتہ نہیں اس قدر گرمی میں کتنی دیر کچن میں وقت گزارنا پڑا ہوگا۔" اس نے ٹیبل پر سجی اپنی تمام پسندیدہ ڈشز سے مکمل انصاف کرتے ہوئے ہمدردی جتانا چاہی۔

"بھئی یہ سب رفعت کا کمال ہے۔ اس نے مجھے کچن میں گھسنے تک نہیں دیا۔ میں نے صرف اسے یہ بتایا تھا کہ تمہیں کیا کیا پسند ہے اور اس نے تمہاری پسند کی تو ساری ڈشز بنا ڈالیں۔"

فرائی چانپ کی ہڈی بھنبھوڑتی کلثوم نے ایک اچٹتی سی نظر موموکی پلیٹ میں فروٹ سلاد ڈالتی رفعت پہ ڈالی۔ سادا سا سراپا' بیس اکیس کا الھڑ پن' معصوم چہرے پہ سادگی' بھولپن اور سنجیدگی کا عجیب امتزاج۔ گرمی کی حدت سے اس کا گندمی چہرہ تمتما رہا تھا' سلیقے سے گندھے لمبے بالوں کی چوٹی سی دو تین لٹیں پنکھے کی تیز ہوا سے نکل کر چہرے پہ لہرا رہی تھیں۔ یقیناً یہ فرائی چانپ' چکن بریانی' پالک گوشت' فروٹ سلاد' کباب اور کسٹرڈ تیار کرنے میں اس کا پورا

دن لگا ہو گا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہشاش بشاش تھی اور اس کی بے ریا مسکراہٹ میں ایک ملائمت تھی۔ کلثوم کی سرسری انداز میں اٹھی نظر بہت عمیق جائزہ لے کر واپس لوٹی۔

موموکے بال سہلاتی رفعت نے عجیب بے چینی سی محسوس کی جیسے وہ کسی کی گہری نظر کے حصار میں ہو۔ غیر ارادی طور پر اس نے تایا کی ابوظہبی سے آئی بہن کو سر اٹھا کے دیکھا کہ بہرحال وہ ہی یہاں نیا اضافہ تھیں اور کسی کو کیا ضرورت تھی اسے گھورنے کی۔ لیکن وہ اطمینان سے پلیٹ میں سویٹ ڈش ڈال رہی تھیں۔ ان سے ہوتی اس کی نظر تایا کے ساتھ بیٹھے راحیل پہ گئی۔

وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

جہاں لمحے بھر کو رفعت کی ساری حسیات جھنجھنا اٹھیں، وہیں وہ بھی اپنی چوری پکڑے جانے پہ سٹپٹا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن رضوانہ کا فون آیا۔ وہ کلثوم کے آنے پہ خوشی کا اظہار کر رہی تھی، ساتھ ہی ویک اینڈ پہ لاہور آنے کا پروگرام بھی بنایا تھا۔

"آپا! ٹھیک ہے میں اس سے ملنے آؤں گی لیکن اسے سمجھائیے گا جانے سے پہلے چاہے ایک دن یا چند گھنٹوں کے لیے ہی سہی مگر میرے گھر آئے ضرور۔ سسرال کا معاملہ ہے اور چھوٹے شہر کے لوگ ویسے طعنے دینے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔ اچھا نہیں لگے گا کہ وہ بڑی بہن سے ملے بغیر واپس چلی جائے۔ بچے بھی خالہ سے مل کے خوش ہوں گے۔ وہ کون سا روز روز آتی ہے۔ لاہور سے سرگودھا تک کا فاصلہ اتنا بھی زیادہ نہیں۔"

"تم خود کہہ لو۔" انہوں نے جان چھڑانا چاہی۔

"ہاں۔ وہ تو میں کہہ ہی دوں گی۔ آپ کا بھی تو فرض بنتا ہے کچھ سمجھانے بجھانے کا۔ بڑی ہیں تو بڑی بن کے بھی دکھایا کریں۔ لائیں، اسے فون دیں، میں بات کرتی ہوں۔"

نصرت آپا کلثوم کو ریسیور تھما کے خود باہر نکل گئیں۔ نصرت آپا باہر صحن سے دھلے کپڑے سمیٹنے لگیں جب راحیل اپنے کمرے سے نکلا۔ نائٹ ڈیوٹی کی وجہ سے وہ صبح نو بجے گھر لوٹا تھا اور اب نیند پوری کرنے کے بعد دوبارہ تیار ہو کے جانے کو تھا جب اس نے راہداری میں دوسری جانب منہ کیے کھڑی کلثوم کی آواز سنی۔

"ارے چھوٹی آپا! کچھ نہ پوچھو گھر کیا ہے سرائے بنا رکھی ہے آپا نے۔ کمنے کو کرائے دار ہیں مگر پانچوں بچے اوپر نیچے دندناتے پھرتے ہیں۔ سنا ہے اب تو کرایہ تک لینا چھوڑ دیا ہے۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے کرایہ لینا نہ لینا ان کی مرضی ہے۔ لیتی تھیں تب بھی ان کا فائدہ، اب نہ لینے سے نقصان بھی ان کا، ہمیں تو وہ دودھ سے مکھی کی طرح نکال پھینکیں۔"

"بالکل ٹھیک بات کہی، کوئی اور بہنیں ہوتیں تو مکان کے حصے کی بات بعد میں کرتیں پہلے کرایہ تین حصوں میں بانٹا جاتا۔"

راحیل نے ایک گہری سانس بھری اور سر جھٹک کے کچن کی جانب مڑ گیا۔ سہ پہر کے چار بج رہے تھے اور جب اسے یوں بے وقت کھانا ہوتا تو وہ کسی کو زحمت دیے بغیر خود کھانا گرم کر کے کھا لیا کرتا۔ چاول ہاٹ پاٹ میں تھے، اس نے رائتہ نکالا، دو کباب پلیٹ میں رکھے اور فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل لے کر نکلا تو کلثوم اب تک فون سے چپکی تھیں، رخ ہنوز دیوار کی جانب تھا، شاید وہ باہر والے دروازے پہ نظر رکھے ہوئے تھیں جہاں سے تایا کے آنے کا خطرہ تھا۔ اپنے کمرے میں بڑھتے، راحیل کے کانوں میں ان کی بات پہنچی۔

"پتہ نہیں لوگوں کو بیمار بنے رہنے کا کیا چسکہ ہوتا ہے۔ میں تو ہمیشہ ان کے خط پڑھ کے راتوں کو رویا کرتی تھی کہ ہائے میری بڑی بہن بیمار ہے کوئی دیکھ بھال والا نہیں۔ یہاں آ کر دیکھا تو بھلی چنگی ہٹی کٹی، نہ شوگر نہ جوڑوں کا درد۔ بازاروں کے چکر لگ رہے ہیں، سلائی

[...]ہو رہی ہے۔ واہ بھئی، پردیس بیٹھی بہنوں کی [...]کھائے دی اور خود کیا مزے ہیں۔ چاپلوسی [...]والے مفت خورے بٹھا رکھے ہیں وہ لڑکی سارا [...]کیا کرتی ہے یہ ایک سے ایک عمدہ جوڑا پہنے [...]کر کے بیٹھی رہتی ہیں۔"

[...] سے زیادہ سننے کی اس میں تاب نہ تھی۔ وہ [...] میں چلا آیا اور پلیٹ سامنے رکھ کے بیٹھ گیا۔ [...]بانہ تھا کہ یہ باتیں، یہ رویے اس کے لیے نئے [...]وہ ایک بھرے پُرے کنبے میں پلا تھا، جوائنٹ فیملی [...] کے تحت ایک ایسے خاندان میں جہاں عورتوں [...]تعلیم کا تناسب نہ ہونے کے برابر تھا۔ خصوصاً [...] بادنی، پھوپھیوں وغیرہ سے وہ واقف تھا۔ خود [...]کی چچی رضوانہ اور ان کی منصوبی یعنی اس کی [...]میں کی چپقلش اور میل ملاپ چلتا رہتا لیکن آج [...]کی باتیں سن کر اسے حقیقتاً افسوس ہو رہا تھا، [...] وجوہات تھیں۔

ایک وجہ تو یہ تھی اس کے خیال میں کلثوم ایک [...]یافتہ خاتون تھیں اپنی بہن رضوانہ کی نسبت ایک [...] ماحول میں رہنے کی وجہ سے الگ عادات [...]یات کی مالک ہوں گی اور بیرون ملک رہنے کی وجہ [...] گھریلو سیاست سے بالا بھی۔ مگر اس کے سارے [...]ازے غلط نکلے۔ اپنی تمام تر تعلیمی قابلیت کے باوجود [...] اعتبار سے وہ وہیں کھڑی تھیں جہاں اس کی [...]اس چچی رضوانہ اور مڈل فیل پھوپھی نسرین۔ لیکن حیرت کا مقام تو یہ تھا کہ دو بہنیں مل کے [...] بہن کے بخیے ادھیڑ رہی تھیں۔ اور بہن بھی [...]رت آرا جیسی۔

[...]کی سب سے بڑی اور اہم وجہ تھی راحیل کی حیرانی [...]

اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ نصرت خالہ جیسی بے [...]شفیق اور مہربان خاتون، جن سے برائیوں تک کو [...]ت ہو جائے، ان کی سگی بہنیں ان سے نالاں کیسے [...]سکتی تھیں۔

کیا محبت اور قربانی کی کوئی قدر نہیں رہ گئی؟ کیا ایثار بالکل بے معنی جذبہ بن کے رہ گیا ہے؟

☼ ☼ ☼

کلثوم کو آئے چھ روز ہو چکے تھے اور یہ چھ کے چھ دن بے حد مصروف گزرے۔ اس کے بھی اور تایا کے بھی۔ تھکن اتارنے اور آرام کرنے کا اعلان کرنے والی کلثوم کے پیر گھر پہ نہ ٹک رہے تھے۔ بمشکل ایک روز اس نے مکمل طور پہ گھر پہ گزارا۔ اب بھی اس بازار کے چکر لگ رہے ہیں تو کبھی اس بازار کے۔ کبھی کسی پرانی سہیلی سے ملنے جایا جا رہا ہے تو کبھی بچوں کو گھمانے کے لیے۔ اتفاق سے ان دنوں راحیل کی مصروفیات بھی کم رہیں، وہ مقررہ وقت پہ شام کو گھر لوٹ آیا کرتا ورنہ اکثر تو کسی ایمرجنسی کی صورت میں وہ رات دیر گئے لوٹا کرتا، کبھی کبھار اچانک نائٹ ڈیوٹی پڑ جاتی۔

کلثوم اسے لے کر اس اسٹیٹ ایجنسی کی طرف بھی گئی جس سے اس نے پلاٹ قسطوں پہ خریدا تھا۔ یہ ساری خرید و فروخت اعظم بھائی اور آپا کی معرفت ہوئی تھی، لیکن اب وہ خود جا کر پلاٹ اور اس کے محل وقوع کا جائزہ لینا چاہتی تھی اور یہ تخمینہ بھی لگانا چاہتی تھی کہ مکان کی تعمیر میں کل کتنی رقم اور کتنا عرصہ لگے گا۔ شاید وہ مستقلاً پاکستان میں شفٹ ہونے کے ارادے میں سنجیدہ تھی۔ البتہ نصرت آرا کو حیرت اسی بات پہ ہوتی تھی کہ شوہر سے خفیہ رکھ کے بالا ہی بالا وہ یہ سارے معاملات کیسے اس رازداری اور کامیابی سے طے کر رہی ہے، وہ کلثوم جسے شادی ہونے تک وہ ایک لاابالی اور الھڑ معصوم سی بچی سمجھتی رہیں۔

شام کو سات بجے تک راحیل لوٹ آتا، ٹیکسی اس کے ساتھ ہوتی، آرام کا ایک منٹ نکالے بغیر وہ سب بچوں کو لے کر گھمانے نکل جاتا، کبھی کبھی کلثوم بھی ساتھ ہوتی۔ اسے گھومنے پھرنے سے زیادہ شاپنگ کا جنون تھا۔ تایا تو اس کے خریداری کے شوق میں ساتھ نہیں دے سکتی تھیں، وہ رفعت کو ساتھ لے جاتی۔ رفعت بے چاری پہ دوہری ذمہ داری آن پڑی۔ صبح

صبح کھانا وغیرہ پکا کے اور دیگر کاموں سے فارغ ہو کے وہ بارہ بجے تک کلثوم کے ساتھ نکل جاتی۔ شام تک واپسی ہوتی۔ کلثوم تو اپنے اور بچوں کے لیے خریدے ملبوسات' جیولری وغیرہ دکھا کے آرام کرنے کی نیت سے کمرہ بند کر لیتی۔ اس بے چاری کو اپنے گھر کا کام بھی دیکھنا پڑتا۔

یہ مسلسل پانچواں دن تھا جب وہ اس کے ساتھ گرمی کی بھری دوپہر میں گھنٹوں خوار ہونے کے بعد لوٹی تھی۔ نصرت آپا کو اس کی شکل دیکھ کے ترس آگیا۔

اس کا گندمی چہرہ دھوپ کی شدت سے سنولا رہا تھا۔ چہرے سے پژمردگی اور تھکن ظاہر تھی۔ اس کے برعکس کلثوم حسب معمول چہک رہی تھی۔ ظاہر ہے اس پہ تھکن کیوں غالب آتی۔ وہ ساڑھے دس بجے صبح جاگی' پیٹ بھر ناشتہ کیا' تھا دھو کے بازار نکل گئی اور خریداری کے شوق نے گرمی' تھکن کو محسوس تک نہ ہونے دیا' اب بھی شربت کا جگ خالی کرنے کے بعد وہ چائے کی فرمائش کر رہی تھی' اس کے بعد وہ روز کی طرح غسل کر کے آرام کرنے کی غرض سے کمرہ بند کر لے گی جبکہ صبح کی جاگی رفعت نے اپنے گھر کی صفائی' کپڑوں کی دھلائی کے ساتھ ساتھ نیچے آکر مٹر پلاؤ کو تیار بنا کے رکھے ناشتے کے برتن دھوئے۔ اب بغیر کچھ خریدے وہ کئی گھنٹے محض مروت میں خوار ہوتی رہی۔ اوپر جانے کے بعد اپنے گھر کے ڈھیروں کام اس کے منتظر ہوں گے۔

"کل سے منع کر دوں گی کہ کوئی بہانا بنا کے رک جائے۔ کہیں بیمار نہ پڑ جائے۔ دو تین روز تک رضوانہ آنے والی ہے۔ اسے بھی بازاروں میں پھرنے کا خبط ہے اور خریداری کا ہوکا۔ اس کے ساتھ مل کے شوق پورا کر لے۔ بہت ہوا تو ایک آدھ روز میں ساتھ ہو لوں گی۔" انہوں نے دل ہی دل میں سوچا۔

دوسری طرف چائے کی چسکیاں لیتی کلثوم بھی شاید دل میں کوئی ارادے باندھ رہی تھی۔ اس کا اندازہ انہیں تب ہوا جب خالی کپ سائیڈ پہ رکھنے کے بعد وہ "اچھا آپا! میں ذرا کمر سیدھی کر لوں" کہتی اپنے لیے مختص کمرے کی طرف جانے کے بجائے ان ہی کی مسہری پہ پاؤں سمیٹ کے پھیل گئی۔

"یہ جو لڑکی ہے رفعت' اس کی ماں نے اس کی ابھی کہیں ٹھہرائی ہے یا یونہی تیرے میرے گھر کے کام کرنے کو گھر بٹھا رکھا ہے؟"

نصرت آپا کو اس کی بات پہ تو نہیں البتہ کہنے کے انداز پہ ضرور ناگواری محسوس ہوئی اس لیے سوال کا جواب دینے کے بجائے ٹوکنا زیادہ ضروری سمجھا۔

"شکیلہ بھابھی نے بچوں کی تربیت بڑے مثالی انداز میں کی ہے۔ اس بچی کو کبھی گلی کے کسی دوسرے گھر میں جھانکتے بھی نہیں دیکھا میں نے اتنے سال ہو گئے ان لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے۔ اعظم بھائی نے بڑے دل سے بس ماں رکھا تھا' آپی مانتے میرے لیے بھی بچوں کا پیار فطری ہے۔ ماں کی ہدایت پہ وہ آج کل خصوصی طور پہ نیچے صرف اسی لیے کام کرنے چلی آتی ہے کہ میں اکیلی جان اب مہمان داری کی عادی نہیں رہی۔ ورنہ اللہ میرے ہاتھ پیر سلامت رکھے گھر کے کاموں کے لیے میں کسی پہ بوجھ نہیں۔"

"اوہو آپا! آپ بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہیں۔ میں نے صرف اتنا پوچھا کہ اس کی کہیں منگنی وغیرہ ہوئی ہے؟"

"نہیں۔" انہوں نے سرد آہ بھری۔

"بے چارے اعظم بھائی' اللہ ان کی مغفرت کرے۔ یہ ارمان دل میں لیے ہی دنیا سے چلے گئے۔ ان کے خاندان میں کوئی خاص تعلقات نہ تھے کہ شکیلہ بھابھی کے میکے میں رفعت کے جوڑ کا کوئی لڑکا تھا ورنہ بچیاں عزت سے خاندان میں ہی کھپ جائیں تو آسانی رہتی ہے۔ باہر کے رشتے آئیں بھی تو سو طرح چھان پھٹک کرنی پڑتی ہے۔"

"تو اتنی چھان پھٹک اور سو نخروں کی ضرورت کیا ہے؟ نخرے تب اچھے لگتے ہیں جب پلے کچھ ہو۔ شکل صورت بھی خاص نہیں۔ اوپر سے باپ کچھ چھوڑ کے مرا نہیں۔ بھائی چھوٹے اور زیر تعلیم۔ کرائے کا مکان' خود بھی نوکری نہیں کرتی کہ تنخواہ کا لالچ ہی کھینچ لے۔ ایسے میں آپ کی اس بھابی کو سو شکر ادا کرتے ہوئے پہلی فرصت میں کسی بھی معقول رشتے کو ہاں کر دینی چاہیے۔"

اس بے رحمانہ تبصرے پہ نصرت آپا کا دل کانپ اٹھا۔

"دیکھ بھال کے رشتہ طے کرنا بیٹیوں کی ماؤں کا فرض ہے۔"

"اب مجھے کیا پتا۔ میری ماں تو تھی نہیں۔" وہ کچھ اس انداز میں بولی کہ نصرت آرا پانی پانی ہو گئیں۔ انہیں لگا وہ سارے بگلے' وہ سارے شکوے جو وہ خطوں میں دہراتی رہی تھی' اب ان کے سامنے اگل دے گی۔ وہ اس کے آگے صفائی پیش کرنے کو الفاظ ڈھونڈنے لگیں کہ یکایک وہ موڈ بدل کے پھر پرانے موضوع پہ آگئی۔

"ایک رشتہ ہے تو سہی میرے پاس۔ اسے دیکھا تو سوچا چلو کسی یتیم لڑکی کا بھلا ہو جائے گا۔"

"واقعی؟" وہ خوش ہونے کے ساتھ ساتھ حیران زیادہ ہوئیں کہ اپنے آپ میں مست رہنے والی' اپنی ہی خوشیوں' اپنے ہی غموں میں بسنے والی کلثوم کسی اور کے لیے بھلا سوچ رہی ہے۔

"ہاں' آپ کو بتایا تو تھا میں نے کہ میرے جیٹھ جاوید بھائی صاحب دوسری شادی کے چکر میں ہیں۔ یہاں تو سب جگہ کوشش کر ڈالی۔ اب مجھے بھیجتے ہوئے اسی شرط پہ رضامند ہوئے تھے کہ جا رہی ہو تو کسی بھلے گھرانے کی بھلی لڑکی دیکھ آنا۔ میری جیٹھانی کو بھی اس پہ اعتراض نہیں۔"

کتنی دیر تک وہ ٹکر ٹکر اس کا چہرہ ہی دیکھتی رہیں۔ سمجھ میں نہ آیا کہ اس بات کا جواب کیا دیں۔ ان کی خاموشی سے فائدہ اٹھا کر وہ مزید کہنے لگی۔

"یہ لوگ تو شکر ادا کریں گے' بیٹھے بٹھائے ایسا اچھا رشتہ مل گیا ورنہ اچھی بھلی لڑکیاں گھر بیٹھی بوڑھی ہو رہی ہیں۔"

"اچھی بھلی؟ تو رفعت کیا ہے؟ کس چیز کی کمی ہے اس میں؟" کتنی دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہوئیں تو انتہائی دکھ بھرے لہجے میں یہ سوال کیا۔

"یہ آپ بہتر جانتی ہیں۔ کوئی آسمان سے تو اترنے سے رہا ایسی عام سی لڑکیوں کے لیے انجینئر' ڈاکٹر' افسر لڑکوں کے رشتے ایسی لڑکیوں کے لیے آتے ہیں جن کے باپ بھائی خود بھی ایسی ہی حیثیت کے ہوں۔ جن کے پاس نوکری' حسن اور بھاری جہیز میں سے کم از کم دو خصوصیات تو ہوں۔ اس کے پاس کیا ہے اور اب بتایئے میرے لائے رشتے میں کیا کمی ہے؟"

"یہ تو تم ہی بہتر جانتی ہو۔" انہوں نے اس کی بات لوٹا دی۔ "بہرحال یہ ذکر دوبارہ مت چھیڑنا' کم از کم شکیلہ بھابی کے سامنے تو ہرگز نہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ ان کی دل آزاری ہو۔"

"کمال ہے میں ان کے بھلے کا سوچ رہی ہوں اور آپ منع کر رہی ہیں۔" وہ بھڑک اٹھی۔

"اس میں اس یتیم بچی کا کیا بھلا ہو سکتا ہے کلثوم! تم خود جانتی رہی ہو اپنے جیٹھ کی فطرت و عادات کے بارے میں۔ ایک بیوی کو تو بل لگا چکا ہے' اب دوسری کو گھیرنے کے چکر میں ہے۔ اگر اتنے ارمان جاگ رہے ہیں تو دوسرے بیاہ کے تو کسی درمیانی عمر کی بیوہ یا طلاق یافتہ ڈھونڈ لے۔"

"اب درمیانی عمر کی بیماریوں کی ماری عورت لا کے رکھنے کا کیا فائدہ۔" وہ اصل بات اگل رہی تھی۔ "انہیں ایسی جوان' چوبند' محنتی لڑکی کی ضرورت ہے جو ان کا ہاتھ بٹا سکے۔ بھابی کی کمی پوری کر سکے۔"

"یوں کہو کہ ملازمہ نکاح میں لے کر جانی ہے۔" وہ دکھ سے چور ہو گئیں۔ "اور تمہیں شرم نہیں آتی اس کے اس گھناؤنے منصوبے میں مدد دیتے ہوئے۔ اس معصوم بچی کے مستقبل پہ ترس نہیں آتا۔ کیوں کسی یتیم کی۔"

"کیا میں یتیم نہیں تھی؟" وہ بات کاٹ کے چلائی۔ "کیا مجھ پہ کسی نے ترس کھایا؟ میں بھی تو ملازمہ بن کے رہ رہی ہوں۔"

"اس کا کھوکھلا دعوا' جس پہ وہ خطوں میں تو اعتماد کر لیا کرتی تھیں' اب حقیقت جانتے ہوئے بھی منہ پہ

جھٹلانہ سکیں ورنہ اس کے ٹھاٹھ باٹ اور ظاہری حیثیت اس بات کی نفی کر رہے تھے۔ کوئی عورت اگر اس حد تک خود مختار اور خود اعتماد ہے کہ وہ تین سالوں میں دس لاکھ کے پلاٹ کی قیمت ادا کر دے اور وہ بھی شوہر سے چوری چھپے محض اپنے بل بوتے پر اور جو پچھلے پانچ روز میں کم از کم ایک لاکھ کی شاپنگ کر چکی ہو اور مزید کا ارادہ رکھتی ہو اور جس نے کئی کلو سونا پہن رکھا ہو، وہ ہرگز خود کو ملازمہ یا زر خرید کنیز نہیں کہہ سکتی تھی۔ یقیناً اس نے علی کو اپنے بس میں کر رکھا تھا ورنہ اس کا جیٹھ وہ ایک کائیاں شخص تھا، اس سے بچا کر اتنا روپیہ جمع کرنا خاصا مشکل تھا۔

اور اس وقت وہ ان کے سامنے بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ اور نصرت آپا کا دل سب جانتے بوجھتے بھی اس کے آنسوؤں سے پگھلا جا رہا تھا۔ انہیں افسوس ہو رہا تھا کہ برسوں بعد میکے واپس لوٹی بہن کا دل دکھا۔

"غیروں کے لیے کتنا دل تڑپ رہا ہے آپ کا۔ اب خوفِ خدا کی باتیں سوچ رہی ہیں۔ مجھے سر سے ایک بوجھ کی طرح اتارتے ہوئے کوئی ڈر نہ لگا۔ تب یہ فرائض یاد نہ تھے۔"

"تم علی کا مقابلہ اس رشتے سے تو نہ کرو کلثوم! میں مانتی ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوئی۔ تجربہ تھا نہ عمر، مشورہ دینے کو کوئی بڑا نہ تھا۔ لیکن اپنی طرف سے میں نے ہر ممکن احتیاط کی تھی۔ ہر لحاظ سے تمہارا بھلا ہی سوچا۔ اب میں اکیلی عورت بیرون ملک کیسے چھان بین کراتی کہ ان کا کاروبار کیا ہے۔ پھر بھی علی سے مل کے میں نے جو اندازے لگائے، وہ ایسے غلط بھی نہ نکلے۔ وہ شریف، چاہنے والا اور ساتھ نبھانے والا شوہر ثابت ہوا کہ نہیں؟ ایمان داری سے بتاؤ۔ تمہاری جٹھانی بھی نرم خو اور بھلی مانس لگی۔ تمہارے جیٹھ سے زیادہ سامنا نہ ہوا، اس لیے بھانپ نہ سکی۔ اس کے باوجود تم ان دونوں باتوں کا تقابل نہیں کر سکتیں۔ میں بہت سی باتوں سے انجان تھی، تم تو بے خبر نہیں ہو۔ میں نے دھوکا کھایا، اور تم دھوکا دینے کی کوشش کر رہی ہو، دونوں باتوں میں بہت فرق ہے۔ جانتے بوجھتے ایک معصوم لڑکی کو کس عذاب میں دھکیل رہی ہو۔ وہ پڑھا لکھا بھی ہے، مہذب بھی اور خوش شکل بھی۔ عمر میں بھی تمہارے جوڑ کا ہے جبکہ رفعت اور تمہارے جیٹھ میں کم از کم اٹھارہ بیس سال کا فرق ہو گا۔ وہ ایک اجڈ گنوار جاہل شخص ہے۔ یہ خیال بھی تمہارے دل میں کیسے آیا۔"

"اس لیے کہ ہر انسان کی طرح مجھے بھی اپنے بارے میں اچھا سوچنے کا حق ہے۔ یہ جو زمین میں نے لی ہے اور سالوں سے پائی پائی جوڑ رہی ہوں، اس پہ اپنا مقبرہ بنانے کے لیے نہیں۔ اس تندور سے دور میں اپنے ملک میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ایک خود مختار اور خوشحال زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ علی بے شک لاکھ اچھے ہوں، میرا خیال رکھتے ہوں، مجھے چاہتے ہوں مگر وہاں بھائی کے آگے دم مارنے کی مجال نہیں۔ ایک ہی طریقہ ہے اس عفریت سے جان چھڑانے کا کہ ان کو کوئی کھلونا دے کر بہلا دیا جائے۔ ایسے تو وہ ہمیں نکلنے نہ دیں گے۔ میرا، بشریٰ اور شبانہ کا مستقبل بدل جائے گا تو شاید، بلکہ یقیناً ہمارے وہاں سے نکلنے پہ اعتراض نہ کریں گے۔"

"انتہائی خود غرضانہ سوچ ہے تمہاری۔" انہوں نے تاسف سے سر ہلایا۔

"ہونہہ، آج کل کون خود غرض نہیں ہے۔" وہ چبا کے بولی اور پیر پٹختی ان کے کمرے سے نکل گئی۔ اندر آتے راحیل سے اس کا ٹکراؤ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس کے پرتپاک سلام کا جواب بھی اس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے دیا اور دھڑ سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

"خیریت؟ انہیں کیا ہوا؟" وہ تعجب سے پوچھ رہا تھا۔

"بس ایسے ہی پرائے معاملوں میں خواہ مخواہ الجھ رہی ہے۔" انہوں نے سر جھٹک کر ٹالنا چاہا۔

"پرایا معاملہ؟ مثلاً کیا؟" اگر وہ کل فون پہ ان کی گفتگو نہ سن چکا ہوتا تو شاید اپنی فطرت کے خلاف اتنے تجسس کا اظہار کرتا نہ، لیکن چونکہ اب اس پہ کھل

چکا تھا کہ وہ بھی یہاں کی ستر فیصد خواتین سے الگ مزاج نہیں رکھتیں، اس لیے کھٹک رہا تھا کہ ضرور انہوں نے کسی نہ کسی بات پہ اپنی آپا کی دل آزاری کی ہے۔

"ارے کہنا کچھ نہیں۔ سمجھ بوجھ کچھ ہے نہیں اور پرائی بچیوں کے رشتے بلاتے طے کرانے کا شوق آن سمایا ہے۔ وہی سمجھا رہی تھی میں کہ یہ نازک مسئلے ہیں، بغیر جانے پرکھے ان معاملات میں نہیں پڑنا چاہیے۔ خدانخواستہ کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو عمر بھر کا الزام اور پچھتاوا۔ اسی بات پہ خفا ہو گئی۔ اپنی رفعت کے لیے کسی رشتے کا بتا رہی تھی۔"

"رفعت کے لیے؟" وہ واضح انداز میں چونکا پھر سنبھل کے پوچھنے لگا۔

"کس کا رشتہ تھا؟"

"بس تھا کوئی آوارہ لفنگا۔ کسی جوڑ کا نہیں تھا۔ میں نے تو صاف کہہ دیا کہ شکیلہ بھابی سے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ برا نہ مان جائیں کہ آج ان کی لڑکی کے سر پہ باپ کا سایہ نہیں رہا تو یہ لوگ مذاق اڑانے کی خاطر ایسے واہیات رشتے لانے لگے۔" وہ زیادہ تفصیل میں نہ گئیں مگر ناگواری کا کھلا اظہار ضرور کیا۔

"ویسے شکیلہ آنٹی فکر مند تو ضرور ہوتی ہوں گی؟"

"فطری بات ہے۔ جوان بچیاں ماں باپ کے ہوش اڑائے رکھتی ہیں خصوصاً سفید پوش گھرانوں میں۔ اب بیوہ ہونے کے بعد تو اور بھی فکر لگی رہتی ہو گی کہ اپنی زندگی میں بچی کو عزت سے گھر بار کا کر دے۔"

"کوئی خاص شرائط وغیرہ ہیں ان کی؟ میرا مطلب ہے ذات پات، کاروبار وغیرہ؟"

"لو اس بھلی مانس نے کیوں شرطیں پیش کرنی ہیں۔ شرطیں رکھنے کی بیماری لڑکوں کی ماؤں کو ہوتی ہے۔ بس اتنا ہے کہ گھرانہ شریف ہو، زیادہ امیر کبیر نہ سہی مگر خوشحال ہوں، بچی سکھ چین سے زندگی گزارے۔ مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ کوئی رشتہ ہے کیا نظر میں؟"

"لیجیے میں ابھی خود لنڈورا پھر رہا ہوں، کسی کا رشتہ کیا کراؤں گا۔" وہ ہنس پڑا پھر ان کے مزید نزدیک ہو کے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں تو اپنی تسلی کے لیے پوچھ رہا تھا کہ آیا میں ان جملہ کوائف پہ پورا اترتا ہوں یا نہیں؟ اور دل کو تسلی تو ہوئی ہے کہ خاندان میرا بھی شریف ہے۔ تعلیم یافتہ بھی ہوں۔ عمر کا فرق بھی تین چار سال کا بمشکل ہو گا۔ اور رہی مالی حیثیت کی بات تو اپنے بل بوتے اور زورِ بازو پہ بھی بیوی کو سکھ سے رکھ سکتا ہوں اور ابو جی کی زمین وغیرہ کی آمدنی تو ہے ہی۔ تو پھر کیا خیال ہے؟"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" سب سمجھ کے بھی وہ حیرت زدہ سی پوچھ رہی تھیں۔ ہر بات واضح تھی مگر بے حد غیر متوقع۔

"کمال ہے خالہ جان! میں رفعت سے شادی کی خواہش کا اظہار کر رہا ہوں۔"

"بری بات ہے بیٹا! ایسے کسی بچی کا نام لے کر۔" وہ ناراض ناراض سی نظر آنے لگیں۔ راحیل حیران ہو گیا۔

"میں نے ایسا بھی کیا کہہ دیا خالہ جان! وہ مجھے ہر لحاظ سے ایک اچھی لڑکی لگی۔ محض دوستی یا دل لگی کے لیے نہیں بلکہ عزت سے گھر میں بسانے کے لیے۔ اسی لیے میں نے براہ راست شریفانہ طریقے سے آپ سے ذکر کیا۔ اس میں بھلا کیا برائی ہے؟"

"برائی ہے مگر تم نہیں سمجھو گے۔ تم یہاں اس نیت سے نہیں آئے تھے کہ اپنے لیے لڑکیاں پسند کرتے پھرو۔ تمہارے گھر والے سارا الزام مجھ پہ ڈالیں گے۔"

گھر والوں سے مراد رضوانہ تھی جو اتیلا کے لیے راحیل کا نہ صرف خواب دیکھے بیٹھی تھی اور ایسے میں اگر وہ یہاں، اس گھر میں رہتے ہوئے، رضوانہ کی بڑی بہن کی موجودگی میں بجائے اس کی بھانجی کے، کسی اور لڑکی سے شادی کے ارادے باندھ رہا ہے تو بات خطرے والی ہی تھی۔ رضوانہ اس کا سارا الزام ان پہ ہی ڈالے گی۔ وہ خوف زدہ ہو کے نفی میں سر ہلانے

لگیں۔

"ایسا مت سوچو' راحیل ہوسکتا ہے تمہارے بڑوں نے تمہارے متعلق کچھ اور سوچ رکھا ہو۔"

"ایسا بالکل نہیں ہے۔ شاید آپ کو اندازہ نہیں کہ بن ماں کے بچے دوسرے بچوں کی نسبت اپنے والد سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ میرے ابوجی بھی میرے دوست ہیں پچھلی بار ویک اینڈ پہ جب میں سرگودھا گیا تھا تو انہوں نے میری شادی کا خواہش کا اظہار کیا تھا تب موقع غنیمت جان کے میں نے ان سے ذکر کردیا تھا کہ لاہور میں ایک لڑکی مجھے پسند ہے' اگر آپ مناسب سمجھیں تو۔ وہ یہاں آکر دیکھنے پہ رضامند ہوگئے تھے اس کے اگلے ہی ہفتے انکل کی ڈیتھ ہوگئی تو میں نے یہ سلسلہ فی الحال ملتوی کردیا۔ ویسے بھی ابوجی نے کہا تھا کہ اس کا ذکر اپنی دادی امی یا چچی جان سے کروں تو زیادہ بہتر ہے' عورتیں ایسے معاملات زیادہ خوبی سے آگے بڑھاتی ہیں۔ ان کی نسبت آپ سے میری زیادہ بے تکلفی ہے جس کی وجہ میں خود بھی نہیں جانتا کہ کیسے ان چند ماہ میں آپ کے اتنے قریب آگیا۔ اب آپ کے ہاتھ میں ہے' آپ ہی کچھ کریں۔"

اس کی اس درجہ محبت واپنائیت پہ نصرت آرا کا دل بھر آیا۔ اس کا سر سہلانے لگیں۔ مگر دکھ اس بات کا تھا کہ اپناپن کا یہ مان دینے والے کا مان انہیں خود توڑنا پڑ رہا تھا۔

"میں ایسا نہیں کرسکتی بیٹے! ابھی میں یہی بات تو کلثوم کو سمجھا رہی تھی کہ رشتے اور شادی بیاہ جیسے معاملات انتہائی نازک ہوتے ہیں۔ کسی بھی ناخوشگوار بات کے نتیجے میں کرانے والے کو بھگتنا پڑتا ہے۔ تمہارے اور اعظم بھائی کے خاندان میں بہت فرق ہے۔ بہت اونچ نیچ ہے۔ تمہارے خاندان والے اس بات پہ ہرگز تیار نہ ہوں گے پھر بلاوجہ میں کیوں بیچ میں آؤں۔"

"یعنی آپ میری شادی کے معاملے کو "پرایا معاملہ" کہہ کر جان چھڑا رہی ہیں۔ دیکھئے خالہ جان! میں نے بتا تو دیا ہے کہ میرے ابوجی کو ان کی مالی حیثیت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ نہ ہی وہ میرے لیے کسی جاگیردارنی کو لانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور چاہتے تھے کہ میں خاندان کی کسی لڑکی کو منتخب کرلوں۔ میری پسند سے آگاہ ہونے کے بعد وہ صرف اتنا بولے کہ چلو اچھا ہے خاندان میں انتخاب کرنے کی دشواری سے جان چھوٹی' ورنہ یہی ڈر رہتا کہ جس کی بیٹی لوں گا وہ تو راضی۔ اور باقی سب ناراض۔"

وہ چپ کر گئیں۔ کھل کے رضوانہ کی خواہش بھی نہ بتا سکتی تھیں' اپنے منہ سے اپنی ہی بھانجی کو ہلکا کیوں کرتیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ راحیل بھلے انیلا سے شادی نہ کرتا۔ یہ تو نصیبوں کی بات ہے' کسی کو بھی دلہن بنالیتا۔ رضوانہ رو دھو کے صبر کرلیتی۔ لیکن رفعت سے شادی وہ کبھی معاف نہیں کرپاتے گی اور یہ جرم ان ہی کے کھاتے میں لکھا جائے گا۔

"پرسوں رضوانہ یہاں آرہی ہے۔" بہت دیر بعد وہ بولیں۔

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ آپ ان سے بات بھی کرلیجئے گا اور رفعت سے ملوا بھی دیجئے گا۔"

"ہرگز نہیں۔" وہ تڑپ کے بولیں۔

"میرا مطلب ہے کم از کم ابھی نہیں۔ ابھی کلثوم بھی یہاں ہے۔ وہ یہاں اور مقصد سے آرہی ہے صرف دو چار روز کے لیے۔ ہوسکتا ہے ابھی اچانک اسے تمہاری بات بری لگے اور وہ کوئی ناخوشگوار ردعمل ظاہر کرے۔ میں نہیں چاہتی کہ عرصے بعد تینوں بہنیں اکٹھی ہوں تو کوئی بدمزگی ہوجائے۔"

"مگر آخر وہ اعتراض کریں گی کیوں؟"

"بڑی ہے تمہاری ساس کی جگہ ہے۔ ماں کی طرح ہی پالا ہے اس نے کیا اس کا تم پہ کوئی حق نہیں۔" انہوں نے دبے الفاظ میں جتانا چاہا۔ پتا نہیں وہ سمجھا نہیں' بہرحال مان ضرور گیا۔

"ٹھیک ہے۔ جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ لیکن وعدہ کیجئے جلد ہی آپ میرا یہ کام ضرور کریں گی۔"

وہ وعدہ کرنا نہ چاہتی تھیں مگر انجانے میں سرہلا بیٹھیں۔

☼ ☼ ☼

اگلا سارا دن اسی ادھیڑبن میں گزرا' ایک پژمردگی سی ان کے وجود پہ چھائی رہی۔ کلثوم نے بھی اپنی ناراضی کا کھلم کھلا اظہار کیا۔ پہلے تو آدھا دن کمرے میں بند گزارا' پھر تب نکلی جب رفعت حسب معمول دوپہر کا کھانا پکانے کچن میں جارہی تھی۔

"رہنے دو۔ میرے بچے تنگ آگئے یہ کھانے کھا کھا کر۔ میرے لیے پکانے کی زحمت نہ کرو۔ ہاں اپنی آپا جان کی سیوا میں حاضر ہونا چاہو تو شوق سے جاؤ۔ میں بچوں کے لیے کے ایف سی سے برگر منگوا رہی ہوں۔"

وہ اس چبھتے لہجے پہ حیران پریشان تھی کہ نصرت آرا نے بہانہ بنا کے اسے واپس بھیج دیا۔ جانتی تھیں کہ اب کلثوم اپنی رائے رد کیے جانے پہ ایسا ہی ضد کل پیش کرے گی۔

رضوانہ نے بھی تو ان پہ اعتماد کرتے ہوئے راحیل کو یہاں بھیجا تھا۔ اگر وہ رفعت کا نام لیتا ہے تو لامحالہ یہی سمجھا جائے گا کہ انہوں نے رفعت کو انیلا پہ فوقیت دیتے ہوئے خود آگے آگے کیا۔ چاہیں تو اس قصے سے سہولت سے نمٹنے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ رفعت کی شادی کلثوم کے جیٹھ سے کردی جاتی۔ شکیلہ بھائی کو مطمئن کرنے کے لیے نصرت آرا کی دو ترغیبیں ہی کافی ہوتیں۔ بھلے رفعت کی زندگی خراب ہوتی' کم از کم وہ اس عذاب سے تو نکلتیں۔ کلثوم بھی ان سے راضی ہوجاتی اور رضوانہ سے جھگڑے کا اندیشہ بھی نہ رہتا۔ لیکن بات پھر وہی آجاتی ہے کہ وہ ایسا کرتیں تو کس دل سے کرتیں۔

کیا اس دل سے جو سدا سے محبتیں بانٹنے کا عادی رہا ہے۔ اور جس دل نے کسی کو دھوکا دینا سیکھا ہی نہیں۔ اور جو دل ہر محبت کرنے والے دل کی طرح خوف زدہ رہتا ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ خوف زدہ تھیں۔

یہ بات راحیل بھی بھانپ گیا۔

مگر کس بات سے خوف زدہ تھیں۔ یہ جاننے سے وہ قاصر تھا۔ اس کی بات سنتے ہی ان کے چہرے پہ جو تذبذب اور سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ وہ صاف ظاہر تھی لیکن وہ اس کی وجہ جاننے میں ناکام رہا تھا۔

ساری رات اور سارا دن وہ یہی سوچتا رہا کہ آخر خالہ جان' جو رفعت سے بالکل ماؤں والی محبت کرتی ہیں' اس کے لیے میرے رشتے پہ خوش کیوں نہیں ہوئیں۔

وہ کیا وجہ ہے جو انہیں ہچکچاہٹ میں مبتلا کررہی ہے؟

اگر ان چند ماہ میں نصرت آرا کی پرخلوص' بے ریا اور محبت بھری فطرت پرت در پرت اس کے سامنے ظاہر نہ ہوتی تو وہ یہی نتیجہ اخذ کرتا کہ عام اور سطحی عورتوں کی طرح ان سے کسی کا بھلا دیکھا نہیں جاسکتا۔ مگر ان کے بارے میں تو وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہی بات اسے الجھا رہی تھی۔

"شاید وہ اس بات سے خوف زدہ ہوں کہ میری فیملی کی جانب سے ناپسندیدگی اور مخالفت کی صورت میں ان کے تعلقات شکیلہ آنٹی اور رضوانہ چچی' دونوں سے خراب ہوجائیں گے۔ یقیناً یہی وجہ ہوگی۔" وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا۔

"ان کا دنیا میں اور ہے ہی کون۔ یہ دو بہنیں جو بڑا احسان جتا کر کبھی کبھار خیریت دریافت کرلیا کرتی ہیں یا یہ آس پڑوس والے جنہیں خالہ جان نے اپنی علوات سے گرویدہ کررکھا ہے کس قدر اکیلی ہیں وہ۔ گھر بار اور بال بچے دار عورت کس قدر خود اعتماد ہوتی ہے۔ اپنے شوہر اور سسرال والوں سے اس کے تعلقات کیسے ہی کیوں نہ ہوں' اپنے گھر کا مان ہی اس کا سر اونچا رکھنے کو کافی ہوتا ہے۔ اسے اوروں کی توجہ اور محبت حاصل کرنے کے لیے یوں جھک کے نہیں رہنا پڑتا۔ کہنے کو وہ بڑی ہیں مگر چھوٹی بہنوں کی ناراضی اور لاتعلقی سے اتنی خوف زدہ رہتی ہیں کہ ہر جائز ناجائز بات سہہ جاتی

ہیں۔ شاید بڑھاپے کا خوف انہیں اس رویے پہ مجبور کرتا ہے۔"

راحیل کا دل ان کے لیے بے طرح دکھ رہا تھا۔

"میں انہیں کب سے جانتا ہوں؟ صرف چھ ماہ سے اور ان چھ ماہ میں' میں انہیں اپنے دل کے اتنے قریب محسوس کرتا ہوں تو پھر یہ دونوں بہنیں' جنہیں خالہ جان نے کلیجے سے لگا کے پالا' جوانی ان کے پیچھے برباد کی' بیاہا ان کے دل ان کے لیے موم کیوں نہیں ہوتے۔ اب بھی ان کی عمر بمشکل پینتالیس سال ہوگی۔ جب یہ اپنی چھوٹی بہن کو بیاہ کے فارغ ہوئیں تو تب بھی ان کی شادی کا خیال کیا جاسکتا تھا۔ کم از کم چچی جان ہی کچھ سوچ لیتیں۔ بہت سی عورتوں کی شادی چالیس سال کی عمر تک ہوتی ہے۔ ان کی بھی ہوجاتی۔" ایک اور خیال جھماکے کی طرح ذہن کے پردے پر روشن ہوا۔

"ابو جی بھی تو تب سے اکیلے ہیں جب میں چند برس کا تھا۔ کسی نے خلوص سے ان کا دوبارہ گھر بسانے کا بھی نہیں سوچا۔ نہ ماں نے' نہ بہنوں نے' نہ بھاوج نے' چچی جان چاہتیں تو اپنی بہن کے ساتھ ساتھ جیٹھ کا گھر بھی آباد کرسکتی تھیں مگر انہوں نے ایسا نہ کیا۔ شراکت کون برداشت کرتا ہے چاہے وہ سگی بہن کی ہی کیوں نہ ہو برسوں سے وہ خاندان کی اکلوتی اور خود مختار بہو اور چودھرانی کے مزے لوٹ رہی ہوں۔ کاش ایسا ہوگیا ہوتا۔ اب تو ایسا صرف سوچا جاسکتا ہے۔ اس معاشرے میں بعض جائز اور فرض باتوں پہ بھی اس طرح ناگواری کا اظہار کیا جاتا ہے کہ انسان انہیں کرنے کے بعد خود کو مجرم جاننے لگتا ہے۔ اگر اب یہ خواہش میری زبان پہ آئی تو نجانے کیسے فساد برپا ہوں۔ مجھے اس پہ صرف آہ بھر کے صبر کرلینا چاہیے۔"

☼ ☼ ☼

رضوانہ اکیلی آئی تھی۔ زعیم خاصا اکھڑ اور بقول ان کے بگڑا ہوا بچہ تھا۔ بہ مشکل اسے کس کے رکھا گیا تھا۔ غیر موجودگی میں نہ پڑھائی کی طرف دھیان ہوتا نہ ہی گھر پہ ٹکتا۔ اس لیے وہ انیلا کو بھی نہ لائیں کہ وہ بھائی پہ مقدور بھر نظر رکھ سکے۔ بشیر صاحب اس لیے نہ آئے کہ رشتے اور عمر میں چھوٹی سالی سے خود چل کے ملنے آنا ان کی شان کے خلاف تھا۔ البتہ ایک ادھیڑ عمر سرائیکی بولنے والی ملازمہ ضرور ہمراہ تھی۔ اس کے آنے سے گھر میں غیر معمولی ہلچل مچ گئی' حالانکہ کہنے کو وہ ایک تھی مگر گھر کی خاموش فضا میں ایک ارتعاش سا برپا ہوگیا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گزشتہ دو روز سے ماحول میں عجیب سی کشیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ رضوانہ کے آنے سے نصرت آپا اور کلثوم دونوں اپنی چپقلش وقتی طور پر بھول بھال گئیں۔

ملازمہ کے ساتھ آنے سے نصرت آرا کو رفعت کو کام سے روکنے یا دوسرے الفاظ میں نیچے آنے سے روکنے کا بہانہ مل گیا۔ انہوں نے سہولت سے شکیلہ بھابھی سے کہہ دیا۔

"بہت جان ماری رفعت نے میرے مہمانوں کے پیچھے۔ اس قدر تباہ کن گرمی میں کچن اور بازار کی ہو کے رہ گئی تھی۔ اس سے کہو اب اوپر ہی رہے اور آرام کرے' بلاوجہ نیچے رہے گی تو سستی کی ماری کلثوم کو کوئی نہ کوئی کام یاد آتا رہے گا اسے دیکھ کے۔ یہ ملازمہ آئی ہے نا رضوانہ کے ساتھ۔ گھر کا کام کاج یہ دیکھ لے گی اور رہے بازار کے چکر تو یہ فریضہ رضوانہ جی جان سے ادا کرلے گی۔ اس شوق میں دونوں بہنیں ایک دوجے سے پیچھے نہیں۔"

پھر بھی رفعت ملنے کے لیے ماں کے ساتھ نیچے آئی تو ضرور۔

نصرت آپا کو اس بے ضرر لڑکی سے بھلا کیا خطرہ ہوتا تھا۔ خدشہ تو صرف یہ تھا کہ اسے سامنے دیکھ کے راحیل رضوانہ سے اشاروں کنایوں میں کچھ ایسا ذکر نہ کردے کہ وہ معاملہ بھانپ جائے۔ شکر ہے کہ سارا دن وہ زیر بحث نہ آئی۔ رضوانہ بڑے سرسری انداز میں اس سے ملی۔ البتہ شکیلہ بھابھی سے ان کے شوہر کی وفات پہ رسمی انداز میں تعزیت ضرور کی۔

نصرت آپا کا یہ سکون عارضی ثابت ہوا۔ رات کو تینوں بہنیں جب کمرے میں اکیلی تھیں تو باتوں باتوں میں کلثوم نے پھر سے وہ ذکر چھیڑ دیا جو دو روز قبل دونوں میں وجہ تنازعہ بنا تھا۔

"تم ہی انصاف سے کام لو رضوانہ! کیا کلثوم کی یہ بات درست ہے۔ تم بھی بیٹی والی ہو' کیسے میں ایک بیوہ عورت کی ہائے لوں اس سے غلط بیانی کروں۔ جب بیرون ملک اس کی یتیم بچی پہ بری گزرے گی تو وہ بدنصیب ماں تو جھولی پھیلا پھیلا کے مجھے بددعائیں دے گی۔ کیا ساری عمر کی ریاضت میں ان بددعاؤں کو حاصل کرنے کے لیے گنواؤں۔"

انہوں نے مقدمہ اس کے سامنے رکھا۔ فوری طور پہ رضوانہ سوائے تائید کے اور کچھ نہ کہہ سکی۔

"ٹھیک کہتی ہیں آپا! کوئی غیر لڑکی ہوتی تو انہیں کیا ضرورت تھی تمہاری راہ میں روڑے اٹکانے کی' مگر رفعت سے ان کا دن رات کا تعلق واسطہ ہے۔ وہ بے چاری کہاں اس کی ماں سے گلے شکوے اور طعنے سنتی رہیں گی۔"

"مگر آپا! میرا بھی تو سوچو' علی اپنے بھائی کو اس حال میں چھوڑنے پہ تیار نہیں۔ انہیں دوسرا کوئی کام آتا نہیں۔ اگر ہم دونوں نکل گئے تو حالات ایسے نہیں رہیں گے کہ وہ ملازموں کا خرچا اٹھا سکیں۔ بھابھی آج ہے' کل نہیں اور علی کو تو بس۔۔۔ بھائی کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ نو سال ہوگئے ان کی برین واشنگ کرتے۔ اب کہیں جاکر اس بات پہ نیم رضامند ہوئے ہیں کہ یہ فضول کام دھندا چھوڑ کے پاکستان شفٹ ہوا جائے۔ اس پہ بھی میں نے یہ ظاہر کر رکھا ہے کہ ابا کے حصے کی جائیداد سے آپا نے میرے لیے مکان تعمیر کرانا شروع کردیا ہے۔ یہ کہہ کر کہ پاکستان جانے کے بعد انہیں صرف اپنے کاروبار کے لیے رقم کی ضرورت ہوگی' اب انہیں کیا خبر کس طرح نو سال تک پائی پائی جمع کی ہے۔ ہر قسم کی ہیرا پھیری کی ہے۔ اب راہ میں رکاوٹ ہے تو صرف یہ کہ علی' جاوید بھائی صاحب کو اس حال میں بیمار بیوی اور گرتے ہوئے کاروبار کے ساتھ چھوڑ کے جانے پہ تیار نہیں۔ مجھے اس لڑکی کی شکل میں امید کی ایک کرن نظر آئی تو آپا معترض ہیں۔ میری زندگی میں یہ مشکلات ان ہی کی لائی ہوئی ہیں۔ اس کا مداوا یا ازالہ نہیں کرسکتیں۔ تو کم از کم مجھے اپنے طور پہ ہی اپنی زندگی سہل بنا لینے دیں۔"

نصرت آرا حیرت سے اس کی قینچی کی طرح چلتی زبان کی رفتار ناپتی رہیں۔

"ارے چھوڑو بھی کلثوم! اس لڑکی کے پیچھے کیوں بہن بہن کے تعلقات خراب ہوں۔ تو میرے ساتھ سرگودھا چل' ہمارے مزارعوں میں ایسی بہتیری لڑکیاں ہیں' ان سے تو جھوٹ بولنے کی بھی ضرورت نہیں۔ وہ خود شکر کرکے لڑکی وداع کریں گے۔ غریب گھر کی لڑکی تیرے آگے سر جھکا کے رہے گی۔"

رضوانہ نے نیا مشورہ دیا جس پہ کلثوم نے رک کے غور ضرور کیا اور شاید یہ مشورہ دل کو لگا بھی لیکن اندر سے وہ اس بات پہ پیچ و تاب کھاتی رہی کہ آخر چھوٹی آپا نے بھی بڑی آپا کا ہی ساتھ دیا ہے۔

"آپ کرلیں اس مسکین صورت رفعت کی طرف داریاں اور ہاں میں ہاں ملالیں آپا کی۔ اتنا تو مجھے بھی پتہ ہے کہ رفعت کوئی اکلوتی کنواری لڑکی نہیں' نہ ہی پاکستان میں ایسے ضرورت مند سفید پوش لوگوں کا کال ہے' جو کسی نہ کسی طرح کنواری بچیاں سر سے بوجھ کی طرح اتارنے کے منتظر ہیں۔ میں تو آج ایک ڈھونڈنے نکلوں' دس ملیں گی۔ یہ رفعت پہ میری سوئی اٹکی تو اس لیے کہ تم نے عرصہ پہلے انیلا کے بارے میں سرسری سا ارادہ ظاہر کیا تھا کہ اپنے جیٹھ کے اکلوتے لڑکے راحیل کے لیے امیدوار ہو اور یہاں آکے دیکھا تو آپا محترمہ نے اپنی منظور نظر رفعت بی بی کو آپ کے لاڈلے راحیل کے گرد چکور بنا کے چھوڑا ہوا ہے۔"

"کلثوم۔۔۔" پہلی بار کسی نے نصرت آرا کی اتنی بلند آواز سنی تھی۔

"کچھ خدا کا خوف کرو کلثوم! کیوں کسی کی بیٹی پہ تہمت لگاتی ہو۔" شدت غم و غصہ سے ان کی آواز پھٹ سی گئی تھی۔ رضوانہ بھی ہکا بکا رہ گئی۔ یہ انکشاف تو اس کے وہم و گمان سے بھی آگے کی چیز تھا۔ وہ تو راحیل کو بہن کے گھر بھیجنے کے بعد اب برملا

سب کے سامنے اس پہ اپنا حق جتانے لگی تھی اور تو اور۔ اب اس کی ساس بھی ہمنوا ہو چکی تھیں۔

”نہ میرا رفعت سے کوئی لینا دینا‘ نہ ہی راحیل سے کوئی مطلب ہے پھر میں بغیر کسی وجہ کے جھوٹ کیوں بولوں گی۔ مجھ سے زیادہ دنیا آپ نے دیکھ رکھی ہے۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ آپ ان دونوں کے تعلقات کی نوعیت بھانپ نہ سکی ہوں۔ ایسی ”معصوم“ آج کل ڈھونڈنے سے نہیں ملتی جو منہ بولی تایا کے ہاں بن دام کی ملازمہ بن کے دن رات کام کرے۔ یہ راحیل کی کشش ہے جو اسے یہاں بٹھائے رکھتی ہے۔ میری مہمان داری تو صرف بہانہ ہے اور آپ سب جانتے بوجھتے چپ سادھے بیٹھی ہیں۔“

”کیا یہ ٹھیک کہہ رہی ہے آپا!“ رضوانہ صدمے سے بے حال ہو گئی۔ اس کی نظروں میں شکوک کے سائے دیکھ کے نصرت آپا بھی ہمت ہار گئیں۔ مزید صفائی دینے کا نہ ارادہ تھا نہ حوصلہ۔

”یہ کیا کہیں گی آپا! اس بہانے ان کے گھر کے سارے کام جو مفت ہو جاتے ہیں۔“

”بس کرو کلثوم! اس کرو‘ خدا کا واسطہ ہے۔“ بالآخر وہ ہاتھ جوڑ بیٹھیں۔

”اور رضوانہ! ایسی کوئی بات نہیں۔ رفعت تب سے مجھ سے اور اس گھر سے مانوس ہے جب راحیل یہاں نہیں رہا کرتا تھا۔ وہ تمیزدار‘ حیادار اور باپردہ بچی ہے۔ اب بھی دن کے وقت ہی نیچے آیا کرتی ہے جب راحیل گھر پہ نہیں ہوتا۔ ان دونوں کا تو سامنا ہی شاذونادر ہوتا ہے۔“

صرف اپنی ذات پہ الزام کی بات ہوتی تو وہ خاموش رہنے کو ہی بہتر جانتیں مگر معاملہ ایک شریف لڑکی کی عزت کا تھا‘ اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی صفائی پیش کر رہی تھیں۔

”یہ تو اب پتا چلے گا جب میں بشیر صاحب کے ذریعے اماں اور بھائی صاحب پہ انیلا کے لیے دباؤ ڈالوں گی۔ اگر تو پس و پیش سے کام لیا گیا تو صاف ظاہر ہو گا کہ لڑکا راضی نہیں کیونکہ دادی کی رائے تو پہلے ہی انیلا کے حق میں ہموار ہے اور رہے بھائی صاحب تو انہوں نے راحیل کو مکمل طور پر میری ہی ذمہ داری قرار دیا ہے۔ خدانخواستہ اگر انکار ہوا راحیل کی جانب سے۔ اگر میری کسی نند کی لڑکی آئی تو ان سے تو میں نمٹ لوں گی اور اگر کہیں اس رفعت کا نام بیچ میں آیا تو آپا! میں آپ کو معاف نہیں کروں گی۔“

وہ رونے دھونے لگ گئی۔

اسی لمحے راحیل دروازے سے پلٹا جو ساری گفتگو ایک سکتے کے عالم میں سن رہا تھا۔ ابھی ابھی اسپتال سے آتے ہی وہ سیدھا چچی جان کو یہ بتانے آیا تھا کہ اس کے قریبی دوست کی والدہ ان سے ملنے آنا چاہتی ہیں کہ دروازے پہ ہی ان کی چھوٹی بہن کی تند و تیز آواز سن کے رک گیا۔ وہ ان کے الزامات کی تفصیل سن کر حیران تھا کہ انہوں نے رائی کا پہاڑ کس سرعت سے تعمیر کیا اور ساتھ ہی ساتھ اس پہ چچی جان کی اس دیرینہ خواہش کا بھی انکشاف ہوا کہ وہ اسے انیلا کے حوالے سے اتنی اہمیت اور توجہ دیتی آئی ہیں۔

وہ تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی جانب لوٹ آیا۔

انیلا میں بظاہر کوئی برائی نہ تھی بلکہ ایک لحاظ سے وہ اسے پسند بھی کرتا تھا لیکن اس پسندیدگی کے معنی ہرگز وہ نہ تھے جو پسندیدگی وہ رفعت کے لیے محسوس کرنے لگا تھا۔

انیلا اس کے خاندان کی دیگر لڑکیوں سے ہر لحاظ سے مختلف تھی اور ممتاز بھی۔ اسے تعلیم سے لگاؤ تھا جس کی حوصلہ افزائی وہ ہی اکثر و بیشتر کرتا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی وہ اچھے اطوار کی مالک لڑکی تھی۔ اگر وہ چچی جان کی اس خواہش سے پہلے ہی آگاہ ہوتا تو یقیناً اب تک فطری طور پر انیلا کے لیے اس کے پسندیدگی کے جذبات کوئی اور رنگ اختیار کر چکے ہوتے کہ وہ باطنی خصوصیات کے ساتھ ساتھ ظاہری طور پر بھی دلکش شخصیت کی مالک تھی‘ لیکن اب وہ اس دل کا کیا کرتا جو نامحسوس طریقے سے رفعت جیسی بظاہر عام سی لڑکی کا اسیر ہو چکا تھا۔ جس کو پانا ناممکن نہ تھا مشکل بھی نہ تھا

مگر اس ساتھ سے کسی اور کی زندگی میں مشکلات ضرور پیدا ہو سکتی تھیں۔

اور وہ ذات اس کے لیے اتنے کم عرصے میں اتنی محترم ہو چکی تھی کہ اب وہ اسے مشکلات میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

* * *

نصرت آپا نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ رضوانہ کی یہ غلط فہمی دور کر سکیں۔ پتہ نہیں وہ مطمئن ہوئی یا نہیں مگر وہ بارہ یہ ذکر نہ چھیڑا بلکہ اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ وہ پانچ روز کے لیے آئی تھی مگر تیسرے دن ہی واپس چلی گئی۔ اکیلی نہیں بلکہ کلثوم بھی بچوں کے ساتھ اس کے ساتھ ہی چلی گئی۔ دونوں نے جھوٹے منہ بھی انہیں ساتھ چلنے کا نہ کہا۔

اتنے دنوں کی چہل پہل‘ ہماہمی اور رونق کے بعد آج گھر میں وہی سناٹا تھا جو سالوں سے در و دیوار کا ساتھی تھا لیکن چند دنوں کی رفاقت کے بعد وہ قہقہے‘ آوازیں‘ شور ہنگامہ رخصت کیا ہوئے‘ ایسے لگ رہا تھا جیسے آج وہ پہلی بار اکیلی ہوئی ہوں۔ بار بار ان کا دل بھر آ رہا تھا مگر وہ آنسو روکنے کی برابر کوشش کیے جا رہی تھیں۔

”کیا ہوا آپا! اداس ہو رہی ہیں۔“ پتہ ہی نہ چلا کب شکیلہ بھابی نیچے اتریں اور کب ان کے پاس آ بیٹھیں۔

”او بھابی! آپ آ گئیں۔“

”ہائے لو‘ کن خیالوں میں گم ہیں آپا! ابھی آپ کے سامنے ہی تو راحیل نے پکار کے بلایا تھا۔ میرے جیٹھ کا فون تھا کینیڈا سے‘ وہی سن کر آپ کے پاس آ رہی ہوں۔“

”بڑی جلدی دوبارہ یاد آ گئی تمہارے جیٹھ کو مرحوم بھائی کی اولاد کی۔ وہ تو سالوں میں بات کرنے کے عادی تھے۔ اب مہینے بعد ہی دوسرا فون‘ حیرت ہے۔ خون سفید ہو گیا ہے۔“

”آپا! میں بھی یہی سمجھتی تھی۔ اب خیال آتا ہے‘ ٹھیک ہے وہ بھائی کے مرنے پہ نہ آ سکے۔ آ کے کرتے

بھی کیا' منہ تک تو رکھ نہیں سکتے تھے اور وہ سارے رشتے دار جو ہفتوں یہاں بیٹھے روٹیاں توڑتے رہے' انہوں نے کون سا تیر مار لیا۔ قل' دسویں' چالیسویں کے قورمے کھا کے دوبارہ پلٹ کے نہ پوچھا کہ بچے کس حال میں ہیں' گزارا کیسے ہو رہا ہے۔ ان سے تو یہ اچھے جو بظاہر لاپروا ہیں' مگر دور بیٹھے بھی دھیان تو رکھا۔ کہہ رہے تھے کہ انیق کو اپنے پاس بلوانے والے ہیں' تعلیم بھی مکمل کرائیں گے اور بعد میں وہیں ملازمت بھی دلائیں گے اور جب تک وہ سیٹ نہیں ہو جاتا' سہیل' ربیعہ اور گڈو کی تعلیم کا خرچہ اٹھانے کو بھی تیار ہیں۔ یہاں تک کہا کہ اگر ان کا جبار رفعت سے سات سال چھوٹا نہ ہوتا تو وہ اسے اپنی بہو بنا لیتے۔ کہہ رہے تھے اس کے لیے رشتہ ڈھونڈو' میری اپنی کوئی بیٹی نہیں' اسے میں خود رخصت کروں گا۔" وہ بتاتے ہوئے آبدیدہ ہو گئیں۔

"جزاک اللہ... دیکھا شکیلہ بھابھی! اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے' کوئی نہ کوئی وسیلہ بنا ہی دیتا ہے۔ اب کسے خبر تھی کہ وہ بھائی جو سالوں سے بھائی سے انجان اپنی دنیا میں مست مگن تھا' اچانک ایسی کایا پلٹ ہوگی اس کی کہ یتیم بھتیجے بھتیجی کا آسرا بن جائے گا۔ بس اب تم رفعت کے لیے تلاش جاری رکھو۔"

"آنٹی! اگر آپ برا نہ مانیں تو میں ایک بات کہوں۔" راحیل نے ان کے نزدیک بیٹھتے ہوئے اجازت طلب کی۔ نصرت آرا کا دل یکبارگی دھڑک اٹھا۔ وہ تکیے پہ سر رکھے نیم دراز تھیں' فوراً اٹھ کے بیٹھ گئیں۔

"ایک بہت اچھا رشتہ تو میرے پاس بھی ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس پہ غور کریں۔"

"اچھا۔ کون ہے' کس خاندان کا ہے' کرتا کیا ہے لڑکا؟"

"شریف لڑکا ہے' اچھے گھرانے کا اکلوتا بیٹا اور ڈاکٹر ہے۔"

اس بات پہ اس نے دزدیدہ نگاہوں سے تپا کی جانب دیکھا۔ ان کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔

لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست تھے جیسے وہ خود کو کچھ کہنے سے بمشکل باز رکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

"اور آنٹی! آپ اس سے اور اس کی فیملی سے مل بھی چکی ہیں۔"

"اچھا... مگر کب؟"

"کل۔" اس نے انکشاف کیا اور نصرت تپا کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ وہ ہر لحاظ سے سنجیدہ لگ رہا تھا۔

"کل میرے جس دوست کی والدہ چچی جان سے ملنے گھر آئی تھیں' میں ان کی بات کر رہا ہوں اور یہ لڑکا میرا دیرینہ قریبی دوست ہے جسے میں پچھلے چھ سال سے جانتا ہوں۔ آنٹی یہاں آئیں تو صرف اس لیے تھیں کہ اتنی پرانی دوستی کے ناتے میرا آنا جانا تو ان کے ہاں رہتا ہی ہے لیکن اب تک ایسا اتفاق نہ ہوا تھا کہ میرے کسی فیملی ممبر سے ان کا تعارف ہوتا۔ جب انہیں پتہ چلا کہ میری چچی جان یہاں لاہور آئی ہیں تو مارے اشتیاق کے اور تعلقات بڑھانے کی نیت سے وہ یہاں چلی آئیں مگر آج ہاسپٹل میں ہی انہوں نے فون کر کے مجھے شام کو گھر آنے کی تاکید کی۔ میں گیا تو پتہ چلا کہ انہیں رفعت نے سرسری سی ملاقات میں ہی بے حد متاثر کیا ہے۔ وہ بھی آپ کی طرح بیوہ خاتون ہیں فرق اتنا ہے کہ وہ بھری جوانی میں تب شوہر کی رفاقت سے محروم ہوئیں جب مسیح دس گیارہ برس کا تھا۔ شکر ہے کہ مالی طور پر مستحکم فیملی تھی۔ فنانشل پرابلم نہ ہوئی لیکن جس طرح انہوں نے اکیلے ہی اکلوتے بیٹے کی پرورش کی ہے' وہ کوئی تیز طرار لڑکی لا کے اپنے گھر کے ماحول میں تلخی گھولنا نہیں چاہتی ہیں۔ زمانہ شناس ہیں' ایک نظر میں بھانپ لیا کہ رفعت گھر بسانے اور دل جوڑنے والی ہستی ہے' اس لیے بضد تھیں کہ میں آپ سے ذکر کروں۔ اگر آپ کی رضامندی ہو تو وہ باضابطہ طور پہ آ کے رشتہ طلب کریں۔"

جواب میں شکیلہ بھابھی نے کیا کہا' ان کا ردعمل کیا تھا' یہ سب دیکھنے کا ہوش ہی کہاں تھا تپا کو۔ وہ تو بس حیرت سے راحیل کو دیکھے جا رہی تھیں' جس کا سنجیدہ چہرہ پل کے پل میں رنجیدہ ہوا اور وہ چپ چاپ اٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔ نصرت آپا نے واضح طور پر اس کے قدموں کی لڑکھڑاہٹ محسوس کی۔ ان کا دل کٹ سا گیا۔ ان کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جانا چاہیے تھا اور ہوا بھی' مگر ایک بوجھ کی جگہ اب ایک درد نے لے لی تھی۔

❁ ❁ ❁

درد بھی مستقل مہمان نہیں ہوتے۔
کسک کبھی کبھی تسکین میں بھی بدل جایا کرتی ہے۔
نصرت آرا کے ساتھ بھی یہی ہوا
یہ وہی گھر ہے۔ وہی آنگن...
وہی در و دیوار ہیں... اور وہی چھت۔

پھر بھی بہت فرق ہے۔ بہت فرق... کچھ مکین رخصت ہوئے' کسی کا اضافہ ہوا۔ جو رخصت ہوئے' وہ دل میں جدائی کی کسک کے ساتھ ساتھ نئی منزل تک پہنچنے کی خوشی بھی دے کر گئے۔ جو آئے' وہ گھر کے ساتھ ساتھ دلوں میں بھی جگہ بنا گئے۔

شکیلہ بھابھی اب بھی اوپر رہتی ہیں۔ انیق تو اپنے تایا کے فون کے ڈھائی ماہ بعد ہی کینیڈا چلا گیا تھا۔ رفعت کی منگنی پہ وہ موجود تھا مگر شادی پہ آ نہ سکا۔ اس کے امتحانات ہو رہے تھے مگر اس کے تایا آئے اور پوری شان و شوکت کے ساتھ اسے مسیح کے ساتھ رخصت کیا۔ اس بات کو اب تین سال ہو رہے ہیں۔ اب تو خیر سے دونوں کی ایک پیاری سی ڈیڑھ سالہ بیٹی رودابہ بھی ہے۔ کبھی کبھار دونوں آتے ہیں تو گھر کی ساری فضا' اوپر بھی اور نیچے بھی چہکاروں سے گونج جاتی ہے۔ رفعت ماشاء اللہ اپنے گھر' ساس اور شوہر کے ساتھ بہت خوش ہے۔ اب تو انیق بھی تعلیم مکمل کر کے اپنے پیروں پہ کھڑا ہے۔ شکیلہ بھابھی اب اس کے لیے ایسی ہی بہو تلاش کر رہی ہیں جیسی بیٹی کسی کے گھر روشنی بنا کے بھیجی ہے۔ سہیل انجینئرنگ کر رہا ہے جبکہ ربیعہ نے ایف ایس سی کا امتحان دیا ہے۔ وہ اپنے بہنوئی کی طرح ڈاکٹر بننا چاہتی ہے اور تو اور کھلنڈرا سا گڈو بھی اب قد نکال رہا ہے۔ میٹرک میں جا پہنچا ہے۔

آنگن تو نصرت آپا کا بھی ویران نہیں' چار سال پہلے جب ایک مدت کے بعد تینوں بہنیں اس گھر کی چھت کے نیچے اکٹھی ہوئی تھیں تو حالات اتنے تلخ تھے کہ انہیں اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی امید باقی نہ رہی تھی۔ انہیں لگ رہا تھا' ان کا بڑھاپا تنہائی اور لاتعلقی کا شکار ہونے والا ہے۔ سگی بہنیں اور وہ بہنیں جن کو انہوں نے ماں بن کے پالا تھا' ان کی خود غرضی اور بدگمانی نے انہیں توڑ کے رکھ دیا تھا۔ اس بات پہ بھی انہوں نے ہمیشہ کی طرح صبر سے کام لیا اور جس بے بنیاد الزام کی زد میں آ کر ان کی ذات بے اعتبار ٹھہرائی جا رہی تھی' اس سے سرخرو ہو کے بری ہونے پہ انہوں نے رب کے حضور شکرانہ بھی ادا کیا۔

شاید اللہ کو ان کا یہی صبر اور یہی شکر پسند آ گیا تھا

اور اس نے انہیں نواز دیا۔ ان کا آنگن محبت اور خوشیوں سے بھر دیا۔

اب کلثوم اور رضوانہ دونوں سے ان کے تعلقات پہلے کی طرح خوشگوار تھے۔ کلثوم پچھلے ہی سال اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان شفٹ ہوئی۔ مہینے میں ایک آدھ بار بچوں سمیت ملنے آتی ہے تو اس گھر میں میکے کا بھرپور مان پا کے نئے سرے سے کھل جاتی ہے۔ پردیس میں گزارے دس سالوں کی تنہائی اور سختی کا مداوا ہونے لگتا ہے۔ ماں جیسی مشفق بہن کے ساتھ ماضی میں کیے سلوک پہ ندامت ہونے لگتی ہے۔

اور رضوانہ۔ وہ تو تب ہی راضی ہو گئی تھی' جب اس کے کچھ کہنے یا کرنے سے قبل راحیل کے والد نے خود انیلا کے لیے دست سوال دراز کیا تھا۔ البتہ راحیل کی عائد کردہ شرط پہ وہ ضرور کھٹک گئی تھی۔

❁ ❁ ❁

"نانو۔"

"دادو۔"

انہوں نے سلام پھیر کے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ دیا اور زید ان کے دائیں بائیں لپٹ گئے اور اپنی توتلی زبان میں انہیں پکار پکار کے متوجہ کرنے لگے۔ دعا مانگتے ہوئے' سفید چادر کے ہالے میں لپٹے ان کے نورانی اور پرسکون پاکیزہ چہرے پہ ایک آسودہ سی مسکراہٹ پھیلی۔

"کتنی بار کہا ہے جب کوئی نماز پڑھ رہا ہو تو اسے آواز نہیں دیتے۔"

انہیں آہستگی سے نصرت آرا سے الگ کرتی یہ انیلا تھی' ان کی اپنی انیلا' رضوانہ کی بیٹی' راحیل کی بیوی' ان کی بھانجی' جو عادات و فطرت میں ہو بہو اپنی بڑی خالہ کا پرتو تھی۔ ویسی ہی نرم خو' اتنی ہی با مروت اور ٹوٹ کے چاہنے والی۔ اس کی ان ساری خصوصیات کا اندازہ تو راحیل کو بھی شادی کے بعد ہوا' اور وہ جو صرف نصرت آپا کی خاطر ایثار کرتے ہوئے رفعت کی محبت سے دستبردار ہوا تھا' اب عطیہ خداوندی کی طرح ملے اس ہم سفر کی ہمراہی میں بے حد شاد و مطمئن تھا۔

"آمین۔" انہوں نے دعا مختصر کرتے ہوئے چہرے پہ ہاتھ پھیرا اور دونوں بچوں کو ساتھ لپٹا کے ان کے معصوم چہروں پہ پھونک مارنے لگیں۔ انیلا واپس پلٹ گئی۔ راحیل آنے ہی والا تھا اور وہ اس وقت کچن میں مصروف تھی۔ عصر کا وقت تھا۔ سردیوں کا اختتام اور بہار کا آغاز تھا۔

بڑی خوشگوار اور روشن سی شام اتری تھی اس آنگن میں۔ نصرت آپا نے برآمدے میں بچھے اپنے نماز والے تخت پہ بیٹھے بیٹھے طمانیت سے اپنے گھر کا جائزہ لیا۔ در و دیوار جیسے زندگی کی حرارت سے دمک رہے تھے۔

پھولوں سے مہکتے آنگن میں پھول جیسے دو بچوں نے اپنے وجود کی الگ سی خوشبو پھیلا رکھی تھی۔ دیا اور زید جڑواں تھے۔ سوا دو سال کے ہو رہے تھے۔ بولنا سیکھا تو راحیل نے نصرت آپا کا تعارف ان سے دادو کہہ کے اور انیلا نے نانو کہہ کے کرایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک کی زبان پہ نانو چڑھ گیا اور دوسرے کی دادو۔

راحیل کی شرط یہی تو تھی کہ وہ انیلا سے شادی کرے گا مگر اسے رخصت ہو کے اس کی خالہ جان کے پاس آنا پڑے گا جواب راحیل کی بھی خالہ جان بن چکی تھیں۔ وہ ان کی ذات سے ماں کی محرومی کا ازالہ کرلیا کرتا تھا۔ رضوانہ کو کیا اعتراض ہوتا' اپنی آپا کی طبیعت سے آگاہ تھی۔ وہ تو الٹا مزید مطمئن ہو گئی کہ انیلا شادی کے بعد بھی ماں نہ سہی' ماں جیسی خالہ کے زیر سایہ رہے گی۔

راحیل اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش سے دستبردار ہوا اور اسے زندگی کی سب سے بڑی خوشی نصیب ہوئی۔

نصرت آرا بیٹے کی ماں بن سکیں نہ بیٹی کی مگر جنت پھر بھی ان کے قدموں تلے آ گئی۔ اب وہ نانو بھی تھیں اور دادو بھی۔

❊

رخسانہ نگار عدنان

زندگی اک روشنی

صوفی صاحب کا گھرانہ بہت مذہبی تھا۔ ان کا بڑا بیٹا عبدالمتین قرآن حفظ کرکے اب ایف اے کا امتحان دے رہا تھا۔ وہ شہر جاکر اپنے گھر سے غافل ہو گیا تھا جس پر صوفی صاحب نے اس کا خرچا بند کردیا۔ دوسرے بیٹے عبدالمبین کو قرآن حفظ کرنے مدرسے بٹھایا تھا مگر اس کا وہاں دل نہیں لگتا تھا۔ اور اس نے گھر سے بھاگ جانے کا عہد کررکھا تھا۔ صوفی صاحب ان کے ساتھ خصوصاً بہت سخت رویہ رکھتے تھے۔ آمنہ مڈل میں تو زینب ساتویں میں اور جویریہ پرائمری میں تھی۔ آمنہ بہت قناعت پسند تھی جبکہ زینب اپنے ماحول سے خاصی متنفر تھی۔ زینب اور آمنہ کی دوستی ماسٹر صاحب کی بیٹی کی بھابی جومر سے ہوگئی تھی۔ وہ بے حد بے باک لڑکی تھی۔ کچھ عرصے بعد گاؤں میں اس کی منشی کے بیٹے سلیم کے ساتھ گھر سے بھاگ جانے کی خبر پھیل گئی۔ صوفی صاحب گھر سے باہر بہت حلیم الطبع تھے مگر گھر میں ایک سخت گیر حکمران تھے۔ وہ سید سلطان بخت کے گاؤں میں رہتے تھے۔

سید سلطان بخت، احمد پور شرقیہ کے گدی نشین تھے اور زین تارا نامی ایک طوائف زادی کی زلف کے اسیر تھے۔ سلطان بخت کی منگنی و ٹے سٹے میں ان کی بہن کی نند سے ہو چکی تھی۔ جو ان سے عمر میں سات سال بڑی تھی۔ سلطان کے والد سبطین شاہ تک ان کی سرگرمیوں کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے ان کی شادی طے کردی مگر سلطان بخت نے خفیہ طور پر زین تارا سے نکاح کرلیا اور اب اپنی خاندانی منگیتر سے بھی شادی کر رہے تھے۔

شادی کی تقریبات کے دوران انہوں نے صوفی صاحب کی بیٹی آمنہ کو دیکھا اور اس سے دست درازی کی کوشش کی مگر اسی وقت اس کی والدہ وہاں پہنچ گئیں اور یوں آمنہ بچ گئی مگر سلطان بخت نے اسے حاصل کرنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ آمنہ کی والدہ نے پورا واقعہ صوفی صاحب کو بتایا تو عبدالمتین نے بھی ان کی گفتگو سن لی۔ صوفی صاحب نے سلطان بخت سے خوفزدہ ہو کر اپنا ٹرانسفر بھنجو پورہ کروا لیا۔ عبدالمتین گاؤں آیا تو والدین سے ملاقات نہیں ہوئی اور سلطان بخت کی بہن شہرینہ سے لفٹ لے کر شہر پہنچ گیا اور شہرینہ کے لیے اپنی پسندیدگی کا بھی اظہار کیا۔

معاذ ایک یتیم خانے میں رہتا تھا۔ میٹرک کے امتحان میں اس نے گولڈ میڈل لیا تھا۔ میٹرک کرنے کے بعد وہ یتیم خانے سے نکال دیا گیا تو وہ اپنے دوست ظفر کے ساتھ اس کے گھر اس کے گاؤں چلا گیا۔ وہاں ظفر کی سوتیلی بہن اور سالے نے اسے پھانسنے کی کوشش کی۔ معاذ کے انکار پر انہوں نے اس کے خلاف چوری کا مقدمہ بنا دیا۔ پولیس کے آنے سے پہلے ظفر نے معاذ کو فرار کرا دیا۔ وہ بھاگتے بھاگتے صوفی صاحب کی مسجد تک جا پہنچا۔ صوفی صاحب اس کی مکمل روداد سن کر اس سے بے حد متاثر ہوئے اور اسے اپنے بیٹے عبدالمتین کا پتا دے کر شہر بھیجا مگر معاذ کو عبدالمتین نہ مل سکا۔ اس کا کیپٹن شہباز کی کار سے ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ کیپٹن شہباز نے معاذ کی داستان سن کر اس کی تعلیم کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔

کیپٹن شہباز کی بھابیاں معاذ سے سخت برافروختہ ہوتی ہیں اور اس کو اپنی تنقید کا نشانہ بنائے رکھتی ہیں۔

کیپٹن شہباز کی منگنی اس کی ماموں زاد نزہت سے ہوتی ہے۔ ان کی والدہ ٹانگوں سے معذور تھیں اور ماموں شدید علیل تھے۔ نزہت کے بھائی سہیل نے ایک بدنام زمانہ لڑکی ریشم سے شادی کر لی جس کا تعلق بازار حسن سے تھا جس پر اس کے والد شدید خفا تھے اور نزہت کے لیے فکر مند تھے۔ اسی اثنا میں ان کا انتقال ہو گیا تو کیپٹن شہباز کی والدہ نے نزہت اور شہباز کا نکاح کروا دیا۔ اور رخصتی چہلم کے بعد طے پائی۔ مگر ریشم نے اپنی بدذات فطرت کے تحت نزہت سے انتقام لیا اور اپنی ایک آشنا کے ساتھ مل کر نزہت کو ٹریپ کرنے کی کوشش کی۔ نزہت جب گھر واپس پہنچی تو بھائی نے اسے قبول کرنے سے انکار کر کے گھر سے نکال دیا۔ وہ وہاں سے اپنی دوست شہلا کے گھر گئی۔ بہت منت سماجت کے بعد اس نے ایک رات گزارنے کی اجازت دی۔ اگلے روز وہ اپنی پھوپھو کے گھر کے لیے روانہ ہو گئی۔ وہاں سب نے اس پر طنز کے تیر برسائے۔ کیپٹن شہباز نے بالکل لاتعلقی اختیار کر لی تھی اور پھوپھو نے اسے سخت برا بھلا کہا۔ بعد ازاں ان کا دل موم ہو جاتا ہے اور شہباز کی شادی نزہت سے ہو جاتی ہے مگر اس کی طرف سے نزہت میں دلچسپی مفقود ہے اور نزہت مسلسل بھابیوں کے طنز بھرے جملوں کی زد میں ہے۔

فخر حیات اور رعنا حیات کا ایک ہی بیٹا تھا سفیان۔ فخر حیات کے پاس بے شمار دولت تھی اور وہ ایک خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ وہ بظاہر اپنی بیوی سے مخلص تھے لیکن عیاش طبع انسان تھے۔ رعنا فخر حیات کے بھائی نواز ریلیف ڈیپارٹمنٹ میں ایس ڈی او تھے اور معقول آمدنی رکھتے تھے لیکن ان کی بیوی عفت آرا، رعنا فخر سے بری طرح حسد کرتی تھی۔ رعنا حیات کو فخر حیات کے کردار کے بارے میں کچھ شک ہو گیا ان کی زبردست لڑائی ہوئی پھر صلح بھی ہو گئی۔ فخر حیات نے اچانک بتایا کہ ان کا بزنس دیوالیہ ہو گیا ہے اور وہ سب کچھ سمیٹ کر جاپان جا رہے ہیں۔

۳۱

اکتیسویں قسط

یاد یار کے جیسی
بھیگی بھیگی شام دسمبر کی
بہت کچھ یاد دلاتی ہوئی، زیر لب دہراتی ہوئی
اس کی زلفوں کے شبنمیں قطرے
اور قطرہ قطرہ بھیگی شام دسمبر کی
اپنے دامن میں سمیٹے

بارہ مہینوں کی سرد و گرم زم و تلخ شامیں لیے آئی بھیگی شام دسمبر کی
ہجر کا بوجھ اٹھائے میرا تھکا تھکا سا بوجھل دل، اس کی رخصتی پر نہ ملول ہے نہ شاد ہے
جو میرے بوجھل دل پر دستک دے رہی ہے اور ہولے ہولے اپنی سرد بانہوں میں مجھے لیے کہہ رہی ہے
کل یکم جنوری ہے
اور اس کے بعد تین سو چونسٹھ دنوں کا بھرا بھرا سال
اپنے بوجھل دل کو جواں کر لو، امیدوں کو پھر سے ہرا کر لو
تین سو چونسٹھ دنوں میں اک پل، اک گھڑی، اک دن
ایسا بھی آسکتا ہے، جو ہر زخم کا مداوا بن جائے، دل کی بنجر زمیں کو ہرا بھرا کر دے
کہ زندگی اک روشنی
اک امید سے عبارت رہتی ہے دم آخر تک
امیدوں کو اپنی ہرا کر لو، آنکھوں کو سپنوں سے روشن کر لو
اپنے دل کو جواں کر لو
زیر لب دہراتی ہوئی بھیگی شام دسمبر کی

* * *

صوفی صاحب کو ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے پچیس منٹ ہونے کو آئے تھے جو ملازم انہیں یہاں تک چھوڑ کر گیا تھا اس کے بعد سے ابھی تک کسی ذی نفس نے ادھر قدم نہیں رکھا تھا۔ انہوں نے اکتا کر کوئی گیارھویں بار ڈرائنگ روم کا تفصیلی جائزہ لینا شروع کیا۔ بہت بڑا ہال کمرہ تھا جو کسی گھر کا ڈرائنگ روم کم اور کسی فائیو اسٹار کا سجا سجایا ہال کمرہ زیادہ لگ رہا تھا۔

بیش قیمت فرنیچر، امپورٹڈ بے حد قیمتی قالین اور پردے، چھت سے لٹکے بیش قیمت سنہری فانوس، نادر و نایاب ڈیکوریشن پیسز، دیوار پر لٹکی بے حد قیمتی اور اچھوتے مناظر سے سجی پینٹنگز گھر کے مالک کے ذوق اور دولت کی فراوانی کا پتا دے رہی تھیں۔

"کیا عبدالمتین اتنا امیر ہو گیا ہے محض ان ساڑھے چار سالوں میں؟" انہوں نے ڈرائنگ روم میں داخل ہونے کے بعد سے اب تک خود سے پچاسویں بار یہ سوال کیا تھا۔ وہ تو اس سے ملنے آئے تھے، کسی پدرانہ شفقت، محبت یا جدائی سے بے حال ہو کر نہیں بلکہ اپنے حالات سے عاجز آ کر۔ بہت راتیں جاگ جاگ کر سوچ سوچ کر انہوں نے خود کو اس مجھ کا ڈیرہ آمادہ کیا تھا۔ وہ آج سے پانچ چھ سال پہلے عبدالمتین کو کس طرح دھتکار کر اپنے گھر سے نکال چکے ہیں، اس آخری منظر کو یادوں کے فریم سے نکال کر۔

"عبدالمتین میرا سب سے لائق، ذہین، فرمانبردار اور سمجھدار بیٹا ہے، وہ میرے ان حالات کو ضرور سمجھے گا اور میرے کہنے سے پہلے ہی سب کچھ جان جائے گا، ساری ناراضی کو بھلا دے گا مجھ سے دل سے پیار جو کرتا ہے، مجھے یقین ہے۔"

یہ آخری سوچ تھی جو بار بار ان کے دل کے دروازے پر دستک دیے جا رہی تھی جس کی ٹھک ٹھک سے مجبور ہو کر وہ آج عبدالمتین سے ملنے چلے آئے تھے جو بیرون ملک سے اعلا تعلیم مکمل کر کے واپس آ چکا تھا۔

"جی فرمائیے، کس سے ملنا ہے آپ کو؟" کمرے کی ٹھنڈی خاموشی میں اچانک ابھرنے والی اس آواز نے انہیں

بے اختیار چونکا دیا۔ چھریرے بدن کا دراز قد ادھیڑ عمر شخص سلیٹی کلر کا نو پیس پہنے آنکھوں پر نازک شیشوں کی خوبصورت عینک سجائے استفہامیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"جی عبدالمتین سے وہ" وہ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا۔ عبدالمتین سے۔" اس آدمی نے سر ہلایا۔

"او کے میں بھجواتا ہوں اسے' ویسے وہ ابھی نکلنے ہی والا تھا آفس کے لیے۔ بائی دا وے آپ اس سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟" وہ جانے کے لیے کھڑا تھا پھر یکدم رکتے ہوئے بولا۔

"جی میں۔" صوفی صاحب کی زبان کبھی اس طرح لکنت زدہ نہیں ہوئی تھی۔ وہ آج تک کسی کے سامنے اس طرح نہیں ہکلائے تھے حتیٰ کہ سید سبطین شاہ کے سامنے بھی وہ بے حد اعتماد سے بات کر لیا کرتے تھے مگر آج تو جیسے ان کی زبان ان کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔ اس بے حد قیمتی گھر کی طاقت انہیں مغلوب کر رہی تھی یا اپنی کمزوری کہ ان سے بات نہیں ہو پا رہی تھی۔

"میرا خیال ہے۔ آپ اس کے مولوی صاحب ہوں گے اس کے گاؤں میں۔ بتایا تھا اس نے مجھے اور آپ کے حلیے سے میں نے آپ کو پہچان لیا۔ بہت عزت کرتا ہے وہ آپ کی کہ کس طرح ماں باپ کے مرنے کے بعد آپ نے اس کی دینی و دنیاوی تعلیم کا خیال رکھا۔ ایسے اچھے نیک لوگ آج کے زمانے میں کم ہی پائے جاتے ہیں جو عبدالمتین جیسے یتیم بے سہارا بچوں کے سر پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ اینی دے میں اسے بھیجتا ہوں جا کر۔ جو چاہیے ہو گا کھل کر بیان کر دیجئے گا اب اس کے پاس روپے پیسے کی کچھ کمی نہیں۔ آپ کے سب احسان اتارنے کے قابل ہو چکا ہے وہ۔" وہ بے حد فخر سے بتا رہے تھے۔

"میرا داماد ہے وہ گھر داماد بعد میں پہلے میرا بیٹا ہے۔ بہت اچھا بہت نیک لائق اور فرمانبردار' بیٹھیں آپ میں کچھ آپ کی تواضع کو بھی بھجواتا ہوں۔"

وہ شخص صوفی صاحب کے قدموں کے نیچے سے زمین سرکا کر انہیں بیٹھنے کو کہہ رہا تھا۔

"یتیم' بے سہارا۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد۔" صوفی صاحب کے کانوں میں جیسے سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ چیت ہاڑ کے مہینوں میں چلنے والی تیز گرد آلود آندھیوں کی سیٹیوں! آندھی کا طوفانی شور۔

انہیں لگا یہ شور' یہ آندھی انہیں بھی اڑا کر لے جا رہی ہے۔ ان کے قدم زمین سے اکھڑ رہے تھے مگر جسم جیسے کسی چٹان کے نیچے دبا جا رہا تھا۔ ہلنے سے قاصر۔ ان کا نفس تیز تیز چلنے لگا۔ سینے کے بائیں جانب ہلکا ہلکا درد اس آندھی کے شور میں بھی صاف اپنے ہونے کا پتا دے رہا تھا۔ ان کی پیشانی پر پسینے کے ننھے منے قطرے چمکنے لگے۔ درد کو ضبط کرنا دشوار ہو رہا تھا۔

"سونا! تم پلیز گاڑی میں بیٹھو جا کر۔ میں تو کسی مولوی کو نہیں جانتا۔ پاپا بھی حد کرتے ہیں۔ ہر ایک سے کرٹسی (مروت) نبھانے بیٹھ جاتے ہیں' چاہے وہ شخص جان پہچان کا ہو یا نہ ہو۔ تم گاڑی میں بیٹھو۔ میں ایک منٹ میں آیا۔" عبدالمتین کی آواز انہوں نے اس آندھی کے ہولناک شور میں بھی باآسانی پہچان لی تھی۔ جیسے ہی عبدالمتین نے کمرے میں قدم رکھا۔ آندھی' اس کا جان لیوا شور' طوفان سب کے سب ایک دم سے غائب ہو گئے۔

کمرے میں بس اے سی چلنے کی ہلکی سی گھوں گھوں تھی یا عبدالمتین کے آخری جملوں کی بازگشت۔ انہوں نے زخمی نظروں سے گردن گھمائے بغیر اپنے لخت جگر کو دیکھا جس کی آنکھوں میں ایک پل کو پہچان کی لہر سی ابھری تھی اور دوسرے پل ڈوب گئی۔ اس کا ماتھا شکنوں سے اٹ گیا۔ ہونٹ بھینچ گئے اور چہرہ تن گیا۔ آنکھوں میں سوا بے حد سرد پہچان کے بجھے بجھے سے دیئے ٹمٹما رہے تھے۔

"تم۔۔۔" آواز اتنی مدھم تھی کہ صوفی صاحب نے بمشکل سنی۔

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟ آپ کا اب مجھ سے کیا تعلق ہے۔ آپ تو مجھے اپنی زندگی سے نکال چکے ہیں اور۔۔۔ اور میں بھی آپ کو بھول چکا ہوں تو پھر۔"

"بھول نہیں چکے' تم ہمیں مار چکے ہو۔" خود پر قابو پا کر صوفی صاحب اونچی آواز میں غرائے۔

"بے شرم' بے غیرت۔ بے حیا انسان! جیتے جی والدین کو قبر میں اتار دیا' روپے پیسے کی خاطر خود کو یتیم بنا لیا' ارے اس طرح تو جھوٹے بھکاری بھی نہیں کرتے۔ چند سکوں کی خاطر وہ بھی ایسا جھوٹ بولنے سے پہلے۔۔۔"

"بس کریں۔" وہ ہاتھ اٹھا کر دبی آواز میں غرایا "میں نے جھوٹ بولا یا سچ آپ کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں آپ کو نہیں جانتا آپ نے خود مجھے دھتکارا تھا۔ اپنی زندگی سے نکال پھینکا تھا اور جو لوگ زندگی سے نکل جاتے ہیں وہ زندہ بھی ہوں تو بھی مر جاتے ہیں اور میرے لیے آپ لوگ اسی دن مر گئے تھے جب آپ نے مجھے دھکے دے کر نکالا تھا۔" اس کا لہجہ ہر قسم کی پہچان سے عاری تھا۔

"عبدالمتین! یہ تم۔ ہو۔ تم؟" وہ بمشکل بول پائے۔

"ہاں یہ میں ہوں۔ اتنے برس آپ نے میری خبر نہ لی' اب پتا چلا ہو گا کہ میں کیا بن چکا ہوں' چاہوں تو آدھا شہر خرید کر جیب میں ڈال سکتا ہوں تو آپ کے پتھر دل میں میری محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اگر والدین آپ کی طرح بے حس ہوں تو اولاد کے دل بھی پتھر کے بن جاتے ہیں۔ وہ بھی ایسے موقع شناس والدین کے ہونے سے یتیم ہونا بہتر سمجھتے ہیں۔" وہ بڑی نفرت سے پھنکار رہا تھا۔

"بہرحال میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے کہ میں آپ کو آئینہ دکھاتا پھروں آپ کو یقیناً پیسوں کی ضرورت ہو گی جس کے لیے آپ نے اپنی سنگلاخ انا کو کچل کر مجھ تک آنا گوارہ کیا۔ یہ کچھ روپے ہیں' رکھ لیں اور مجھے ایڈریس دے جائیں۔ ہر ماہ آپ کو ایک معقول رقم بھجوا دیا کروں گا۔ آپ کو دوبارہ ادھر آنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ہزار ہزار کے سات آٹھ نوٹ نکال کر ان کے سامنے میز پر پھینکے اور باہر کی سمت مڑنے لگا۔

"ایڈریس لکھوا دیں مجھے۔" جانے سے پہلے رکتے ہوئے اس نے کہا اور جیب سے چھوٹی سی انڈکس اور پین نکال کر بولا۔ صوفی صاحب نے ایک افسوس بھری نگاہ اس پتھر دل بیٹے پر ڈالی جس کی پیدائش کی خوشی میں کئی دن اور راتیں سو نہیں سکے تھے۔ اس ننھے وجود نے انہیں کئی دن تک نہال رکھا تھا۔ تو یہ تھی وہ خوشی! مستقبل کی امید! آنے والے کل کا سہارا۔

انہوں نے سینے میں کب کا رک رک کر آتا سانس بڑی سہولت سے خارج کیا۔ ایک نظر میز پر پڑے ان نیلے نوٹوں پر ڈالی' خود کو لحہ بھر میں جمع کیا' زمین میں گڑے قدم اٹھائے اور باہر کی طرف بڑھے۔

"ایڈریس تو لکھوا دیں۔" عبدالمتین نے انہیں پکارا۔

"اس کی ضرورت نہیں اور تمہیں معلوم نہیں مُردوں کے ایڈریس نہیں ہوا کرتے' قبرستان چلے جاؤ۔ کسی بھی مٹی کی ڈھیری بے نام قبر پر ہاتھ رکھ کر کہہ دینا یہ میرے ماں باپ کی قبریں ہیں۔ دل چاہے تو کبھی کسی بے نام قبر پر فاتحہ پڑھ لینا اگر تمہارا اسٹیٹس اس کی اجازت دے۔ اللہ تمہیں ہدایت دے اور کبھی تمہیں زندگی میں ایسے حالات سے دوچار نہ کرے کہ تمہاری اولاد کو تمہیں جیتے جی قبر میں اتارنا پڑے اور اس درد کا زہر تمہیں کھڑے کھڑے مار ڈالے۔ کھڑے کھڑے منوں مٹی تلے اتار دے' منوں مٹی تلے۔" ان کی آنکھوں میں آئی نمی نے اب واضح شکل اختیار کر لی تھی۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھے اور باہر نکل گئے۔ عبدالمتین نے جھک کر نوٹ اٹھائے جیب میں ڈالے اور باہر نکل گیا۔

"ابھی جاؤ' اتنی دیر لگا دی۔" اس کی بیوی گاڑی میں بیٹھی ناگواری سے بولی۔

"کون تھا تمہارا وزیٹر؟" جیسے ہی وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا مونا نے پوچھا۔

"کوئی نہیں۔" اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔ مونا نے ایک نظر اس کے سپاٹ چہرے کی طرف دیکھا اور کندھے اچکا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی اس نے شاید صوفی صاحب کو باہر جاتے نہیں دیکھا تھا جیسے ہی گاڑی مین روڈ پر پہنچی۔ سرخ سگنل کے اشارے پر رکتے ہوئے عبدالمتین نے دائیں طرف فٹ پاتھ پر بیٹھے صوفی صاحب کو دیکھا۔ وہ گولیوں کی شیشی میں سے ایک گولی نکال کر اپنی زبان کے نیچے رکھ رہے تھے۔

"متین! تمہارے پاس کچھ ریزگاری ہوگی؟"۔ مونا کی آواز پر اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"نہیں۔" وہ سرد مہری سے بولا۔ "کیوں؟"

"بیچارا بابا جو دوائی کھا رہا ہے اس کو دینے ہیں کتنا غریب لگ رہا ہے کپڑوں پر پیوند لگے ہیں۔ ویسے لوگ بڑے اصل مستحق ہوتے ہیں۔ تھینک گاڈ کہ اس نے مجھے غریب نہیں بنایا ورنہ۔ توبہ غربت تو بہت مشکل زندگی ہے۔ چینج ہے تمہارے پاس؟۔"

"نہیں۔" پہلا سگنل کھلتے ہی عبدالمتین نے تیز رفتاری سے گاڑی آگے بڑھادی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا گاڑی کسی اندھی کھائی میں دے مارے۔

* * *

"ہاں۔ ادھر سے دبا ذرا زور سے۔ جان نہیں ہے تیرے ہاتھوں میں۔" سیدہ نے تیز لہجے میں کہا۔ گاؤں کی دائی نیچے زمین پر بیٹھی ان کی پنڈلیاں اور پاؤں دبا رہی تھی۔ گزرتے وقت نے سیدہ کو جوڑوں کے درد اور بڑھاپے کا تحفہ دیا تھا۔

"ہاں ادھر سے۔" سیدہ نے پرسکون انداز میں آنکھیں بند کیں کچھ دیر یوں ہی گزری۔

"صالحہ بی بی کے پاؤں دبا آئی ہو؟"

"نہیں جی میں گئی تھی ان کے کمرے میں وہ سو رہی تھیں۔" وہ سر جھکائے ہوئے بولی۔

"اتنا سوتی ہے یہ صالحہ نہیں کمبخت پھر نہ لڑکی ہو۔" سیدہ منہ میں بڑبڑائیں۔

"جی آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟" دائی نے سن کر بھی انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تیرے کان بڑے بجتے ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھ۔" انہوں نے ایک ہلکی سی لات اس کے گھٹنے پر ماری۔

"تیرا اندازہ کیا کہتا ہے کب تک ہوگی صالحہ بی بی کے ہاں بچے کی پیدائش؟" چند لمحوں کے بعد سیدہ نے پوچھا۔

"اگلے مہینے چڑھتے چاند کی پہلی تاریخیں جی۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

"ہوں۔ ڈاکٹر بھی یہی کہہ رہی تھی۔ اللہ کرے اس بار ہماری امیدیں بر آئیں۔ پانچ سالوں میں تین بیٹیاں بھی اس حویلی میں پہلے نہ ہوئی تھیں۔ اب تو کان بیٹے کی آواز سننے کو ترس گئے ہیں۔ کب اس حویلی کا وارث پیدا ہوگا۔" وہ حسرت بھرے لہجے میں بولیں۔

"آمین اللہ سوہنا اس بار یہ خوشی ضرور دکھائے گا جی۔" دائی خوشامدی لہجے میں بولی۔

"وہ الٹرا ساؤنڈ کرائی ہے جی؟"

"نہیں۔ ہمارا ان چیزوں پر یقین نہیں اللہ کے شریک بنتے ہیں یہ لوگ ہم تو اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں اور مجھے یقین ہے وہ اس بار ہماری ضرور سنے گا۔" سیدہ نے دوسری ٹانگ اس کے آگے کی۔

"مجھے اس بار اللہ کے کرم سے پوری امید ہے اس بار تو صالحہ کی ساری نشانیاں ہی الٹ ہیں۔ چال بھی بدلی ہوئی ہے۔ میرا تو دل کہتا ہے بیٹا ہی ہوگا اس بار۔ دیکھنا پورے سال کا جشن مناؤں گی گاؤں بھر میں۔ اللہ ہمیں یہ خوشی

دکھاوے۔" سیدہ جوش میں آکر بولیں۔

"تیرا منہ موتیوں سے بھروں گی۔ پکا کوٹھا پانچ سال کے دانے اگر ابھی ولواد دوں گی کپڑا لتا اتنا کہ تیری آل اولاد ایک پھاڑے ایک اتارے پھر بھی ختم نہ ہوگا۔" سیدہ ہونے والے بچے کے خیال سے ہی خوشی میں بولے جا رہی تھیں۔

"آمین جی ثم آمین! انشاء اللہ جی اللہ سوہنے کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔ بیٹا ہوگا جی اس بار شاہ جی کے گھر۔ میں تو سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ایک ہی تسبیح کرتی ہوں کہ اللہ سائیں اس بار حویلی کے وارث کی شکل دکھائے ہم سب کو۔ بادشاہوں جیسا نصیب لے کر پیدا ہو زمینوں حویلیوں میں اضافہ ہو۔ دھن دولت میں برکت ہو۔" دائی کے ہاتھوں میں طاقت بڑھ گئی تھی اور رفتار بھی۔ وہ بڑی لگن سے دبا رہی تھی۔

"انشاء اللہ انشاء اللہ۔" سیدہ سرہلا کر بولیں۔

"ایک بات کہوں جی؟" چند منٹوں بعد دائی پھر سے بولی۔

"ہاں بولو۔" سیدہ نے پھر ٹانگ بدلی۔

"وہ جی میرے پتر کا سنگی دوست ہے طارق شہر میں ڈاکٹری پڑھ رہا ہے بلکہ پڑھ لی ہے اس بار پنڈ آیا تو بڑی دیر ڈیرے میں بیٹھا باتیں کرتا رہا اس نے ایک بڑی عجیب بات کہی جی۔" دائی نے پاؤں کی انگلیاں آہستہ آہستہ دباتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" سیدہ نے خمار سے پر آنکھیں ذرا کھول کر پوچھا۔

"وہ کہہ رہا تھا جی عجیب سی بات ہے پر یہ تو ہمارے بڑے سیانے بھی کہتے ہیں کہ رزق عورت سے اور اولاد مرد کے نصیب سے ہوتی ہے۔ پر کہہ رہا تھا سائنس (سائنس) کہتی ہے کہ اگر مرد کے گھر لگاتار لڑکیاں ہوں تو ڈاکٹر اس کا بھی علاج کرتے ہیں جس سے پھر لڑکے پیدا ہونے لگ جاتے ہیں اور۔۔۔"

"کیا بکواس کی تو نے؟" سیدہ نے ایکدم سے ٹانگیں کھینچیں۔

"دفع دور۔ حرامزادی کتیا۔ میری باوضو زبان کو پلید کیا تو نے مسلنڈی تیرا مطلب ہے شاہ جی میں نقص ہے خیال ہے علاج کرائیں اپنا۔ حرام خور! تیرا نہ علاج کراؤں میں۔ تیرا بھیجا نہ درست کراؤں میں۔ تجھے الٹا لٹکا کر۔" سیدہ نے ہاتھوں اور لاتوں سے دائی کو پیٹنا شروع کردیا۔

"نئیں سائیں۔ نئیں بیگم صیب میرا یہ مطبل (مطلب) نئیں جی۔" لاتیں گھونسے اسے بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہے تھے۔

"دفع دور ہو جا یہاں سے کتیا۔ آئندہ میں تیری صورت نہ دیکھوں۔ اس حویلی کے ارد گرد ہزار کوس کے اندر۔ نہ تو نہ تیری آل اولاد کی۔ دور ہو جا میری نظروں کے سامنے سے۔ بشیراں فیضاں رسولاں۔ کہاں مر گئیں سارنی ہو جکے دے کر نکالو اس حرام خور کو۔" سیدہ کی چیخ و پکار پر آنا" فانا" ساری ملازمائیں اکٹھی ہو کر آگئیں اور چند منٹوں میں روتی دھوتی معافی مانگتی دائی کو اٹھا کر حویلی سے باہر پھینک آئیں۔ سیدہ کا جلال بھرا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ ہاتھ دائی کو مار مار کر سرخ ہو چکے تھے اور ہونٹ ہولے ہولے کپکپا رہے تھے۔

"نمک حرام بے غیرت بکواس کرتی ہے آگے سے۔ شاہ جی اپنا علاج کرائیں۔ رسولاں ٹھنڈے جوس کا گلاس لے کر آ میرے لیے جلدی سے۔" سامنے سے آتی ملازمہ کو دھاڑ کر انہوں نے حکم دیا۔ وہ الٹے قدموں پلٹ گئی۔

"خیر تو ہے تایا! کس پر چلا رہی ہیں اس وقت؟" سلطان بخت اندر داخل ہوئے مسٹرڈ کلر کا سفاری سوٹ پہنے ہاتھ میں گولڈن کی چین گھماتے وہ کہیں جانے کو تیار دکھائی دے رہے تھے۔ دونوں کنپٹیوں پر سفید گرے بال مل جل کر ان کی میچورٹی کا اعلان کر رہے تھے۔ چہرے کا رنگ البتہ اسی طرح سرخ و سفید تھا۔ مضبوط توانا جسم کڑی کمان کی طرح تنا تھا۔ سیدہ نے دل ہی دل میں بھائی کی نظر اتاری۔

"میرے صحت مند شہزادے کو تو کسی کالی زبان والی کی بدخواہ کی نظر نہ لگے۔ سات بیٹوں کا منہ دیکھے' خوشی' دھن دولت اس کی چوکھٹ کی لونڈی رہے۔" وہ دل ہی دل میں بھائی کی بلائیں اتار رہی تھیں۔

"بھئی اک نمک حرام۔ دفع کرو اس کے ذکر کو۔ تم کہیں جا رہے ہو؟" وہ اب خود پر قابو پا چکی تھیں۔ آرام سے بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"بھول گئیں آپ' آج ہماری ملٹی نیشنل کمپنی کی سب برانچ کی افتتاحی تقریب ہے وہیں جا رہا ہوں۔ کل تک واپسی ہوگی۔ حسین شاہ تو آئیں گے نا' ادھر آپ نے تاکید کی تھی؟"

"ہاں کی تھی' دیکھو کہہ تو رہے تھے آگے ان کی مرضی' تم شام تک واپس نہیں آسکتے؟۔"

"کیوں خیریت' کوئی کام ہے؟۔"

"کل بابا چراغ شاہ کے مزار پر چادر چڑھانی ہے۔ لنگر تو خیر ادھر ایک ماہ سے جاری ہے۔ حویلی کی طرف سے سو محتاجوں کو کھانا کھلایا جا رہا ہے۔ کل حضرت پیر ولی کے سرکار بھی جانا ہے۔ انہوں نے آخری تعویز دینا ہے۔ اس کے بعد تو ضرورت نہیں جانے کی۔ بس پھر خوشی کی دیگیں چڑھانے ہی جائیں گے۔" وہ جلدی جلدی بتانے لگیں۔

"آپا! آپ خود ہی ہو آیئے گا میں رات کو جانے کب فارغ ہوتا ہوں۔ آج کل رات کا سفر یوں بھی تماشا ذنجیر ہو چکا ہے۔ میں کل صبح ہی آسکوں گا۔"

"کل صالحہ نے چیک اپ کے لیے بھی جانا ہے۔"

"معلوم ہے مجھے۔" ان کے چہرے کے تاثرات ایک بدل گئے تھے پیشانی پر ناگواری کی شکنیں ابھر آئیں۔

"کل ڈاکٹر مکمل چیک اپ کے بعد ایکوریٹ ڈیٹ بتا دے گی۔ الٹرا ساؤنڈ بھی کرے گی اور دوسرے ایک دو ٹیسٹ بھی۔" سیدہ نے بھائی کی ناگواری کو محسوس کرنے کے باوجود بیان جاری رکھا۔

"کل اس سے معلوم کر لیجیے گا اس بار صالحہ بی بی کیا "گل" کھلانے والی ہیں۔" وہ طنز سے بولے۔

"اللہ کا نام لو سلطان شاہ! پچھلی بار تیسری بیٹی کی دفعہ اتفاقاً" صالحہ کو پہلے علم ہو گیا تھا کہ بچی ہونے والی ہے تو دیکھا کیسا ڈیپریشن ہوا تھا اسے' مرتے مرتے بچی تھی۔"

"مری تو نہیں تھی نا۔" وہ تلخی سے بولے۔

"اور میں مروں گی بھی نہیں' بے فکر رہو تم۔ تمہارے سینے پر مونگ دلنے کو زندہ رہوں گی ہزاروں برس تک بلکہ اس سے بھی زیادہ۔" صالحہ جانے کب کمرے میں داخل ہوئی تھی اور سلطان بخت کا آخری جملہ سن کر تیزی سے دھاڑی۔

"اور تم مرنے والی ہو بھی نہیں۔ مر بھی جاؤ گی تو تمہاری منحوس روح میری زندگی کے پیچھے پڑی رہے گی۔ میں نے تو اب اس گھڑی کو بھی رونا چھوڑ دیا ہے جب تم میری زندگی کو عذاب بنانے چلی آئی تھیں۔" سلطان بخت نفرت بھرے لہجے میں بولے۔

"عذاب تو میں سہ رہی ہوں اس دوزخ میں آنے کے بعد۔"

"ہنہ۔ تم عذاب سہ نہیں رہیں' عذاب پیدا کر رہی ہو۔ ہر سال ایک ننگی تلوار ایک بیٹی کی شکل میں' ایک عذاب کی صورت میں میری زندگی پر مسلط کر رہی ہو منحوس عورت۔" سلطان بخت غصے سے چلائے۔

"سن رہی ہیں آپ یہ ساری بکواس۔" صالحہ ہانپتے ہوئے چلائی۔

"سن رہی ہیں' دیکھ رہی ہیں اور بھگت رہی ہیں تمہاری صورت میں جیتا جاگتا عذاب کا تحفہ۔ چیخنے کی ضرورت نہیں۔" سلطان بخت نے دانت پیستے ہوئے باہر کا رخ کیا۔

"ہمت ہے تو یہاں کھڑے ہو کر مقابلہ کرو۔ میں سے میں بھگت رہی ہوں' جیتے جی برزخ میں جل رہی ہوں۔ پتا

نہیں کب میرا چھٹکارا ہوگا اس سے۔" وہ لہرا کر گرنے کو تھی کہ سیدہ نے لپک کر اسے تھاما۔

"صالحہ! صالحہ! ہوش کرو کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑی ہو' وہ تو بے وقوف ہے تم تو نادان نہیں۔ رسولاں! کہاں مر گئی جوس لے کر آ جلدی سے۔" سیدہ کی پکار سلطان بخت نے پورچ کی طرف جاتے ہوئے سنی اور ہونہہ کہتے ہوئے گاڑی کا لاک کھولنے لگے۔

❀ ❀ ❀

"گریجویٹس نوجوان فرینڈ' اکن فرینڈلیڈی ٹیچرز کی فوری ضرورت ہے۔ ڈاکومنٹس ہمراہ لائیں' انٹرویو کل صبح نو بجے ہوگا معقول تنخواہ اور الاؤنسز دیے جائیں گے۔"

"پڑھا تم نے؟۔" آمنہ نے اونچی آواز میں پڑھتے ہوئے زینب سے پوچھا۔

"پڑھنے کی ضرورت نہیں پڑی تم نے جو سنا دیا ہے۔"

"کیا خیال ہے پھر؟۔" آمنہ کچھ بے تابی سے بولی۔

"کس بارے میں؟۔"

"بھئی اپلائی کرنے کے بارے میں؟۔"

"تم نے پڑھا نہیں انہوں نے گریجویٹس ٹیچرز ڈیمانڈ کی ہیں۔"

"تو کیا میں گریجویٹ نہیں ہوں۔" آمنہ جلدی سے بولی۔ "اب تم کالج میں رہے جانے کے شوق میں پانچواں سال بھی ادھر لگا رہی ہو تو میرا کیا قصور' بالکل گھر کے پاس ہے اسکول۔ تمہارا اور جویریہ کا کالج بھی پاس ہے اگر مجھے ادھر جاب مل جائے تو بس۔" وہ جوش سے اسکول کی نئی خوبصورت عمارت کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"تو بس۔" زینب نے اس کی نقل اتاری۔

"بابا صاحب کو پتا چل گیا تو وہ بھی تمہاری "بس" کر دیں گے۔"

"کالج میں پڑھنے کی اجازت بھی تو انہوں نے دی تھی نا' اب میں چھ ماہ سے گھر میں فارغ بیٹھی کیا کمال کر رہی ہوں۔ گھر کے حالات دیکھے ہیں نا تم نے۔ بابا صاحب بے چارے کیا کریں' دو تین سال ان کی ریٹائرمنٹ میں رہ گئے ہیں پھر ہم کیا کریں گے۔" آمنہ نے ایک بار پھر مڑ کر اسکول کی عمارت کو دیکھا۔

"اس میں بھی زیادہ قصور بابا صاحب کا خود اپنا ہے۔ کیوں اس قدر ضدی ہیں وہ' دونوں بھائیوں کو نکال باہر کیا تو اب خود ہی ساری ذمہ داریاں بھگتیں گے نا' اس قدر بھی انسان کو انا پرست نہیں ہونا چاہیے۔" زینب نے اپنا موقف دہرایا۔

"تو ان دونوں نے کون سا پلٹ کر خبر لے لی۔ اگر بابا صاحب غصے میں آ کر انہیں برا بھلا کہہ کر گھر سے نکال چکے ہیں تو وہ پلٹ کر معافی مانگ لیتے' وہ چار بار معافی مانگ لیتے تو کیا بابا صاحب ان کو معاف نہ کر دیتے؟ کسی باپ کا دل اس قدر سخت نہیں ہوتا کہ اولاد کو یوں خود سے الگ کر پھینکے اور معافی مانگنے پر معاف بھی نہ کرے۔ ان دونوں کے دل تو بابا صاحب سے بھی سخت نکلے۔" آمنہ نے ہمیشہ کی طرح باپ کی طرف داری کی۔

"کسی باپ کا دل اس قدر سخت نہیں ہوتا مگر بابا صاحب کا تو ہے نا اور وہ دونوں بھی ان کے بیٹے ہیں۔ عبدالمتین کو کیسے انہوں نے نکالا۔ اماں جی اور ہمارے ہزار اصرار پر بھی کبھی دوبارہ پلٹ کر اس سے رابطہ نہیں کیا۔ جلیل نے بتایا نہیں کہ وہ شہر میں کیسی اعلا زندگی گزار رہے ہیں۔ کسی بہت بڑے آدمی کے داماد بن کر کروڑوں میں کھیل رہے ہیں اگر بابا صاحب اپنی انا کو اپنی ضد کو پس پشت ڈال کر ایک بار ان سے ملنے چلے جاتے تو کیا بھائی کا دل نرم نہ ہو جاتا۔" زینب تیزی سے بولی۔

"بھائی کو خود کون سا خیال آ گیا۔ صرف بابا صاحب نہیں اماں جی بھی تو ہیں ہم تینوں بھی تو ہیں انہوں نے کسی

کا بھی خیال نہ کیا اور وہ ان کا آخری خط یاد ہے نا تمہیں؟"

"کیسی فضول باتیں لکھی تھیں بابا صاحب کے بارے میں۔ ہمیں وہ پڑھ کر اس قدر غصہ آیا اگر بابا پڑھ لیتے تو نہ جانے ان کا کیا حال ہوتا۔"

"تو پھر یہی کچھ ہوتا ہے نا جب اولاد خاص طور پر بیٹے جوان ہو جاتے ہیں تو والدین کو ان کی بہت سی باتیں نظر انداز کرنا پڑتی ہیں پر بابا صاحب تو ایک دم سے غصے میں آجاتے ہیں' مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں۔ کسی کی عزت نفس ان کی نظر میں کچھ معنی ہی نہیں رکھتی اور بیچارے عبدالمبین کے ساتھ کیا کیا۔ اب کیوں پچھتاتے ہیں دل میں۔"

"تمہیں خبر ہے کہ وہ دل میں پچھتاتے ہیں؟" آمنہ ٹھٹک کر بولی۔

"ارے آمنہ بی بی! میں اتنی بھی ناسمجھ نہیں ہوں مجھے معلوم ہے آج کل جو گھر کے حالات جا رہے ہیں بلکہ گزشتہ چار پانچ سالوں سے بابا صاحب دل ہی دل میں خوب پچھتا رہے ہیں مگر اس کا اظہار نہیں کرتے۔ اکڑ کر انہیں آج تک کچھ بھی نہیں ملا۔ جھک جائیں تو شاید بہت کچھ پالیں۔" وہ دونوں بے حد سست رفتاری سے گھر کی طرف جا رہی تھیں کالج میں کانووکیشن تھا آمنہ اپنی ڈگری لے کر آتی تھی اور زینب اس کے ساتھ گئی تھی۔

"ہاں کچھ سال ہو گئے بلکہ اس سے بھی زیادہ گھر کے تنگ حالات نیچے ہی نیچے جا رہے ہیں اور کوئی حل نظر نہیں آرہا جویریہ کے کالج کے اخراجات بھی شامل ہو گئے ہیں اگر عبدالمبین یوں چھپ چھپا کر ہماری مدد نہ کرتا تو شاید ہم دونوں پڑھ بھی نہ سکتے مگر گھر کے خرچ کے معاملے میں بابا صاحب کی کڑی نظر ہوتی ہے ہم عبدالمبین کے دیے ہوئے پیسے خرچ میں شامل نہیں کر سکتے۔ وہ اس کمائی کو حلال کب سمجھتے ہیں۔ اس کا ایک آنہ بھی خود پر حرام قرار دے رکھا ہے۔" آمنہ افسردگی سے بولی۔

"اتنے سال ہو گئے عبدالمبین چھپ چھپا کر آتا ہے۔ ایک دو بار بابا صاحب سے معافی بھی مانگی انہوں نے اسے کون سا معاف کر دیا۔ آمنہ! میں اب تھکنے لگی ہوں۔" زینب ایک سرد آہ بھر کر بولی۔

"تو تیز چلو نا' تم ہی تو من من کے قدم اٹھا کر سست رفتاری سے چل رہی ہو۔ سر پر دھوپ چمک رہی ہے اور تم چیونٹی کی رفتار سے چل رہی ہو۔ تھکنا تو ہے۔" آمنہ تیزی سے بولی۔

"میں اس تھکن کی بات کب کر رہی ہوں۔" زینب کے قدم اور سست پڑ گئے۔

"تو پھر کون سی تھکن؟" آمنہ نے رک کر پوچھا۔

"ہماری زندگیاں تو لگتا ہے گندے جوہڑ کے رکے پانی کی سی ہو گئیں۔ ایک ہی جگہ' ایک ہی مقام پر جیسے ساکت ہو گئی ہیں۔ کہیں بھی کوئی تازگی' کوئی نیا پن نظر نہیں آتا اور نہ ان کٹھن حالات سے نجات کا کوئی حل' کوئی رستہ! آخر یہ بیکاری تکلیف دہ زندگی ہم کب تک یونہی جیتے رہیں گے؟ ترس ترس کر دال روٹی کے چار نوالے ملتے ہیں اور تن ڈھانپنے کو جو کپڑے ہوتے ہیں۔ یقین مانو خود پر ترس آتا ہے۔ ہمارے تو چہروں سے بھوک اور مسکینی ٹپکتی ہے۔ میں نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ میں صوفی عبدالرحمن کی بیٹی ہوں پھر بھی نہ جانے کیسے سارے کالج کو میرے پہلے قدم سے ہی پتا چل گیا تھا کہ میں ایک مولوی کی بیٹی ہوں جس کی تنخواہ میں اس دوزخ جیسی زندگی کی سانسوں کا رشتہ بمشکل برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ تم نے دیکھا ان چار سالوں میں کسی بھی اچھی معقول لڑکی نے ہم سے دوستی کرنے کی کوشش بھی نہیں کی' نہ ہمارے قریب آنے کی جیسے ہمیں کوئی موذی روگ لگا ہو جو ہمارے قریب آنے سے ان کو بھی لگ جائے گا۔ آخر ہماری اس بے کار زندگی کا مصرف کیا ہے اور آخر کب تک ہم اسے یونہی جیے چلے جائیں گے؟" زینب رو دینے کو تھی' اسے معلوم تھا کہ اب آمنہ ایک لمبا لیکچر جھاڑے گی بہت سوں سے بہتر زندگی گزارنے پر مگر وہ تین منٹ گزر گئے' پختہ سڑک پر اس کے قدموں کی ہلکی چاپ تو سنائی دیتی رہی مگر آمنہ کچھ نہ بولی۔ زینب نے سر اٹھا کر بہن کا چہرہ دیکھا۔ آمنہ سپاٹ نظروں سے گھر کی طرف جاتی گلی کو دیکھ رہی تھی۔

"تم نے کوئی جواب نہیں دیا؟"

"میرے پاس اس کا کچھ جواب نہیں سوائے اس کے کہ تم اس زندگی' اپنی اس بیکار زندگی کے بارے میں جتنا زیادہ سوچو گی اتنا ہی اسے گزارنا مشکل ہو جائے گا۔ آتی جاتی سانسوں کا بہاؤ رک جائے گا۔ اسے چپ چاپ اسی طرح جیے جاؤ' اس کے متعلق سوچو نہیں' ورنہ پتا نہیں کیا ہو جائے گا۔ بہت جگہوں سے ضبط کے ٹانکے اکھڑ جائیں گے تو آنے والے سیلاب کو کون روکے گا۔" آمنہ جیسے خود سے بڑبڑا رہی تھی۔

"ہم۔ تم بھی مایوس ہو آمنہ رے؟" زینب نے گویا سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

"میں کل ادھر اسکول میں انٹرویو دینے آؤں گی۔" آمنہ نے گلی میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"کیسے' بابا صاحب اجازت دے دیں گے؟" زینب حیرت سے بولی۔

"ضرور دیں گے' تم دیکھنا میں لوں گی اجازت۔ میں بھی کنویں میں رہ کر جیتے جی اپنے مرنے کا تماشا نہیں دیکھ سکتی۔ کسی کو تو اس کنویں کی منڈیر سے باہر جھانکنا ہو گا۔ کب تک ہم دونوں بھائیوں کے خیالات بدلنے کا انتظار کریں کہ وہ آئیں اور ہمارے ہاتھ پکڑ کر ہمیں اس اندھے کنویں سے باہر نکالیں۔ ہمیں خود ہی کچھ کرنا ہو گا۔ خود ہی۔" کہتے ہوئے آمنہ تیزی سے گھر کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ زینب ابھی تک حیران تھی آمنہ کے خیالات سن کر۔ وہ بہت سست قدموں سے چل رہی تھی۔

"یہ ایک اچھی خوش آئند نشانی ہے کہ آمنہ بی بی کے خیالات بدل گئے ہیں۔ اب ضرور کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔" خوشگوار جھونکے کی سرسراہٹ کا احساس اس کے اندر جاگا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے آمنہ کے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

"میرا ماسٹرز کا رزلٹ آ گیا ہے۔" شہرینہ نے چھوٹتے ہی فون پر عبدالمبین سے کہا۔

"اچھا۔" عبدالمبین نے منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر جمائی روکی۔

"پوچھو گے نہیں کیا آیا ہے؟" وہ کچھ خفگی سے بولی۔

"مجھے معلوم ہے' تم بہت اچھے مارکس لے کر پاس ہوئی ہو گی اور میرے پوچھنے سے پہلے ہی بتا دو گی۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

"مگر تمہیں پوچھنا تو چاہیے تھا نا' کم از کم فون تو تمہیں خود کرنا چاہیے تھا۔ میں تمہیں بتا چکی تھی کہ آج صبح میرا رزلٹ آؤٹ ہونے والا ہے۔ سارا دن' ساری شام میں نے تمہارے فون کا بے تابی سے انتظار کیا۔ آخر مجبور ہو کر میں نے خود فون کیا۔" وہ گلہ کرتے ہوئے بولی۔

"شہرو جان! تمہیں معلوم ہے میں آج کل کس قدر مصروف ہوں۔ اوہ گاڈ! آج کل میرے پاس سر کھجانے تو کیا کھانے پینے کی فرصت نہیں ہے۔ خدا خدا کر کے تو یہ دن آئے ہیں ہزار انتظار کے بعد۔ چار سال کی دن رات محنت اور جگل خواری کے بعد اب جو میرا کچھ مقام بننے چلا ہے لوگ مجھے پہچاننے لگے ہیں۔ میں زندگی کے کہکشاں بھرے آسمان پر میں ایک اسٹار بننے چلا ہوں تو اس کے لیے کچھ نہ کچھ تو قربان کرنا پڑے گا۔ تمہیں خود بھی تو میرے کچھ بن جانے کا انتظار تھا' اب گلہ کیوں کرتی ہو؟"

عبدالمبین نے وضاحت پیش کی مگر لہجہ ابھی بھی کچھ بیزار سا تھا۔

"مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم مجھے ہی فراموش کر ڈالو۔ آج کتنے دنوں بعد فون پر ہماری بات ہو رہی ہے تمہیں کچھ اندازہ ہے۔"

"پھر وہی گلہ' سمجھا کرو جو کہہ رہا ہوں کہ مصروفیت ہے آج کل۔ میری تین فلمیں اکٹھی آن ایئر آ رہی ہیں' میرا

دوسرا البم آرہا ہے۔ اگلے ماہ مارکیٹ میں اس کی افتتاحی تقریب ایک بڑے ہوٹل میں ہوگی بڑے پیمانے پر یہ البم میرے کیرئیر کا سنگ میل ہوگا۔ اس کے بعد ایک خوبصورت زندگی کو جاتی شاہراہ پر رستہ بالکل سیدھا اور صاف ہوگا پھر ہم دونوں کو ایک ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا پھر یہ چھپ چھپ کر ملنے اور فون کرنے کی مصیبت سے بھی چھٹکارا مل جائے گا۔ بس ایک بار مجھے اپنا کچھ نام بنا لینے دو پھر میں تمہاری ایک نہیں سنوں گا' تمہیں اٹھا کر لے آؤں گا۔ مجھ سے خود اب یہ دوری نہیں سہی جاتی اور یہ ادھوری ادھوری سی ملاقاتیں' چھپ چھپ کر ڈر ڈر کر ملنا' آدھی راتوں کو بستر میں چھپا کر فون کرنا' کوئی آ رہا ہے' کہہ کر نازک لمحوں میں فون بند کر دینا' مجھ سے اب نہیں برداشت ہوتا۔" وہ جیسے پھٹ پڑا۔

"مجھ سے ہوتا ہے برداشت؟ مگر یہ سب کچھ اس قدر آسان بھی نہیں۔" شہرینہ نے مدھم آواز میں کہا۔

"جانتا ہوں میں خراب مر یہ سب کچھ تمہیں بہت آسانی سے کر کے دکھاؤں گا' بس مجھے چند ماہ کی مہلت اور دے دو۔"

"تمہارے پاس اب شاید یہ چند ماہ ہی ہوں۔" شہرینہ اسی مدھم لہجے میں بولی۔

"اب کیا ہو گیا؟" وہ جیسے تنگ آ کر بولا۔

"صالحہ بھابھی کے فارغ ہوتے ہی اس بار آپا مجھے شاید ایک ماہ کی بھی مہلت نہ دیں۔"

"مطلب؟"

"مطلب بھی میں بتاؤں۔" وہ تلخی سے بولی۔

"میں واقعی نہیں سمجھا۔" وہ سمجھتے ہوئے بھی انجان بن کر بولا۔

"آپا نے بڑی مشکل سے میرے ماسٹرز کو ہضم کیا ہے۔ اب وہ میری شادی کے لیے ایک دن بھی نہ رکیں گی۔ بھابھی بیگم کے فارغ ہوتے ہی....."

"تمہاری بھابھی بیگم فارغ ہوں گی تو تمہاری آبا جان کو سوگ یا خوشی منانے میں مہینے لگ جائیں گے۔ ویسے تو قرین از قیاس ہے' اس بار بھی وہ حویلی کی ایک اور وارثہ کو جنم دیں گی۔" وہ تمسخرانہ انداز میں بولا۔

"خدا نہ کرے عبدالمبین! کم از کم تمہیں تو ایسا نہیں کہنا چاہیے۔" شہرینہ نے دہل کر کہا۔

"میرا تو خیال ہے کہ مجھے ہی یہ کہنا چاہیے بلکہ اس کے لیے باقاعدہ منت ماننی چاہیے۔"

"کیوں' تمہارا کیا مفاد ہے اس میں؟" وہ کچھ غصے سے بولی۔

"میرا مفاد تو اس میں ہے کہ شہرینہ بنت سبطین شاہ میری ہو جائے اور یہ دوریاں دور ہو جائیں اور مجھے حویلی سے کچھ غرض نہیں' چاہے وہاں لڑکیوں کی قطاریں لگیں یا لڑکوں کی۔" وہ فوراً بات بدل کر بولا۔

"تم نے بتایا نہیں' تمہارے مارکس کتنے آئے ہیں؟"

"تمہیں اس سے کیا۔" وہ ناراضی سے بولی۔

"پھر وہی فضول کی خفگی۔ اچھا ملنے کب آ رہی ہو۔ تمہاری کامیابی کی خوشی میں ٹریٹ تو دینی ہے اور گفٹ بھی۔ اس بار ڈنر کسی اچھے سے ہوٹل میں نہ کریں؟" شہرینہ کو لگا آج اس کا دماغ کھسک گیا ہے۔

"نہ جانے تم کیسی باتیں کر رہے ہو' میرا خیال ہے تمہیں نیند آ رہی ہے۔ سو جاؤ جا کر۔" وہ نروٹھے پن سے بولی۔

"تمہاری آواز سن کر تو میری نیند اڑ جاتی ہے اور جو یہ بہکی بہکی باتیں ہیں' یہ تو پیار کا نشہ ہے۔" وہ لہجے کو گمبھیر بناتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے اب بس کرتے ہیں' کافی ٹائم ہو گیا ہے۔" شہرینہ اس کے انداز سے ڈر کر بولی۔

تم فون بند نہیں کرو بلکہ میری بات غور سے سنو۔ میں ذرا پانی کا ایک گھونٹ بھرلوں۔" کہہ کر اس نے پاس پڑی بوتل کا کارک ہٹا کر منہ سے لگایا' دو تین لمبے لمبے گھونٹ بھرے اور بوتل رکھ دی۔

یہ "تحفہ" اس نے "گل کدہ" سے حاصل کیا تھا' جہاں ہر دوسرے فنکشن میں اس کا کھلے عام استعمال ہوتا تھا اور زیور گل کا منہ بولا بیٹا ہونے کے ناتے وہ اس بلا سے کتنے دن بچ سکتا تھا اور اب تو خود بھی وہ اس سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔

"شہرو ڈارلنگ! تم ذہنی طور پر تیار ہو جاؤ' ان دو چار ماہ میں ہمارے خفیہ پیار کے رشتے کو نام ملنے والا ہے۔ میں نے پختہ ارادہ کرلیا ہے' میں اب تم سے زیادہ دن دور نہیں رہ سکتا۔ بس دو چار ضروری کام نبٹانے ہیں۔ ہم دونوں اب شادی کرلیں گے' تم میرے ساتھ آنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرلو۔"

"شادی مگر کیسے۔۔۔؟" شہرینہ حیران رہ گئی۔

"جیسے سب کرتے ہیں۔ ہم کورٹ میرج کریں گے یا دو چار گواہوں کی موجودگی میں خفیہ نکاح' وہ بھی اس لیے کہ تم حویلی سے بخیریت نکل سکو' ورنہ میں تو ڈنکے کی چوٹ پر بارات لانے کو تیار رہوں۔"

"نہیں نہیں۔" شہرینہ کانپ گئی۔

"کیا نہیں نہیں۔ کیا تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں؟" وہ بگڑ کر بولا۔

"کیوں نہیں کرنا چاہتی مگر اس طرح۔۔۔" وہ جلدی سے بولی۔

"اسی طرح ہوگی ڈیر ہماری شادی' تم ذہن بنا رکھو اور کوئی رستہ نہیں ہے۔ اور اب تم مجھ سے دامن چھڑانے کی کوشش بھی نہیں کرسکتیں کہ میں تمہارے پیار کی دلدل میں گھٹنوں تک دھنس چکا ہوں۔ اب اس سے باہر نکلنا ممکن نہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں؟"

"معلوم ہے مجھے۔" وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔ اسے عبدالمبین کے ان خطرناک ارادوں کا پہلے سے اندازہ نہیں تھا۔ اس کے جارحانہ عزائم بتاتے تھے کہ وہ اسے اغوا بھی کرسکتا تھا۔ وہ بری طرح سے ڈر گئی تھی۔

"تو پھر یہ ہچکچاہٹ کیوں؟"

"مجھے ڈر لگتا ہے اس طرح۔"

"وہ تو تمہیں اول روز سے لگتا ہے۔ اب سب کچھ اسی طرح ہوگا جس طرح میں کہہ رہا ہوں۔" اسی وقت اس کے پاس پڑے ٹیلی فون سیٹ کی بیل بج اٹھی۔ اس نے گردن گھما کر سی ایل آئی پر نمبر دیکھا۔ نیلی تارا کا فون تھا۔

"اسے بھی یہی وقت ملا تھا فون کرنے کو۔ اب ایک گھنٹہ اس کے ساتھ عشق بگھارو۔" وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔

"اوکے ڈارلنگ! باہر ڈور بیل بج رہی ہے۔ میں ذرا دیکھوں باہر کون ہے۔ کل فون کرکے ملنے کی ڈیٹ اور جگہ بتاؤں گا' اوکے بائے۔" اس نے شہرینہ کو اگلی بات کا موقع دیے بغیر موبائل آف کردیا۔ اسے معلوم تھا شہرینہ ایک بار پھر کال کرے گی' اسی لیے اس نے موبائل آف کردیا اور فون کی طرف متوجہ ہوگیا۔

* * *

"لیجیے ام جان! سنبھالیے اپنے اس شیطان کو۔ ایڈمیشن کروا آیا ہوں میں اس کا پلے گروپ میں۔ یہ حضرت تو ابھی سے اسکول میں بیٹھنے کو تیار تھے۔ زبردستی لے کر آیا ہوں۔ دو تین بچوں سے پکی دوستی بھی گانٹھ آئے ہیں۔ ایک کیوٹ سی بے بی تو کلاس روم کے دروازے تک چھوڑنے آئی تھی انہیں۔ یہ ابھی سے اتنے سوشل ہیں تو بڑے ہوکر کیا عالم ہوگا ان کی شہرت کا۔" معاذ نے خوبصورت' صحت مند' سرخ و سفید رنگت اور شرارتی آنکھوں والے چار سالہ ارتضیٰ کو مسز خان کی گود میں بٹھاتے ہوئے کہا۔ مسز خان نے چٹاچٹ تین چار بار ارتضیٰ کا منہ اور

ماتھا چوم ڈالا۔

"میرا بیٹا ہے ہی اتنا پیارا اور ڈیکنو بھی کہ جو کوئی دیکھتا ہے' خود بخود اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ اس میں میرے جگنو کا کیا قصور۔" مسز خان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بچے کو اپنی آنکھوں کے رستے دل میں چھپالیں۔

"بالکل دادو! ہم ہیں ہی اتنے پیارے' بیوٹی فل اور۔۔۔" وہ سوچنے لگا۔ "سمارٹ کہ سب ہم سے پیار کرتے ہیں۔" وہ مسز خان کی گود میں اور پھیل کر بیٹھ گیا۔

"پرنسپل صاحب تو مان نہیں رہی تھیں کہ یہ تین سال کے ہیں۔ وہ تو میں نے زبردستی یقین دلایا اوپر سے یہ خود بار بار کہے جائیں' ہم چار سال کے ہیں' ہم چار سال کے ہیں۔ آپ بھول رہے ہیں معاذ بابا۔" معاذ نے بتایا۔

"زیتون بی! ہمیں بھوک لگی ہے' جلدی سے کچھ لاؤ۔" ارتضیٰ نے کہا۔

"کیوں؟ معاذ نے تمہیں رستے میں کچھ نہیں کھلایا۔"

"کچھ بھی نہیں۔" وہ معصوم شکل بنا کر بولا۔

"ارتضیٰ کے بچے' پٹو گے مجھ سے۔ ایک جوس کا ٹن' چپس کے دو پیکٹ اور ایک چاکلیٹ اور واپسی پر آئس کریم کس نے ٹھونسی تھی۔"

"آپ نے' میں نے تو صرف چکھی تھی۔" وہ چھلانگ لگا کر نیچے اترا اور زیتون بانو کو کھینچنے لگا۔

"زیتون بی! اٹھو۔ فرج کی' کچن کی تلاشی لو' مجھے بھوک لگی ہے۔"

"میاں! تلاشی تو آپ پہلے لے چکے ہوں گے۔ کچھ نہیں ملا ہوگا تو میرا خیال آیا ہوگا۔ کتنا اچھا دن ہے۔ آج ہمارے ارتضیٰ میاں اسکول میں داخل ہوگئے' اسی خوشی میں اٹھ جاتی ہوں۔ آج ان کے والدین۔۔۔"

"زیتون بانو! ارتضیٰ جو کہہ رہا ہے' اسے بنا کردو۔" مسز خان فوراً سخت لہجے میں بولیں تو زیتون بانو جلدی سے سرہلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور ارتضیٰ کے پیچھے باہر نکل گئی۔

"تمہارا ہاؤس جاب کب سے شروع ہو رہا ہے؟" مسز خان' معاذ سے بولیں۔

"اگلے ماہ۔" وہ کرسی پر ایزی ہوکر بیٹھ گیا۔

"ہاؤس جاب مکمل ہوجائے تو میں تمہیں کلینک سیٹ کروا کے دوں گی' بڑا عالیشان قسم کا۔ میری بڑی تمنا تھی کہ میرا کوئی بیٹا ڈاکٹر بنے۔ ایاز اور اظہر کا ذہن اعلا تعلیم کی طرف ویسے ہی نہیں تھا۔ دونوں بزنس کی طرف نکل گئے۔ شہباز کو ویسے ہی آرمی کا جنون تھا' سو میرا خواب تشنہ ہی رہ گیا۔ دیکھو تو قدرت نے تمہاری شکل میں وہ بھی پورا کردیا۔"

"آپ لکی ہیں ام جان! جو قدرت نے آپ کا کوئی بھی خواب تشنہ نہیں رہنے دیا۔" وہ جوتے اتارنے کو جھکا۔

"تم بھی ایسا سمجھتے ہو؟" وہ ایکدم سے دکھی ہوکر بولیں۔

"سوری ام جان! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" اسے ایکدم سے احساس ہوا تو فوراً سیدھا ہوکر بولا۔

"کوئی بات نہیں' مجھے معلوم ہے' تم اب فارغ ہو؟"

"جی' کوئی کام ہے؟"

"ہاں ہے تو سہی' اگر تم کردو گے۔"

"آپ کہیں اور میں انکار کردوں' ایسا کبھی ہوسکتا ہے۔"

"جیتے رہو' تمہاری فرمانبرداری دیکھتی ہوں تو جیسے بہت سے زخموں کو مرہم مل جاتا ہے۔ ذرا یونیورسٹی تک جانا ہے۔"

"وہ کیوں؟" وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولا۔

"مشی کو لے کر آنا ہے۔ اس کی گاڑی آج خراب ہو گئی تھی' صبح اظہر اسے ڈراپ کر آیا تھا۔ ابھی ابھی اس کا فون آیا ہے۔ گھر میں کوئی اور تو ہے نہیں' میں نے اس سے کہہ دیا کہ آدھے گھنٹے تک تم اسے پک کر لو گے ہو۔"

"ام جان!" وہ احتجاجی لہجے میں بولا۔ "آپ کو معلوم ہے' مجھے یہ سب۔" وہ اپنے ہونٹ چبانے لگا۔

"معلوم ہے مجھے' پر بیٹا! اب مجبوری ہے۔ جاؤ' بچی انتظار کر رہی ہوگی۔ پتا نہیں کیسے آئے گی۔ تم سے تو وہ محبت سے پیش آتی ہے' تم اپنے والدین کے برعکس۔"

"معلوم ہے مجھے۔" وہ ترشی سے بولا۔

"اچھا اب جاؤ' اس کا فون آئے بھی آدھا گھنٹہ ہو چلا ہے۔ انتظار کر رہی ہوگی۔" مسز خان کے کہنے پر وہ دل کڑھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

اظہر بھائی کی یہ صاحبزادی حد سے زیادہ اس پر فریفتہ تھی۔ معاذ کے خشک اور اجنبی رویے کے باوجود وہ معاذ کے آگے پیچھے پھرتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مشی کی آنکھوں کی چمک' چہرے کی رنگت اور چال کی روانی میں اس طرح نمایاں فرق آجاتا کہ ایک اجنبی کو بھی اس تبدیلی کا فوراً علم ہو جاتا۔ مسز خان اس کی دیوانگی سے آگاہ تھیں اور انہیں بظاہر کچھ اعتراض بھی نہیں تھا مگر معاذ اس سے بے حد چڑتا تھا۔

"آہستہ آہستہ سمجھ جائے گا اس کے معصوم دل کی خوشی کو۔" مسز خان سوچتیں۔

"ہائے۔" مشعل حسب توقع اسے گیٹ کے پاس ہی کھڑی مل گئی۔ اپنی دوستوں کو ہاتھ ہلاتی وہ گاڑی کے پاس آکر بولی۔

معاذ نے کوئی جواب نہیں دیا' ہاتھ بڑھا کر پچھلے دروازے کا لاک کھول دیا۔

"تمہیں میرا ڈرائیور بننے کا بہت شوق ہے۔" اس نے فرنٹ ڈور کھولا اور بیٹھ گئی۔ "مگر مجھے تمہارے ساتھ بیٹھنے کا شوق ہے' کریز ہے بلکہ میرا خواب ہے تمہارے ساتھ زندگی کے لمبے سفر میں ساتھ ساتھ رہنے کا۔" وہ گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے آرام سے بولی۔

"تم نے ام جان سے جھوٹ کیوں بولا؟" معاذ نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کچھ خفگی سے کہا۔

"کون سا جھوٹ؟" وہ اپنے ہینڈ بیگ سے ہیئر برش نکال کر آہستہ آہستہ اپنے بالوں میں چلانے لگی۔

"تمہاری گاڑی خراب ہے' جبکہ صبح میں نے خود تمہیں گاڑی ڈرائیو کرتے یونیورسٹی جاتے دیکھا تھا۔" معاذ نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے گھورا۔

"بڑی نگرانی کرتے ہو چھپ چھپ کر۔ سامنے آکر جو اس قدر ہماری خبر رکھو تو شاید ہم خوشی سے مر ہی جائیں۔" وہ ہنس کر بولی۔

"تم یہ فضول فلمی ڈائیلاگ بولنا بند کرو اور میری بات کا جواب دو۔" وہ چڑ کر بولا۔

"یار! خوامخواہ تپ نہ جایا کرو۔ ویسے میری گاڑی صبح ہی سے نخرے دکھا رہی تھی۔ ابھی ایک دوست کو ضرورت تھی' اس نے کہا۔ میں گاڑی کا مکمل چیک اپ بھی کروا دوں گا اور صبح واپس بھی کر دوں گا اور میں نے بھی سوچا اتنے سہانے موسم میں اکیلے اتنی بڑی گاڑی' بڑی بڑی ویران تنہا سڑکوں پر ڈرائیو کرنا اچھا نہیں لگتا۔ کوئی ہینڈسم سا ہم سفر ہونا چاہیے پھر یوں لگے۔ "ہم چلیے تو ہمارے سنگ سنگ یہ نظارے چلیں۔" وہ نہر کے گرد ہرے بھرے ہواؤں میں جھومتے درختوں کو دیکھ کر بڑی ترنگ میں گنگناتی۔

"اگر تمہارے پاپا کو تمہارے اس ون وے رومانس کی خبر ہو جائے تو....." معاذ نے اسے ڈرایا۔

"جی ہاں!" وہ اس کی طرف جھکی۔ "فکر تم کرو' پاپا کی میں جان ہوں۔ پاپا میرے ون وے رومانس کو دو طرفہ بنانے کے لیے ہر صورت' ہر حال میں۔ تم اگر میرے رومانوی اثرات سے بچنا چاہتے ہو تو دعا کرو' میرے پاپا بے خبر رہیں ورنہ تمہاری خیر نہیں۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"تم بہت ڈھیٹ ہو۔" معاذ نے دانت کچکچا کر کہا۔

"تنہائی' رومانس کی پہلی سیڑھی' جو اس سیڑھی پر جم گیا' وہ تیزی سے باقی کے زینے عبور کر گیا۔ چلو بور نہیں کوئی اچھا سا رومانٹک سا میوزک لگاؤ۔" وہ کہہ کر خود ہی کیسٹس چیک کرنے لگی تو معاذ نے ایک گہرا سانس لے کر گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

* * *

"آپ ڈاکٹر کو چیک کروا ہی آتے تو اچھا تھا۔ اتنی لمبی رات پڑی ہے' خدانخواستہ اگر درد بڑھ گیا تو۔" اماں جی نے آہستہ آہستہ صوفی صاحب کا سینہ مسلتے ہوئے کہا۔

"درد بڑھ گیا تو کیا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ جان سے چلا جاؤں گا۔" صوفی صاحب اپنے چہرے سے تکلیف کے اثرات کم کرتے ہوئے بڑی مشکل سے مسکرائے۔

"اللہ نہ کرے بابا صاحب! کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" آمنہ نے دہل کر کہا۔ وہ ان کے بازو دبا رہی تھی' زینب ان کی ٹانگیں دبا رہی تھی اور جویریہ سرہانے کی طرف چھوٹی میز پر بیٹھی ان کا سر دبا رہی تھی۔

صوفی صاحب کی طبیعت دوپہر سے خراب تھی۔ جب سے وہ عبدالحسین کی طرف سے ہو کر آئے تھے' ان کے سینے کا درد بڑھتا جا رہا تھا۔ سہ پہر تک وہ ضبط کرتے رہے اور مغرب پڑھ کر جو اوپر آئے تو پھر عشاء کے لیے نیچے مسجد بھی نہ جا سکے۔ ان کے چہرے کا رنگ زرد ہو رہا تھا' سینے میں درد تھا تو دل میں درد کا طوفان مگر وہ اس طوفان سے کسی کو بھی آگاہ نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔

"بابا صاحب! جلیل سے کہہ کر ڈاکٹر کو ادھر بلوا لیں۔" زینب نے آہستگی سے کہا۔

"ڈاکٹر کیا کرے گا زینب بیٹا! دوا میں نے کھا لی ہے۔ ڈاکٹر نے بھی وہی دینی تھی۔ اب آہستہ آہستہ ہی آرام آئے گا نا۔ تم لوگ سو جاؤ جا کر' رات کافی ہو گئی ہے۔ میں بھی سو جاؤں گا۔ دوا میں نیند بھی تو ہوتی ہے۔"

وہ بہت نرم لہجے میں بات کر رہے تھے۔ پتا نہیں وقت نے یہ نرمی ان کے لہجے میں بوئی تھی یا اپنی بے بسی کے احساس نے۔ وہ اب تینوں بیٹیوں سے بھی بہت نرمی سے بات کرتے تھے۔ البتہ دونوں بیٹوں کے نام لینے کے بھی روادار نہیں تھے۔

"جب تک آپ نہیں سوئیں گے' ہمیں نیند نہیں آئے گی۔" جویریہ نے آہستگی سے کہا۔ "آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا۔"

"جویریہ! تم جا کر سو جاؤ' صبح تمہیں کالج بھی جانا ہے۔" وہ اس کی بات نظر انداز کر کے بولے۔

"بابا صاحب! اب آپ ٹھیک ہیں نا' طبیعت کچھ بہتر ہوئی؟" آمنہ بولی۔

"ہاں بچے! اللہ کا شکر ہے' کچھ بہتر محسوس کر رہا ہوں۔" وہ محبت سے اس کی طرف دیکھ کر بولے۔

"بابا صاحب! آپ سے ایک بات کہنی تھی۔" وہ دھیرے سے بولی۔

زینب نے بے اختیار آمنہ کی طرف دیکھا۔ اشارے سے اسے بات کرنے سے منع کیا کہ ابھی موقع نہیں ہے۔ صبح انٹرویو تھا اور آمنہ یہ موقع کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے زینب کی تنبیہہ کو نظر انداز کر کے نظریں صوفی صاحب پر جما دیں۔

"تم نے اس وقت کیا کہنا ہے؟" اماں جی ناگواری سے بولیں۔

"باباصاحب! آپ سے ایک اجازت لینا تھی۔" وہ سر جھکا کر بولی۔

"بولو۔ جویریہ بیٹا! یہ سامنے کی کھڑکی کھول دو۔ تازہ ہوا آئے گی۔" ان کے کہنے پر جویریہ نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی اور یونہی غیرارادی طور پر کھڑکی سے باہر سنسان گلی کو اس نے ایک نظر دیکھا۔ اس کا دل زور سے دھڑکا' وہ تیزی سے آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور صوفی صاحب کا سر دبانے لگی مگر اب اس کے ہاتھوں میں پہلے جیسا دم نہیں تھا' انگلیاں بھی آہستہ آہستہ سرد ہونے لگی تھیں۔

"باباصاحب! ہمارے کالج کے سامنے ایک مڈل اسکول کھلا ہے' وہاں لیڈی ٹیچرز کی ضرورت ہے' بچوں کے لیے گریجویٹ ٹیچرز۔ صبح انٹرویو ہے' معقول تنخواہ ہے اور گھر سے زیادہ دور بھی نہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو....."

آمنہ نے ایک ہی سانس میں اپنی بات پوری کردی۔

"آمنہ!" صوفی صاحب نے اسے غور کر دیکھا۔

"باباصاحب پلیز..... آخر میں نے اتنا پڑھا ہے' گھر بیٹھ کر کیا کروں گی۔ میری تعلیم کسی کے کام آئے گی' خود ہمارے اپنے بھی۔ میں اس تعلیم کو سینے میں سمیٹ کر بیٹھی رہوں اور وہیں دفن کردوں تو اس کا کیا فائدہ ہوگا بابا صاحب!" وہ ہمت کرکے انہیں قائل کرتے ہوئے بولی۔

"یہ ممکن نہیں۔"

"کیوں باباصاحب! علم کو پھیلانا تو نیکی ہے۔ آپ بھی تو یہی نیکی کررہے ہیں۔ اگر میں بھی۔"

"آمنہ! بحث نہیں کرو اپنے باباصاحب سے۔ وہ پہلے ہی ٹھیک نہیں ہیں۔" اماں جی نے اسے ٹوکا۔

"ٹھیک ہے' تم جو اچھا سمجھو۔ اگر تمہیں اس اسکول کا ماحول اچھا لگے۔ ویسے میں خود بھی صبح پتا کروں گا پھر تمہیں بتاؤں گا۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

"پر باباصاحب! انٹرویو تو صبح ہے۔" وہ جلدی سے بولی۔

"انٹرویو تم دے آنا اور....." اسی وقت پتھر میں لپٹی کاغذ کی ایک گول کھلی کھڑکی سے آکر صوفی صاحب کے سینے پر گری۔

اس سے پہلے کہ اسے کوئی اور ہاتھ بڑھا کر اٹھاتا صوفی صاحب نے فوراً اس چھوٹے سے پتھر کو مٹھی میں لے لیا۔ جویریہ کی تو پورے جسم سے جیسے جان نکل گئی۔ صوفی صاحب جلدی سے اٹھے اور پتھر کے گرد لپٹا کاغذ کھول کر پڑھنے لگے۔

"جویٔ! آج اتنے دن ہوگئے تمہاری صورت دیکھے۔ پلیز چند منٹ کے لیے کھڑکی میں آؤ میں منتظر کھڑا ہوں۔" دو لائنیں کسی نے جلدی سے کاغذ پر گھسیٹی تھیں۔

صوفی صاحب جھپٹ کر اٹھے اور کھلی کھڑکی میں جاکر کھڑے ہوگئے۔ نیچے گلی میں کھڑکی کے سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا جسے دیکھتے ہی صوفی صاحب کو لگا ان کا ہارٹ فیل ہونے لگا ہے۔ ان کے جسم میں خون کی جگہ جیسے آگ کے شرارے دوڑنے لگے۔

انہوں نے جلدی سے کھڑکی کی چوکھٹ کو تھاما اور دو تین گہرے گہرے سانس لیے اور مڑ کر جویریہ کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگے۔ جویریہ کا جسم سوکھے پتے کی طرح کپکپا رہا تھا۔ صوفی صاحب مڑے اور اس کی طرف بڑھے۔

اماں جی' زینب اور آمنہ کو لگا' وہ آج جویریہ کو مار ہی ڈالیں گے۔ سب کی سانسیں رکنے لگیں۔

(باقی انشاء اللہ آئندہ شمارے میں)

ناولٹ

زہرہ ممتاز

"راحیل رانا! یہی نام بتایا نا آپ نے اپنا؟"

"جی سر!" اسی نے اپنے سامنے بیٹھے انٹرویو کے چینل کو ایک نظر میں جانچ لیا۔

(مسٹر راحیل رانا! آپ کا کام اس دفتر میں ہونے والا نہیں) اس نے پہلے ہی اپنے آپ کو تسلی دے ڈالی۔

"کوالیفیکیشن تو آپ کی بہت متاثر کن ہیں اور تعلیمی ریکارڈ بھی اچھا ہے لیکن..." وہ شاید دفتر کے ایم ڈی تھے' اس کی تعلیمی ریکارڈ کی فائل کو انہوں نے ڈیڑھ دو منٹ تک الٹ پلٹ کر دیکھا۔

"تھینک یو سر! آپ نے میری تعلیمی ریکارڈ پر نظر ڈالنے کی زحمت کی۔ ساتھ ہی سوری کہ میں نے اپنا اور آپ کا قیمتی وقت ضائع کیا۔" وہ اچانک اٹھ گیا اور ان سے ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"کیا ہوا نوجوان! ابھی تو انٹرویو شروع ہی ہوا ہے۔" برابر میں بیٹھے صاحب نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

"یس سر! ان کی "لیکن" بڑی خطرناک تھی پھر کوئی کام بننا مشکل بلکہ ناممکن ہی ہوتا ہے۔ پھر صرف فارملیٹیز میں وقت کیوں ضائع کیا جائے۔" پھر وہ پلٹا اور بغیر دیکھے شیشے کا دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

"عجیب بددماغ لڑکا ہے۔ آج کل کے نوجوانوں میں اتنا اسٹیمنا نہیں ہے کہ رک کر تسلی سے بیٹھ کر کسی کی دو باتیں سنیں۔ یہ نوکریاں کیا کریں گے۔" ایم ڈی یعنی بٹ صاحب نے اس کی فائل اٹھا کر میز پر دائیں طرف بددلی سے پھینک دی اور دوسری فائل دیکھنے لگے۔

"میرا خیال ہے سر! راحیل رانا ہماری شرائط پر پورا اترتا ہے۔ وہ سوچ میں ڈوب گئے کوئی بھی ان کے معیار پر پورا نہ اترا تھا۔

"واٹ! وہ سر پھرا لڑکا جس نے ڈھنگ سے انٹرویو بھی نہ دیا۔ دماغ یوں آسمان پر چڑھا کر آیا تھا جیسے کوئی بادشاہ اپنی جاگیر سے آیا ہو۔ اتنا خود سر اور مغرور وہ کسی کی سنے گا تو ہی کام کیا کرے گا نا۔"

میرا خیال ہے سر! ہمیں ایک پر اعتماد ذہین اور Conceited (خود آگاہ) نوجوان ہی کی ضرورت ہے۔" منیجر صاحب نے یاد دلایا۔

"ایسا بھی نہیں کہ جو صبح شام میرا بلڈ پریشر بڑھاتا رہے۔"

☼ ☼ ☼

"تم نوکری مانگنے گئے تھے یا جائداد میں اپنا حصہ!" اس کی ساری بات سن کر حمزہ نورانی نے عادتاً اپنے دائیں ہاتھ کی اگلی دو انگلیوں سے پیشانی کو رگڑتے ہوئے کہا۔ جو اس کی ذہنی الجھن کا غماز تھا۔

"تو تم کیا چاہتے ہو نوکری بھیک کی طرح مانگوں؟" وہ چڑ گیا۔

"وہی تو کہہ رہا ہوں۔ تمہیں ورثے میں اور کچھ تو نہ ملا' ایک نوکری ہی مل جاتی۔" حمزہ نے افسوس سے کہا۔

"ارے ورثہ تو ہمارا اپنے تینوں چاچا کھا گئے' میں نے بھی انہیں دنیا میں پھلنے پھولنے کے لیے چھوڑ دیا ہے' بس قیامت کے دن حساب پورا لوں گا۔" وہ لاپروائی سے ہنسا۔

"حالانکہ اگر ہمت کرو تو دنیا میں ہی حساب کتاب پورا کر سکتے ہو۔" وہ جوش دلانے لگا۔

"میری ماں بڑے کمزور دل کی عورت ہے اور تم جانتے ہو مجھے ان سے بہت محبت ہے اس لیے ان کی بات نہیں ٹال سکتا۔ ان کا خیال ہے کہ پیسے کے لیے دشمنی مول لینا ٹھیک نہیں اور میں سمجھتا ہوں ان کا خیال ٹھیک ہی ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ مجھے جو کچھ ملے میری اپنی محنت کے بل بوتے پر ملے۔ حمزہ نورانی! تمہیں خبر ہے' ماں کی دعاؤں میں بڑی طاقت ہے۔"

"بھلا اس بات کی مجھ سے زیادہ کس کو خبر ہوگی میں جو تمہارے ساتھ تمہاری لائن میں ایم بی اے کی ڈگری لیے کھڑا ہوں یہ ان ہی کی دعائیں ہیں ورنہ مجھے کہاں بزنس سے ایک پرسنٹ بھی لگاؤ تھا۔ بس ابا کے حکم اور اماں کی دعا پر تو چل رہا ہوں۔"

"مگر سچ یہ ہے کہ اگر تم نے انٹرویو میں اسی طرح کے نقوش چھوڑے تو تمہیں اس شہر میں کبھی نوکری نہ ملے گی اور صالحہ سے تمہاری شادی کبھی نہ ہو سکے گی۔" حمزہ نے پھر یاد دلایا۔

"تمہارا خیال ہے کہ اچھی نوکری اور صالحہ کو حاصل کرنے کے لیے مجھے جو کچھ کرنا چاہیے وہ میں نہیں کر رہا؟ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کرتا ہوں۔ باقی جو قسمت کا لکھا ہوگا۔"

☼ ☼ ☼

وہ ایک بہت ذہین باہمت محنتی لیکن تھوڑا ضدی اور خود سر سا نوجوان تھا۔ اس نے زندگی میں بہت دکھ دیکھے تھے لیکن کوئی اس سے مل کر اسے جان کر حتی کہ اس کے ساتھ رہ کر بھی یہ نہیں جان سکتا تھا کہ اس نے سچ مچ ایک مشکل اور سخت زندگی گزاری ہے۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا لیکن لاڈلا نہ تھا کیونکہ لاڈ اٹھانے کے لیے جن کثرت اقسام نعمتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس کے گھر میں میسر نہ تھیں۔ گھر میں تھا ہی کون' صرف ایک ماں' باپ کا انتقال اس وقت ہو چکا تھا جب وہ صرف چھ سال کا تھا۔ ددھیال والے ایک سے بڑھ کر بے درد اور بے مروت تھے۔ دادا تھے تو سوچتے گننے اور کمانے کے سوا تیسرا کوئی کام نہ جانتے تھے۔ دادی ایسی سخت گیر اور تند مزاج کہ لگتا تھا نرمی انہیں چھو کر نہیں گزری۔ تین چچا تھے۔ دو پھوپھیاں لیکن کسی نے اسے رسماً بھی پیار نہ کیا تھا۔ اس کا باپ اس پورے خاندان میں واحد شخص تھا جسے دولت سے محبت نہ تھی' نہ اس نے کبھی ناجائز کمایا نہ ناجائز اڑایا۔ شاید اسی لیے وہ اپنے گھر میں اتنا پسندیدہ نہ تھا۔

اس کی زندگی میں تو غنیمت تھے مگر اس کے مرنے کے بعد آہستہ آہستہ وہ سب کھل کر سامنے آ گئے۔ حالانکہ بھائیوں میں وہ سب سے بڑا تھا لیکن دادا کو اپنے اس بڑے بیٹے سے عجب چڑ اور بیزاری تھی' بات بات پر ان باپ بیٹوں میں آپس میں جھگڑے ہوتے' آئے دن ناراضی ہو جاتی جو کئی کئی دنوں تک چلتی رہتی' بزنس پہ' رہن سہن کے انداز پر'

شادی کے چار سال بعد ہی وہ اپنے لیے الگ گھر لے کر رہنے لگا۔ کیونکہ اس نے دیکھا تھا کہ ساتھ رہنے میں اس کی بیوی پر بھی بے شمار زیادتیاں ہونے لگی تھیں۔ سو اس نے "رانا ہاؤس" کو چھوڑ کر اپنے لیے ایک تین کمروں کا فلیٹ لے لیا۔ دادا کو اس کا یہ فیصلہ بھی پسند نہ آیا اور بس ناپسندیدگیوں کی اسی انتہا نے اس کی زندگی اتنی مختصر کر دی۔

بیوہ ہونے کے بعد جو عدت کے پہاڑ جیسے دن صوفیہ خاتون نے اپنے سسرال میں گزارے اس کا ذکر آج بھی کوئی کرے تو ان کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔ ظلم' زیادتی' ناانصافی' طعنے' وہ سوچتی ہی رہ جاتیں کہ ایسی بے رحم اور شدید باتیں کس طرح ان کی ذات سے وابستہ ہو گئیں۔

اور کتنے ہی الزامات تھے ان کے اوپر' بے حساب اور جھوٹے۔ اپنے شوہر کو ورغلائے جانے کا الزام' "رانا ہاؤس" چھوڑنے پر مجبور کرنے کا الزام' وہ ماں باپ کا نافرمان تھا اور بھائی بہنوں کا مخالف یہ بھی ان ہی وجہ سے تھا۔ اس نے کبھی اس گھر کے اصولوں سے سمجھوتہ نہ کیا تھا' یہ بھی ان کا جرم تھا۔ یہاں تک کہ شوہر کے بے وقت مر جانے کا الزام بھی انہیں ہی دے دیا گیا۔

چار مہینے دس دن تک وہ یہ سب برداشت کرتی رہیں۔ انہیں پتا تھا کہ ان سب سے اکیلے لڑنا ان کے بس کی بات نہ تھی اور اب تو وہی نہ رہا تھا کہ جس کی وجہ سے وہ لڑتیں سو وہ چپ چاپ چھ سالہ راحیل رانا کو لے کر "رانا ہاؤس" سے نکل کر اپنے میکے چلی آئیں۔

عورت جس میکے کو شادی سے پہلے اپنی راجدھانی سمجھتی ہے' شادی ہو جانے کے بعد وہ اس کے لیے کتنا پرایا ہو جاتا ہے یہ انہیں اب پتا چلا تھا میکے میں کوئی دکھ نہ تھا' مگر پہلے جیسا سکھ بھی نہ تھا۔ وہ پانچ بہن بھائی تھے' تین بھائی اور دو بہنیں' بڑی بہن کی شادی کو تو عرصہ ہو گیا تھا' پھر دو بھائی تھے ان کی شادیاں بھی ان کی شادی سے پہلے ہوئی تھیں' اور چھوٹے بھائی کی شادی تین سال پہلے ہی ہوئی تھی اور وہ ملک سے باہر رہتا تھا۔

ماں باپ' بھائی بھابھی' بڑی بہن ان کے بچے سب ویسے ہی تھے مگر اب وہ محبت میں بے اختیاری' سلوک میں رواداری اور رویوں میں اپنائیت نہ تھی۔ انسانوں کی فطرت میں عجب نادانی سی ہے' جب تک کوئی ساتھ رہتا ہے بھلا لگتا ہے' جب جدا ہو کر واپس آتا ہے تو اسے وہی جگہ دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ سیانے کہتے ہیں چڑیا بھی ہماری منڈیر پر آ کر بیٹھتی ہے تو اپنا رزق لے کر آتی ہے لیکن خدا کی بڑائی کو بندہ نہیں سمجھتا۔ اپنے گھر اپنی روزی میں کسی کو شریک کرنا پڑ جائے تو کیسا دل چھوٹا کر لیتے ہیں۔ ان کی بھابھیوں کے رویے میں خاصی رکھائی آ گئی تھی۔

بھائی بھی آہستہ آہستہ صبح شام "کیسی ہو بہن" پوچھ کر گویا فرض ادا کرتے تھے۔ پھر کبھی آتے جاتے ان کے بچے پر نظر پڑتی تو گال پر ہاتھ پھیر کر عجلت میں مسکرا کر آگے بڑھ جاتے۔ شروع شروع میں سب نے بہت خیال کیا کوئی کہیں جائے تو راحیل کو لینا نہ بھولے۔ کچھ لایا جائے تو راحیل کو سب سے پہلے دیا جائے' لیکن آہستہ آہستہ یہ سب باتیں خواب سی ہو گئیں۔ ان سے پلٹ پلٹ کر پوچھا گیا' یاد دلایا گیا' پھر اکسایا بھی گیا کہ انہیں اپنے شوہر کا حق پورا لینا چاہیے' ان کے بچے کا حق ہے' لیکن ان کی خاموشی پھر مسلسل خاموشی نے سب کو زچ کر دیا۔

"بیٹی صوفیہ! تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟" ایک دن ان کے ابا شاید صاف بات کرنے کے لیے ہی ان کے کمرے میں آئے تھے۔

"میں کیا سوچوں ابا جان! حالات میرے اختیار میں کب ہیں۔"

"مگر یوں تو زندگی نہیں گزاری جا سکتی بیٹی! تمہارے بچے کا مسئلہ ہے ورنہ میں تو تمہارے عقد ثانی کا ارادہ رکھتا ہوں۔" وہ حیران ہو گئیں۔

"ابا جان! آپ کیسی باتیں سوچ رہے ہیں۔ اب بھلا میں۔۔۔" آنسوؤں نے ان کی آواز بند کر دی۔ بھلا ماں باپ کے دل میں اور گھر میں ان کے لئے کوئی جگہ

نہ تھی؟ لیکن شاید وہ بھی دنیاداری' بڑھتی ہوئی مہنگائی' ضروریات کی زیادتی اور اپنی سفید پوشی سے نالاں تھے۔ متوسط طبقے کے لوگ آمدنی اور خرچ کے توازن کے چکر میں پڑے ہی رہ جایا کرتے ہیں۔

"ابا جان! مجھے چند دن کی مہلت دیں میں کوئی نہ کوئی حل سوچ لوں گی۔"

"تم کو "رانا ہاؤس" جانا چاہیے آخر تمہارے بچے کا حق ہے' اگر تمہارے ساتھ بچہ نہ ہوتا تو ہم تم کو وہاں جانے کا نہ کہتے' لیکن اب تمہارے سامنے اس کی پوری زندگی ہے۔ اس کا مستقبل' پڑھائی' ہمیں سوچنا چاہیے کہ اس کا حق اسے ضرور ملے وہ کیوں محروم رہے۔"

"اماں جان! آپ تو میری حالت سے ناواقف نہیں۔ آپ ہی ابا کو سمجھائیں' وہ حق دینے والے ہوتے تو پلٹ کر مجھے اور میرے بچے کو پوچھتے تو سہی۔"

"تم نے بھی تو بغیر آزمائے ان لوگوں کی طرف سے برائی ہی تصور کرلی ہے۔ حق دینے اور لینے کی تو کبھی تمہارے اور ان کے درمیان بات ہی نہیں ہوئی۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ راحیل کی ذمہ داری ان لوگوں کو اٹھانی چاہیے اور وہ اٹھائیں گے بھی۔"

وہ آنکھیں پھاڑے اپنی ماں کو دیکھ رہی تھیں' ابا بھی ان کی حمایت میں سرہلا رہے تھے۔

پھر انہوں نے سوچا بہت سوچا' صبح سے دوپہر ہوگئی اور دوپہر سے شام۔ آخر رات کے کھانے پر انہوں نے اعلان کردیا۔

"اماں! میں نے اپنا سامان رکھ لیا ہے' ہم ماں بیٹا کل صبح یہاں سے چلے جائیں گے۔" ایک ہلکی سی امید تھی' کوئی انہونی آس سی تھی' اپنی اپنی پلیٹوں پہ سرجھکائے لوگوں میں سے کوئی انہیں روکے گا' بھلے نہ روکے پوچھے گا تو کہ آخر کیوں جارہی ہو' کیا تکلیف ہے' کوئی مشکل ہو تو بتاؤ۔ مگر وہ خاموشی بہت کڑوی تھی' سب اپنی دھن میں مگن یا اپنے حالات سے مجبور۔

"تم یہ نہ سمجھنا کہ ہم کو تمہاری پروا نہیں ہے یا ہم تمہیں مشکلات میں تنہا چھوڑ رہے ہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ تم حالات کا ہمت سے مقابلہ کرو' اور اپنے بچے کو بھی ایک باہمت انسان بناؤ۔ یہاں رہ کر کسی بھائی کی تھوڑی سی مدد' کسی کی تھوڑی سی محبت' کسی کی تھوڑی مہربانی سے تمہارے بچے کا کوئی عمدہ و اعلا مستقبل نہ بن پائے گا۔ لیکن اسے اس کا حق مل گیا تو یہ ضرور کچھ بن جائے گا۔"

جب وہ صبح اپنا سب سامان سمیٹ کر خود بھی تیار ہوگئیں تب بڑی بھابھی ان کے پاس آئی تھیں اور ان کے دل کی کدورتیں دور کرنے کو بولیں۔

"آپ شاید ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ میرا بیٹا یہاں رہ کر وہ کچھ نہ بن سکے گا جو میں اسے بنانا چاہتی ہوں۔" وہ سامان اٹھا کر کمرے سے باہر صحن میں آگئیں۔

"تمہارے بھائی تمہیں "رانا ہاؤس" چھوڑ دیں گے۔" اماں نے کہا تو انہوں نے پلٹ کر انہیں یوں دیکھا جیسے وہ ان کے لیے بالکل انجان ہوں۔

"میں رانا ہاؤس" نہیں جارہی۔ اپنے فلیٹ پر جاؤں گی۔" سب حیران رہ گئے' ابا تو کچھ زیادہ ہی پریشان ہوگئے' وہ اپنی بیٹی کی کیفیت اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔

"فلیٹ پر اکیلی کیا کروگی؟" اماں بوکھلا گئیں۔

تو "رانا ہاؤس" جاکر کیا کروں گی' وہاں میرا کون ہے' اماں یہ بات آپ کیوں نہیں سمجھ رہی ہیں کہ میری اب ان لوگوں سے کوئی رشتہ داری نہیں رہی ہے۔" وہ تیزی سے بولیں۔

"تمہارے بیٹے کی تو ہے' اور تم بھی بناکر رکھنا چاہو تو تمہارا ابھی رشتہ تو ہے۔"

"اماں میں اب اپنے گھر میں جاؤں گی اور کوئی مجھے چھوڑنے بھی نہ جائے گا۔" وہ چڑ گئیں۔

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے بیٹا! تم اپنے ماں باپ بہن بھائیوں کے ہوتے ہوئے اکیلے کسی فلیٹ میں رہوگی' لوگ کیا کہیں گے۔" ابا جان نے بجھے ہوئے افسردہ لہجے میں کہا۔ انہیں خیال آرہا تھا کہ صوفیہ بی بی نے یہ فیصلہ ان سب کے رویوں سے مایوس ہوکر ہی کیا ہے۔

"تنہا کیوں۔ میرا بیٹا میرے ساتھ ہے' کل جوان ہوجائے گا تو میرا آسرا بنے گا۔ اور رہی لوگوں کی بات تو وہ کچھ دن باتیں کرکے چپ ہوجائیں گی۔" جی تو ان کا چاہا تھا کہ اس بات کا سخت سا جواب دیں لیکن ابا کے چہرے کی افسردگی اور اماں کے چہرے کی پشیمانی انہیں مار گئی۔

"اچھا جانے دو' تم یہیں رہ جاؤ صوفیہ! یوں اکیلی فلیٹ میں جانے کی ضرورت نہیں کل کو لوگ باتیں بنائیں گے تو ہمیں ہی سننا پڑیں گی' تمہارا کیا بگڑے گا۔" بڑے بھائی نے اتنے روکھے انداز میں کہا' صوفیہ بیگم کے دل ودماغ کے اندر عجیب درد کی لہر اٹھی۔ اوروں نے ظلم کیا وہ سہہ گئیں۔ لیکن ان کے تو اپنے بھی انجان بننے پر تلے ہوئے تھے۔ مگر اس وقت اس گھڑی انہوں نے سوچ لیا کہ وہ کسی سے نہ الجھیں گی۔ جب قسمت نے آزمائش ان ہی کے نصیب میں لکھ دی تھی تو کسی کا کیا قصور اور ان کو کیا حق پہنچتا تھا کہ وہ ہر کسی کے ظرف کو آزماتی پھریں عام حالات میں جو ماں باپ بھائی بہنوں کے فرائض تھے وہ سب تو انہوں نے پورے ہی کیے تھے' ماں باپ نے اچھا کھلایا پلایا' اچھی تعلیم دی' جب وقت آیا تو چن کر اچھے معزز اور امیر گھرانے میں شادی کردی' اپنی حیثیت کے مطابق جہیز دیا پھر اب اس سے آگے ان کی آسرے اور سہارے کی ضرورتیں ہی ختم ہونے میں نہ آرہی تھیں تو اس میں کسی کا کیا قصور؟ وہ اس وقت بڑے بھائی کے غصے' باپ کی التجا اور ماں کے سمجھانے پر اندر کمرے میں جاکر بیٹھ گئیں۔

لیکن' جو انہوں نے ٹھان لیا تھا وہ انہیں کرنا ہی تھا۔ اور اس کے لیے انہوں نے سب سے پہلے اپنے اندر سے اس غم وغصے کو نکالا ان کے اچھے مزاج کو گھن کی طرح کھا رہا تھا۔

پھر بڑی محبت سے انہوں نے ماں باپ کو سمجھایا۔ بڑے بھائی پر اپنا نقطہ نظر واضح کیا۔ اس طرح کہ بھائی کی انا بھی قائم رہے اور ان کی خودداری بھی داؤ پر نہ لگے۔ طے یہ پایا کہ تھوڑے دن اماں اور ابا ان کے ساتھ رہیں گے' جب تک وہ اپنے فلیٹ میں سیٹ ہوں گی' اپنے بچے کے اسکول آنے جانے کا انتظام کریں گی اور اپنی ضروریات کا حساب کتاب کرلیں گی۔

پھر وہی بات سامنے آگئی کہ اپنی ضروریات وہ کہاں سے پوری کریں گی؟ اس مسئلے پر انہوں نے کسی سے بحث کی نہ کسی سے مشورہ لیا اور شاید اسی مسئلے سے ہر کوئی بچنا بھی چاہ رہا تھا۔

جب بندوں کے آسرے پر انسان کو غم وغصہ ہوتا ہے تو وہ اللہ سے آس لگاتا ہے' اور دراصل یہی سچی آس ہوتی ہے' پوری لگن' جستجو اور ایمان سے بس بندے کے پکارنے کی دیر ہوتی ہے۔

شوہر نے کبھی ان سے اپنے بینک اکاؤنٹ کا ذکر کیا تھا اور اپنی تمام چیک بکس بھی وہ صوفیہ بیگم کے پاس ہی رکھواتے تھے۔

اس دن رات گئے سب کے سوجانے کے بعد انہوں نے ان کی الماریاں اور درازیں ٹٹولنا شروع کردیں۔ بے شمار کاغذات ان کی دکانوں' جائیداد' بینک کی اکاؤنٹ بکس اور اسی فلیٹ کے مالکانہ حقوق کے علاوہ "رانا ہاؤس" کی لیز کے کاغذات بھی ان کی فائلوں میں موجود تھے' زیادہ کاغذات فوٹو اسٹیٹ تھے لیکن وہ چاہتیں تو اگلے دن ہی دعوا کرسکتی تھیں اور اپنے بچے کا حق ضرور وصول کرسکتی تھیں لیکن ان کے ہاتھ کانپنے لگے اور ماتھے پر پسینہ نمودار ہوگیا۔

انہیں تو صرف اپنے بیٹے کی اچھی پرورش کے لیے تھوڑا آسرا چاہیے تھا' ان کی اپنی زندگی عزت سے گزر جائے اور راحیل رانا پڑھ لکھ کر کچھ بن جائے۔ انہوں نے سارے کاغذات وغیرہ سمیٹ کر الماری کی نچلی دراز میں بالکل کونے میں ڈال دیے' صرف ان میں سے اپنی فلیٹ کے کاغذات اپنے شوہر اور اپنی ذاتی چیک بک کو الگ کیا اور اس نچلی دراز کو مقفل کرکے چابی اپنی الماری میں نیچے کہیں دبا دی۔

اگلے دن راحیل کو اسکول بھیج کر اور ناشتہ وغیرہ کرنے کے بعد انہوں نے اماں سے کہا کہ انہیں راحیل کے اسکول جانا ہے اور اس بہانے وہ گھر سے

نکل کر سیدھا بینک چلی گئیں۔
انہیں کچھ اندازہ نہ تھا کہ یہاں کتنی رقم ہوگی اور یہ رقم وہ نکلوا بھی سکیں گی یا نہیں۔ جب چیک بک اور رسید آگے بڑھائی تو شیشے کے دوسری طرف بیٹھے شخص نے رسید دیکھ کر آنکھیں چڑھاتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔
"جی فرمائیے!"
"کیا یہ چیک کیش ہو سکتے ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔
"بی بی! جن کا اکاؤنٹ ہے وہ خود کیش کروالیں' یا آپ ان کے دستخط لے آئیے" اتنا اصول تو جاہل لوگ بھی جانتے ہیں۔" وہ چڑا ہوا تھا یا شاید اس کا لہجہ ہی ایسا تھا۔
"ان کا انتقال ہوگیا ہے" بہت مشکل سے ان کے منہ سے نکلا۔
"اوہ! آپ ان کی بیوہ ہیں؟" شیشے کے اس طرف بیٹھے شخص کے چہرے کی سختی کم ہوئی۔
"جی ہاں!" انہوں نے سر ہلایا۔
"میں تو آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا کمپیوٹر بتا سکتا ہے' اس کے لیے آپ تھوڑی دیر بیٹھیں اکاؤنٹ انکوائری کھلوا کر آپ کو بلاتا ہوں۔" وہ پلٹ کر دیوار سے لگے بنچ پر بیٹھ گئیں۔
اور ان کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی جب انہیں بتایا گیا کہ اس اکاؤنٹ میں دس لاکھ کی کثیر رقم موجود تھی اور یہ اکاؤنٹ ان کے شوہر کے مرنے کے بعد خود بخود ان کے نام منتقل ہوگیا تھا جس میں کوئی دوسرا شخص دعوے دار نہیں ہو سکتا تھا۔
اپنی رقم کا آدھا حصہ انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر اپنے بڑے بھائی کے حوالے کردیا جسے انہوں نے کاروبار میں لگا کر ہر ماہ ایک معقول رقم بہن کو دینے کا انتظام کرلیا۔ یہ تو وہ بھی سمجھتی تھیں کہ صرف ان کی بری قسمت نے ان لوگوں کو وقتی طور پر تنگ نظر بنا دیا تھا ورنہ حقیقتاً" ان کے میکے میں سب لوگ ایماندار اور مخلص ہی تھے۔ ان کی والدہ تین سال بعد ہی انتقال کر گئیں اور پھر ان کے ابا سب بیٹوں کے علیحدہ ہو جانے پر تقریباً" مستقل طور پر صوفیہ بیگم کے پاس اٹھ آئے۔ ان کو آسرا بھی ہوگیا اور والد کی خدمت کا موقع بھی مل گیا۔

☼ ☼ ☼

شروع شروع میں ان کے سسرال والے انہیں یاد کرلیتے۔ کسی شادی بیاہ اور خوشی غمی میں انہیں بلایا جاتا' پھر سال کے سال ان کے میاں کی برسی پر کوئی نہ کوئی ان کے پاس آتا' اس میں بھی انہیں لگتا کوئی غرض ہی ہوتی کہ وہ باخبر رہنا چاہتے تھے کہ صوفیہ بیگم کیسی ہیں' کس طرح گزر بسر کرتے ہیں وغیرہ لیکن انہوں نے بھی دور اندیشی اور ذہانت سے کام لیتے ہوئے کبھی ان پر کچھ واضح نہ ہونے دیا کہ وہ اپنا گھر کس طرح چلاتی ہیں ہمیشہ یہی ظاہر کیا کہ بھائی بھاوج ہیں نا' ابا کا آسرا دکھایا۔ وہ سب اسی پر مطمئن ہو جاتے کم کبھی نظر آتا تھا۔
سو سسرال سے تعلق تو اسی حد تک تھا' البتہ میکے سے انہوں نے اچھا تعلق رکھا ہوا تھا سب بہن بھائیوں سے ملنا ملانا' جب راحیل کی چھٹی ہوتی یا بڑی بہن آتیں تو بڑے بھائی کے ہاں رہنے چلی آتیں' ان سب کے بچوں سے انہیں بہت محبت تھی خاص کر بڑے بھائی کی عمیرہ انہیں بہت عزیز تھی وہ یوں بھی سب کی لاڈلی تھی کہ سب سے چھوٹی تھی اور تھی بھی بہت خوبصورت' نازک خدوخال' گورا رنگ' گھنے سیاہ بال' دھیما لہجہ اور ذہانت کی انتہا۔ میٹرک تک پہنچی تو خاندان بھر میں دھوم مچ گئی۔
"اف یہ سہیل چچا کی بیٹی ہے؟"
"ارے سہیل بھائی کی عمیرہ پر تو نظر نہیں ٹھہرتی۔"
"فرحت بھابھی! آپ کی بیٹی تو شہزادیوں والا حسن لائی ہے۔"
سچ یہ تھا کہ خوبصورتی تو اللہ کی دین ہے مگر ساتھ میں بہترین تربیت اور نیک سیرت ہو تو خوبصورتی کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ سب کہتے تھے کہ کوئی نہ کوئی کمی تو ہر کسی میں ہوتی ہے لیکن عمیرہ کو دیکھ کر لگتا کہ کمی کہیں ہے ہی نہیں۔ وہ اپنی صوفیہ پھوپھو کی ہو بہو تھی برملا کہتی کہ پھپھو ہی میرا آئیڈیل ہیں۔
"تمہیں سچ مچ صوفیہ خالہ سے عشق ہے یا ان کے گھر میں کہیں دل بھٹک رہا ہے۔" بڑی خالہ کی روحی اسے بہت چھیڑتی۔ وہ اس کی ہم عمر اور رازدار دوست تھی۔ اس کا کوئی بھی رشتہ آتا فرحت بھابھی ہر مسئلے پر اپنی بڑی نند کے پاس دوڑتیں اور ان کے خفیہ مشوروں کی رپورٹ میں روحی آکر عمیرہ کو دیتی رہتی۔
"یہ تمہاری امی صوفیہ خالہ سے مشورہ کیوں نہیں لیتیں؟"
"تمہاری اماں بڑائی کا رعب بہت جھاڑتی ہیں نا اس لیے۔" عمیرہ خود ایسی صورت حال پر چڑی رہتی۔
"اے خبردار میری امی کو کچھ نہ کہنا۔ ہاں۔" روحی فوراً" آنکھیں نکالتی۔
لیکن اب کی بار فرحت بھابھی سنجیدگی سے صوفیہ بیگم سے بھی مشورہ لینے کا سوچ رہی تھیں۔ جس طرح ان کی بیٹی سب کی مرکز نگاہ بنی ہوئی تھی۔ اسی طرح فرحت بھابھی اور سہیل بھائی کے دل اور آنکھوں میں بھی راحیل رانا ٹھہر گیا تھا۔
اس میں بھی ہر خوبی موجود تھی لیکن ایک کسر رہ گئی تھی' جس طرح باپ کی جائداد اسے ورثے میں نہ مل سکی تھی۔ اسی طرح ماں کی طبیعت کی بردباری' مروت اور نرم مزاجی بھی اس کے حصے میں نہ آئی تھی۔ بات بات پر بگڑ جانے والا راحیل رانا۔ اکھڑ بھی تھا اور تند خو بھی لیکن شخصیت اتنی پرکشش پائی تھی کہ اس کی اکھڑ مزاجی اسے اور منظور نظر بناتی۔
"کتنا ہینڈسم' اسمارٹ اور چارمنگ ہے۔" اسے دیکھ کر اکثر لڑکیوں کی رائے ہوتی' لیکن بے تکلف ہونے کی کسی میں ہمت نہ ہوتی خاندان بھر میں بھی کالج یا یونیورسٹی میں بھی وہ ایک بددماغ سالڑ کا مشہور تھا۔ لڑکیاں تو دور کی بات' لڑکوں سے بھی اس کی بہت کم ہی بن پاتی۔

"راحیل بی بی اے کرنے کے بعد جاب کرنا چاہتا تھا۔ مگر صوفیہ بیگم کا خیال تھا کہ وہ ابھی مزید پڑھے' یہ راحیل کی بھی منزل نہ تھی مگر اس کا خیال تھا کہ اب اسے ماں کے ساتھ اپنی ذمہ داری شیئر کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے جاب کے ساتھ وہ ایم بی اے نہ کرپاتا اسی لیے صوفیہ بیگم قائل نہ ہورہی تھیں۔ لیکن وہ بیٹے پر زبردستی بھی نہ کرنا چاہ رہی تھیں۔

"دیکھو بیٹا! اب تم اتنے سمجھ دار ہوگئے ہو کہ اپنے لیے کوئی فیصلہ کرسکو مگر صرف اس لیے کہ تم میری ذمہ داری میں میرا ساتھ دینا چاہتے ہو۔ اپنے کیریئر کو نہ ٹھکرانا جس کا میں نے تمہارے لیے خواب دیکھا ہے اور تم خود بھی اسی کے بارے سوچتے رہے ہو۔"

انہوں نے اپنی بات کہہ کر فیصلہ اس پر چھوڑ دیا تھا۔

ان ہی دنوں دادا جان کے بہت زیادہ بیمار ہونے کی اطلاع ان کو ملی۔ ان کی نند نے انہیں خود فون کیا اور یہ بھی کہا کہ آپ ضرور آئیں اور راحیل کو بھی ساتھ لے کر آئیں۔ وہ کچھ تذبذب میں پڑ گئیں' وہ خود تو چلی جاتیں مگر راحیل؟

لیکن جب راحیل جانے کے لیے تیار ہوگیا تو وہ مطمئن ہوگئیں۔

☼ ☼ ☼

"رانا ہاؤس' بہت سی تبدیلیوں کے باوجود وہی تھا۔

"وہی اونچی اور سخت دیواریں' گھٹے ہوئے بند کمرے جن میں روشن دان بھی اتنے اوپر تھے کہ کوئی ان میں سے باہر نہ جھانک سکے۔ پورے گھر کی خاص بات یہ تھی کہ بیٹھک اور صحن کے علاوہ کہیں بھی کھڑکیاں یا اضافی دروازے نہ تھے شہروں میں ایسے مکان اب بہت کم ملتے ہیں لیکن دادا جان اس گھر کی اندرونی ساخت اور بناوٹ میں تبدیلی کے سخت خلاف تھے' اتنا ضرور ہوا تھا کہ اب ہر کمرے میں اے سی لگ گیا تھا۔ فرنیچر' قالین' پردے وغیرہ سب کمروں کے تبدیل ہوگئے تھے' لیکن لوگ نہ بدلے تھے۔ اس طرح ناک چڑھا کے گردن اکڑا کر چلنے والے۔

"اوہو! صوفیہ! تم نے تو کبھی پلٹ کر ادھر دیکھا ہی نہیں۔"

"بس بچے کی طرف لگی رہی اماں جی! تو کسی اور طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہ ملی۔" بظاہر اداس غمزدہ اور پریشان بیٹھی تھیں لیکن لہجے اور نظروں کی چبھن انہیں پریشان کررہی تھی۔

ان کو عجب وحشت اور بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ اس ماحول میں ابھی تک کوئی گنجائش نہ نکلی تھی۔

"السلام علیکم دادا جان!" راحیل اپنے چچا سے سلام دعا میں لگ گیا تھا۔ اس لیے اندر کمرے میں ذرا دیر سے آیا تھا۔

دادا جان کی آنکھوں میں عجب چمک سی آگئی تھی' اسے دیکھ کر وہ کچھ کہنا چاہتے تھے' لیکن بات نہ کرسکتے تھے فالج نے سیدھے ہاتھ پاؤں کی طاقت کے ساتھ زبان کی جنبش بھی چھین لی تھی۔

"ارے' راحیل اتنا بڑا ہوگیا ہے؟" دادی جان تو اسے دیکھ کر دم بخود ہی رہ گئی تھیں۔ وہ دبلا پتلا لڑکا جس پر انہوں نے پہلے کبھی نظر خیر نہ ڈالی تھی' جوانی میں یوں سج گیا تھا کہ رانا ہاؤس میں رہنے والے بہت سے لوگ آج سات آٹھ سالوں بعد اسے دیکھ کر نئی امیدیں لگا بیٹھے تھے۔ اتنا خوبرو جوان' آنکھوں میں ذہانت کی چمک کیسی تھی اور لہجے میں اعتماد کتنا حملہ سے ان کا ہو رہا تھا۔

"کیسا ظلم کیا تم نے صوفیہ خاتون! ہمارے خون کو ہم سے دور رکھ کر دیکھو تو کیسا گبرو جوان میرا پوتا ہے اور میں اس کی صورت یوں تک رہی ہوں اور یہ بھی مجھے حیرانی سے ایسے دیکھ رہا ہے جیسے غیر ہو ہمارے ہی بچے کو ہم سے اجنبی انجان بنا کر رکھ دیا تم نے۔" اماں جی اپنی فطرت سے باز نہ آئیں۔ لیکن راحیل کو یہ انداز اور یہ باتیں اچھی نہ لگیں۔

"آپ عجیب سی باتیں کررہی ہیں دادی اماں! جسے آپ نے اپنا تسلیم ہی نہیں کیا اس پر حق کیسا؟"

راحیل نے صاف گوئی سے کہا۔ اور اس کے بعد ہر کسی کے لیے اس کا یہی انداز تھا۔

کچھ حیران ہوئے کچھ پریشان' پشیمان شاید ہی کوئی ہوا ہو۔ صوفیہ خاتون کا بیٹا اتنا تیز' حاضر جواب' اس میں تو نہ اس کے باپ کی جھلک تھی نہ ماں کی شخصیت کا عکس۔

"کیا ہوا کسی نے چائے کے لیے کہا یا نہیں؟" دادی جان نے اپنی بہو صوفیہ خاتون کی دیورانی عابدہ خاتون سے کہا۔

"ہاں میں نے اسی وقت کہلوا دیا تھا' صالحہ خود چائے بنا رہی ہے' بلکہ لیجیے وہ آگئی۔"

راحیل کی اس پر پڑنے والی پہلی نظر بہت سرسری تھی مگر کمال یہ تھا کہ وہ نظر پلٹ کر نہیں آئی۔

"صالحہ! تم یہاں کیوں آگئیں؟" دادی جان کے تیور یکدم بگڑ گئے۔ وہ حیران ہو کر اپنی نظر کے زاویے کو فوراً درست کرنے پر مجبور ہوگیا۔ صوفیہ خاتون بھی اپنی ساس کے رویے پر کچھ حیران ہوگئیں۔

"دادی اماں' تائی جان سے ملنے آئی تھی۔ مجھے ان سے ملنے کا بہت شوق تھا۔" وہ سلجھی ہوئی نرم آواز یوں ٹوکے جانے پر کچھ ناراض سی ہونا چاہیے تھی مگر ہوئی نہ تھی۔ جانے یوں ٹوکے جانے کی عادی تھی یا برداشت کی انتہائی صلاحیت رکھتی تھی۔

"السلام علیکم تائی جان! میں صالحہ ہوں' آپ کے بڑے دیور کی بیٹی' مجھے آپ سے ملنے کا بڑا ارمان تھا۔" اس نے ایسے کہا جیسے پھر کبھی نہ مل سکے گی یا بات نہ ہوسکے گی۔

"بس اندر جاؤ چائے ملازمہ دے دے گی۔" صوفیہ خاتون' صالحہ کو پیار کررہی تھیں اور ساتھ بیٹھا راحیل بظاہر لاپروا سا تھا دادی جان نے پھر ٹوکا۔

"چائے تو رہنے دیں دادی جان! اتنے شوق سے بنائی ہے۔" وہ ٹرالی کی طرف بڑھ گئی اور اسی لمحے اس کے سر پر احتیاط سے رکھا کہ آنچل نیچے ڈھلک گیا' گھنے سیاہ بالوں کی چوٹی کمر تک لہرا رہی تھی' دوپٹہ ڈھلک جانے سے وہ کچھ سہم سی گئی۔ ساری پُراعتمادی پل میں ہوا ہوگئی۔ جلدی سے منہ پھیر کر دوپٹہ درست کرنے لگی۔

عابدہ خاتون! صالحہ سے کہو اندر جائے یہ اس کی پڑھائی کا وقت ہے' چائے دینے میں وقت لگے گا۔" اب دادی جان نے سختی سے کہا اور صالحہ تیزی سے تقریباً" دوڑتے ہوئے اندر کہیں غائب ہوگئی۔

اپنی ساس کا رویہ صوفیہ خاتون کو بھی برا لگا انہوں نے اپنی دیورانی پر نگاہ ڈالی جن کا چہرہ اتر گیا تھا۔ لیکن چپ رہی وہ ان معاملات میں کیا کہہ سکتی تھیں۔ سسر کی عیادت کے لیے آئی تھیں۔ سو چائے پی' سسر کی خیریت پوچھی' کچھ رسمی سی بات چیت کی اور اٹھ گئیں۔

"آتے رہنا بیٹا! اپنے دادا کو پوچھنے کے بہانے ہی آجایا کرو۔" دادی جان نے چلتے ہوئے پھر راحیل سے کہا۔

☼ ☼ ☼

نہ کوئی بات ہوئی تھی نہ تعارف لیکن راحیل کے ذہن پر وہ لڑکی چھا سی گئی تھی۔ وہ کچھ اندازہ نہیں کرپا رہا تھا کہ کیوں؟۔ کوئی ایک چہرہ' ایک انجان چہرہ کسے یوں ڈسٹرب کرسکتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بڑا قائل کیا' بہت جھٹلایا۔ یونہی سا تاثر ہے چند دنوں میں ختم ہوجائے گا۔ لیکن نہ چند روزوں میں احساس ختم ہوا نہ تاثر مٹ سکا۔ راحیل کو اپنی بات کچھ پسند نہ آئی۔ اس نے کسی چیز کو زندگی میں اپنی کمزوری نہ بنانے کا عہد کر رکھا تھا لیکن بعض جذبے اختیار سے نکل کر بے اختیاری کے دائرے میں چلے جاتے ہیں اور ہمارا منہ چڑاتے رہتے ہیں۔

"تم جانتے ہو آج فرحت بھابھی گھر آئی تھیں۔" شام کو چائے پیتے ہوئے صوفیہ بیگم نے اپنے بیٹے سے کہا۔ راحیل کو ان کا لہجہ معنی خیز سا لگا۔

"جی امی! میں صبح جا رہا تھا اسی وقت تو وہ آئی تھیں۔ میری ملاقات ہوئی تھی۔"

"وہ عمیرہ کے بارے میں بات کررہی تھیں۔ اس

کے آج کل بہت اچھے اچھے رشتے آرہے ہیں۔" وہ بغیر کسی تمہید کے اصل بات پر آ گئیں۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے امی جان! ویسے بھی عمیرہ ایک بہت اچھی پیاری اور ذہین لڑکی ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"اور یہ اچھی اور ذہین لڑکی مجھے بہت پسند ہے' تمہیں پسند نہیں؟" انہوں نے صاف بات کی۔

"امی جان! آپ کیسی باتیں کررہی ہیں۔ میری زندگی میں ابھی ان باتوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مجھے تو ابھی زندگی میں سیٹ ہونے کے لیے بہت لمبا سفر کرنا ہے۔" وہ کبھی کسی بات پہ اتنا جذباتی نہ ہوتا تھا لیکن اس بات پر اسے جانے کیا ہورہا تھا۔

"بیٹا! اگر ہم فرحت بھابھی اور بھائی کو آس دلائیں تو تم جتنا چاہو وہ انتظار کرلیں گے۔" صوفیہ بیگم شاید دل میں بڑے ارمان لیے اسے سمجھا رہی تھیں۔

"لیکن کیوں؟ ایک اچھی لڑکی آپ چاہتی ہیں کہ میرے انتظار میں ضائع ہوجائے؟ امی! سوچیے تو ابھی میری پڑھائی بھی مکمل نہیں ہوئی۔ اور آگے بھی مجھے ایسی بات سوچنا بھی نہیں۔" اس نے بھی ٹھان لیا کہ کوئی بھی ہیر پھیر والی بات کرنا ناروا ہوگا۔

"مجھے لگتا ہے کہ بھائی جان اور بھابھی بہت آس لگائے بیٹھے ہیں بیٹا!" صوفیہ بیگم اپنے دل کی بات اسے بتا نہیں پارہی تھیں۔

"دیکھیں امی! آپ نے تھوڑی سی بھی نرمی دکھائی تو وہ لوگ امید لگا بیٹھیں گے اور ہم گناہگار ٹھہریں گے' مجھے پتا ہے کہ آپ کو اپنے دل کی خواہش کی اتنی پروا نہیں جتنا آپ یہ سوچ کر پریشان ہورہی ہیں کہ فرحت بھابھی سے کیا کہوں گی؟ یا بھائی جان کو کیا بتاؤں گی' وہ کیا سوچیں گے وغیرہ۔"

"تمہاری ساری باتیں ٹھیک ہیں بیٹا! میں سچ مچ اسی فکر میں مبتلا ہوں کہ یہ بات ان سے کیسے کہوں گی' مجھے خوب اندازہ ہے کہ ان کے دل میں آس ہے۔" وہ اپنی پریشانی بیٹے سے شیئر کررہی تھیں۔

"سو طریقے ہیں نا امی! خالہ سے بات کرلیں' نانا جان سے کہہ دیں یا ایسا کریں آپ بھی عمیرہ کے لیے اچھا سا رشتہ ڈھونڈنا شروع کردیں۔" وہ سمجھانے لگا۔

اور پریشانی میں پہلی بار ان کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔

"ارے میرا بیٹا تو گھریلو معاملات میں بھی طاق ہے' دیکھو مجھے تو ایسے حل سجھائی ہی نہیں دیتے۔"

"اس لیے امی کہ آپ پریشان ہوجاتی ہیں اور پریشانی بندے کی عقل کو یرغمال بنالیتی ہے۔" راحیل نے کہا تو بیٹے کی خاطر وہ راضی ہوگئیں' انہیں دکھ بہت ہوا تھا لیکن راحیل کی مرضی کے بغیر وہ اپنی خواہش کی تکمیل نہیں کرسکتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

عمیرہ کے سلسلے میں اپنی ماں کو ناامید کرکے راحیل کو ان کی دوسری خواہش کا لاشعوری طور پر احترام کرنا پڑا۔ اس نے ایم بی اے میں داخلہ لے لیا تھا' یہ اس کی اپنی بھی آرزو تھی لیکن ماں کا مسلسل اس کے لیے پریشان رہنا اس کی فکر کرنا گھر چلانے کے لیے آمدنی اور پیسے کو ناپتے تولتے رہنا اس کے دل کو دکھاتا رہتا۔ اس نے خود کو منایا۔ وہ تین سال اور یہ منزل پالینا اتنا آسان بھی نہیں' جستجو انسان کو ضرور کامیاب کرتی ہے اور اس کی محنت نے یہ دن دکھایا کہ اس نے بہترین نتیجے کے ساتھ ایم بی اے کا امتحان پاس کرلیا اور اب اچھی جاب کی تلاش میں نکلا تھا۔ اور آج بٹ صاحب کے آفس میں وہ پہلا انٹرویو دینے ہی گیا تھا اور انٹرویو بھی کیا تھا بس جان لیا کہ وہاں تو نہ صفر ہی نکلنا ہے اسی لیے دوسرے دن سے ہی اخبارات جھانک جھانک کر دفتروں میں چکر لگانے شروع کردیے' دو ایک جگہ ماموں جان نے بھی حوالہ دیا تھا اور اگلے دن اسے ان ہی جگہوں پر جانا تھا۔

آج وہ جلدی گھر لوٹ آیا' ابھی ظہر کا وقت ہی ہوا تھا۔ صوفیہ بیگم کچھ حیران ہوئیں مگر اس وقت کہا کچھ نہیں' قیمہ بھرے کریلے راحیل بڑے شوق سے کھاتا تھا' وہ قیمہ بھر کر کریلوں پر دھاگہ لپیٹ کر ایک چھوٹی پلیٹ میں رکھ چکی تھیں۔ اب آہستہ آہستہ کریلے تلنے لگیں۔ لکڑی کے چمچ سے ہلکا سرخ ہونے پر ان کو دوسری طرف گھماتے ہوئے وہ احتیاط برت رہی تھیں جب کریلے دونوں طرف سے سرخ ہوگئے تو انہوں نے چھوٹی پیالی میں بچا قیمہ بھی اس میں شامل کردیا' کام کرکے پلٹیں تو کچن کے دروازے میں کھڑے راحیل کو دیکھ کر مسکرائیں۔

"بہت بھوک لگی ہے تمہیں؟"

"امی! آپ صرف میرے لیے اتنا تردد کیا کرتی ہیں' سیدھا سیدھا کوئی دال سبزی یا گوشت پکا دیا کریں' ہم دونوں ماں بیٹے ہی تو ہیں۔ نانا جان بھی نہیں رہے۔"

جس سال اس نے ایم بی اے میں داخلہ لیا اسی سال صوفیہ خاتون کے والد انتقال کرگئے تھے۔

"ارے بیٹا! تو ایک سبزی ہی تو پکائی ہے۔"

"اونہہ ایک کڑوی کسیلی سبزی کے اتنے چونچلے۔ اتنی دیر تو آپ کو مرغ پلاؤ پکانے میں بھی نہ لگے۔" وہ ہنسنے لگا اسے واقعی بھوک بھی لگی تھی اور دل بھی مچل رہا تھا اپنی ماں کو خوش خبری سنانے کے لیے جس کی وجہ سے وہ آج جلدی گھر آگیا تھا۔

"نہیں کڑوی کسیلی سبزی کو ذرا سی توجہ دی جاتی ہے تو کتنی عمدہ اور لذیذ بن جاتی ہے' صرف کریلے کے فائدے ہی دیکھو تو۔"

"پلیز امی! مجھے کریلے کے فوائد والا پروگرام نہیں سننا' میں جلدی میں ہوں' مجھے بہت بے چینی ہورہی ہے۔"

"کھانا کھانے کی جلدی ہے تو چلو کھانا تو بالکل تیار ہے۔ آج میں نے اسپیگٹی بھی پکائی ہیں۔"

"امی! مجھے کھانے کی نہیں آپ کے فارغ ہونے کی جلدی ہے۔ مجھے آپ کو ایک زبردست بات بتانی ہے مگر آپ کچن سے نکل ہی نہیں رہیں۔"

"اچھا تو یہیں کھڑے کھڑے بتادو' میرا خیال ہے میں کام کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کرسکتی ہوں۔"

"ایسے تھوڑی امی! آپ باہر آئیں۔ تسلی سے صوفے پر بیٹھیں' محبت سے میرا چہرہ دیکھیں پھر بتاؤں گا۔"

"چلو یوں سہی!" وہ اس کے ساتھ باہر آ گئیں اور جب صوفے پر بیٹھ کر پیار سے اس کا چہرہ تک رہی تھیں تب اس نے بتایا کہ اسے جاب مل گئی ہے۔

"کہاں؟" انہوں نے پوچھا۔

"ان ہی بٹ صاحب کے دفتر میں جہاں میں سب سے پہلے دن انٹرویو دینے گیا تھا۔"

"مگر تم نے تو بتایا تھا کہ انہوں نے ڈھنگ سے تمہارا انٹرویو بھی نہیں لیا تھا۔"

انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔

"امی جوہری کو ہیرے کی پہچان ایک نظر میں ہوجاتی ہے۔" وہ ہیرے سے بولا۔

"اوہو! اپنے بارے میں اتنی خوش فہمی! لیکن بیٹا فخر خود پر ناز کرنے کی حد تک اچھا ہوتا ہے' تکبر تک نہ پہنچے۔" انہوں نے فوراً سمجھایا۔

"آپ اپنے بیٹے کی طبیعت سے واقف نہیں ہیں کیا؟" اس نے اپنی ماں کو دیکھا۔

"مجھ سے زیادہ تمہیں کون پہچانے گا' لیکن تمہیں ٹوکنا بھی میرا فرض ہے۔" وہ سر ہلانے لگا۔ اسے خود بھی دراصل اس نوکری کے مل جانے پر سخت حیرت ہوئی تھی۔ یہ بہت اچھی جاب تھی اور اچھی ابتدا کا مطلب تھا روشن مستقبل۔ اسے اپنی قابلیت پر بھروسا تھا اور اس کے خیالات ہمیشہ امید افزا رہے تھے۔

اسی امید کے سفر میں اس کی ایک نظر صالحہ پر بھی تھی۔ حالانکہ عجیب سی بات تھی وہ اس کے ان چچا کی بیٹی تھی جن سے اس کے والدین کے کبھی اچھے تعلقات نہ رہے تھے' لیکن بس گنتی کی ہی چند ملاقاتوں میں وہ اسے اتنی اچھی لگی کہ اسے منزل ہی مان لیا تھا۔ لطف کی بات یہ تھی کہ ان ملاقاتوں میں کوئی خاص بات بھی نہ ہوئی تھی۔ وہ رانا ہاؤس اس وقت گیا تھا' جب خود باشعور نہ تھا کہ صالحہ کا خیال آتا۔ دوسری بار پورے خاندان کا ہجوم' رشتہ داروں کی بھیڑ' ان میں سے آدھے لوگوں کو تو وہ پہچانتا بھی نہ تھا۔

”دادا کے سوئم والے دن وہ وہاں جانا نہ چاہ رہا تھا لیکن صوفیہ خاتون نے زبردستی کی تو اسے جانا پڑا۔ وہی ہجوم تھا اور وہی اس کا اور اس کی ماں کا اکیلا پن۔ دادی جان نے پہلی بار اسے دیکھ کر جیسی بے تابی اور گرم جوشی کا مظاہرہ کیا تھا وہ اسے لگا وقتی ابال ہی تھا۔ بعد میں انہوں نے ہمیشہ اس کے سلام کا سرسری سر ہلا کر جواب دینے کے سوا کوئی تعلق انہوں نے نہ جتایا۔ صالحہ اتنا چھپ چھپ کر آتی اِدھر جھلک دکھاتی اُدھر لگتا پھر چھپنے کی جستجو میں ہے۔ وہ اس کے بارے میں متجسس تھا اور محتاط بھی کسی سے اس کا ذکر تو کیا اس کی طرف اشارہ بھی نہ کیا تھا' یہاں تک کہ اپنی ماں سے بھی نہیں' ہاں مگر حمزہ نورانی اس کا وہ دوست تھا جو اس کے ہر راز' احساس اور اختیار سے واقف تھا۔ اور اس واقفیت پر اسے بڑا بھروسا تھا۔

☼ ☼ ☼

”جی مسٹر راحیل! اگر میں نے دھوکہ نہیں کھایا تو آپ مسٹر عظمت رانا کے کوئی قریبی رشتہ دار ہیں۔ غالباً“ وہ آپ کے دادا ہیں۔“

وہ بہت حیرانی سے بٹ صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ دفتر میں پہلا دن تھا اور بٹ صاحب کے سامنے یہ اس کی پہلی حاضری تھی۔

”آپ نے مجھے نوکری کیا اس رشتہ داری کی بنا پر دی ہے؟“ سوال لازمی تھا۔

”مسٹر راحیل! اس رشتہ داری کا اگر مجھے پہلے علم ہو جاتا تو میں شاید آپ کو نوکری نہ دیتا۔“ وہ پھر ان کی صورت تکنے لگا۔ ”آئی ڈونٹ بلیو کہ رانا گروپ آف انڈسٹریز کے شیئرز کا حصہ دار یا عظمت اینڈ سنز پرائیوٹ لمیٹڈ کے مالکوں کا بیٹا میرے پاس نوکری کے لیے درخواست دے سکتا ہے' حتیٰ کہ اب میرے دفتر میں ملازم کی حیثیت سے کام شروع کر رہا ہے لیکن تمہارے ہر انداز اور باتوں سے یہ رشتہ داری ثابت ہو جاتی ہے۔“

اس نے کیا کیا نہ سوچا تھا پہلا دن دفتر میں کیسے گزارے گا' اپنا انداز اور رویہ اس طرح رکھے گا کہ ضرور سب کو متاثر کرے۔ مگر وہ اس وقت اپنے باس کے سامنے گنگ تھا' جو سوچا جائے وہ ہو نا جائیں اسی کا نام زندگی ہے۔

”آپ بہت حیران ہیں؟“

”نہیں میں آپ کی حیرانی پر پریشان ہوں سر۔“ اس نے اپنی کیفیت پر قابو پایا۔

”تمہیں ہونا چاہیے پریشان کیونکہ۔ تم خود جتنے اکھڑ مزاج اور تند خو ہو میں اس سے کہیں زیادہ سخت مزاج ہوں۔ اور میرا بگڑا ہوا مزاج اسی بات پر اڑا ہوا ہے کہ تمہیں ابھی کھڑے کھڑے اس نوکری سے نکال دوں جسے تم نے ابھی ابھی جوائن کیا ہے۔“

وہ کرسی کھسکا کر کھڑا ہو گیا۔

”تھینک یو سر! یہ بھی آپ کی ذرہ نوازی ہے کہ آپ نے مجھے یہ بتانے کے لیے بلایا ورنہ میرا خیال ہے کہ میری طرح آپ کو بھی اپنا وقت ضائع کرنا پسند نہ ہوگا۔“ اب بٹ صاحب اس کی صورت تکنے لگے۔

”اتنا کہ پر کبھی نہیں بیٹھنے دیتے پر خود دار! میں نے تو پہلے ہی دن کہا تھا نوکری کرنا تمہارے بس کی بات نہیں۔ میں نے تمہیں نوکری سے نکالا نہیں ہے' صرف یہ بتا رہا ہوں کہ میرا موڈ کیا کہتا ہے۔ بیٹھ جاؤ!“ انہوں نے تقریباً“ تحکمانہ انداز میں کہا اور اس لہجے کو ناپسند کرتے ہوئے وہ کھڑا رہا کچھ وقفے کے بعد وہ بیٹھ گیا' اور وہ کچھ سیکنڈ بٹ صاحب کو بہت بھاری لگے لیکن انہوں نے بہت تحمل سے برداشت کیا۔

”سوری سر! میری جاب کی ابتدا ہی دھمکیوں پر ہو رہی ہے؟“

”یہ صرف تمہارے غلط رویے کا جواب ہے مسٹر راحیل! تمہاری بیک اگر اتنی مضبوط ہے تو تمہیں اس کا حوالہ دینا چاہیے تھا۔“

”آپ کون سے حوالے کی بات کر رہے ہیں میں اب بھی سمجھ نہیں پایا ہوں۔ عظمت رانا سے میری رشتہ داری پر آپ کو اعتراض کیوں ہے“ آپ کو اپنے کام کے لیے ایک باصلاحیت اور کوالیفائیڈ نوجوان کی

ضرورت ہے وہ میں ہوں' لیکن آپ میرے خاندانی بیک گراؤنڈ میں یوں دلچسپی لے رہے ہیں جیسے مجھے جاب نہیں رشتہ دے رہے ہوں۔"

"صرف اس لیے کہ عظمت اینڈ سنز سے ہمارے گہرے کاروباری مراسم ہیں سو میں یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ اس کمپنی کے مالکوں کا بیٹا ہمارے ہاں کیوں ملازمت کرنا چاہتا ہے' اس پوسٹ پر تو بیسیوں ملازم ان کی اپنی کمپنی میں کام کر رہے ہیں۔" اب بٹ صاحب نے اپنی پریشانی بتائی۔

"شاید آپ کو یہ فکر لاحق ہو رہی ہے کہ میری ملازمت کہیں آپ کی بہترین کاروباری دوستی میں خلل نہ ڈال دے۔" اس کا لہجہ اب مضبوط اور رواں تھا۔

"آف کورس! بٹ یو آر اے جینئس تم نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔" وہ اس کی صورت دیکھنے لگے۔

"پھر فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے' آپ چاہیں تو میری جاب ختم کردیں۔"

"تم صاف بات بتاؤ۔ تم ملازمت کیوں کرنا چاہتے ہو؟"

"اس لیے کہ میری ماں نے بہت تکلیفیں اٹھا کر میری پرورش کی ہے مجھے پڑھا لکھا کر اس قابل بنایا ہے کہ آج آپ کے سامنے بیٹھ کر میں اتنے اعتماد سے بات کر رہا ہوں۔ اب میرا فرض ہے کہ میں انہیں آرام پہنچاؤں اور اپنے گھر کا خرچ چلاؤں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس صدی کا کون سا مذاق تم میرے ساتھ کر رہے ہو۔"

"ہو سکتا ہے کہ آپ کو مذاق لگ رہا ہو لیکن سچ ہے کہ عظمت رانا نے مجھے سوائے اپنے نام کے کچھ نہیں دیا اور یہ بھی انہوں نے نہیں دیا میں نے خود ہی اپنایا ہے' لوٹا دیتا تو شاید یہ نشانی بھی وہ میرے پاس نہ رہنے دیتے۔"

"لیکن ایسا کیوں! شاید تمہارے والد نے کوئی غلط قدم اٹھایا ہوگا؟"

"ہرگز نہیں۔" وہ بری طرح تڑپ گیا "انہوں نے بھی ماں باپ کی نافرمانی نہیں کی' لیکن کبھی کبھی فرمانبردار اور ایماندار اولاد بھی والدین کو راس نہیں آتی۔"

پھر اس نے مختصر لفظوں میں اپنے حالات زندگی بٹ صاحب کو بتائے۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم سچ کہہ رہے ہو' کاروبار میں اتنے پکے' اصول پسند آدمی نجی زندگی میں اتنے بے اصول کیسے ہو سکتے ہیں۔"

"آپ میری جگہ ہوتے تو سمجھ لیتے کہ کیسے ہو سکتے ہیں۔" وہ نہ بٹ صاحب کی عظمت گروپ کے ساتھ کاروباری دوستی پر گھبرایا تھا نہ ان کی بے یقینی پر پریشان ہوا۔

لیکن اگلے چند دنوں میں نوکری کے دوران اسے اندازہ ہوا کہ بٹ صاحب اس سے اور اس کے کام سے متاثر ہیں اور اس کے کڑوے کل پر کچھ متفکر سے بھی۔

☼ ☼ ☼

"پلیز پھوپھی جان! آپ سفارش کر دیں' تایا پا مجھے آگے پڑھنے کے لیے کالج جانے کی اجازت نہیں دے رہے۔" عمرہ صبح سے ہی اپنی پھوپھی کے ہاں آئی ہوئی تھی۔

صوفیہ بیگم کے گھر اور دل میں عمرہ کے آنے سے بڑی رونق ہو جاتی' اس کے انٹر کے امتحانات کے بعد لمبی چھٹیاں تھیں۔ وہ اکثر اپنی پھوپھی کے ہاں چلی آتی۔ راحیل سے بھی اس کی اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی اور صوفیہ بیگم تو اس کے اتنے لاڈ اٹھاتیں کہ وہ شرمندہ ہو جاتی۔

"بس اب اتنا پڑھ کر کیا کرو گی ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ تمہارے لیے تو میں یہ سفارش کروں گی کہ بس بہت ہو گئی' جلدی کوئی اچھا رشتہ دیکھ تمہاری شادی طے کر دیں۔"

وہ چائے پیالی میں انڈیلتے ہوئے رک گئی۔

"حد ہے پھوپھی جان! میں دنیا میں واحد آپ کو اپنا

ہمدرد اور غمگسار مان کر آپ کے پاس آئی ہوں تو آپ بھی دل جلانے والی بات کرتی ہیں' گھر میں تو ہر وقت ہی یہ بحث چلتی ہے اور بڑی پھپھو کی زندگی کا تو اولین مقصد ہی یہ ہے کہ میری شادی کرادیں' ایک آپ سے آسرا تھا آپ نے بھی اسی فہرست میں نام لکھوا دیا۔"

"ارے تو میں اپنی بچی کے خیر خواہوں میں سے نہ ہوں گی کیا؟ شادی تو سب لڑکیاں کرتی ہیں اور شادی سے پہلے اسی طرح کے نخرے بھی کرتی ہیں۔"

"لیکن میں نخرے نہیں کر رہی بہت سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہی ہوں اگر آپ پاپا سے سفارش نہ کریں گی تو میں خود بات کرلوں گی۔ مجھے آگے پڑھنا ہے بس۔"

"عمرہ چندا! ایسی کیا بات ہے جنا' بیٹیوں کے ماں باپ کا ایک ہی تو ارمان ہوتا ہے کہ ان کی جلد سے جلد اور اچھی جگہ پر شادی کردیں۔"

"پھوپھی جان! میں مر جاتی ہوں' مجھے یہ چائے بھی نہیں پینی۔" اس نے میز پر پڑی پیالی کو کھسکا کر دور کیا اور منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔ غصے میں اس کا چہرہ اور گلابی ہو گیا تھا' ملائم ریشمی پیشانی پر جھولتی بالوں کی لٹیں بھی ناراضی دکھانے لگیں۔ وہ اتنی خوبصورت لگی کہ دیکھنے والے کو بے وجہ پیار آجائے۔ صوفیہ بیگم اس کے بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"چلو ساری دنیا میں مجھے ہی ہمدرد غمگسار مانتی ہو تا تو بیٹھ کر بتاؤ میں وعدہ کرتی ہوں کہ وہی بات کروں گی جو تمہارا دل کہتا ہے۔" وہ جاتے جاتے بیٹھ گئی۔

"بس یہی کہ مجھے سکون سے پڑھنے دیں اور پڑھائی کے دوران ایک کوئی مسئلہ نہ چھیڑیں یعنی شادی وغیرہ کا۔" اسے خبر تھی کہ صوفیہ پھوپھو کی بات مانی جائے گی۔

"تمہیں آگے پڑھنے کی زیادہ فکر ہے یا شادی نہ کرنے کی؟ دیکھو میں اپنے بھائی سے ایک بات منوا سکتی ہوں' لیکن یہ بیک وقت دو مطالبے ناممکن ہیں۔"

"ٹھیک ہے پھر آپ یہ بات منوالیں کہ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔" یکدم عمرہ نے کہا تو صوفیہ بیگم تھوڑی دیر کے لیے بھتیجی کی صورت دیکھتی رہ گئیں۔

"ٹھیک ہے۔ میں بات کرلوں گی لیکن۔"

"اوہ پھوپھو یو آر گریٹ' مجھے پتہ تھا کہ آپ میری مشکل حل کروادیں گی۔" عمرہ نے جوش میں ان کی بات کاٹ دی پھر اسے خیال آیا تو وہ رک گئی۔

"لیکن' لیکن آپ کیا کہہ رہی تھیں پھوپھو؟"

"لیکن یہ کہ پہلے تمہیں مجھے یہ بتانا ہوگا کہ کیوں؟ تمہارے اس مسئلے کی ٹھوس وجہ؟" وہ سنجیدہ ہو گئیں۔

"وجہ یہی کہ میں پڑھنا چاہتی ہوں کچھ کرنا چاہتی ہوں شادی میں کیا رکھا ہے!" اس کا یہ انداز کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔

"تم بھول رہی ہو کہ پڑھائی کو تم نے ترجیح نہیں دی ہے۔"

"اوہو پھوپھو! جب شادی نہ ہوگی تو میں بیکار بیٹھے کیا کروں گی پڑھائی ہی کروں گی نا۔ ہو سکتا ہے بیکار ہی بیٹھی رہوں بھائی جان اتنی آسانی سے ہر بات نہ مانیں گے۔"

"آپ نے کہا ہے' آپ منوائیں گی۔"

"ہاں' لیکن پہلے تم مجھے ٹھیک طرح سے مطمئن تو کرو' معقول وجہ ہونی چاہیے۔"

"پھوپھو! آپ کو کیا ہو گیا ہے ماننے کے لیے جاننا ضروری نہیں ہوتا۔"

"بندے کے سلسلے میں ہوتا ہے' کہیں بندہ راستہ بھٹک کر الٹے سیدھے چکر میں نہ پڑ جائے۔ اور تم مجھے باتوں میں الجھا کر ہر بات منوانے کے چکر میں لگی ہو' جبکہ میں نے ایک بات ماننے کی ہامی بھری ہے۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔ پھوپھو سے اپنی مشکل شیئر کرلینے کا مطلب تھا اطمینان کہ وہ ضرور کچھ نہ کچھ کریں گی۔

☼ ☼ ☼

"آپ کہیں جا رہی ہیں امی؟" چھٹی والا دن تھا' وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہا تھا۔ آج اس نے سوچ لیا

تھا کہ سارا دن آرام کرتے ہوئے گزارے گا۔
"ہاں تمہارے چچا کی بیٹی کی نسبت طے ہوئی ہے' میں نے سوچا چل کر مبارک باد دے دوں۔" اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ جانے کون سے چچا کی کون سی بیٹی ہوگی۔ وہ پوچھنا چاہ رہا تھا لیکن جیسے زبان گنگ سی ہوگئی۔
"بیٹا! اگر تمہیں دوبارہ چائے پینی ہو تو میں نے تھرماس میں ڈال کر رکھ دی ہے۔"
"آپ نہ چاہتے ہوئے اپنے سسرال سے تعلق رکھے ہوئے ہیں' کیوں امی؟" اس تعلق میں اب اس کی بھی غرض چھپی ہوئی تھی۔ لیکن شاید یہ غرض بھی وقتی ہی تھی' شاید اس لگن کا حاصل بھی مایوسی اور کھونے اضطراب کے سوائے کچھ نہ نکلنا تھا۔
"میرا خیال ہے بیٹا خاندان والوں سے جڑے رہنا بھلا ہے' کہیں نہ کہیں اچھائی کا پہلو نکل آتا ہے۔"
"امی لوگوں نے آپ کے ساتھ اچھا نہیں کیا مگر پھر بھی آپ اتنی ہی مخلص ہیں۔"
"میرے پاس تو یہی چند اچھی باتیں ہیں' لوگوں کا اپنا ظرف ہے اور میرا اپنا۔" راحیل ماں کی صورت دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ انسان سچ کے ساتھ چلے تو اسے پہچان ضرور ملتی ہے۔
"آپ شہر میں اکیلی کہاں جائیں گی' میں ساتھ چلتا ہوں۔"
"تم آرام کرو بیٹا! میں خود ہی چلی جاؤں گی' یوں بھی تمہاری نوکری نئی لگی ہے' جب تنخواہ ملے تو ایک بار مٹھائی لے کر ہی جانا۔" انہوں نے اسے روکا۔
"کیوں؟ بار بار نہ جاؤں؟"
"ہاں' بار بار نہ ہی جاؤ تو اچھا ہے۔"
"ابھی آپ نے کہا میری وجہ سے تعلق رکھے ہوئے ہیں اب آپ میرے جانے پر اعتراض کر رہی ہیں۔" اس نے کہا تو وہ چپ ہو گئیں۔
"دل ڈرتا ہے بیٹا! عجب واہموں میں گھری رہتی ہوں اور اس میں تمہارا بھی قصور نہیں' ماں کی ممتا ہے ہی ایسی تم پر کوئی گہری نظر ڈالتا ہے تو میرا رواں رواں دعا بن جاتا ہے کہ یا اللہ میرے وجود کے حصے کو میرے ساتھ ہی رکھنا۔ تمہارے ددھیال سے تو میرا جی ویسے بھی کانپتا رہتا ہے۔ انہوں نے میرے حصے اور حق کی ہر دولت مجھ سے چھینی ہے لیکن تم۔"
صوفیہ بیگم کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں اور آواز بھرا گئی کہ مزید بات ہی نہ ہو سکی۔
"ارے امی! آپ اتنی جذباتی ہیں میرے معاملے میں' مجھے تو خبر ہی نہ تھی' اچھا ہوا آپ نے بتا دیا۔ اب طے کر لیا ہے کہ آپ سے دور نہ جاؤں گا' آپ کے نزدیک رہ کر ہی آپ کو ستایا کروں گا۔" اس نے ہنس کر صوفیہ بیگم کو بھی مسکرانے پر مجبور کیا۔
"اور امی "رانا ہاؤس" والوں کی نظر مجھ پر کتنی ہی گہری پڑے۔ آپ کی محبت کے حصار کو نہیں توڑ سکتی وہ تو اپنی بنائی نفرت کی دیوار بھی نہیں گرا سکتے۔" انہوں نے بیٹے کی پیشانی چومی اور کہا۔
"تم اپنے دل میں نفرت کی جگہ کسی کے لیے نہ رکھنا' یہ جذبہ انسان کو اندر سے کھا جاتا ہے' اس کی شخصیت کی ساری اچھائیوں کو چن چن کر نشانہ بناتا ہے۔"
"او امی! نفرت نہ رکھوں گا تو آپ کے خدشے درست ثابت ہونے لگیں گے۔"
"نہیں' خاموشی رکھو' دوری رکھو' بے رخی رکھو لیکن نفرت نہ رکھو۔"
"امی! اب آپ کا بیٹا جوان ہو گیا ہے اب تو آپ کو بہادر ہو جانا چاہیے۔" انہوں نے یوں سر ہلایا جیسے اس کی بات ابھی مان لیں گی۔ مگر بھلا خدشے یوں گھڑی بھر میں جان چھوڑ سکتے ہیں۔
"چلیں ہم ساتھ ہی چلتے ہیں اور آپ کو بھی میری طرف سے کسی تشویش یا خدشے میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں' ہم اللہ پر بھروسا رکھتے ہیں اور اللہ ہم کو کبھی مایوس نہ کرے گا۔" وہ تیار ہونے کے لیے اندر اپنے کمرے میں چلا گیا اور چند ہی منٹوں میں نیلی جینز اور آسمانی شیڈ کی چیک والی شرٹ پہن کر آ گیا۔
"اللہ نے تم کو اتنا سمجھدار اور ذہین بنایا یہ اس کا بڑا

احسان ہے۔" انہوں نے پھر بیٹے کو پیار کیا۔
"امی! اس کے ساتھ خوبصورت اور اسمارٹ بھی تو بنایا ہے' آپ ذرا ٹھیک طرح سے دیکھیں تو سہی۔" وہ ان کے سامنے اپنے ایک پاؤں کی ایڑی پر کھڑا ہو کر پورا گھوم گیا تو وہ ہنس پڑیں۔
"اللہ نظر بد سے بچائے۔" انہوں نے دل ہی دل میں دعا کی اور بیٹے کے ساتھ چل دیں۔
"رانا ہاؤس" تک پہنچتے پہنچتے پھر راحیل کا دل صالحہ کے خیال میں ہی اٹک گیا۔ اس میں اتنی بھی جرات نہ تھی کہ اپنی ماں سے پوچھتا کہ آخر اس کی کون سی کزن کی منگنی ہوئی ہے۔ بھلا وہ کبھی ان کے سامنے اس کا نام لے بھی سکے گا۔"
اس کا دل کم بخت بھی کس "شجر ممنوعہ" پر عاشق ہوا تھا۔ وہ در و دیوار جہاں کے سائے میں اس کی ماں کی بے بسی اور بدنصیبی' بے چارگی اور بے یقینی کی کہانی شروع ہوتی تھی' وہاں وہ اپنی محبت کی کوئی داستان کیسے لکھ سکتا تھا۔ وہ اپنی دادی جان کو سلام کر کے ذرا الگ لاؤنج ہی میں بیٹھ گیا۔
یہاں اس کے لیے کچھ نہیں ہے' اسے اچھی طرح یہ بات خود کو سمجھا دینا چاہیے۔"
ندا کی منگنی ہوئی تھی' وہ منجھلے چچا کی بیٹی تھی یہ سن کر اس نے سکھ کا گہرا سانس لیا اور پھر خود کو بہت ڈانٹا۔
"جب ایک انسان سے اسے واسطہ ہی نہیں رکھنا تو پھر۔"
"السلام علیکم تائی جان! آپ کب آئیں!" آج پھر لگتا تھا وہ تائی جان سے ملنے کے شوق میں ادھر نکل آئی تھی اور موقع بھی خوب تھا۔ ابھی ابھی دادی جان مغرب کی نماز کے لیے اٹھ کر اندر گئی تھیں ورنہ اس کے بعد دادی جان کے ہوتے ہوئے وہ ان کے سامنے آنے کی جرات نہ کر سکی تھی۔ لگتا تھا اسے ایک سبق زبردستی پڑھایا گیا تھا۔ راحیل کی سوچوں کے گرداب سمٹنے لگے۔ احتیاطیں' تاویلیں سب بکھر گئیں۔ وہ سامنے آئی تو اسے سب کچھ بھولنے لگا۔
وہاں عابدہ خاتون اور ان سے چھوٹی دیورانی یعنی ندا کی امی جنہیں صوفیہ خاتون مبارک باد دینے آئی تھیں وہ بھی موجود تھیں۔ ندا بھی ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنی تائی امی سے مل کر گئی تھی' اور وہ اپنی دادی جان کے سامنے آئی تھی' دادی جان نے اسے نہ ٹوکا نہ جھڑکا نہ گھورا کہ وہاں کیوں آئی ہے! پھر صالحہ پر روک ٹوک کیسی' وہ الجھ سا گیا۔
"بیٹی! تم کیا کرتی ہو؟" آج سامنے بیٹھی تو صوفیہ خاتون نے بھی صالحہ سے بات کی ورنہ اس سے پہلے ان کی بھی صالحہ سے ہر بار تقریباً "سرسری ہی ملاقات ہوئی تھی۔
"عطیہ بی بی سے کڑھائی سیکھتی ہوں اور انٹر کے پرائیویٹ امتحان کی تیاری بھی کر رہی ہوں' اگر بابا نے اجازت دے دی تو انٹر کا امتحان ضرور دوں گی۔" سر ہلاتے ہوئے انہوں نے عابدہ خاتون کو دیکھا۔
"آپ تو جانتی ہی ہیں ان بھائیوں کے مزاج کو' اور اماں جان بھی اس کی پڑھائی کے سخت خلاف ہیں' لیکن اس کے اندر جانے کس کی روح سما گئی ہے' جس کام کو منع کیا جاتا ہے اسی کام کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔" عابدہ خاتون نے کہا۔
"او امی! اب آپ نے تائی جان کے سامنے بھی میری برائیاں شروع کر دیں۔ آپ کو اپنی بیٹی سے پیار نہیں ہے۔"
"نہیں بیٹا! بیٹیوں سے تو سب کو پیار ہوتا ہے' صالحہ! تم میرے گھر آنا' میں تمہیں اچھی سی کڑھائی سکھاؤں گی۔ بھابی! لے کر آئیں ضرور کبھی بچیوں کو۔ اور چھوٹی بھابی آپ بھی' ندا ہے' صالحہ ہے پھر افرا' صبا ہیں لیکن رابعہ خاتون کی بیٹیاں تو نظر ہی نہیں آئیں۔" انہوں نے سب سے چھوٹی دیورانی کا نام لے کر پوچھا۔
"بھلا اماں جان کہاں بچیوں کا یوں آنا جانا پسند کرتی ہیں۔ یہ تو صالحہ ہی جی دار ہے کہ کڑوی کسیلی سن کر بھی ادھر سے ادھر پھدکتی پھرتی ہے ورنہ رابعہ خاتون اور ان کی بچیاں تو قدم بھی اماں جان کی مرضی سے

انھاتی ہیں' جو بیاہ گئی ہیں یا منگنی والی ہیں ان کے لیے تو اماں جان کا رویہ نرم ہے لیکن کنواری بچیوں پر تو اپنی مرضی حرام ہی سمجھیں۔" ندا کی امی آمنہ خاتون' ساس کے رویوں سے بہت شاکی لگ رہی تھیں۔

"آپ کے گھر تو کبھی بھی امی لے کر نہیں آئیں گی۔" صالحہ نے منہ بنا کر اپنی تائی سے کہا۔

"دیکھا اب اسے اسی بات کی دھن لگ جائے گی۔" عابدہ خاتون نے اپنی جٹھانی سے کہا۔ اسی وقت اندر کمرے کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی اور صالحہ اتنی سرعت سے اٹھ کر دائیں رخ پر بھاگی کہ ایک لمحے کو سب دیکھتے رہ گئے اور اگلے ہی لمحے دادی جان اندر کی طرف سے آتی نظر آئیں۔

وہ گلابی چہرے کا یوں ڈر ڈر کر جھلک دکھانا' کسی کو الجھانا' کسی کو پریشان کرنا۔ اس کہانی کا کوئی سرا دوسری طرف ملتا نہیں تھا' وہ نہ رومیو تھا نہ فرہاد نہ مجنوں ال تھا نہ رانجھا کہ اپنی محبوب کو صدا دیتا' کھوج میں نکل پڑتا یا سامنے گہرا دریا ہوتا تو اسی میں اتر جاتا اگر اگلی طرف محبوب کے ملنے کی آس ہوتی۔ اکیسویں صدی کے اس تیز رفتار۔ اس دور میں جب بندہ اپنے دل سے نہیں کمپیوٹر سے پوچھتا ہے کہ (Who is the best) اس کے لیے کیا ٹھیک رہے گا اور کیا غلط وہ کس چکر میں پڑ گیا تھا۔ اس نے بے بسی سے سوچا۔

☼ ☼ ☼

"تم سے میں نے کہا تھا کہ اب وہاں نہ جانا مگر تم تو اماں کے ساتھ دوڑے پڑتے ہو' بھائی میرے کسی کو بھولنا ہو تو اس سے دور بھاگتے ہیں' اس کی طرف نہیں۔" حمزہ نورانی اسے بتا رہا تھا جیسے وہ کوئی بچہ ہو۔

"میں تو امی جان کے اکیلے پن کے خیال سے ان کے ساتھ چلا گیا تھا۔" وہ صفائی دینے لگا۔

"ہاں تو چھوڑ کر واپس آجاتے۔ بھلائی اسی میں ہے کہ تم ابھی سے اپنا ہر دھیان اس کی طرف سے ہٹا دو۔ اپنی زندگی گزارو یار! کس دلدل میں پھنس رہے ہو۔"

"میں جسے ایک وقتی احساس سمجھ کر ٹالتا رہا ہوں وہ بہت گہرا جذبہ نکلا ہے میں اسے حاصل نہیں کر سکتا لیکن اسے دیکھ تو سکتا ہوں' اس سے محبت تو کر سکتا ہوں۔"

"چھوڑو میرے یار! یوں عورت کے چکر میں پڑے تو خواری ہی ملے گی۔" حمزہ کا کہنا درست ہو سکتا تھا لیکن اس کا دل اب قطعی نا سمجھ بچہ بن کر مچل رہا تھا۔ جو کھلونا وہ خرید نہیں سکتا۔ وہ آتے جاتے کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر شیشے میں سے دیکھ تو سکتا ہے۔ "میں کسی چکر میں نہیں ہوں بس یونہی جذباتی ہو رہا ہوں۔"

"بے وجہ اپنی سیدھی سادی زندگی کو الجھا رہے ہو' وہ اتنی پیاری لڑکی عمیرہ صرف تمہارے اشارے کے انتظار میں بیٹھی ہے' اس سے شادی کرو' تمہاری ماں بھی دعائیں دیں گی' اور تمہارا جذباتی پن بھی ختم ہو جائے گا۔"

"سنو تم میرے دوست ہو ناصح بننے کی کوشش نہ کرو سمجھے۔" حمزہ کو تو اس نے جھڑک دیا لیکن پھر بہ گزرتے دن کے ساتھ اسے حمزہ کی ساری باتیں درست لگ رہی تھیں۔ سچ ہی تھا یہ تو خود کو ضائع کرنے والا راستہ تھا' اور عقلمندی کا تقاضا یہی تھا کہ وہ سود و زیاں کے بھنور میں نہ پھنسے۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے کام کی مصروفیات میں الجھ گیا' اپنے گرنز دوستوں اور چاہنے والوں کی محفل میں سارا فارغ وقت گزارنے لگا۔ کسی کو بھلانا اتنا آسان نہیں' خاص کر اس وقت جب جی پوری طرح بے ایمان ہوا ہو' دل بدبختی میں مبتلا ہوا اور تپ کے جذبے خود آپ کو دھوکا دینے پر تلے ہوں۔ دراصل محبت ازل سے انسان کی کمزوری رہی ہے' کسی کے سپنے دیکھنا' اس کی کھوج میں رہنا' اس کو پانے کی آرزو کرنا' بڑا سرور ہے بس جستجو میں' بڑی رنگینی ہے اس خواب میں' انسان باز نہیں آسکتا۔

آج وہ آفس سے اٹھ کر سیدھا ساحل سمندر کی

طرف آ گیا تھا' شام ہونے والی تھی' چھٹی کا دن نہیں تھا اس لیے وہاں انتشار نہیں تھا لیکن سکون اس کے اپنے دل میں نہ تھا۔

وہ ساحل کے کنارے ــــــ قدرے تیز تیز چلنے لگا اور پھر بھاگنے لگا۔ اس کا پورا جسم تھکن میں ڈوب کر دل کی طرف سے اپنا دھیان ہٹانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ تھوڑی دور اکڑوں بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا اور سامنے سمندر کی طرف دور تک ایک نظر ڈال کر وہ اٹھنے والا تھا کہ اپنے برابر میں بالکل تھوڑے ہی فاصلے پر کھڑے ایک جوڑے پر اس کی نظر پڑی۔

"ندا! یہ تم ہو' مجھے یقین نہیں آرہا؟" وہ رہ نہ سکا فوراً قریب جا کر بولا۔

"ارے راحیل بھائی آپ! آپ بھی تو اسی دنیا اسی شہر میں رہتے ہوئے بھی ہمیں نظر نہیں آتے۔" وہ ہنسی اور پھر سامنے کھڑے اپنے منگیتر سے راحیل کو ملوایا۔

"یہ جمال احمد ہیں' اور جمال یہ راحیل ہیں میرے کزن۔" دونوں ایک دوسرے سے ملے تو راحیل نے ادھر ادھر دیکھا۔

"تم اکیلی یہاں آئی ہو ندا! میرا مطلب ہے کوئی اور ساتھ نہیں؟" اس نے جمال کو دیکھ کر فوراً بات بدلی۔ ندا پہلے کچھ گھبرائی لیکن اب قدرے سنبھل چکی تھی۔

"میرے ساتھ ہوتے ہوئے یہ اکیلی کیسے ہو گئیں۔" جمال نے فوراً کہا۔

"آپ کو ابھی اکیلے ساتھ گھومنے کی مکمل دستاویز نہیں ملیں۔"

"تمہارے سارے خاندان والے ایک ہی سوچ کے مالک ہیں ندا! دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ آپ بے فکر رہیں مسٹر راحیل! ایک نہیں ان کے ساتھ تین چوکیدار آئے ہیں۔ ایک ڈرائیور' ایک والدہ اور ایک دوست۔"

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ لیکن اس کا دل تو اسی پر

بے چین ہو گیا کہ دوست کون!

"امی کے ساتھ صالحہ ہے' اوپر کی طرف گاڑی میں بیٹھی ہوئی ہیں' آپ تو دادی جان کے مزاج سے واقف ہیں۔" اس نے بس صالحہ کا نام سنا تھا۔

"پھر آپ لوگ باتیں کریں' میں چچی جان سے مل لیتا ہوں۔" وہ جلدی سے بولا۔

"چچی! پلیز چلیں نا تھوڑی دور تک گیلی ریت پر چلیں گے' آپ کتنی سنگدل ہیں' سامنے کھلا سمندر ہے اور آپ مجھے پابند کر رہی ہیں۔" وہ سفید ٹویوٹا کرولا تک پہنچا تو اندر سے باتوں کی آواز آرہی تھی' وہ صالحہ ہی تھی۔

وہ ایک لمحے کے لیے رک گیا۔

"دیکھو صالحہ چندا! کوئی بات مان بھی لیتے ہیں' میں پہلے ہی ندا کی وجہ سے پریشان ہوں اور پھر تم اکسی نے دیکھ لیا تو پھندا سیدھا میری ہی گردن میں ڈالا جائے گا۔ تمہارے معاملے میں تو ویسے ہی اماں جان بہت حساس ہیں۔" آمنہ خاتون اسے سمجھاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"اونہہ! آپ کو دنیا میں اپنی ساس کے علاوہ بھی کوئی جیتا جاگتا انسان نظر آتا ہے یا نہیں۔ اور آپ قسم لے لیں دادی جان یہاں اس وقت کبھی نہیں آسکتیں۔" وہ بضد تھی۔

"السلام علیکم چچی جان کیسی ہیں آپ!" اسی وقت راحیل نے جھک کر گاڑی کے اندر دیکھتے ہوئے اپنی چچی کو سلام کیا۔

"ارے راحیل بیٹا تم! تم کیسے آئے؟" وہ یقیناً کچھ گھبرا گئیں لیکن صالحہ اسے دیکھ کر اٹھلا گئی۔ اس کی آنکھوں سے اس کا جوش اور خوشی چھلک رہی تھی۔ باقی تو اس کا پورا چہرہ ڈھکا ہوا تھا' لمبی سی سر سے پاؤں تک چادر کے ساتھ اس نے چہرے پر بھی نقاب ڈالا ہوا تھا۔

"ان کو سمندر پسند ہے جب ہی تو یہاں آئے ہوں گے۔" حسب عادت وہ جلدی سے بولی۔

"اور آپ بھی اسی لیے آئی ہیں کہ آپ کو سمندر

بہت پسند ہے۔" اس نے لطف لیتے ہوئے کہا۔
"تمہیں، ہم لوگ۔" لیکن اسی وقت چچی نے اس کا ہاتھ زور سے دبایا۔
"ہاں، ہم بھی اسی لیے آئے ہیں۔" اس نے "ہمیں" کرتے ہوئے بات یوں پلٹی کہ سامنے والا کوئی اناڑی ہی ہو جو نہ سمجھے کہ اس نے غلط بیانی کی ہے۔
"تو پھر باہر آئیں نا سمندر گاڑی کے اندر تو نہیں آئے گا۔" راحیل دلچسپی سے کہہ رہا تھا۔
"یہی تو میں بھی چچی جان کو سمجھا رہی ہوں لیکن یہ ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو دیکھ کر بھی بہادر نہیں ہوئی' ہر وقت انہیں بھوت پریت اور چڑیلوں سے ڈرائی رہتی ہیں۔"
"اُف صالحہ! آئندہ میں تمہیں کبھی ساتھ لے کر کہیں نہ جاؤں گی۔" آمنہ خاتون زچ ہو گئیں۔ انہیں پہلے ہی ندا کی فکر کھائے جا رہی تھی اب راحیل کو بھی ان کی پریشانی کا احساس ہوا۔
"لگتا ہے چچی جان! آپ مجھے یہاں دیکھ کر پریشان ہو گئی ہیں۔ اچھا پھر میں چلتا ہوں۔" وہ پلٹنے لگا تو انہوں نے جلدی سے دروازہ کھول کر اسے پکارا۔
"ارے نہیں بیٹا! تم سے کیا پریشانی' صالحہ کی باتوں سے الجھ رہی ہوں۔ ہر انسان کو اپنی حدود جانتے ہوئے انہیں ان کی پابند ہونا چاہیے۔" انہوں نے کہا۔
"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن بے جا پابندیوں پر باغی ہو جانا بھی انسان کی فطرت ہے اسی لیے تھوڑی نرمی جائز ہے کہ انسان اپنے ماحول میں جی تو سکے۔" وہ رسان سے بولا۔
"آپ گاڑی سے باہر تو آجائیں' ایک طرف کنارے کی دیوار پر بیٹھ جائیں گے' یوں گاڑی کے اندر بیٹھے ڈھنگ سے بات بھی نہیں ہو رہی۔" راحیل کہہ رہا تھا اور صالحہ جی ہی جی میں ورد کر رہی تھی کہ چچی جان مان جائیں۔
"اچھا آؤ صالحہ! چادر اچھی طرح اوڑھ لو۔" انہوں نے جیسے نہ چاہتے ہوئے کہا۔
"اُف چچی جان! اس سے زیادہ اچھی طرح کیونکر اوڑھی جا سکتی ہے۔" وہ کہنا چاہتی تھی لیکن باہر نکلنے کی خوشی میں کچھ نہ بولی۔
صالحہ گاڑی سے باہر نکلی تو جیسے اس کا رواں رواں خوشی سے بے تاب ہوا جا رہا تھا۔
"بس یہاں بیٹھ جاؤ صالحہ!" چچی جان نے گاڑی سے کافی قریب جگہ بتائی۔ ساحل کے ساتھ ساتھ بنی سیدھی لمبی دیوار پر دور دور اکادکا لوگ بیٹھے ہوئے تھے' سامنے سمندر دیکھ کر صالحہ کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ وہ اپنی بے قابو ہوتی دھڑکن کو سنبھالنے میں مصروف تھی اور راحیل اس کا جوش دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔
"کیا آپ نے کبھی سمندر نہیں دیکھا؟" وہ یونہی پوچھنے لگا۔
"دیکھا ہے' جب ہی تو اتنا شوق ہے لیکن ہمارے گھر میں سب شوق کا قتل کرنے والے لوگ ہی رہتے ہیں' سو مہینوں بلکہ سالوں میں کبھی ایسے شوق پورے ہوتے ہیں۔" وہ اپنی دھن میں مگن اتنی اچھی لگ رہی تھی۔
"بیٹھ جاؤ نا صالحہ!" چچی جان اپنی گھبراہٹ اور جھنجھلاہٹ چھپانے میں بری طرح ناکام ہو رہی تھیں۔ ان کے تیز لہجے میں کہنے پر صالحہ فوراً بیٹھ گئی۔ لیکن اتنے انہماک سے آتی جاتی' ڈوبتی' ابھرتی ڈوبتی موجوں کو دیکھ رہی تھی کہ چچی جان اس کی محویت کو دیکھ کر تھوڑی دیر چپ ہو گئیں۔
راحیل خود اپنی زندگی کے ان خوش نصیب لمحوں پر حیران ہو رہا تھا۔ یوں ایسی جگہ پر صالحہ کا ملنا کتنا ناممکن تھا لیکن یہ نصیب ہی تو تھا جو مہربان ہوا تھا۔ اور اس مہربانی سے وہ کون سا فائدہ اٹھانے والا تھا۔
"بس اب واپس چلو!" چچی جان اٹھنے لگیں۔
"وہ چچی جان! بیٹھیں نا' ندا ابھی نہیں آئے گی۔" اس بار صالحہ کے بجائے راحیل نے کہا اور ندا کا نام اس کے منہ سے سن کر وہ حیران ہو گئیں۔
"تم ندا سے مل چکے ہو۔" وہ پوچھنے لگیں۔
"جی' اسی نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تو میں نے آپ لوگوں کو ڈھونڈا۔ ابھی سمندر میں سورج

ڈوبنے کا منظر بڑا دلفریب دکھائی دے گا" پلیز چچی جان اچھا لگ رہا ہے۔" وہ یکدم چونک سی گئیں۔

چچی پلیز۔ ایک بار نیچے چلی جاؤں۔ صرف سمندر کو چھو کر واپس چلی آؤں گی؟" اس نے اتنی لجاجت اور امید سے کہا کہ جانے کیسے انہوں نے سر ہلا دیا۔

"اوہ تھینک یو چچی! یو آر گریٹ۔" وہ فوراً" اٹھ کر دھیرے دھیرے اتر کر پتھروں سے نیچے جانے لگی۔

اور آمنہ خاتون عجیب ہی سوچ میں ڈوب رہی تھیں۔ ایک فکر چھوڑ کر دوسرے ٹینشن میں مبتلا ہو رہی تھیں۔ راحیل کیوں اتنی دیر سے ان لوگوں کے ساتھ وقت برباد کر رہا تھا۔ انہوں نے بائیں طرف رخ کر کے غور سے راحیل کو دیکھا لیکن راحیل محویت سے نیچے جاتی صالحہ کو دیکھنے میں مگن تھا۔

"کیا ہوا چچی جان؟" یکدم راحیل کو اپنے اوپر چچی جان کی تیز نظریں محسوس ہوئیں تو وہ گڑبڑا سا گیا۔

"میں تم سے پوچھ رہی ہوں کہ تمہیں کیا ہوا ہے ہمارے پیچھے اپنا وقت کیوں برباد کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں یونہی، کبھی کبھی رشتہ داروں سے ملنا اچھا لگتا ہے نا؟"

"اتنے سالوں میں تو تمہیں کبھی ہم سے ملنا اچھا نہ لگا؟" اچانک ہی ان کا انداز اور لہجہ بدل گیا تھا۔ اس وقت وہ واقعی "رانا ہاؤس" کی باسی لگ رہی تھیں۔

"چچی جان! میں تو آپ لوگوں کو کمپنی دینے کے خیال سے ٹھہر گیا ہوں ورنہ میرا کیا ہے میں تو اکیلا ہی گھوم پھر کر چلا جاؤں۔" وہ شرمندہ ہونے لگا۔

"تمہیں کمپنی دو گے! اگر کسی نے سن لیا یا دیکھ لیا تو تم اپنی جان گنوا دو گے تم جانتے نہیں کہ "رانا ہاؤس" میں اب بھی کچھ لوگ ہر روز تمہیں مار دینے کے منصوبے بناتے ہیں۔"

"آپ رانا ہاؤس کے رہنے والے خود کو سمجھتے کیا ہیں! حاکم، بادشاہ یا نعوذ باللہ خدا ہی بن بیٹھے ہیں لیکن میرا پورا ایمان ہے کہ میری جان میرے اللہ کی امانت ہے، اسی نے دی ہے اور اسے ہی لینے کا اختیار ہے، کوئی دوسرا میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" وہ لہجے تمر کے لیے چپ ہوا۔

"میں نے رانا ہاؤس کے معاملات میں کبھی دلچسپی نہیں رکھی لیکن آپ بڑے لوگوں کی بدقسمتی کہ مجھ جیسے معمولی آدمی کی وجہ سے ڈسٹرب ہوتے ہیں۔" وہ اٹھ گیا اور ٹہلنے لگا۔

"سنو! رکو! ایک منٹ کے لیے رکو۔" وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئیں اور اسے روکتے ہوئے بولیں۔

"یہ بتاتے جاؤ کہ "رانا ہاؤس" میں تمہاری دلچسپی نا محور کیا ہے؟" انہوں نے پوچھ ہی لیا حالانکہ جانتی تھیں کہ اس کا جواب خطرناک ہو سکتا تھا مگر وہ بہت گہری الجھن میں تھیں۔

"صالحہ!" اس نے بھی پلٹ کر بنا جھجکے فوراً" جواب دیا اور نیچے سمندر کو چھو کر اپنے وعدے کے مطابق فوراً" واپس آتی صالحہ اپنا نام راحیل کے منہ سے سن کر اتنی حیران ہوئی کہ چپ ہی رہ گئی۔

"کتنے پاگل ہو تم! تمہاری ماں جن رشتہ داروں کے معاملے میں ساری عمر اتنی محتاط رہی تم انہیں پر اپنی ساری احتیاطیں ختم کر رہے ہو، لیکن سچ ہے کہ جب انسان کی عقل داؤ پر لگ جائے تو اس کے پاس کچھ نہیں بچتا۔" انہیں نہ صرف شدید غصہ آیا تھا۔ بلکہ انتہائی افسوس بھی ہوا تھا۔

"آپ میرے جذبات کے ساتھ ساتھ میری ہمت وذہانت کو بھی چیلنج کر رہی ہیں۔

لیکن میں جس دن صرف صوفیہ خاتون کا بیٹا نہیں عظمت رانا کا پوتا بن کر آپ لوگوں کے سامنے کھڑا ہو گیا اس دن آپ سب لوگوں کو اپنی عقل کا ماتم کرنا پڑے گا۔"

وہ چلا گیا نہ پلٹ کر صالحہ کو دیکھا نہ چچی جان کے تیور دیکھے۔

☼ ☼ ☼

بٹ صاحب اس کی ذہانت، حاضر دماغی اور کام کی لگن سے اتنے متاثر ہوئے تھے کہ بنا سوچے سمجھے اسے پروموشن دیتے چلے جا رہے تھے۔

"بٹ صاحب! اوور" اتنی جلدی کسی کو آزمایا نہیں جا سکتا۔"

ان کے منیجر نے انہیں ہر بار روکا۔ لیکن ان کا اپنا نظریہ تھا جو خود ترقی کے لیے تیزی سے پیش رفت کرنا چاہتا ہو اس کی رفتار پر قابو کرنا سمجھو ایسا ہے جیسے ترقی کو روک دیا جائے۔

"بس ایک جھٹکا لگتا ہے مجھے عظمت اینڈ سنز کو کور اسی کے لیے میں اس نوجوان راحیل کو تیار کر رہا ہوں۔ کیونکہ یہ لوگ اندر سے متحد نہیں ہیں یہ بڑی خاص بات ہے جو مجھے ایک بہت با اعتبار ذریعے سے پتا چلی ہے بس سمجھو ملائشیا کا پروجیکٹ ختم ہو تو سیدھا ہمیں وار کرنا ہے۔ اگر ہم نے اس پروجیکٹ پر اپنا ٹارگٹ حاصل کر لیا تو میرا اگلا پلان کامیاب ہی ہے۔" وہ اپنے منیجر سے انتہائی اہم میٹنگ کر رہے تھے۔

"اگر میں غلط نہیں سوچ رہا تو آپ ملائشیا بھی راحیل کو ہی بھیجنے والے ہیں۔"

"آف کورس، راحیل تو اس پروجیکٹ کی کامیابی کی پہلی دلیل ہے۔ کیا زبردست نوجوان چنا ہے نیازی تم نے اس بار تم نے ہیرا چھانٹ کر اپنی کمپنی میں ملازم رکھا ہے۔"

"تھینک یو سر! اس کے اندر جو انانیت ہے وہ اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو ثابت کرنا چاہتا ہے اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو بہت کچھ مانتا ہے۔" منیجر نیازی صاحب نے کہا۔

"ٹھیک ہے نیازی! کل کی ہماری میٹنگ میں ہمارے ساتھ تیسرا فرد راحیل ہو گا۔ اس کے بعد ہم اہم اسٹاف ممبرز کی میٹنگ رکھیں گے۔" انہوں نے کہہ کر نشست برخاست کر دی۔

☼ ☼ ☼

وہ چھت کو گھورتے ہوئے بستر پر بالکل سیدھا لیٹا مسلسل سوچ میں گم تھا۔ بٹ صاحب کی اس بڑی سی مہربانی اسے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ اتنی ترقی، تنخواہ میں بے حد اضافہ گاڑی، موبائل فون گھر کے لیے فون حتیٰ کہ شہر کے بہترین علاقے میں گھر کے لیے پلاٹ بھی اسے دیا گیا تھا جس پر کنسٹرکشن کا کام بھی تیزی سے ہو رہا تھا۔ لیکن ملائشیا بھیجے جانے کی بات نے اسے کچھ چونکایا تھا۔ وہ کیا اتنی جلدی اتنا قابل بھروسہ ہو گیا تھا کہ بٹ صاحب نے اپنے سینئر اسٹاف ممبرز کو چھوڑ کر اپنے اتنے اہم بزنس ٹرپ پر صرف اسے بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔

وہ ہر ترقی اور کامیابی کو اپنا حق سمجھ کر وصول کر رہا تھا۔ لیکن آج ٹھٹک گیا تھا۔

وہ بہت بڑا آدمی بننا چاہتا تھا ہر آسائش حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس جنون میں وہ آنکھیں بند کر لے یہ ناممکن تھا۔ سوچ سوچ کر وہ تھک گیا تو اٹھا اور بال درست کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔

"امی! میں حمزہ کے پاس جا رہا ہوں تھوڑی دیر میں آجاؤں گا۔"

"صاف بات ہے وہ تم پر اتنی مہربانی کر رہے ہیں کہ اس کے بدلے وہ تم سے جو لوز جیسا کام چاہیں آئندہ لیں گے۔" حمزہ سے بات کر کے اسے ہمیشہ تسلی ہوا کرتی تھی۔

"تم بھی یہی سمجھ رہے ہو۔ میرے دل میں بھی ایسے ہی کچھ خدشات ابھر رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

"اس ٹرپ میں کوئی چکر تو نہیں ہے؟" حمزہ پوچھنے لگا۔

"اب اتنا بے وقوف تم مجھے نہ سمجھنا! جہاں بیٹھ کر کام کرتا ہوں اس ادارے کے بارے میں پہلے دو دنوں میں ہی اچھی طرح تحقیقات کر لی تھیں۔ چکر تو ان کے پورے کاروبار میں کہیں نہیں ہے۔ صاف ستھرا بزنس ہے اور میں نے اتنی سختی سے ہر چیز کو پرکھا ہے کہ بٹ صاحب بھی میری نیچر کو سمجھ گئے ہیں۔" اس نے حمزہ کا وہم دور کرنا چاہا۔

"یہی تو کہہ رہا ہوں کہ تمہاری سخت مزاجی انہیں بہت محتاط بنا سکتی ہے۔ بہت سے بڑے بزنس مین آڑ میں سائیڈ بزنس کے طور پر بڑے بڑے کام کر جاتے ہیں۔"

"نہیں حمزہ! اس طرف سے میرا ذہن بالکل صاف ہے۔ ہاں البتہ ان کی کاروباری دوستوں اور دشمنوں سے مجھے عجب وحشت سی ہوتی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم ملائشیا نہ جاؤ' ضرور اس میں ان کا کوئی بڑا مفاد ہے۔"

"تم جانتے ہو حمزہ! میں چند ہزار روپے کماتے ہوئے کبھی بھی اتنی ترقی نہیں کر سکتا جتنی کرنا چاہتا ہوں' یہ سنہری موقعے تو میری سب سے بڑی ضرورت ہیں' اسی طرح میں کچھ بن پاؤں گا۔"

"کیا اتنے بڑے بن جاؤ گے کہ عظمت اینڈ سنز کے مقابل کھڑے ہو جاؤ۔"

"دیکھ میرے یار! تو چاہے کسی سے محبت کر لیکن ہمیں تو تجھ سے محبت ہے' اپنے جنون میں اور تیری اس آس میں جینے والوں کی ریاضتیں نہ بھول جائیں۔" اس نے حمزہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"اپنے چاہنے والوں کا اگر خیال نہ ہوتا تو اس محبت کے دریا میں کب کا کود کر فنا با امر ہو چکا ہوتا لیکن میں کسی کے حصے کی ریاضت کسی کے کھاتے میں کبھی نہ ڈالوں گا' اتنا بھروسہ رکھنا۔"

"ٹھیک ہے پھر جو چاہو کرو میں جانتا ہوں تم کسی کی آس نہ توڑو گے لیکن کم بخت یہ محبت کے جنون میں بڑی دلفریبی ہے۔"

"میں بھی اس دلکشی کا مارا ہوا ہی ہوں لیکن اس کے لیے سطح سے گرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔" راحیل نے سخت نظروں سے حمزہ کو دیکھتے ہوئے کہا اس کی آنکھوں میں ارادہ کی پختگی تھی۔

حمزہ بھی قائل ہو گیا اور اپنے غمگسار اور جگری دوست سے بات کر کے راحیل کا ذہن بھی کچھ صاف سا ہوا۔

☆ ☆ ☆

"عمیرہ! پاگل مت بنو اس سے اچھا رشتہ تمہارے لیے کبھی نہ آئے گا۔ جہانگیر بہت اچھا انسان ہے اور اس کی پوری فیملی کو ہم بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"جاننے سے کیا ہوتا ہے جب دل نہ مانے۔" روحی اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھی لیکن اس کا جواب وہی مرغی کی ایک ٹانگ۔ وہ عاجز آنے لگی۔

"تم چاہتی ہو کہ تمہارے ماں باپ تمہاری فکر اور پریشانی میں ہی گھل گھل کر دنیا سے اٹھ جائیں؟" اس کا انداز بہت غصیلا تھا۔

"اف روحی! ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو' تم اتنی بے درد کب سے ہو گئی ہو؟"

"جب سے تم بے رحم اور سنگدل ہو گئی ہو۔ بھلا وہ اولاد ہی کیا جو ماں باپ کی آرزوؤں اور احکامات کا احترام نہ کرے۔"

روحی اب بیزار ہونے لگی تھی۔

"اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق تو ہر انسان کو ہے کہ نہیں۔ اگر میں چاہتی ہوں کہ میری شادی نہ ہو تو کیوں سب لوگ ضد کر رہے ہیں۔" وہ بھی چڑ گئی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا! تم ساری عمر شادی نہ کرو گی؟ اف کیسی ڈھیٹ لڑکی ہو تم۔ یوں اچھے اچھے رشتوں کو ٹھکرا رہی ہو جن کے لیے لڑکیاں ترسا کرتی ہیں صرف اس لیے کہ خدا نے اچھی شکل وصورت اور ذہانت دے دی ہے' ابھی وقت ہے تو لوگ تمہارے ارد گرد چکر لگا رہے ہیں' لیکن وقت اور انسان کے نصیب کو بدلتے ذرا بھی دیر نہیں لگتی۔"

"کیا ہر لڑکی کی زندگی کا ایک ہی مقصد ہے کہ وہ شادی کر لے' اگر مجھ جیسی چند لڑکیاں شادی نہ بھی کریں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تو چاہ رہی تھی کہ تم یہ بات میری طرف سے امی اور ابو کو سمجھاؤ۔" اب وہ روحی سے منت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"سوچو تو سہی۔ ایسی بات پر کوئی بھی کیوں راضی ہو گا' بھلا بتاؤ تم ماموں ممانی کی اکیلی پیاری لاڈلی بیٹی ہو۔ ان کے دل میں تمہارے بیاہ کے کیسے کیسے شوق اور ارمان پل رہے ہیں اور جب تم کہہ دیتی ہو تو آرزوؤں کو دل کی مٹھی میں بند کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔"

"اب اس میں میرا کیا قصور ہے کہ انہوں نے اسی

ایک خواہش کو اپنی زندگی کا محور بنا لیا ہے۔" اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ وہ اس صورت حال کیسے چھٹکارا حاصل کرے۔

اور عمیرہ ان سب مشکلوں کے باوجود اپنے دل کا راز کسی کے سامنے نہ کھول پائی تھی۔ روحی بھی بس شک میں ہی رہتی' اس کی زبان پر جب ہی ویسی کوئی بات آتی وہ بری طرح ٹال دیتی یا بات رد کر دیتی۔ لیکن خود کو ٹالنا یا قائل کرنا سب سے مشکل بات ہے اس وقت جب حاصل کچھ نہ ہو' اس کے پاس کچھ بھی تو آسرا نہیں تھا نہ کوئی آس کہ راحیل رانا کے سامنے کھڑی ہو کر پوچھ سکتی۔

"کیا تمہیں میری محبت کلیہ بے حساب خزانہ قبول ہے؟"

مانا کہ وہ اکھڑ' بد مزاج تھا' لیکن نادان نہ تھا نہ اتنا بے پروا کہ کسی کے احساس شدت اور جذبۂ محبت کی پہچان نہ رکھتا ہو۔ عمیرہ کو تو جب سے شعور آیا تھا بس اسے ہی دیکھا تھا اسے ہی چاہا تھا۔ اس سے آگے نہ اس کی نظر کہیں ٹھہری نہ پیچھے کی طرف بھٹکی اور اس انتہا کا کربناک پہلو یہ تھا کہ دوسری طرف کوئی ابتدا ہی نہ تھی۔

لیکن یہ بھی طے تھا کہ وہ بے خبر نہیں تھا۔ جان کر انجان بنا ہوا تھا۔ مگر کیوں؟ اس کا جواب عمیرہ کے پاس نہیں تھا۔ وہ دن میں سو بار خود سے یہ سوال پوچھتی کہ کیا وہ راحیل کے قابل نہیں' کسی اور طرف مائل تو وہ لگتا ہی نہ تھا اور بس یہی اس کی شخصیت کی بڑی خوبی تھی۔

☆ ☆ ☆

صوفیہ بیگم' راحیل کے ملک سے باہر جانے کا سن کر گھبرا سی گئیں۔

"کیا ہو گیا ہے امی جان! مرد تو روزی روٹی کے چکر میں نکلے ہی رہتے ہیں' آپ تو یوں گھبرا رہی ہیں جیسے میں خدانخواستہ کسی محاذ پر جا رہا ہوں۔ امی! آپ کے بیٹے کو بہت ترقی کرنی ہے' بڑا آدمی بننا ہے؟"

"اتنی ترقی ہمارے کس کام کی بیٹا! ہمیں تو قناعت پسندی کی عادت ہو گئی ہے بیٹا۔" وہ جانتی تھیں کہ بیٹے کے قدم وہ آسانی سے روک نہ سکیں گی۔

"آپ کو ہو گئی ہو گی قناعت پسندی کی عادت لیکن میرے آگے تو ابھی عمر پڑی ہے اور میں نے تو اس لمبی عمر کے لیے بہت کچھ سوچ کر رکھا ہوا ہے۔" وہ ٹکر ٹکر اپنے بیٹے کی شکل دیکھنے لگیں۔ انہیں خبر ہی نہ ہوئی۔ انسان کے اندرونی اور داخلی معاملات پر بیرونی اور خارجی دنیا کتنی طاقت سے حملہ آور ہوتی ہے کہ ہمیں خبر نہیں ہوتی اور ہمارے ساتھ بیٹھا شخص ہم سے یوں الگ ہو جاتا ہے' جیسے جدا ہی ہو جاتا ہے۔ بالکل گنگ سی ہوئی صوفیہ بیگم کا چہرہ دیکھ کر راحیل کو بھی احساس ہوا۔

"سوری امی جان! آئی ایم سوری سوری میں ایسا کچھ نہیں سوچتا' ایسا کچھ نہیں کروں گا۔" وہ اپنی ماں کے قدموں میں بیٹھ کر ان کی ہتھیلیوں کو سہلانے لگا۔

"پلیز امی! مجھے معاف کر دیں!"

"معاف تو تم مجھے کر دینا۔ سوری بیٹا! مجھے حق نہیں کہ میں تمہاری پرواز کے آگے' یہ تو وہ زمانہ ہے جب ہر شخص کے پر لگ گئے ہیں تو اپنی بساط بھر اڑنے کا حق کسی انسان سے کوئی نہیں چھین سکتا۔" ان کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

راحیل نے پھر بہت کوشش کی' اپنی ماں کو بہلایا' بیسیوں بار اپنی بات کی تردید کی' لیکن صوفیہ بیگم کو مستقبل کی جھلک راحیل کے ارادوں میں نظر آ چکی تھی اس کا تصور بدلنا ناممکن لگ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ گیلی ہری نرم گھاس کی پتیاں بکھیر رہی تھی۔

"یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہو عمیرہ؟" صوفیہ بیگم شام کو چائے پینے کے بعد ٹہلنے کی غرض سے صحن میں آئی تھیں۔

"عمیرہ! مجھے لگ رہا ہے کہ تم کسی غلط آدمی کی کھوج میں بھٹک رہی ہو۔" وہ انتہائی حیرانی سے اپنی

پھوپھی کی طرف دیکھنے لگی۔

"تم نے کچھ نہ کہنے کی قسم تو کھا ہی رکھی ہے' لیکن میں بھی کھوج میں لگی ہوئی تھی اور اب مجھے یقین ہے کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہے۔"

"پلیز پھوپھو! آپ کوئی اندازہ نہ لگائیں۔" وہ یکدم کہہ کر اٹھ گئی۔

"خبردار یہیں بیٹھی رہو' کہیں نہ جانا۔" انہوں نے سختی سے کہا۔

"راحیل بالکل ہی نکما لڑکا ہے' وہ کسی کے معیار پر پورا نہیں اتر سکتا' میرا بیٹا ہے اسی لیے میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں اسے دولت حاصل کرنے اور بہت بڑا آدمی بننے کی دھن لگ گئی ہے اور ایسے مرد کبھی کسی عورت کو خوشیاں نہیں دے سکتے۔ اس کا خیال دل سے نکال دو۔"

صوفیہ بیگم بہت صاف لہجے میں کہہ رہی تھیں کہ آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہنے لگے اور پھر وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ صوفیہ بیگم نے آگے ہو کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس نے اپنا چہرہ ان کی گود میں رکھ دیا۔

"بس آج آخری بار اس کے لیے رو لو پھر میں یہ آنسو تمہاری آنکھوں میں نہ دیکھوں' اور اگلے مہینے ہم تمہاری شادی طے کر رہے ہیں تم کوئی اعتراض کرو گی نہ احتجاج۔" عمیرہ ان کے مزاج اور ارادے کی سختی پر حیران تھی۔

"پلیز پھوپھو! ایسا ظلم نہ کریں میں سنبھل جاؤں گی مگر کچھ وقت تو لگے گا۔"

"ظلم وہ ہے جو تم خود اپنے ساتھ کر رہی ہو' بس اب یہ قصہ ختم کرو۔"

عمیرہ کے لیے یہ سختی بالکل انوکھی تھی' ماں باپ بھائی بہن دوست احباب کسی کے کہے میں وہ نہ آئی لیکن صوفیہ پھوپھو کی بات انتہائی لگ رہی تھی وہ اٹھ کر روتی ہوئی کمرے میں چلی گئی اور صوفیہ بیگم نے یہ تہیہ کیا کہ اب اپنی اس خوبصورت اور خوب سیرت بھانجی کی زندگی خوشیوں سے سجا کر دم لیں گی۔ وہ اس بار جب سے یہاں آئی تھیں اسی کھوج میں لگی ہوئی تھیں' شک تو انہیں پہلے ہی تھا' راحیل کو دیکھ کر عمیرہ کی آنکھوں کی چمک' اس کی ذکر پر اس کی محویت اس کی ذات سے متعلق ہر بات میں اس کی بے پناہ دلچسپی۔

اور دو دن پہلے ہی انہوں نے اسے اپنے کمپیوٹر پر بیٹھ کر اپنا حال دل لکھتے اور مٹاتے دیکھ لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کے موبائل کی گھنٹی کئی بار بج چکی تھی لیکن وہ بے دھیانی سے بجھاتا رہا۔ ابھی تو اس کے سفر کی تھکن مٹی نہ تھی کہ آج بٹ صاحب نے ایک نیا چیلنج اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ بٹ صاحب بھی حسد کے مارے ہوتے ہیں اور اس حد تک اور وہ آج پھر بری طرح الجھ گیا تھا بلکہ جتنا آج الجھا تھا ویسا تو کبھی عمر بھر بھی نہ الجھا تھا۔

اس کے اپنے ازلی دشمن' پیدائشی رقیب عظمت لینڈ سنز کو بٹ صاحب اپنا سب سے بڑا حریف مانتے تھے اور اسے خبر ہی نہ ہوئی۔ وہ جو خود کو بہت ذہین' ہوشیار سمجھتا تھا کتنی بری طرح پٹا تھا۔ حمزہ نورانی سچ ہی کہتا آیا تھا' بٹ صاحب کی عنایتیں اور نوازشیں بے جا نہ تھیں۔

تو راحیل رانا! کتنی بے دردی سے بٹ صاحب نے تمہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا ہے کہ تمہیں خود خبر نہ ہوئی۔ انہوں نے تم جیسے ذہین آدمی کو اپنے مطلب کے لیے خوب استعمال کیا ہے کہ اگر اب تم ان کا مطلب پورا نہیں کرتے تو وہ تم سے جینے کا ہر آسرا چھین لیتے ہیں اور اگر مطلب پورا کر لیا تو شاید عظمت اینڈ سنز والے تم سے زندگی ہی چھین لیں۔"

اس نے ملائیشیا کے بزنس ٹرپ کو ہر طرح کامیابی سے نبھایا تھا اور اسی جوش میں آ کر بٹ صاحب نے شاید اپنے تمام ٹارگٹ راحیل کو بتا دیے تھے' خوشی سے جذباتی ہو کر انہوں نے چند ایسے نکتے بھی بیان کر دیے تھے جو راحیل کے لیے بہت خطرناک اشارے تھے۔

پھر گھنٹی بجی تو اس نے غصے میں موبائل بند کرنا چاہا لیکن ایک لمحے کے لیے چونک کر رک گیا۔ موبائل کے چھوٹے سے اسکرین پر "رانا ہاؤس" کا نمبر چمک رہا تھا۔ اس نے آن کا بٹن دبا کر فون کانوں سے لگایا۔

"ہیلو!" کون ہو سکتا ہے؟ اس نے سوچا۔

"ہیلو راحیل' میں صالحہ ہوں!" وہ اتنا زیادہ حیران ہوا کہ موبائل آنکھوں کے سامنے لے کر اسے تکنے لگا۔

"ہیلو راحیل! پلیز مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"مگر ہم نے تو آپس میں کبھی کوئی بات نہیں کی' اس نے دل میں سوچا۔

"آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟" اس کی حیرت بدستور تھی۔

"پہلے ایک بات کنفرم کرنا تھی' میں صرف آپ کی دلچسپی کا محور ہوں یا اس سے آگے آپ نے مجھے کوئی حیثیت دی ہے؟"

"آپ تو شاید میری زندگی ہو کر رہ گئی ہیں۔" اس نے بلا جھجک کہہ دیا۔

"ندا کی شادی ہونے والی ہے اور اس کے فوراً بعد میری شادی کی تیاری ہے' کسی بھی چچا کے بیٹے کے ساتھ کر دی جائے گی۔"

"وہ چچا کا بیٹا میں بھی تو ہو سکتا ہوں۔" اس نے محتاط انداز سے کہا۔

"ہونہہ! اتنی ہمت تو آپ سات جنم لے کر بھی نہیں کر سکتے۔"

"آپ مجھے چیلنج کر رہی ہیں؟"

"نہیں' حقیقت بتا رہی ہوں۔"

"آپ کسی طرح مجھ سے ملنے آ سکتی ہیں؟"

"بہت مشکل ہے' اس وقت فون بھی اس طرح کر رہی ہوں کہ سب گھر والے ندا کی شادی کی تاریخ لینے گئے ہیں میں اپنی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے بچ گئی اور اکیلی گھر پر رہ گئی۔"

"مگر میں نے آپ کے بارے میں بہت کچھ سوچ رکھا ہے اور مجھے آپ سے بہت سی باتیں بھی کرنی ہیں۔"

"یہ ساری بحث بیکار ہے بلکہ آپ سمجھ لیں کہ آپ کی سوچی ہوئی ہر بات بیکار ہے' آپ نے یہی سوچا ہے نا کہ شرافت سے اپنی ماں کو رانا ہاؤس بھیجیں اور ان لوگوں سے میرا ہاتھ مانگ لیں۔ مگر ایسا کبھی نہ ہو گا جس دن آپ نے اس گھر میں پہلی بار میری جھلک دیکھی تھی اس کے چار دن بعد ہی دادی جان نے مجھے بے شمار باتیں سناتے ہوئے آخری بات یہی کہی تھی کہ ان نگوڑوں کو اپنی صورت دکھا تو دی ہے دیکھنا اب بہانے سے تیرا رشتہ لے کر اس گھر میں آئیں گے کہ دولت سیدھے ہاتھوں نہ ملی ہے تو دوسرا طریقہ اپنا لیں۔ اور میں ہر روز دیکھتی ہوں کہ یہ سب لوگ اپنی رائے پر اسی طرح جمے ہوئے ہیں۔"

راحیل کے دل پر عجب دکھ کے سائے سے پھیل گئے' وہ جانتا تھا کہ "رانا ہاؤس" میں اس کو کوئی پسند نہیں کرتا مگر اتنا بھی ناپسند! کیا کبھی یہ مغرور اور سنگدل لوگ اس کے جذبے کو مانیں گے یا اس کی قدر کریں گے؟ ہرگز نہیں' شاید کبھی نہیں۔

"تم کو خبر نہیں صالحہ! کہ میں اب صرف راحیل نہیں' ایک نامور کمپنی کا منیجنگ ڈائریکٹر راحیل رانا ہوں' میرا اپنا ایک بنگلہ ہے' ایک بہترین ماڈل کی گاڑی اور زندگی کی بیشتر آسائشیں مجھے میسر ہیں۔ شاید یہی شرائط ہیں رانا ہاؤس کی لڑکی کا رشتہ مانگنے کے لیے اور میں نے بڑے دنوں کی محنت مشقت اور ریاضت کے بعد یہ مقام حاصل کیا ہے۔ صرف تمہاری جستجو میں' تمہیں حاصل کرنے کی لگن میں ورنہ مجھے خود دولت جمع کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" وہ چپ ہو گیا۔

"صالحہ! کبھی کبھی انسان کچھ حاصل کرنے کی آرزو اور جستجو میں اتنا آگے نکل جاتا ہے کہ آرزو دب جاتی ہے' مسافت کی داستان باقی رہ جاتی ہے۔ میں نے بہت تھوڑے عرصے میں بہت طویل سفر طے کیا۔" وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا۔

''راحیل! تم نے یہ سوچا ہی کیوں کہ کبھی تم ایک کامیاب انسان بنو گے تو ''رانا ہاؤس'' والے پھول گجرے لے کر تمہارا استقبال کریں گے۔''

''میں نے ایسا کچھ سوچا ہی نہیں۔ کبھی میں تو اتنا مگن ہو گیا کہ رویوں کو بھلا ہی بیٹھا ہوں۔''

''اور تم تو رویوں کے احساس سے ہی ہار ماننے لگے ہو۔''

''آخر تم لوگوں نے مجھے دولت و جائداد ہی کی ہوس میں مبتلا شخص کیوں سمجھ لیا ہے؟؟''

''اس گھر کے سارے لوگ ہی ایسے ہیں شاید اس لیے۔ لیکن تم مجھے اس فہرست میں شامل نہ کرو سمجھے۔''

''کیوں نہ کروں آخر تم اسی گھر کی فرد ہو۔''

''ایسا کیوں ہوا ہے راحیل! کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں اور ایک دوسرے کے جنون میں مبتلا ہوئے ہیں۔ خبر نہیں مجھے تمہاری بات کا اعتبار کرنا چاہیے کہ نہیں۔''

''شاید! مجھے تو تمہارے یقین کی بھی ضرورت نہیں۔ میں نے تو جب پہلی بار تمہیں دیکھا اسی دن سے لاشعوری طور پر ایک ان دیکھی چاہت کی ڈور میں بندھ گئی۔ اور یہ چاہت اب اتنی انتہا کو پہنچ گئی ہے کہ اظہار کرنے پر مجبور ہو گئی ہوں حالانکہ نہ حالات میرے بس میں ہیں نہ تم نہ میں خود۔''

اس کا لب و لہجہ کہہ رہا تھا کہ وہ خود کسی لمبی مسافت کی تھکن کی ماری ہوئی ہے بس یہ اس کی طبیعت کی بے باکی اور مزاج کی بے خوفی تھی کہ وہ اتنا کچھ کہہ گئی، ورنہ اس جیسے حالات میں پلنے والی کوئی اور لڑکی اس کی جگہ ہوتی تو اسی ماحول میں گھٹ کر مر جاتی مگر کبھی کچھ نہ کہتی۔

''کیا ہمارے لیے قسمت نے کوئی گنجائش نہ رکھی ہو گی، کہیں تو کوئی راہ ہو گی؟؟'' یہ بات صالحہ نے کہی حالانکہ شاید راحیل کو کہنی چاہیے تھی۔

''قسمت سے ہی تو جھگڑا مول لیا ہے ہم نے، ورنہ ہمارے راستے شاید کہیں نہیں ملتے۔'' راحیل کی خودی کا احساس سچ مچ بہت بری طرح بیدار ہو گیا تھا۔

''ہوں بھی ایک بنگلہ، ایک گاڑی، ایک اچھی نوکری کہاں اسے اتنا معتبر بنانے والی تھی کہ وہ ان رئیس لوگوں کے آگے ٹھہر پاتا۔ اپنی تمام تر سمجھداری کے باوجود وہ اپنی ہی زندگی کے ہر اہم فیصلے میں بیوقوف ثابت ہو رہا تھا۔

''اچھا پھر خدا حافظ، شاید دل کا حال سنا کر انسان واقعی ہلکا ہو جاتا ہے۔''

صالحہ صرف ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔ راحیل کو لگا شاید مسکرائی بھی تھی۔ کیسی بدنصیبی تھی مدتوں بعد آج پہلی ہی بار اسے صالحہ کے اظہار کی خوشی ملی تھی اور آج ہی اس کی انا نے اس سے یہ خوشی چھین لی تھی۔

☼ ☼ ☼

راحیل نے اگلے دن بٹ صاحب کے سامنے اپنا استعفیٰ رکھ کر صرف اتنا کہا۔

''بندے پر بے شمار عنایتیں صرف اللہ ہی بے غرض ہو کر کر سکتا ہے، یہ انسان کے بس کی بات نہیں۔''

بٹ صاحب اس کے انکار پر اتنے حیران تھے کہ جب تک اس سے کچھ کہتے وہ جا چکا تھا۔

گھر آیا تو امی کہیں جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

''آپ کس چکر میں ہیں امی جان! مجھے آپ سے کوئی بات کہنی تھی۔''

''ابھی تو میں تمہارے ماموں کے ہاں جا رہی ہوں، عمیرہ کے رشتے کے لیے کچھ لوگ آنے والے ہیں، بہت اچھے لوگ ہیں بیٹا! لڑکا ڈاکٹر ہے، اس کا اپنا ذاتی گھر ہے اور خاندان بھی بہت اچھا ہے، بس خدا کرے عمیرہ کی بات طے ہو جائے۔''

ان کے لہجے میں اتنی محبت تھی۔ اس نے سوچا یہ تو اس کا حق تھا اور وہ اس دعا اور محبت کی قدر نہ کر رہا تھا۔

''آپ کو عمیرہ کی بڑی فکر ہے اپنے بیٹے کی پروا نہیں۔''

''تمہاری پروا کیوں نہیں! لیکن تمہارے پاس وقت ہی کہاں ہے کہ میری پروا کی بھی قدر کرو بیٹا۔''

''اچھا معاف کر دیں اب ضرور قدر کروں گا۔'' اس نے کان پکڑ لیے۔

''ابھی کھڑے مجھ سے باتیں کر رہے ہو ابھی پانچ منٹ بعد دفتر کی طرف دوڑ لگاؤ گے بس اتنا ہی وقت ہو گا تمہارے پاس۔'' انہوں نے ہنس کر کہا۔

''دیکھیں امی! آج مجھے کوئی جلدی نہیں لیکن لگتا ہے آپ کو بہت جلدی ہے اسی لیے آپ مجھے وقت کا احساس دلا رہی ہیں۔''

''خیریت بیٹا! کھانا کھا کر دفتر نہیں جاؤ گے؟'' وہ حیران ہوئیں۔

''نہیں امی! میں نے نوکری چھوڑ دی، آپ کو پسند نہیں تھی نا یہ نوکری۔'' صوفیہ بیگم بیٹے کی صورت دیکھنے لگیں، جس نوکری، دولت اور آسائش کے پیچھے وہ کل تک دیوانہ تھا آج اس نے وہ چھوڑ دی۔

''پھر امی میں بھی چلوں آپ کے ساتھ ماموں کے ہاں؟؟''

''ضرور چلو، وہ تو بہت خوش ہوں گے۔''

''امی! آپ ان سے یہ بھی پوچھ لیجیے گا کہ اگر ایک ڈاکٹر کے مقابلے میں اپنے بے روزگار بھانجے کو ترجیح دے سکیں تو ہم بھی ان کی بیٹی کا رشتہ مانگ لیں۔''

صوفیہ بیگم استعجاب کے عالم میں اسے دیکھے گئیں۔

''تم سچ کہہ رہے ہو، مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ ایک دن میں میری اتنی دعائیں کیسے پوری ہو رہی ہیں۔''

وہ شکر گزاری کے لیے اپنے رب کے آگے جھک گئیں۔

اور چند دنوں بعد راحیل اپنی ماں کے ساتھ ''رانا ہاؤس'' جا رہا تھا۔

اس کے ذہن میں صالحہ کی کہی ہوئی ایک ہی بات کی گونج تھی۔

دادی جان نے کہا۔

''ان ندیدوں کو اپنی صورت دکھائی ہے، دیکھنا اب یہ بہانے سے تیرے رشتے کے لیے اس گھر میں آئیں گے کہ دولت سیدھے ہاتھوں نہ ملی تو دوسرا طریقہ اپنا لیں۔''

''رانا ہاؤس'' کا وہی طرز تھا، سب اپنے آپ میں مگن اور سب ان کی آمد پر چونکنا۔

''صوفیہ خاتون! بہت دنوں بعد آئی ہو۔ جلدی جلدی چکر لگایا کرو، اپنا ہی گھر سمجھا کرو۔ اب تو ندا کی شادی ہونے والی ہے، ایسا کرو کچھ دنوں کے لیے یہیں آ جاؤ۔''

دادی جان کی مہربانی حیران کن تھی۔

''وقت ہی کہاں ملتا ہے۔'' وقت نہ ملنے کا طنز ہمیشہ ان پر ساس نے کیا لیکن انہوں نے بھی طے کر لیا تھا کہ یہ رشتہ نہ چھوڑیں گی۔

"تم ایک اکیلی عورت مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ تمہیں وقت کیسے نہیں ملتا؟" حسب عادت طنز کے بعد انہوں نے چائے کے لیے کہلوایا' عابدہ خاتون نظر آئیں تو یہ بھی کہا۔

"رحمت ہے نا' اسے بھیجنا اب وہ اچھی چائے بنا لیتی ہے۔" ملازمہ کا نام لیا گیا۔ مطلب گھر کی لڑکیاں کوئی سامنے نہ آئیں۔

"ساتھ پکوڑے بھی بنوالینا۔"

"بس اماں! زیادہ تکلف نہ کریں ہم اتنا بیٹھیں گے نہیں' مجھے گھر میں بڑے کام ہیں۔"

"خیریت تمہارے ایسے کیا کام پڑے ہیں۔" انہوں نے روکھے سے لہجے میں کہا۔

"بیٹے کی منگنی کی تیاری کر رہی ہوں' اسی کی دعوت دینے آئی ہوں' اگلے ہفتے جمعے والے دن رسم ہو رہی ہے آپ سب لوگ ضرور تشریف لائیے گا۔"

انہوں نے بات کہہ کر ایک ہی سانس میں دعوت بھی دے ڈالی۔ اسی وقت ملازمہ کے ساتھ ٹرالی لے کر آتی وہ صالحہ کی امی ہی تھیں جانے کیوں وہ چونکیں اور ان ہی کے پیچھے چند قدم کے فاصلے پر صالحہ بھی تھی' شاید آج آخری بار نافرمانی کرنے آئی تھی۔

"ارے کوئی خبر' نہ اطلاع۔ اس طرح کیسے منگنی طے کر دی اور کس کے ساتھ کر دی؟ کوئی ڈھنگ کی لڑکی دیکھی ہے یا نہیں' ہمارا راحیل تو ہیرا ہے۔"

انہیں اس خبر سے عجیب حیرانی کے ساتھ جانے صدمہ ہوا تھا یا کیا لیکن صالحہ جو پیچھے کھڑی تھی' پیچھے ہی کھڑی رہ گئی اس نے آخری نافرمانی کا ارادہ ترک کر دیا تھا شاید۔

"میرے بھائی کی بچی ہے عمیرہ! سگھڑ' سلیقہ شعار' نیک سیرت' خود راحیل کو بہت پسند ہے اسی لیے اس کی مرضی سے بات طے ہوئی ہے۔"

صالحہ کی صورت پر سے سارے لگن کے رنگ اتر گئے' وہ سفید' بامیت' بکھرا بے رنگ چہرہ لیے گھر کے اسی کونے میں کھڑی رہ گئی۔

"کیا اس کی چاہت اتنی بے اثر تھی یا اسی کی لگن اتنی بے وقعت۔"

رانا ہاؤس کی اونچی اونچی بے رونق دیواریں' جن میں کوئی جھروکا نہیں' جہاں ہوا بھی نہیں اور روشنی بھی نہیں۔ جیسے زنداں میں قید کوئی شہزادی انتظار کرے کہ کوئی شہزادہ آئے گا اور اسے اس قید سے رہائی دلا جائے گا۔

"امی میں ذرا چچا جان سے مل لوں۔"

وہ اٹھا اس نے کونے میں کھڑی صالحہ کو دیکھ لیا تھا۔ اسے اٹھ کر اسی سمت آتے دیکھ کر وہ مڑنے لگی۔

"تمہاری کوئی پسند بھی تھی کہ تو نہ سہی اور سہی۔" اس نے منت بھری نظروں سے اسے دیکھا تو وہ رک گئی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں شکایت کی۔ صالحہ کی نظروں کی بے بسی اور بے خوابی اسے سننی بھی اور اپنی دو باتیں اسے ضرور سنانی تھیں۔

اسی لیے وہ کونے میں دائیں طرف والے کمروں کے درمیان رک گیا۔

"پلیز میری بات سن لو۔"

"اب کیا حاصل!" وہاں سے کوئی بھی گزر سکتا تھا۔ لیکن راحیل کو رسک لینا تھا۔

"خدا کی قسم! مجھے اپنی جان محبت سے زیادہ پیاری نہ تھی کہ اس خوف سے پیچھے ہٹ جاتا۔ نہ کوئی اور دنیا میں تم سے زیادہ عزیز تھا لیکن کم بخت اس انا اور خودداری کو نہیں ہرا سکا۔"

"پلیز مجھے ضرور معاف کر دینا۔ سچ یہ ہے کہ چند دنوں پہلے تک تو میں اپنی محبت کو یک طرفہ ہی سمجھتا تھا۔ صالحہ میری بات سمجھنے کی کوشش کرنا' میں دولت کی ہوس کا لیبل ماتھے پر لگا کر تمہیں حاصل کرنے کی کبھی بھی آرزو نہیں کر سکتا۔ مجھے......"

اچانک اس کی نظر صالحہ کے سپاٹ چہرے پر پڑی۔ وہ بالکل ساکت کھڑی تھی' اس کی کسی بات کے اثر سے خالی۔ اس کی معافی' اس کا احساس ندامت یا اس کی وضاحت سے بے نیاز۔

اور پھر وہ اس سے کچھ بھی کہے بغیر آگے بڑھ گئی اور رانا ہاؤس کے بھول بھلیاں' بر و دیوار میں کھو گئی۔ یہ تنہا اس کا نصیب تھا۔

حصارِ ذات میں سارا جہان ہونا تھا
قریب ایسے تجھے میری جان ہونا تھا

تری جبیں پہ شکن کیوں وصال لمحے میں
ترے لباس پہ یہ تو نشان ہونا تھا

تیرے چھونے سے کچھ روشنی بدن کو ملی
دگرنہ اس کو فقط خاکدان ہونا تھا

بہت ہی تھوڑی تھی دل میں تمہارے عمر مری
تھی خواب زاد مجھے داستان ہونا تھا

بچھڑ گیا تو شبانہ ملال کیا کرنا
اُسے بچھڑنا تھا وہم و گمان ہونا تھا

شبانہ یوسف

شبِ ماہتاب گزر گئی نہ فراق تھا نہ وصال تھا
سرِ بزم تھا وہ ستارہ تو جسے دیکھنا ہی محال تھا

وہ نہ آئینے کے قریب ہے تو یہ آئینے کا نصیب ہے
جسے آئینے کی تھی جستجو کبھی آپ اپنی مثال تھا

جو ازل سے میرا رقیب ہے وہی اب بھی اس کے قریب ہے
میرے لب پہ کوئی گلہ نہیں میری چشم تر میں سوال تھا

میرے یار پیارے کدھر گئے میرے خواب سارے بکھر گئے
مجھے اس کی بزم میں بیٹھ کر ابھی رفتگاں کا خیال تھا

وہ جو راہ و رسم تھی کیا ہوئی کوئی بات کی نہ نگاہ کی
وہ تھا جان بوجھ کے اجنبی مجھے صرف اس کا ملال تھا

ثوبیہ رفیقی

میں ہوں سچ یا کوئی خواب اک
پانی ہوں یا سراب اک

وہ مرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے
دیکھا تھا میں نے خواب اک

پھر سوال سارے ہی مر گئے
لکھا تھا اس نے جواب اک

لکھتی ہوں، پھاڑ دیتی ہوں
لاحق ہے یہ بھی عذاب اک

گزرے لمحوں کی ہے داستاں
لکھی ہے ایسی کتاب اک

جانے کس نے کیسے دیا تھا
گلی میں پڑا تھا گلاب اک

نقش

اپنے پیکر میں شعاعوں کو سمو لے کوئی
زیست آنچل نہیں رنگوں میں بھگو لے کوئی

کہہ رہی ہے یہ گھنی گھاس پہ گرتی شبنم
غم نکھر آئیں گے کچھ دیر تو رو لے کوئی

خامشی میں ہی گزر جائے نہ جیون کا سفر
میری تنہائی کے سناٹے میں بولے کوئی

خاکِ تن میری ہواؤں میں بکھر جائے سحر
میری پرواز کے پر اتنے تو کھولے کوئی

یاسمین سحر

یوم حشر،

غائب دماغ پروفیسر نے ایک بار بھنگ پی لی اور نشے میں کسی ٹوٹی ہوئی قبر میں جا کر گرا۔ ذرا آرام ملا تو سو گیا۔

صبح نشہ اترا، آنکھ کھلی تو قبر سے نکلا۔ قبرستان کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا پھر بڑبڑایا۔

"غضب خدا کا یوم حشر آ گیا۔ میں واحد مردہ ہوں جو اپنی قبر سے نکل آیا ہوں۔ باقی مردے بے خبر سو رہے ہیں۔"

ثمرہ شعیب بٹ۔ گوندلانوالہ

عمل،

اپنے ملازموں کو تیزی سے کام پورا کرنے پر اکسانے کی خاطر ایک فرم کے مالک نے فیکٹری اور دفتر میں جا بجا کتبے لگوا دیے جن میں سے ایک پر یہ لکھا تھا۔

"جو سوچ رہے ہیں اسے آج ہی کر ڈالیے۔"

کچھ دنوں بعد اس کے ایک دوست نے اس سے پوچھا۔

"ملازموں پر ان کتبوں کا اثر کیسا رہا؟"

اس نے افسردگی سے جواب دیا۔ "مجھے تو اس سلسلے میں بات کرتے ہوئے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ تین ٹائپسٹوں نے تو پہلے روز ہی تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ کر دیا۔ فیکٹری کا منیجر فوج میں چلا گیا۔ مزدوروں نے ہڑتال کا اعلان کر دیا اور ابھی ابھی پتا چلا ہے کہ کیشئر دو لاکھ روپے لے کر بھاگ گیا ہے۔"

نادیہ الیاس شیخ۔ سیالکوٹ

موقع شناس،

نیویارک کا ڈیزی ریسٹورنٹ شہر بھر میں بڑی شہرت کا حامل تھا۔ اس کی خوبرو مالکہ آئے دن نت نئے طریقوں سے اپنے ریسٹورنٹ کی مقبولیت اور شہرت کا اندازہ لگاتی رہتی تھی۔ ایک بار ایک ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے اس نے ڈرائیور سے کہا۔

"مجھے شہر کے کسی مشہور ترین ریسٹورنٹ میں لے چلو۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کو اس شہر کے کیا بلکہ اس دنیا کے بہترین ریسٹورنٹ ڈیزی میں لے چلتا ہوں۔"

پرل ڈیزی اپنے ریسٹورنٹ کی تعریف سن کر بہت خوش ہوئی۔ ٹیکسی سے اترتے ہوئے اس نے ڈرائیور کو دس ڈالر کا نوٹ دیا اور کہا کہ وہ باقی رقم اپنے پاس رکھ لے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے سلام کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"بہت بہت شکریہ، مس پرل ڈیزی۔"

شاہدہ شبیر۔ رحمٰن گوٹھ

ہنی مون،

شادی کے بعد میاں بیوی ایک صحت افزا پہاڑی مقام پر ہنی مون منانے کے لیے گئے تو ہوٹل کے منیجر نے نام پوچھے بغیر اندراج کر لیا۔ یہ دیکھ کر بیوی حیران رہ گئی اور کہنے لگی۔

"منیجر صاحب! آپ کو میرے شوہر کا نام کیسے معلوم ہوا؟"

منیجر بولا۔ "محترمہ! آپ کے شوہر ہر سال ہمارے ہی ہوٹل میں ہنی مون منانے آتے ہیں۔"

ضرورت نہیں پڑے گی،

لڑکی کے باپ نے اپنے ہونے والے داماد سے کہا۔ "میری بیٹی اس قدر اچھا گاتی ہے کہ تمہیں ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"اچھا!" ہونے والے داماد نے بڑی حیرت سے کہا۔

"میری بیٹی اس قدر سادگی پسند ہے کہ زیور بالکل نہیں پہنتی اس لیے اسے کسی زیور وغیرہ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"بڑے اچنبھے کی بات ہے۔"

"میری بیٹی کو ٹھنڈی چیزوں سے الرجی ہے اور وہ باسی چیزیں استعمال نہیں کرتی لہٰذا تمہیں ڈیپ فریزر کی ضرورت نہیں پڑے گی اور وہ کپڑے اتنے اچھے دھوتی ہے کہ واشنگ مشین بھی نہیں دھو سکتی۔"

"مگر آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟" داماد نے جھنجلا کر کہا۔

"اس لیے برخوردار کہ تمہیں جہیز میں کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔" ہونے والے سسر نے معصومیت سے کہا۔

سدرہ سحر عمران۔ کراچی

فائدہ،

"میں نے تمہارے والد صاحب کو بیماریوں کے بارے میں جو چند کتابیں پڑھنے کو دی تھیں کیا ان سے انہیں بیماریوں کو سمجھنے میں مدد ملی؟"

"ہاں۔ بہت زیادہ۔ ان کتابوں کو پڑھنے سے پہلے ان کا خیال تھا کہ انہیں تین بیماریاں لاحق ہیں لیکن کتابیں پڑھنے کے بعد انہیں پتا چلا ہے کہ وہ گیارہ بیماریوں میں مبتلا ہیں۔"

صفیہ کوکب گوندل۔ سلانوالی

کنجوسی،

میاں بیوی گھومتے پھرتے ایک ہوٹل کے سامنے سے گزرے۔ "کیا خیال ہے؟" خاوند نے بیوی سے پوچھا۔ "ایک ایک آئس کریم اندر ہو جائے؟"

"آپ نے تو یوں کہا جیسے ایک ایک آئس کریم ہم کھا چکے ہیں۔" بیوی نے طنزیہ کہا۔

"بھول گئی ہو؟" خاوند نے کہا۔ "چھ سات سال گزرے ہم نے اس ہوٹل میں آئس کریم کھائی تھی۔"

عمارہ رحمٰن۔ جہلم

ڈسکو،

ڈسکو ڈانس کرتے ہوئے لڑکے اور لڑکیوں کو دو کتے دیکھ رہے تھے۔

"یہ کیا کر رہے ہیں؟" ایک کتے نے دوسرے سے پوچھا۔

"یہ تو میں نہیں جانتا۔" دوسرے کتے نے کہا۔ "میں یہ جانتا ہوں کہ جب میں اس طرح کرتا ہوں تو میرا مالک مجھے پیٹ کے کیڑے مارنے کی دوائی پلاتا ہے۔"

نمرہ۔ کراچی

سردار جی،

ایک سردار جی سے کسی نے پوچھا۔

"سردار جی! عقل بڑی کہ بھینس؟"

سردار جی نے اس کی طرف غور سے دیکھا، اپنی پگڑی اتار کر ذرا سا سر کھجایا اور پھر مسکرا کر بولے۔

"یار! پہلے تاریخ پیدائش تو بتاؤ۔"

اجنبی،

درمیانی عمر کی ایک خاتون جو شاپنگ کے بعد گھر جا رہی تھیں۔ انہوں نے جب ایک کمسن بچے کو سگریٹ نوشی کرتے ہوئے دیکھا تو بولی۔

"اوہ بیٹے! تم سگریٹ پی رہے ہو کیا تمہارے والدین اس بات سے واقف ہیں؟"

کمسن لڑکے نے نہایت تمسخرانہ انداز سے عورت کی جانب دیکھا اور پھر اس کے منہ پر ڈھیر سارا سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔

"اوہ لیڈی۔ کیا۔ تمہارے شوہر اس بات سے واقف ہیں کہ تم راہ چلتے ایک اجنبی سے محو گفتگو ہو؟"

عرشیہ فرحین۔ رحیم یار خان

ابھی تو ،

ایک شخص بہت گھبرایا ہوا ڈاکٹر کے پاس پہنچا اور بولا کہ اس کی بیوی کی طبیعت اچانک بے حد خراب ہوگئی ہے۔ اس نے ڈاکٹر سے التجا کی کہ وہ فوراً اس کے ساتھ چلے۔ ڈاکٹر صاحب اپنا بیگ لے کر اس کے ساتھ چل پڑے۔ وہ شخص ڈاکٹر کو اپنی بیوی کے پاس لے گیا جو بے ہوش پڑی تھی۔ ڈاکٹر نے اس سے کہا کہ وہ کمرے سے باہر چلا جائے۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر نے آکر کہا۔ "تمہارے پاس پیچ کس ہے؟"

اس شخص نے پیچ کس لاکر ڈاکٹر کو دیا جسے ڈاکٹر لے کر اندر کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر نے پھر باہر آکر کہا۔

"ہتھوڑا لے تو لا دو۔"

وہ شخص ہتھوڑا لے آیا۔ چند منٹوں کے بعد ڈاکٹر نے پھر باہر آکر کہا۔

"چھینی ہوگی تو ذرا لا دو۔"

وہ شخص پریشان ہوچکا تھا بولا۔ "خدا کے لیے ڈاکٹر صاحب! مجھے اتنا تو بتا دیں میری بیوی کو کیا تکلیف ہے؟"

ڈاکٹر نے ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کو خشک کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی بتا دوں گا۔ پہلے میرا بیگ تو کھل جائے۔"

خدا کی پناہ ،

بالی ووڈ کی ایک اداکارہ نے اپنی سہیلی سے کہا۔

"میرا نیا بوائے فرینڈ ہر اعتبار سے مکمل ہے۔ وہ نہ شراب پیتا ہے نہ جوا کھیلتا ہے اور نہ ہی کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے۔"

سہیلی نے کہا: "خدا کی پناہ! ایسی صورت میں تم اس سے طلاق کیسے لوگی؟"

شمع حسام۔ سلانوالی

سیاست ،

ایک مرتبہ ایک سیاسی لیڈر ووٹ مانگنے کے لیے کسی بستی میں گیا۔ وہاں کسی کے گھر میں میت ہوچکی تھی۔ اس نے سوچا کر ووٹ مانگنے کا اچھا موقع ہے وہاں کافی لوگ جمع ہوں گے اور لوگوں کی ہمدردی بھی حاصل ہو جائے گی۔ وہاں جانے اور فاتحہ پڑھنے کے بعد سیاسی لیڈر بولے۔

"اللہ بخشے مرحوم میرے جگری یار تھے۔ روزانہ رات کو میرے گھر تشریف لاتے اور آدھی رات تک ہم گفتگو کرتے۔"

لوگوں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا اور بولے۔

"جناب! آپ کی ان سے کیا رشتے داری تھی؟"

سیاسی لیڈر بہت اکڑ کر بولے۔ "ہم ایک جان دو قالب تھے۔"

یہ سن کر ایک شخص طیش میں آگیا اور اٹھ کر بولا۔

"مرنے والی میری بیوی تھی۔"

رمشاء درشن۔ کراچی

کمزور ،

"آپ کی نئی ریلیز ہونے والی فلم میں پہلے جیسی بات نہیں ہے۔" فلمی صحافی نے ہدایت کار سے کہا۔

"رومانس کا ایک سین بھی جما ہوا نہیں ہے حالانکہ ہیرو، ہیروئن وہی ہیں۔ شاید آپ کی ہدایت کاری کمزور ہے۔"

"نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔" ہدایت کار نے کہا۔

"میں نے ہیرو، ہیروئن کے ہر سین پر سخت محنت کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔"

"ایسا کیوں ہے؟"

"ایسا اس لیے ہے کہ ہیرو، ہیروئن نے اب شادی کرلی ہے۔"

اقراء۔ کراچی

انگور کھٹے ہیں ،

ایک صاحب دوستوں کی محفل سے رخصت ہوئے تو کافی رات ہوچکی تھی۔ وہ اپنی بیگم سے بہانہ بنانے کا سوچ کر گھر کو چل دیے۔ صبح آفس پہنچے تو دوستوں نے پوچھا۔

"یار کل رات دیر ہوگئی تھی، بھابی نے کچھ کہا تو نہیں نا؟"

"نہیں بس۔ یہ سامنے کے دو دانت نکلوانے کا تو میں کب سے سوچ رہا تھا۔" ان صاحب نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

علیزہ شاد، مہوش فاطمہ۔ کراچی

بہادری ،

بچہ روتا ہوا ماں کے پاس آیا۔ ماں نے رونے کی وجہ پوچھی تو بچے نے کہا۔

"ابو دیوار پر کیل ٹھونک رہے تھے تو ہتھوڑی ان کے ہاتھ پر لگ گئی۔"

ماں بولی۔ "بیٹا! بہادر بچے اتنی سی بات پر رویا نہیں کرتے۔ تمہیں تو ہنس دینا چاہیے تھا۔"

بچے نے کہا۔ "امی! میں ہنسا ہی تو تھا۔"

صحت یابی ،

ذہنی امراض کے اسپتال سے ایک مریض کو رخصت کرتے وقت ڈاکٹر نے کہا۔

"آپ ہمارے علاج سے صحت یاب ہوگئے۔ امید ہے اب تو آپ آسانی سے ہمارا بل ادا کرسکیں گے۔"

مریض نے شاہانہ انداز میں کہا۔ "کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ اگر ہم نے تمہارا یہ چند لاکھ کا بل ادا نہ کیا تو ہمیں شہنشاہ اکبر کون کہے گا۔"

مہرین جان محمد۔ ٹنڈو الٰہ یار

پڑوسی ،

بیوی نے شوہر کو چوروں کے ہاتھوں پٹتے دیکھ کر ساتھ والے پڑوسی کو مدد کے لیے پکارا۔

"بھائی ذرا دوڑ کر آنا۔ میرے شوہر کو چار آدمی پیٹ رہے ہیں۔"

پڑوسی سویا ہوا تھا۔ ہڑبڑا کر اس نے ذرا سی آنکھ کھولی اور وہیں سے لیٹے لیٹے کہا۔

"چار آدمی کم ہیں جو مجھے بلا رہی ہو۔"

فریدہ فیضی مغل۔ سیالکوٹ

جواب ،

اردو کے ایک پروفیسر سے اس کی محبوبہ نے دل لگی کرنے کے لیے جھلاتے ہوئے کہا۔

"میں تم جیسے کتابی کیڑے سے شادی تو دور کی بات ہے، بات کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ نہ تمہارے دل میں کوئی امنگ ہے نہ ترنگ۔ اس لیے میرے خطوط واپس کردو۔"

پروفیسر نے جواباً کہا۔

"مجھے بھی تمہارے لکھے ہوئے خطوط رکھنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہاری اردو کی لکھائی بہت خراب ہے۔ تمہارا خط پڑھنے کے لیے اگر میں صبح بیٹھوں تو شام ہو جاتی ہے اور خدا کی پناہ۔ تم ایک پیرے میں چھ سات غلطیاں کرلیتی ہو۔ تم بے فکر رہو۔ میں ابھی گھر جا کر تمہارے خطوط نمائش سے لے کر آتا ہوں۔"

مدیحہ یوسف۔ کراچی

جوا ،

ایک دولت مند آدمی ایک ہوٹل کے ویٹر کو ہمیشہ بہت بھاری ٹپ دیتا تھا۔ ایک دن وہ کھانے کے لیے ہوٹل گیا تو اس نے دیکھا کہ اس کا مخصوص ویٹر اس کے پاس کھڑے ہونے کے بجائے ایک دوسرا ویٹر ادھر کھڑا ہے۔ وہ بولا۔

"بھئی! میرا منظور نظر کہاں ہے؟"

ویٹر نے جواب دیا۔ "اب میں ہی آپ کی خدمت کیا کروں گا کیونکہ میں نے رات جوئے میں آپ کو جیت لیا ہے۔"

عظمیٰ کوثر۔ ہرڈ

احتیاط ،

ایک پبلشر نے اپنی سیکریٹری سے کہا۔

"اے پیاری لڑکی! میں اپنے دل کے سادہ ورق پر تمہارا نام تحریر کرسکتا ہوں؟"

"ضرور کرسکتے ہیں لیکن براہ کرم اسے شائع مت کیجیے گا۔" سیکریٹری نے شرماتے ہوئے کہا۔

ندا یوسف۔ کراچی

شگفتہ جاوید

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

اسود کہتے ہیں کہ قریش کے چند جوان لوگ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس گئے۔ وہ منیٰ میں تھیں۔ وہ لوگ ہنس رہے تھے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے پوچھا۔

"تم کیوں ہنستے ہو؟"

انہوں نے کہا: "فلاں شخص خیمہ کی طناب پر گرا اور اس کی گردن یا آنکھ جاتے جاتے بچی۔"

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کہا: "مت ہنسو اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اگر مسلمان کو ایک کانٹا لگے یا اس سے زیادہ کوئی دکھ پہنچے تو اس کے لیے ایک درجہ بڑھے گا اور ایک گناہ اس کا مٹ جائے گا۔" (مسلم)

اقوال حضرت ابوبکر صدیق رضؓ،

خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں۔

- صدقہ فقیر کے سامنے عاجزی سے باادب پیش کرو کیونکہ خوش دلی سے صدقہ دینا قبولیت کی نشانی ہے۔
- عبادت ایک تجارت ہے اس کی دکان "خلوت" ہے اس کا سرمایہ "تقویٰ" ہے۔ اور نفع "جنت" ہے۔
- ہر چیز کے ثواب کا ایک اندازہ ہے سوائے صبر کے کہ اس کا ثواب بے اندازہ ہے۔
- تو دنیا میں رہنے کے سامان میں لگا ہے اور دنیا تجھے اپنے سے نکالنے کی کوششوں میں سرگرم ہے۔
- زبان کو شکوہ سے روک۔ خوشی کی زندگی عطا ہوگی۔

- گفتگو میں اختصار سے کام لے، کلام اتنا ہی مفید ہوتا ہے جتنا آسانی سے سنا جاسکے۔
- وہ لوگ بہتر نہیں جو دنیا کو آخرت کے لیے ترک کر دیتے ہیں بلکہ بہتر وہ ہیں جو دنیا اور آخرت دونوں کو لیتے ہیں۔
- وہ علماء حق تعالیٰ کے دشمن ہیں جو امراء کے پاس جاتے ہیں اور وہ امراء حق تعالیٰ کے دوست ہیں جو علماء کے پاس جاتے ہیں۔

شاہدہ شبیر۔ رحمن گڑھ

سوچ کا آئینہ،

- آپ کے گھر سے خالی ہاتھ لوٹنے والا ابنی فرد تمند سائل آپ کے سکون برباد کرے گا۔ چھوٹے سے چھوٹے دکھ کو بھی چھوٹا نہیں سمجھنا چاہیے۔
- یادداشت میں محفوظ رہنے والا علم عارضی ہے یادداشت خود دیرپا نہیں۔ سب سے اچھا علم وہ ہے جو دل میں اتر کر عمل میں ظاہر ہوتا ہے۔
- دنیا میں ہر چہرہ ایک ہی چہرہ ہے بس روپ الگ ہوتے ہیں۔
- اپنے محسن کی ذات بیان کرنے کے بجائے اس کے احسانات بیان کرو۔
- حقیقت آئینے کے عکس کی طرح ہے۔ آپ قریب ہو جاؤ وہ قریب ہوتا ہے۔ آپ دور ہو جاؤ وہ دور ہو جاتا ہے۔ آپ سامنے سے ہٹ جاؤ وہ بھی ہٹ جاتا ہے۔
- کسی ایک مقصد کے حصول کا نام کامیابی نہیں اس مقصد کے حصول کا نام ہے جس کے علاوہ یا جس کے بعد کوئی اور مقصد نہ ہو۔

(واصف علی واصف)

ندا ثمن۔ سرگودھا

حقیقت،

پاؤں گیلا کیے بغیر سمندر تو پار کیا جاسکتا ہے مگر آنسو بہائے بغیر زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔

(مستنصر حسین تارڑ)

رقیہ کلثوم۔ سندھیلیانوالی

اک نظر ادھر بھی،

- محبت اور نفرت دونوں اگر حد سے بڑھ جائیں تو جنون کی حد میں داخل ہو جاتی ہیں اور جنون کسی بھی چیز کا اچھا نہیں ہوتا۔
- احساس ہی رشتے، تعلق کی بنیاد ہوتا ہے۔ جب دلوں سے احساس ہی ختم ہو جائے تو تمام رشتے، ناتے بے معنی ہو جاتے ہیں۔
- اگر ہم دلی سکون و راحت چاہتے ہیں اور اللہ کے صحیح اور شکرگزار بندے بننا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ ہم ہمیشہ اپنے سے کم عقل، کم صورت اور کم امیر بندوں کی طرف دیکھیں۔
- مجبوریوں کے بندھن اور ساتھ بہت عارضی اور ناپائیدار ہوتے ہیں، اگر کبھی آپ کو لگے کہ کوئی آپ کے ساتھ مجبوری کے تحت ہے تو جتنی جلدی ہو سکے اسے اس بندھن سے آزاد کر دیں۔ کیونکہ ایک نہ ایک دن یہ عارضی بندھن ٹوٹنا ہی ہوتا ہے تو بہتر نہیں کہ آپ خود ہی اس کو آزاد کر دیں تاکہ آپ کی عزت نفس برقرار رہے۔
- انا اور خودداری بہت ہی اچھی چیزیں ہیں لیکن بے جا انا اکثر آپ کو تنہا بھی کر دیتی ہے۔

عمارہ رحمن جمونی۔ الاگ بہ جگہ

تدبر،

جس وقت حضرت شیخ بہاؤالدین ذکریا ملتانیؒ کا وصال ہوا تو آپ نے چار کروڑ روپے ترکہ میں چھوڑے۔ آپ کے چار بیٹے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد بڑے بیٹے حضرت صدرالدینؒ مسند پر بیٹھے تو انہوں نے حکم دیا۔

"میرے حصے کے ایک کروڑ روپے فقراء میں تقسیم کر دیے جائیں۔"

لوگوں نے عرض کی: "آپ کے والد نے باوجود یاد خداوندی کے چار کروڑ روپے جمع کیے اور آپ اس طرح اتنی بڑی رقم ختم کیے ڈالتے ہیں؟"

فرمایا: "میرے والد بڑے عالی ظرف تھے۔ ان کے پاس چار کروڑ تھے، پھر بھی یاد خدا کیا کرتے تھے لیکن میرا یہ حال ہے کہ جب سے سنا ہے کہ میرے حصے میں ایک کروڑ روپے آئے ہیں۔ طرح طرح کے خیالات آ رہے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے ان روپوں کی وجہ سے میں خدا سے غافل نہ ہو جاؤں اس لیے ان کو تقسیم کر دینا ہی بہتر ہے۔"

تقدس گیلانی۔ شیخوشریف

دو باتیں،

حکیم لقمان ایک دن اپنے شاگردوں کو حکمت و دانائی کا درس دے رہا تھا۔ ایک شخص سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور کافی دیر تک ان کی صورت پر غور کرتا رہا۔ آخر پہچان کر بولا۔

"تم وہی آدمی ہو نا جو فلاں مقام پر میرے ساتھ بکریاں چرایا کرتے تھے؟"

"ہاں میں وہی شخص ہوں۔" انہوں نے جواب دیا۔

"تو یہ مرتبہ تمہیں کیونکر حاصل ہوا؟"

حکیم لقمان نے فرمایا: "دو باتوں سے۔ ایک سچ بولنا۔ دوسرے بلاضرورت بات نہ کرنا۔"

مریم صدیقہ۔ حیدرآباد

دعا،

دعا کے بارے میں مجھے کامل یقین ہے کہ خلوص دل سے نکلی ہوئی دعا ہمیشہ قبول ہوتی ہے یہ الگ بات ہے کہ قبولیت انسان کی مرضی کے مطابق ہو

یا اللہ کی رضا کے مطابق ہو، خوش قسمت لوگ اپنی خواہشات کو اللہ کی رضا کے تابع رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان کی دعا اپنی مرضی کے مطابق پوری ہو یا نہ ہو، ان کے نزدیک دونوں صورتیں برابر ہوتی ہیں۔

عبدیت کی یہ شان اگر مستحکم ہو کر ترقی پاتی رہے تو رفتہ رفتہ انسان کی رسائی کسی حد تک مقام مرادیت تک بھی ممکن ہو سکتی ہے۔"
(قدرت اللہ شہاب کے "شہاب نامہ" سے اقتباس)
سارہ بتول۔ راولپنڈی

حضرت معروف کرخیؒ کے اقوال،

- اگر صاحب بدعت کو دیکھو کہ ہوا پر چلتا ہے تو بھی اس کو قبول نہ کرو۔
- درویش وہ ہے کہ کسی چیز کی طمع نہ کرے جب بے طلب کوئی لائے تو منع نہ کرے اور جب لے لے تو جمع نہ کرے۔
- عقلمند وہ ہے کہ اس پر جب کوئی مصیبت نازل ہو تو اول روز وہی کرے جو کہ وہ تیسرے روز کرے گا۔
- شرک ظاہر بتوں کی پرستش اور شرک باطن مخلوق پر بھروسا رکھنا ہے۔
- شیطان کو سب سے پیارا بخیل مسلمان اور ناپسند گنہگار سخی ہے۔
- جس طرح تو برائی سننے کو ناپسند کرتا ہے، اسی طرح اپنے آپ کو مدح سرائی سے بھی بچا۔
- بغیر عمل کیے ہوئے بہشت کی آرزو کرنا گناہ، بغیر ادائے سنت کے امید شفاعت رکھنا محض غرور اور دھوکا، اور بغیر فرمانبرداری امیدوار رحمت ہونا محض جہالت اور حماقت ہے۔

عظمیٰ کوثر۔ ہری پور

خلیل جبران نے کہا،

- اے میرے نفس! اگر کوئی احمق تم سے یہ کہے کہ روح بھی جسم کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے تو اس کی جہالت پر ترس کھا۔ اور اُسے بتا کہ پھول بھی پنپ ہو کر ختم ہو جاتا ہے لیکن بیج ہمیشہ باقی رہتا ہے اور یہ ہماری نظروں کے سامنے جاوداں زندگی کے سارے اسرار منکشف کرتا ہے۔
- افسوس ہے اُس قوم پر جو اُس وقت بغاوت کرتی ہے اور مردہ عزتی کی بازی لگاتی ہے جب پھانسی کا پھندا اُس کے گلے میں کس دیا جاتا ہے۔
- مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں سوچو کہ یہ سوچ تمہارے حال کی سکون آفرینیوں کو چھین لیتی ہے۔ جو ہونا ہے ہو کے رہے گا۔ کل کی فکر کے خنجر سے آج کی مسرت کا گلا مت کاٹو۔
- عجلت دانش و حکمت کی دشمن ہے۔

عرشیہ فرحین۔ رحیم یار خان

روشن لمحے،

- جب تک تمہیں اپنی تمنا کے منظور ہونے کی وجہ سے حاصل ہونے والی چیز کی ماہیت کا پتا نہ ہو اس وقت تک دعا نہ کرو۔
- ہم خیال لوگ ہم سفر ہو جائیں تو منزل آسان ہو جاتی ہے۔
- دو منصوبوں پر کام یکسوئی سے محروم کر دیتا ہے اور یکسوئی کے بغیر عروج حاصل نہیں ہوتا۔
- اللہ کا راستہ مومن کے دل کے دروازے سے شروع ہوتا ہے۔
- عظیم لوگ وہ ہوتے ہیں جو دردوں کے صحراؤں میں بیٹھ کر دنیا کو نخلستان کی خبر دیتے ہیں۔
- الفاظ سے مضمون اور مضامین سے الفاظ کے رشتوں کا علم ہی انسان کو مصنف بناتا ہے۔
- ضمیر کی آواز پر کان نہ دھرنے والے بڑے بڑے محلات میں رہنے کے باوجود اپنے پیچھے ویرانیاں چھوڑ جاتے ہیں۔

فرح ثمن۔ سرگودھا

عینی عمران

"میں کبھی بھی اپنی ماں کا پیشہ نہیں اپناؤں گی کیونکہ اس اداکاری نے ہی میری ماں کو ہلاک کیا تھا۔ اداکاری نے ہی انہیں مہلت نہ دی کہ وہ آرام دہ اور پرسکون زندگی گزار سکیں۔"

سارہ کی ماں کے ساتھ یہ سب نہ ہوتا تو شاید وہ اداکاری کی طرف پہلے ہی مائل ہو جاتی۔ خیر اب بھی وہ اس طرف گئی ہے کیونکہ وہ "رومی کی بیٹی" کے لیبل سے چھٹکارا پا کر اپنی پہچان خود بنانا چاہتی ہے۔

لڑکیاں اور تتلیاں

"تتلیاں" سیریل کی مقبولیت کے قریب قسطیں آن ایر جا چکی ہیں۔ یہ اپنے موضوع کے اعتبار سے خاصی کامیاب جا رہی ہے۔ اس کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اسے عظمیٰ علی خان تحریر بھی کر رہی ہیں اور اس میں بطور ہیروئن کام بھی کر رہی ہیں۔ چونکہ وہ خود ایئر ہوسٹس کے پیشے سے

ماں کی بیٹی

سارہ بہا بینی بالی ووڈ کی فلموں میں ایک نیا چہرہ ہے۔ اسے اپنی پہچان بنانے میں کچھ وقت لگے گا۔ اس سے پہلے اس کی شہرت اپنی ماں کے حوالے سے تھی۔ اس کی ماں رومی چیندر عالمی شہرت رکھتی تھی اور اس کے انتقال کے وقت اس کی عمر پانچ سال کی تھی۔

سارہ، رومی کی واحد اولاد تھی اور ایک سخت گیر باپ کی کفالت میں فرانس میں بڑی ہوئی۔ سارہ کے باپ نے اس کی پرورش بہت سخت گیری سے کی۔ اگرچہ اداکارہ ماں کی بیٹی ہونے کے باوجود سارہ کا اداکارہ بننے کا قطعی رجحان نہیں تھا۔ پندرہ برس کی عمر میں سارہ نے اس بات کا اعلان بھی کر دیا تھا کہ۔

وابستہ رہ چکی ہیں' اسی لیے اس میں پیش کی جانے والی کہانیاں حقائق پر مبنی ہیں۔ اس ڈرامے کی مصروفیت کی وجہ سے وہ ایئر لائن بھی چھوڑ چکی ہیں۔ اس جاب کے بارے میں اور اس ڈرامے کے بارے میں انہوں نے بتاتے ہوئے کہا۔

"بلاشبہ یہ ایک اچھی جاب ہے مگر اس کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اپنے گھر والوں سے دور رہنا جو میرے لیے بہت تکلیف کا باعث تھا۔ مجھے اس دوران گھر والوں کی بہت یاد آتی تھی لہٰذا میں نے سوچا کہ کیوں نہ اسے خدا حافظ کہہ کر اپنے نئے شوق پر محنت کی جائے' اس لیے میں نے ڈرامہ لکھنے پر بھرپور توجہ دینا شروع کردی۔ میں نے اس کا نام "تتلیاں" اس لیے تجویز کیا کہ جہاز کی طرح تتلیاں بھی اڑتی ہیں اور پھر اس میں کام کرنے والی لڑکیوں کو بھی ہم "تتلیاں" کہہ سکتے ہیں۔ عام طور پر ہمارے یہاں لڑکیوں کو تتلیاں ہی کہا جاتا ہے جیسے تتلیاں رنگ برنگی ہوتی ہیں۔ تتلیوں کو پکڑنے سے ان کا رنگ اڑ جاتا ہے' وہ بہت نازک ہوتی ہیں۔ ذرا سی بد احتیاطی انہیں ناقابل تلافی نقصان پہنچا دیتی ہے۔ یہی کچھ لڑکیوں کے ساتھ بھی ہے۔

اگر آپ ان پر ظلم کریں گے تو ان کا بھی رنگ اڑ جائے گا کیونکہ وہ بھی تتلیوں کی طرح ہی نرم و نازک ہوتی ہیں۔

شروع شروع میں اس میں پیش کی جانے والی کہانیوں کے سلسلے میں کافی پریشانی اٹھانا پڑی۔ جن لوگوں کی کہانی پیش کی گئی' انہیں زیادہ غصہ اس بات پر تھا کہ میں نہ صرف یہ سب لکھ رہی ہوں بلکہ کردار بھی میں ہی کررہی ہوں مگر اس سلسلے میں میرے شوہر علی نے میرا بہت ساتھ دیا اور مجھے کافی حوصلہ ملا۔"

اور شادی ہوگئی

ارباز اور خوشبو کے درمیان پیار و محبت کا سلسلہ گزشتہ آٹھ سالوں سے چل رہا تھا۔ کئی بار "ظالم سماج" درمیان میں آیا مگر ان دونوں نے کسی بھی "ظالم" اور کسی بھی "سماج" کو در خور اعتنا نہ جانا اور محبت کے نغمے الاپتے رہے۔ بالآخر ۲۴ جون کو یہ دونوں ہمیشہ کے لیے ایک ہوگئے (اب یہ ہے کہ یہ "ہمیشہ" کب تک پر محیط رہتا ہے۔ ابھی سے کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی کہ بہت سی مثالیں سامنے ہیں) جس دن ان کی شادی ہوئی' یہی دن خوشبو کی سالگرہ کا بھی تھا۔ اس خوشی کے موقع پر دولہا کی ساتھ

نیں اپنی رشتہ دار خواتین کے ہمراہ پشتو گانوں پر رقص کرکے خوشی اور دلی جذبات کا اظہار کرتی رہیں۔ دو سو مہمانوں کی موجودگی میں نکاح کی مقدس رسم ادا کی گئی جبکہ حق مہر پانچ لاکھ مقرر کیا گیا۔ اس موقع پر دولہا اور بازخان بہت خوش تھے۔ انہوں نے کہا۔

"مجھے اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی ہے۔ اپنی منزل کو پاکر میں بہت خوش ہوں۔ میں نے اور خوشبو نے بیرون ملک ہنی مون کا اہتمام کیا ہے۔ ہم دونوں زیادہ سے زیادہ وقت ساتھ گزارنا چاہتے ہیں۔"

خوشبو کا کہنا تھا۔

"میں آج اپنا پیار ملنے کے بعد خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی تصور کررہی ہوں۔ میں مدیحہ شاہ کا ضرور ذکر کروں گی کہ اس نے میری بہن اور دوست ہونے کا حق ادا کیا۔ شادی کی تیاریوں میں وہ میرے ساتھ پیش پیش رہی ہے۔ میں اس کی تہہ دل سے مشکور ہوں۔"

رخصتی سے قبل خوشبو نے اپنی سالگرہ کا کیک کاٹا اور مٹھائی رشتہ داروں کو اپنے ہاتھ سے کھلایا۔

غیر ذمہ دار نہیں ہوں

لیلیٰ لیلیٰ ہے۔ کبھی اس کے حوالے سے غیر ذمہ داری کی خبریں آتی ہیں تو کبھی اسکینڈلز کے حوالے سے شہرت بنتی ہے۔ اس حوالے سے اس سے پوچھا تو وہ اپنا دفاع کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں بنیادی طور پر ہنس مکھ اور خوش باش لڑکی ہوں۔ زندگی کے ہر پل سے محظوظ ہونا ہی میرا اصول ہے۔ اول تو غصہ کم کرتی ہوں اور اگر کسی بات پر آجائے تو پھر کنٹرول نہیں کرپاتی اور مجھ پر اللہ بہت مہربان ہے جو مجھے ہر قدم پر اپنے ہم عصروں سے زیادہ پذیرائی مل رہی ہے۔ جب حیدر امام نے مجھے سیریل آفر کیا اور میرے مخالفین تک اس کی اطلاع پہنچی تو انہوں نے میری مخالفت میں محاذ بنالیا اور حیدر امام سے کہا کہ آپ نے ایک غیر ذمہ دار فنکارہ کو کیوں کاسٹ کیا' وہ تو بہت پریشان کرے گی۔ ایک قسط ریکارڈ کرا کے غائب ہوجائے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔

شوٹنگ سے فراغت کے بعد کچن بھی میری ذمہ داری ہے۔ انواع و اقسام کے کھانے تیار کرنا میرا شوق ہے۔ تاہم ایکٹریس کی حیثیت سے میرے فرائض شوٹ بوز تک محدود ہیں۔ کیمرے کے سامنے خود کو کردار

کے مطابق ڈھال لیتی ہوں (اب بھلا بتائیں' ایسی لڑکی غیر ذمہ دار ہوسکتی ہے جو اتنا کام کرتی ہو' بالکل "اصغری" کی طرح)

قصہ تمام ہوا

نعمان مسعود پہلی شادی سے فارغ ہوئے تو ٹی وی ڈراموں میں بری طرح مصروف ہوگئے اور کامیابی ان کے قدم چومنے لگی۔ یہیں انہیں عروج ناصر مل گئیں۔ ان دونوں کے درمیان محبت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ عروج نے نعمان کی پہلی شادی اور بچے سب بخوشی و رغبت قبول کرلیا مگر اس شادی کے لیے نعمان کی والدہ تیار نہیں تھیں۔ بہرحال یہ شادی بھی ہو ہی گئی۔ نعمان اپنی گھریلو زندگی میں مصروف ہوئے اور ٹی وی پر ان کی ڈیمانڈ کم ہونے لگی تو انہوں نے فلم کی طرف رجوع کیا۔ جیسہ بھی ان کی والدہ نے لگایا۔ فلم کامیاب ہوسکی نہ ہی ڈوبا ہوا پیسہ ملا اور گھریلو زندگی بھی ڈسٹرب ہوکر رہ گئی۔ آئے دن کے جھگڑے شروع ہوگئے۔ اب خبریں یہ ہیں کہ ان دونوں کے درمیان طلاق کا معاملہ زیر غور ہے۔ عروج نے بتایا۔ "یہ شادی ہر روز ہونے والے لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے ختم ہو رہی ہے۔ میری برداشت ختم ہوچکی ہے۔"

اب دیکھنا یہ ہے کہ تیسری شادی کے لیے نعمان کیا کرتے ہیں۔

❋

آتی جاتی رتیں، بدلتے موسم انسانی احساسات پر یقیناً اثر انداز ہوتے ہیں مگر حساس دل اور ذہن رکھنے والوں کا المیہ تو یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کے موسموں کے زیر اثر ہی جیتے ہیں۔ باہر کا موسم کیسا ہی پُر بہار کیوں نہ ہو، من کی نگری سونی ہی رہتی ہے۔ ہاں کبھی کبھی قدرت مہربان ہوتی ہے اور ساون رت کی پھوار کے ساتھ دل و ذہن میں بھی رنگوں کی قوس قزح بچھ جاتی ہے۔ ہر سو خوشبو اور ہریالی کا راج ہوتا ہے۔

ایسی ہی ایک خوبصورت ساون رت میں شعاع کا اجراء ہوا تھا۔ شعاع کی اس طویل مسافت میں قارئین کا خلوص اور محبتیں قدم قدم پر زاد راہ رہیں۔

شعاع کے سلسلوں کی خوبصورتی ہماری قارئین کے ہی حسن انتخاب کی مرہون منت ہے۔ ہماری بہت سی قارئین ہر ماہ بڑی باقاعدگی سے شعاع کے سلسلوں میں شرکت کرتی ہیں۔ اپنی قارئین کے تعارف کے لیے ہم نے سالگرہ نمبر میں ایک سروے ترتیب دیا ہے۔ سروے کے سوالات یہ ہیں۔

1۔ شعاع سے وابستگی کو کتنا عرصہ گزرا۔ اس حوالے سے کوئی دلچسپ واقعہ پیش آیا ہو تو لکھیں۔

2۔ دن کے آغاز سے رات ہونے تک کتنے کام نمٹاتی ہیں۔ ان مصروفیات میں شعاع کے مطالعے کے لیے وقت کب نکالتی ہیں۔

3۔

افسانوں کی دنیا میں سب جھوٹ نہیں ہوتا
دل اور بھی الجھے گا پڑھیے نہ کتابوں کو

شعاع کی وہ کون سی تحریریں ہیں جو ایک خوبصورت یاد بن کر دل پر نقش ہیں اور وہ تحریریں جنہیں پڑھ کر دل الجھا۔ کیا کسی کردار میں اپنی شخصیت کی جھلک نظر آتی؟

4۔ اپنی ذات کی خوبیاں، خامیاں، وہ تعریفی جملہ جسے سن کر خوشی محسوس ہوئی۔

5۔

پھر ساون رت کی پون چلی تم یاد آئے
پھر پتوں کی پازیب بجی تم یاد آئے

ساون کے حوالے سے کوئی دلچسپ واقعہ، کوئی خوبصورت بات۔

6۔ اپنا پسندیدہ لطیفہ، شعر، اقتباس، کتاب لکھیے۔

آئیے دیکھتے ہیں ہماری قارئین نے کیا جوابات دیے ہیں۔

"شعاع کے ساتھ ساتھ"

ادارہ

صائمہ اکرم چوہدری ۔۔۔۔ صادق آباد

اخبارات، کتابیں اور رسائل و جرائد کی میں شروع سے دیوانی ہوں اور شعاع ہی نہیں خواتین ڈائجسٹ اور کرن کے ساتھ بھی میرا تعلق کوئی سولہ سترہ سال پرانا ہے۔

شروع میں جب امی جی رسائل (خواتین کے) پڑھنے نہیں دیتے تھے تو اس دور میں شعاع وغیرہ پر کتابوں کی طرح کور چڑھا کر بڑے اعتماد سے رسائل کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ ۱۹۹۶ کوئی 96ء کی بات ہے گورنمنٹ ڈگری کالج صادق آباد

میں فرسٹ ایئر کی کلاس میں غالباً "اردو" کے لیکچر کے دوران میں نایاب ملک کی کسی تحریر میں کھوئے کھوئے ڈوبی ہوئی تھی کہ اچانک میڈم عمارہ نے ریڈنگ کے لیے کھڑا کر دیا۔ ان دنوں ہمارے گروپ کا اتحاد خاصا مشہور تھا۔ سیکنڈ لاسٹ لائن سے کتاب سعدیہ نے بھیجی فرزانہ، عنبرین، آمنہ وغیرہ سے ہوتی ہوئی مجھ تک پہنچی اور میں نے بڑے آرام سے مطلوبہ پیراگراف پڑھنا شروع کر دیا اور میڈم کو پتا تک نہ چلا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اب اسی کالج میں میں اردو کی لیکچرار ہوں اور اپنی میڈم عمارہ کی کولیگ بھی... بعض اوقات اس کلاس روم میں جاتے ہوئے بے اختیار یہ واقعہ یاد آجاتا ہے۔

٭ زندگی واقعی بہت مصروف ہو گئی ہے اور "سوشل" اور "ایکٹو" لوگوں کے لیے تو مصروف ترین۔ اللہ کا شکر ہے کہ ابھی گھر کی کوئی ذمہ داری میرے اوپر نہیں ہے۔ لیکن باوجود کوشش کہ شعاع کے لیے دوسرا افسانہ نہیں لکھ سکی۔ زیادہ ٹائم لکھنے پڑھنے میں گزر جاتا ہے۔ "کمپیوٹر" کے چلے جانے کے بعد (فی الحال) تھوڑی سی مصروفیت کم ہوئی ہے لیکن زیادہ وقت کتابیں اور رسائل پڑھنے، فرینڈز سے فون پر ہیلو ہائے کرنے اور موبائل پر ایک دوسرے کو missed call دے کر یہ بتانے میں کہ ہم اس وقت تمہیں miss کر رہے ہیں گزر جاتا ہے۔ لیکن "شعاع" جس دن آجائے صرف ایک دوپہر میں ختم ہو جاتا ہے اور اس کے آگے ساری ایکٹیویٹیز ختم ہو جاتی ہیں۔

٭ بے شمار تحریریں ہیں نسیم آمنہ شاہ کا "خواب تو ہمارے ہیں" "عبیر" "بخت عالم" کا کردار "پیر کامل" عمیرہ احمد، فرحت اشتیاق "کا ہر ناولٹ" اپنی شوخ و شریر "فائزہ افتخار چندا" کی ہر تحریر اور مجھے شعاع کی کوئی تحریر ایسی یاد نہیں جسے پڑھ کر دل الجھ گیا ہو اور نہ ہی کسی کردار میں اپنی شخصیت نظر آئی۔ بقول میری بیسٹ فرینڈ (فریحہ خان "ڈی جی خان") کے تم "ون" "اینڈ" "اونلی" ہو۔ اللہ تعالیٰ نے بنا کر "سانچہ" "ہی توڑ دیا ہوگا کہ" "تخریب کاری" کرنے کو "ایک" ہی کافی ہے۔

٭ مجھ سے وابستہ لوگوں سے اگر پوچھا جائے تو خامیوں کی ایک پوری کتاب لکھ ڈالیں۔ شاید ایک آدھ خوبی بھی کہیں شرمندہ شرمندہ نظر آجائے۔ اپنی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں ایک شخصیت کو فون کیا اس نے کہا کہ تمہاری

سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تم بہت بڑا "لطفہ" ہو اور سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ دوسروں کی بہت جلد اعتبار کر لیتی ہو اور وہ نصیحت مجھے اتنا جانتی ہے کہ اس کے بعد کسی اور سے پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔

تعریفی جملے تو بے شمار ہیں لیکن 26 جون 2004ء کو تحصیل کونسل ہال میں منشیات کے خلاف سیمینار میں کمپیئرنگ کے بعد ایک پولیس افسر نے کہا تھا کہ "آپ لفظوں کا استعمال بڑی خوبصورتی سے کرتی ہیں اور لفظوں کے طلسم میں جکڑنے والے عام لوگوں کی تقریروں میں نقص تو نکالیں گے ہی۔" دراصل ان کے خطاب پر میں نے ایک دو جملے طنز کے پردے میں چھپا کر کہے تھے۔

٭ بے شمار واقعات ہیں لیکن بہت سے "اپنے" جو یونہی کہیں بچھڑ گئے یا بہت سے "اپنے" جو بہت دور ہیں۔ مثلاً "فریحہ خان (ڈی جی خان)" صبا احتشام (گوجرانوالہ) عظمیٰ حمیرا (ابہ کوہراں) فرزانہ جاوید (حطار) وغیرہ اور خصوصاً "سبگی" (Sagi) سے یہ کہنا ہے کہ "بارشوں نے گلہ کیا ہے کہ پرانی رفاقتوں کے بغیر یہ ساون اچھا نہیں۔"

٭ میرا پسندیدہ شعر یہ ہے

کچھ اور مانگنا میرے مسلک میں کفر ہے
لا اپنا ہاتھ دے میرے دست سوال میں

پتا نہیں کس کا فقرہ ہے لیکن مجھے بہت پسند ہے کسی رسالے میں پڑھا تھا۔ "تم نے کبھی موت کو دیکھا ہے وہ بالکل ویسی ہی ہے جیسی زندگی میں تمہارے بغیر گزار رہا ہوں۔"
پسندیدہ کتابیں بے شمار ہیں لیکن "مولانا وحید الدین" کی کتاب "راز حیات" آج کل میری موسٹ فیورٹ ہے۔ میری موسٹ فیورٹ فرینڈ نے یہ لکھ کر مجھے سالگرہ پر اس دفعہ گفٹ کی کہ "23 جون کا تحفہ 30 مئی کو وصول کرنا کیسا لگا؟"

دز ثمن ۔۔۔۔۔۔ سرگودھا

شعاع نے حسب سابق لب کشائی کا موقع دے کر ایک بار پھر اپنے قارئین کے دل جیت لیے ہیں (کیا بات ہے آپ کی)
٭ مجھے تو شعاع کی دوستی کے حوالے سے ایک ایک پل یاد ہے۔ جس کا رہا ہوا شعور آج میرے لیے میرے والدین کی بے شمار دعاؤں کا باعث بن رہا ہے۔ سات سال پہلے ہماری دوستی ہوئی۔ مہینے کی آخری تاریخوں میں جب تک میری ملاقات شعاع سے نہ ہو تو بقول میرے بھائیوں کے ثمن تو ہمیں کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ میں 9th میں تھی جب بھابھی ثمرہ دو دن میں شعاع پڑھ کر فارغ کر دیا کرتیں اور میں حیران ہوتی۔
"اللہ بھابھی آپ دو دن میں پورا رسالہ پڑھ کیسے لیتی ہیں؟"
"جس دن تمہیں شعاع پڑھنے کا چسکا لگا تو یہ سوال میں تم سے کروں گی۔"
وہ ہمیشہ مجھے مسکرا کر یہی جواب دیا کرتیں۔ بہرحال ان دنوں مجھے پڑھنے سے کچھ خاص لگاؤ نہیں تھا البتہ شعاع میں بنے اسکیچز بہت اچھے لگتے تھے اور میں اپنی ڈرائنگ بک میں ویسے ہی اسکیچز بنایا کرتی تھی۔ ایک دن یونہی میں نے اسکیچ بنایا تو میری نظر تحریر کے نام پہ پڑی "میں نے شام یادوں ہے" کچھ خاص تھا اس نام میں جس نے مجھے یہ تحریر پڑھنے پر اکسایا۔۔۔ شازیہ چوہدری (اللہ انہیں جنت نصیب کرے) کی وہ تحریر میں نے کسی بھی ڈائجسٹ میں پہلی بار پڑھی تھی۔ وہ تحریر اتنی اثر انگیز تھی کہ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں ایک دم سے بڑی ہو گئی ہوں۔
بس پھر تو چوری چھپے پڑھنے کا سلسلہ ہی شروع ہو گیا۔ گھر والوں کا خیال تھا کہ ابھی تم چھوٹی ہو یہ ڈائجسٹ وغیرہ پڑھنے کی عادت مت ڈالو لیکن شعاع کی دوستی نے میری شخصیت کو بہت نکھارا اور مجھ پہ مثبت اثرات مرتب کیے۔ مجھے اچھے برے کا شعور دیا۔ آج یہ بات میں نہایت فخر سے کہتی ہوں کہ مجھے اس دوستی پہ فخر ہے۔
٭ دلچسپ واقعہ راحت جبیں کی تحریر "اے وقت گواہی دے" کے حوالے سے ہے۔ کہ ساری فرینڈز میں سب سے پہلے میں ہی شعاع لیتی ہوں۔ اس دن اتفاق سے میں شعاع ساتھ ہی لے گئی اور چپکے سے رسالہ علینہ کی فائل میں رکھ دیا۔ پہلا پیریڈ مس نسرین اسلم کا ہوتا تھا جو کہ بہت سخت مزاج۔ علینہ سر جھکائے اہم پوائنٹ نوٹ کرنے میں مصروف تھی اور میں اسے بتانے کے لیے سخت بے چین ہو رہی تھی۔
"علینہ بدتمیز! ادھر دیکھو۔" میں نے نظر بچا کر اس کے پاؤں پر اپنا پاؤں مارا۔
"سن رہی ہوں اب بک بھی چکو۔"
"زین کو گولی لگ گئی ہے" میں نے سرگوشی کے انداز میں انکشاف کیا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔
"کب؟"
"ابھی!" مجھے اس کے انداز پہ بے ساختہ ہنسی آئی۔
"یہ کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے؟" مس نسرین اسلم کی عقابی نگاہوں نے ہمیں نے گھورا۔ ان کی آواز کے ساتھ ہی پوری کلاس کی لڑکیوں کے سر بھی ہماری طرف گھوم چکے تھے۔
"علینہ یہاں آئیں میرے پاس۔"
جب یہی جملہ مس نے دوسری بار علینہ سے دہرایا تو ایک بار پھر مجھے اپنی ٹانگ کو حرکت دینا پڑی۔
"کیا بات ہو رہی تھی ابھی؟" علینہ نے بے بس نظروں سے مجھے دیکھا۔ خود میری حالت بھی اس سے کم نہیں تھی۔
"مم۔ مس وہ زین کو گولی لگ گئی ہے۔"
"کون زین؟" اب کے حیرت سے پوچھا گیا۔
"کیا قصور تھا اس بے چارے کا۔۔۔ صرف نین تارا کی مدد ہی تو کی تھی اس نے مگر۔" میرے اشارے بھی اس کی زبان کو بریک نہ لگا سکے۔
اچھا تو آپ میری کلاس میں یہ باتیں کرتی ہیں کہاں ہے وہ رسالہ؟
"مم۔ مس یہ میری فائل میں۔" علینہ نے منمناتی آواز میں جواب دیا۔
"یہ رسالہ یہاں رکھیں اور جا کر اپنی سیٹ سنبھالیں۔ آج معاف کر رہی ہوں لیکن آئندہ کے لیے خیال رکھیے گا۔" انہوں نے شعاع کا وہ شمارہ اپنے ڈائس پر رکھا اور تب کہیں جا کر علینہ صاحبہ کی جان بخشی ہوئی مگر چھٹی کے وقت ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں اور علینہ اسٹاف روم کے آگے سے گزریں تو مس نسرین نے ہمیں آواز دے کر روک لیا۔
"یہ اپنی امانت لے جائیں ویسے اچھا اور معیاری ڈائجسٹ ہے۔ پڑھا کریں لیکن فارغ وقت میں۔"
ان کی تنبیہہ کے بعد ہم نے انہیں کبھی شکایت کا موقع نہ دیا۔
٭ صبح سے شام تک کتنے کام نمٹاتی ہوں؟ یہ سوال پوچھ کر تو آپ نے میری دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ دیا ہے۔ کسی زمانے میں در ثمن بہت لاڈلی بیٹی تھی (لاڈلی تو اب بھی ہوں بس انداز بدل گیا ہے لاڈ کا) میں نے کبھی پانی تک نہیں پیا تھا۔ حتیٰ کہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ مرچ مسالے اور دیگر چیزیں کچن کے کس کس کیبنٹ میں موجود ہوتی ہیں۔ بھائی امی سے کہا کرتے تھے کہ بجو (در صدف) کی شادی ہو گئی تو ہمیں مستقل کسی ہوٹل میں قیام پذیر ہونا پڑے گا۔ (بکنے کی بھی آخر کب تک خیر منائی)
میری اکلوتی بجو کی شادی ہونے کی دیر تھی میرے تو ایسے چودہ طبق روشن ہوئے کہ آج تک دماغ ٹھکانے نہیں آسکا۔
امی کی بیماری نے تو مجھے نوکر رکھ دیا۔ انہیں اپنے علاج کے سلسلے میں کئی کئی ہفتے لاہور میں رہنا پڑتا تھا اور گھر میرے سپرد۔ الحمدللہ میں نے تمام ذمہ داریوں کو نہایت خوش اسلوبی سے نبھایا۔ پورا خاندان دنگ حیرت میں مبتلا تھا کہ اتنی سی بچی نے دو کنال کا گھر مع اہل خانہ کے اتنی اچھی طرح سنبھال کیسے رکھا ہے۔ ان حالات کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ چھوٹی سی عمر میں مجھے ذمہ دار بنا دیا۔

میری صبح کا آغاز اذان کے فوری بعد ساڑھے چار بجے ہوتا ہے وضو کے بعد میں چائے کو ہلکی آنچ پہ دم دے کر نماز پڑھتی ہوں۔ اتنے میں امی بھی نماز سے فارغ ہو جاتی ہیں امی کے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے کے دوران ڈھیروں باتیں ہوتی ہیں اس کے بعد امی تلاوت میں مصروف ہو جاتی ہیں اور میں باہر لان میں آجاتی ہوں۔ واک کے دوران میری پالتو بلی میرے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ دراصل یہ اس کی خوشامد کا ایک انداز ہے جس کا مطلب ہوتا ہے کہ جلدی سے میرے برتن میں دودھ ڈال دو۔
ابو بھی نماز سے فارغ ہو کر لان میں واک لگا لیتے ہیں وہ لان کی کیاریوں کو پانی دیتے ہیں میں پورچ اور برآمدے میں قطار در قطار رکھے ہوئے سرخ گملوں میں بہار دکھاتے پودوں کو پانی دیتی ہوں (باغبانی ہمیشہ سے میرا شوق رہا ہے) اس کے بعد میرا آدھا گھنٹہ ایکسرسائز کے لیے وقف ہے چاہے کچھ ہو جائے میں اپنی ایکسرسائز کی قربانی نہیں دے سکتی۔۔۔ اس منٹ وبلیکس کرنے کے بعد ٹھیک سات بجے

میرا رخ کچن کی طرف ہوتا ہے سب سے پہلے میں امی ابو کا ناشتہ ٹیبل پہ لگاتی ہوں۔ ان کے بعد وہ لاؤنج میں آکر اخبار سنبھال لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں ناشتے میں سب کی چوائس مختلف ہے۔ کچن سے نکلنے کے بعد ابھی میرا پسینہ بھی خشک نہیں ہوپاتا آئرن اسٹینڈ پہ کپڑوں کا ڈھیر دیکھ کر میرا پارہ ہائی ہوجاتا ہے۔ "غضب خدا کا احساس نام کی تو چیز ہی نہیں ہے یہاں۔ ابھی میں کچن سے نکلی نہیں کہ کپڑے بھی پریس کرنے کے لیے رکھ دیے۔ امی! آپ دیکھ رہی ہیں نا؟ آپ کے بیٹے میرا بالکل بھی خیال نہیں کرتے۔" تب امی بولتی ہیں۔

"بلال! کچھ شرم کرو کتنی بار کہا ہے کہ اپنے کپڑے خود پریس کیا کرو۔" امی کا یہ تنبیہی جملہ میرا حوصلہ بڑھاتا ہے۔

"قسم سے امی آپ جب گھر پر نہیں ہوتیں تو ثمن ہمارے کپڑے خود بخود پریس کرکے رکھ دیتی ہے۔ آپ کے سامنے تو یہ بھیگی بلی شیرنی بن جاتی ہے۔"

ساڑھے نو بجے تک ابو اور بھائی سب گھر سے روانہ ہوجاتے ہیں۔ شور شرابے کے بعد ایک دم خاموشی چھا جاتی ہے اور اس خاموشی کو لاؤنج میں رکھے آسٹریلین طوطے اپنی چہکار سے خوبصورتی بخش دیتے ہیں۔ تقریباً ایک گھنٹہ تو بھائیوں کی پھیلائی ہوئی چیزیں سمیٹتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ دس بجے کام والی آتی ہے میں ان سے برتن اور کپڑے دھلواتی ہوں باقی پورے گھر کی صفائی ستھرائی میں خود کرتی ہوں۔ کام والی کے برتن دھونے تک میں بھی فارغ ہوجاتی ہوں۔ جتنی دیر میں دودھ کو ابال آتا ہے میں کچن میں کھڑی تمام دھلے ہوئے برتن سمیٹ لیتی ہوں۔ ساتھ میں اپنے اور امی کے لیے سلاد بھی بنالیتی ہوں۔ اس وقت اگر دھیمی آواز میں میوزک لگا ہو تو کیا ہی بات ہے۔ مجھے کچن میں بار بار جانا اچھا نہیں لگتا اسی لیے میں ایک وقت میں آسانی سے دو چار کام نمٹا کر فارغ ہوجاتی ہوں۔ اپنے گھر کی مہمان نوازی دیکھتے ہوئے مجھے کچھ اضافی ڈشز بنا کر فریج میں رکھنا پڑتی ہیں۔

دوپہر میں امی میڈیسن لے کر تھوڑا آرام کرتی ہیں اور مجھے چائے کی طلب ایک بار پھر کچن میں جانے پر مجبور کرتی ہے۔ مجھے دیکھ کر میری پالتو بلی فٹ سے کچن کی کھڑکی میں آبیٹھتی ہے۔ چائے بنانے کے دوران میں اس سے باتیں کرتی ہوں۔ وہ اپنی زبان میں مجھے میری ہر بات کا جواب دیتی ہے۔ چائے کا مگ ہاتھ میں آتے ہی میرا رخ اپنے راؤنڈنگ ٹیبل کی طرف ہوتا ہے۔ دوپہر کے دو گھنٹے میرے پڑھنے یا لکھنے کے لیے مخصوص ہیں پھر شام کی اپنی مصروفیات ہوتی ہیں دن ڈھلنے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔

بلال کے گھر آنے تک باسط نے کمپیوٹر سنبھال رکھا ہوتا ہے۔ مجھے تو آج بھی کمپیوٹر سے زیادہ کتابیں خرید کر پڑھنے سے دلچسپی ہے۔ لکھنے اور پڑھنے سے مجھے دلی تسکین ملتی ہے۔ اگر آپ میری روز مرہ کی روٹین دیکھ لیں تو حیران رہ جائیں کہ میں کس طرح وقت بچا بچا کر شعاع پڑھتی ہوں۔

رات کے کھانے کے برتن سمیٹ کر میں سب کے بستر لگاتی ہوں۔ گھر کے تمام دروازے کھڑکیاں ضرور چیک کرتی ہوں۔ کمپیوٹر سے چپکے ہوئے بلال اور باسط کو تنبیہہ دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ ڈور بیل بجے تو انٹر کام سے پوچھ کر دروازہ کھولنا ہے۔

سوتے سوتے گیارہ تو بج ہی جاتے ہیں۔ رات کو چہرے کی کلنزنگ ضرور کرتی ہوں۔

اور بستر پر جانے سے پہلے میں چاہے کتنی ہی تھکی ہوئی کیوں نہ ہوں اپنی امی کے پاؤں ضرور دباتی ہوں۔ امی کے لیے میرے دل میں جتنا بھی احترام اور محبت ہوتی ہے اس لمحے میرے ہاتھوں کی نرمی میں شامل ہوجاتی ہے۔ امی کو سلیپنگ پلز لینے کے باوجود تب تک نیند نہیں آتی جب تک میں ان کے پاؤں نہ دباؤں۔

- شعاع کی کس کس تحریر کا ذکر کروں؟ (ذال دیا نا مشکل میں) راحت کی تحریروں میں "ساون رت کے پار" سرخ گلابوں کے موسم میں" جیسے اک کانچ کی گڑیا اور عجب رت مہکی ہے" خوبصورت یاد بن کر یاد رہیں گی۔ اسی طرح فائزہ افتخار کی بھی کوئی تحریر میں نے آج تک مس نہیں کی۔ فاخرہ جبیں کی تحریریں "کہیں جگنوؤں کی قطار میں" اور شام ردپ والا ناولٹ۔ شازیہ کی "میں نے شام ہاری ہے" تمہاری یاد کے آنسو "شہر دل کے دروازے" میمونہ کی "تیری راہ میں رل گئی ہوں" صمیہ کی کس کس تحریر کا ذکر کروں وہ ثمی از ادلی دن "ہم بھی تو مات باقی ہے" بس اک داغ ندامت"

امر بیل اور حال میں ہی شائع ہونے والے پیر کامل نے تو میرے دن کا چین اور راتوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ فرحت اشتیاق کی تحریروں کا تو یوں بھی مجھے اشتیاق رہتا ہے۔ ان کی بے شمار اچھی تحریروں میں دو ایسا اک تجربہ ہو" تم ہستی اچھی لگتی ہو" وہ یقین کا اک نیا سفر" وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر" اور ابھی حال ہی میں اختتام پذیر ہونے والی تحریر "بن روئے آنسو" اس لیے بھی بہت اچھی لگی ہے کہ میری فرمائش پر فرحت نے اس ناول میں میرا نام شامل کیا (تھینک یو فرحت!)

نگہت سیما کی تحریر "مجھے تم سے محبت ہوگئی تھی" اف میں بتا نہیں سکتی شہوار کے دکھ نے مجھے کتنا رلایا تھا کئی ہفتے میں ذہنی طور پہ ڈسٹرب رہی تھی۔

سوال کے آخری حصے کا جواب ہے کہ اگر آپ در ثمن سے ملنا چاہتے ہیں تو راحت کی تحریر "عجب رت مہکی ہے" میں رانیہ کے کردار کو پڑھیں۔ رانیہ کا کردار ایسا ہی تھا جیسے راحت نے میرے اندر کی لڑکی کو لفظوں کا روپ دے کر اپنی تحریر میں شامل کرلیا ہو۔

- سب سے پہلے تو خامیاں بتاؤں گی۔ مجھ سے غلط بات برداشت نہیں ہوتی نہ ہی میں کسی کی زیادتی سہہ سکتی ہوں۔ سوچتی بہت ہوں چھوٹی سے چھوٹی بات پہ بھی پہروں الجھتی رہتی ہوں۔ جو دل میں ہوتا ہے بس کہہ دیتی ہوں۔ مقابل کا رد عمل دیکھے بغیر۔ انا بہت ہے مجھ میں (کتنی بری بات ہے نا۔)

گھر کی چیزوں کو بے ترتیب دیکھ کر غصہ بہت جلدی آجاتا ہے۔ بہت جلد شاکی ہوجاتی ہوں۔ (باقی خامیاں کسی اور وقت کے لیے رکھ لیں) خوبیاں؟ اہم اہم۔ اگر زیادہ ہوجائیں تو آپ "اپنے منہ میاں مٹھو" نہ سمجھ لیجیے گا۔ کیونکہ میں جانتی ہوں اگر میں نے ذرا بھی چالاکی دکھائی میری فرینڈز نے مجھے اسی وقت پکڑ لینا ہے لہٰذا جو کچھ کہوں گی سچ کہوں گی۔ ورنہ فرینڈز کی مار تو کھانا ہی پڑے گی۔

نہایت ذمہ دار ہوں سب کا خیال رکھتی ہوں (خود کو بھول کر) ڈرپوک ہوں لیکن ڈرپوک کی علامت ہی محبت اور دوستی ہے۔ سب سے خوش مزاجی سے ملتی ہوں۔ منہ بسورنے والے لوگ مجھے بالکل اچھے نہیں لگتے (اسی لیے تو میں فائزہ افتخار کی تحریریں شوق سے پڑھتی ہوں) زیادہ دوستیاں پالنے کی قائل نہیں ہوں۔ امی کی تربیت نے سکھایا ہے کہ کبھی کسی کا اعتماد نہیں توڑنا۔ کیونکہ اعتبار ایک ایسا لفظ ہے جسے توڑ کر انسان کبھی خود سے بھی نظریں نہیں ملا پاتا۔ وعدہ کبھی نہیں کرتی جب کروں تو نبھاتی بھی خوب ہوں۔ ایک فوجی گھرانے سے تعلق ہونے کی وجہ سے ڈسپلن مجھ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ چاہے کتنی ہی مشکل آن پڑے امید کا دامن نہیں چھوڑتی۔ کبھی بے جا خواہشات نہیں پالیں "میں" سوچتی ہوں جو ہے جیسے ہے کی بنیاد پر مطمئن اور خوش رہتی ہوں۔

تعریفی جملہ سن کر کسے خوشی نہیں ہوتی۔ کرن ڈائجسٹ میں جب میرا کوئی ناول چھپے تو مجھے قارئین کی رائے جاننے کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ پورا ایک مہینہ میں گن گن کر گزارتی ہوں بہنوں کی تعریف مجھ میں نئی توانائی بھر دیتی ہے (ویسے میں تنقید بھی اتنی ہی توجہ سے پڑھتی ہوں) گجرات سے میری عزیز از جاں فرینڈ انیسہ مریم جب یہ کہے... "ثمن! مجھے فخر ہے کہ تم میری سب سے قریبی فرینڈ ہو" تو اس کا یہ جملہ سن کر تو میرا "وجیہ" خون بڑھ جاتا ہے اور اپنی بہنیں تعارف کرواتے ہوئے کہتی ہیں کہ میری بہن نے خوش اسلوبی سے گھر کی تمام ذمہ داریاں سنبھال رکھی ہیں مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ امی کا یہ اعتماد مجھے بہت سکون دیتا ہے یا بھائیوں کا یہ جملہ "ثمن کھانا بہت لاجواب بناتی ہے۔"

- ساون کے مہینے کی بس ساکھ بنی ہے
بارش ہوں تو برسات بھلا کب نہیں ہوتی

جنی! مجھے تو ساون کا مہینہ بہت پسند ہے۔ ہر چیز نکھر جاتی ہے۔ ایسے موسم میں میرے اندر کی لڑکی دھیرے دھیرے بولتی ہے اور مجھے کچھ لکھنے پہ اکساتی ہے ایسے موسم میں ڈائری لکھنے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ سارے رنگ لفظوں میں سما جاتے ہیں۔

ساون کے حوالے سے ایک یاد ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ تب میں بمشکل کوئی دس برس کی تھی۔ ابو کی کاروباری سلسلے میں دو چھٹیاں آئیں تو امی نے کہا کہ

"اباجی اور ماں جی (نانا اور نانی) کب سے کہہ رہے ہیں بچوں کو لے کر گاؤں آؤ مگر آپ کو فرصت ہی نہیں ملتی اب دو چھٹیاں ملی ہیں تو کیوں نہ کل صبح گاؤں نکل چلیں۔"

"کل کیوں؟ تم فٹافٹ بچوں کو تیار کرو۔ کچھ کپڑے سوٹ کیس میں رکھو ہم ابھی تھوڑی دیر میں نکل چلتے ہیں۔"

بس جی، عجلت میں امی نے تیاری کی۔ اپنی گاڑی کی سہولت تھی سو بسوں کے دھکے کھانے کی بھی پریشانی نہ تھی۔ ہمارا گاؤں ضلع گجرات تحصیل کھاریاں میں واقع ہے۔ آزاد کشمیر بہت نزدیک پڑتا ہے۔... ہمارے گاؤں کو اس لحاظ سے بھی تاریخی اہمیت حاصل ہے کہ جب شہنشاہ اکبر کشمیر کے راستے اس جگہ سے گزرا تو اس نے یہ گاؤں راولیاں آباد کروایا۔

بہرحال ہم شام کو گجرات کے لیے روانہ ہوئے۔ ابھی سفر کو ایک گھنٹہ ہوا تھا کہ گاڑی دو چار جھٹکے کھا کر رک گئی موسم کے تیور بھی بدل رہے تھے سڑک کے قریب واقع مکینک کی ایک چھوٹی سی دکان دیکھ کر ابو نے مکینک کو بلوایا اور گاڑی چیک کروائی۔

"بھاجی! اکھ تے ذرہ لسا ہے پر نسی نسلی رکھو۔ نے بال بچیاں نوں اینھے درخت تھلے بٹھاؤ۔ او چھوٹے! ذرہ جھبنی جا کے کرسیاں رکھ تے بھاجی ہوراں نو بٹھا۔"

کالی گھٹائیں تھیں کہ یکجا ہو کر تاریکی بڑھا رہی تھیں۔ امی متفکر ہو رہی تھیں۔ کافی دیر گزرنے کے بعد ہم بچے بھی سخت بیزار ہو چکے تھے۔

"امی! ہم کب لالہ وہاں پہنچیں گے؟"

"بیٹا! بس تھوڑی سی دیر میں گاڑی ٹھیک ہو جائے گی تو سفر کا پتا ہی نہیں چلے گا۔"

امی گویا خود کو تسلی دیتیں۔ ہم نے تو ساری سوئیس پوپ کورن، چپس اور قریبی بیکری سے جوس خرید کر بھی پی لیے... آتے جاتے لوگوں پہ تبصرے بھی کر لیے لیکن گاڑی ٹھیک ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ دفعتاً" بادل زور سے گرجے اور یک دم موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بوڑھے درخت کی شاخیں بھلا ہمیں کب پناہ دے سکتی تھیں۔ تیز ہوا کے ساتھ بارش کی بوچھاڑ نے ہمیں پورے کا پورا بھگو دیا اور امی اس وقت کو کوس رہی تھیں جب ہم لاویاں جانے کے لیے روانہ ہوئے تھے۔

سڑک کے ساتھ دکانوں میں افغانی پٹھانوں نے ڈیرہ جما رکھا تھا۔ وہ اس صورت حال کو دیکھ کر ابو کے پاس آئے اور ہمیں اپنے ہاں آنے کو کہا۔ امی خوفزدہ ہو رہی تھیں کہ یہ خانہ بدوش پٹھان جانے کیسے لوگ ہوں۔ لیکن پٹھان عورتوں نے ہمیں بہت عزت دی اور ہمیں سبز چائے پلائی۔ امی نے ہمارے کپڑے چینج کیے اللہ اللہ کر کے گاڑی ٹھیک ہوئی تو ہم ان پٹھان لوگوں کا شکریہ ادا کر کے اپنے سفر پہ روانہ ہوئے۔ تمام راستے ساون کی بارش کبھی تیز اور کبھی ہلکی ہو جاتی۔

رات کے نو بجے جب ہم کھاریاں چھاؤنی سے گزرے تو گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا ایک نئی مصیبت! ہمارے منہ پھر لٹک گئے۔ ابو نے گاڑی سے نکل کر آس پاس کا جائزہ لیا نہ بندہ نہ بندے کی ذات۔ اسی اثناء میں ایک آرمی آفیسر اپنی جیپ میں چند فوجیوں کے ساتھ گزرے تو ہمیں کھڑا دیکھ کر رک گئے۔ ابو نے انہیں اپنا مسئلہ بتایا تو انہوں نے اپنے فوجی جوانوں سے کہہ کر ہماری گاڑی کے ٹائر کو پنکچر لگوایا۔ نانی ماں کے گھر تک ہمیں مختلف گلیوں سے ہو کر جانا تھا۔ چوکیدار ٹارچ لیے ہمارے ساتھ چل رہا تھا۔ باجرے کی فصلوں سے گزرتے ہوئے گاؤں کے آوارہ کتوں کی غراہٹ میرا جی بار جنتا ول ہولا رہی تھی۔ گاؤں میں عموماً" لوگ آٹھ نو بجے تک سو جاتے ہیں۔ خیر دس منٹ کا فاصلہ ہم بیس منٹ میں طے کر کے نانی ماں کے گھر پہنچے تو نانا اور نانی ہمیں اچانک اور بے وقت دیکھ کر حیران بلکہ پریشان بھی ہوئے۔ نانا نے تو امی اور ابو کو اچھا خاصا ڈانٹ بھی دیا کہ وہ وقت کے نہایت پابند اور اصولوں کے پکے انسان تھے۔

● پسندیدہ شعر تو بہت سارے ہیں لیکن اس وقت خواتین کے سالگرہ نمبر میں حنا رانا کا بھیجا ہوا شعر مجھے یاد آ رہا ہے۔

کسی بھی درد کی حد سے ذرا گزرنے تک
میں خود کو جوڑتا رہتا ہوں پھر بکھرنے تک

پسندیدہ اقتباس میں خلیل جبران کا یہ قول بہت پسند ہے۔

"ہر عمل کھوکھلا ہے جب تک محبت نہ ہو اور جب محبت کے ساتھ عمل کرتے ہو تب تم خود کو اپنے آپ سے ایک دوسرے سے اور خدا سے باندھ لیتے ہو۔"

پسندیدہ کتابیں تو بہت ساری ہیں ان میں سے اگر نام لوں تو پہلا نمبر بانو قدسیہ کی کتاب "دوسرا قدم" کو دوں گی۔ شاعری میں گزشتہ سال فرحت عباس شاہ کو بہت پڑھا۔ ان کی لاجواب منتخب شاعری پہ مشتمل کتاب 'اداسی ٹھہر جاتی ہے' مجھے بہت پسند ہے۔

نقش ــــــ صادق آباد

شجاع سے تعلق یہی کوئی پانچ سال پرانا ہے۔ رہا سوال کسی دلچسپ واقعے کا تو اس کی بھی سن لیجیے۔ ابو کھیتوں سے تھکے ہارے لوٹے تھے۔ میں نے بڑی مسکین سی شکل بنا کر پوچھا۔

"ابو! آپ نے شہر جانا تھا۔"

"تو؟" بڑا چونک کر پوچھا گیا۔

"وہ میرا مطلب ہے اس دفعہ کا شعاع۔"

"پہلے پاؤں پڑو۔" بڑے آرام سے میرے سامنے پاؤں پسار دیے گئے۔ بس پھر وہ مقاصد تو کچھ اور تھے کہ جنہیں میری بے عزتی میں لپیٹ کر فائر کیا گیا تھا کیونکہ ابو ایک اس "نی میل اولاد" کی کام چوری کے سو فیصد قائل ہیں۔ ناچار پاؤں دبائے اور شعاع پایا۔

میری ان دنوں کی واحد اور شدید نوعیت کی مصروفیت نیند اور صرف نیند ہے کیونکہ پچھلے چار پانچ ماہ میں جو تھکن نکالی ہے اب اس کا حساب برابر ہو رہا ہے۔

دن کا آغاز ابو کی ایک شاندار قسم کی دھاڑ سے ہوتا ہے کہ جس کے بارے میں ان کی اولاد کے "چوکے" کا کہنا ہے کہ وہ گھر میں "مارشل لاء" لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ (ابو ریٹائر ہو چکے ہیں) نماز پڑھنے کے بعد امی ابو کاموں میں جت جاتی ہیں اور میں اپنے کمرے کا تھوڑا سا اسپیس میں چلا کر (کمرے کے) سامنے وہ جہاں جاتی ہوں۔ صبح کی اس نیند میں ایک نامعقول سی مداخلت اس وقت ہوتی ہے۔ جب سات بجے بی بی سی سے "جہاں نما" نشر ہونا شروع ہوتا ہے پھر اٹھ کر ناشتا کیا جاتا ہے اور باقی کے سارے کام میرے سر ہو جاتے ہیں۔ اس دوران آسیہ ریڈیو بانی جبکہ بیٹھی رہتی ہے اور باقیوں کو بھی بہلا پھسلا کر پہلے آکاش وانی کا "چترلوک" پھر "پوپ سنگام" اور پھر "آج کے فنکار" سنواتی ہے۔ ردی ساخت اور جماعتی سائز کے ہمارے اس ریڈیو کی آواز ڈیک کی آواز کو مات کرتی ہے۔ اس لیے سب ہی اپنے اپنے کام نمٹاتے ہوئے اس سے فیض یاب ہو لیتے ہیں (منز ظلیکہ ابو گھر پہ نہ ہوں)۔

ان دنوں ہمارا ٹی وی اپنی گولڈن جوبلی منانے کو ہے۔ یہ پچھلے ایک سال سے خراب پڑا ہے اور ابو نے جان بوجھ کر ٹھیک نہیں کروایا کیونکہ بقول ان کے ہماری پڑھائی متاثر ہوتی ہے (جبکہ ہمارا خیال اس سے بالکل مختلف ہے) بے حد اصرار اور ہوم منسٹر (امی جان) کے دباؤ پر ان دنوں یہ ماسٹر یوسف کے زیر علاج ہے (امید پہ دنیا قائم ہے) دوپہر میں سلائی کڑھائی ہو جاتی ہے یا پھر لکھنے پڑھنے کا کوئی کام۔ اس دوران کالج کی بہت سی باتیں یاد آتی ہیں۔ وہ ایک فیشن

ایبل سی بندی "موتی ارم" ایک با مروت سی لڑکی ابلا تقی اور ایک بڑی پیاری سی دوست مصباح جس کی آٹو گراف (سوما نالی) کو میں اپنی تحریریں کہیں بھی اشاعت کے لیے بھجوانے کے لیے آج تک قائل نہیں کر سکی۔ کبھی کبھی وہ میڈم مصباح کو ایک زیست کے لیے بے طرح تنگ کرنا، میڈم نفیسہ کا وہ ہمارے اوٹ پٹانگ مطالبات پر عاجز آجانا اور ہمارا پریکٹیکل پیریڈز کے دوران عجیب و غریب حرکات کرنا بھی یاد آجاتا ہے۔ نماز ظہر ادا کرنے کے بعد نیند آنکھوں میں اتر آتی ہے اور پھر آنکھ عصر کی اذان کے ساتھ کھلتی ہے۔ نماز کے بعد رات کے کھانے کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ ابو اور بھائی مغرب پڑھ کر مسجد سے لوٹتے ہیں تو سب مل کر کھانا کھاتے ہیں۔ رات تاریکی اوڑھنے لگتی ہے تو سارے ہی گھر میں شفیع نقی جامعی، الجیا حیدر، راجہ شاہ زیب جیلانی (بی بی سی کے براڈ کاسٹرز) کی آواز گونجنے لگتی ہے۔

دس ساڑھے دس تک کھلے صحن میں سونے کے لیے چارپائیاں لگ چکی ہوتی ہیں۔ بارہ ایک بجے میری نیند ٹوٹ جاتی ہے۔ بالشت بھر کی وہ بلی کہ جس کے جسم پہ بال ہونے کا صرف الزام ہے میری گردن چاٹ رہی ہوتی ہے اور میرے سارے جسم میں سنسناہٹ دوڑ جاتی ہے کہ محترمہ اب پنجہ ماریں گی کہ تب۔ کچھ دیر اس شغل میں مصروف رہنے کے بعد میری "بیوٹی بون" کے ساتھ واقع گڑھے میں منہ گھسیڑ کر اتنا گفیل ہو جاتی ہے اور میری پلکیں بھی بوجھل ہونے لگتی ہیں۔ چند گھنٹے بعد روز مرہ کے معمولات کا وہی ایک چکر پھر سے شروع ہو جاتا ہے (شعاع دوپہری میں پڑھتی ہوں)۔

- راحت 'فرحت 'رفعت 'شاہدہ اور عمیرہ کی ہر تحریر ایک خوبصورت یاد ہے (شازیہ تو خود ایک یاد ہو کر رہ گئی ہیں۔ اللہ انھیں غریق رحمت کرے)۔ تسیم آمنہ اور زہرہ ممتاز کی ہر تحریر نے دل کو الجھایا۔ بہت سے کرداروں میں کبھی رلی اور کبھی ٹوکہ کے برابر اپنی شخصیت کی جھلک دکھائی دی۔
- اپنی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں بہت سی جگہ اور بہت کچھ کہا۔ بہت اوٹ پٹانگ اور بہت بکواس بھی۔ لیکن اب دل چاہتا ہے کہ اس بارے میں دوست احباب اور گھر والے کچھ کہیں۔ ان کی جو رائے ہے وہ مجھے بڑی اچھی طرح معلوم ہے۔ مارچ میں ہماری الوداعی پارٹی تھی۔ اس میں میں نے فتیل شفائی کی ایک غزل گائی تھی جس کا مطلع یہ ہے۔

انگڑائی پہ انگڑائی لیتی ہے رات جدائی کی
تم کیا سمجھو تم کیا جانو بات میری تنہائی کی

اس کا بحر از بردست ریسپانس ملا تھا (حالانکہ میں ایک انتہائی درجے کا بے سرا گلا رکھتی ہوں)۔

- ساون کا کیا پوچھتے ہیں۔ اس دن گھرے سیاہ بادلوں نے زمین کا سورج سے پردہ کرا رکھا تھا جب ہم گھر سے کالج جانے کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ راستے میں بوندا باندی شروع ہو گئی۔

"تم لوگ آج اگر چھٹی کر لیتے تو کون سی ابنی جنگ چھڑ جانی تھی۔" ابو کی صلواتیں جاری تھیں اور کالج پہنچنے تک ہم تینوں بھیگ چکے تھے۔ کلاس میں لیکچرز ایک تواتر سے جاری تھے اور میری تمام تر توجہ رائٹنگ بورڈ کی بجائے باہر گھٹتی بڑھتی تاریکی کی طرف تھی۔ ایک طرف دل میں ہول اٹھ رہے تھے کہ گھر واپسی کیسے ہو گی اور دوسری طرف دل اس موسم پر عاشق ہوئے کو تھا۔ بڑی منت سماجت کے بعد ایک لیکچرر سے پیریڈ حاصل کیا گیا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑی تو ہم نے رنگ میں کئی گانوں کے ٹانگ اور بازو توڑ ڈالے۔ ہمارے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی کہ کب کالج انتظامیہ کے ایک رکن ہمارے سر پر پہنچ گئے۔ یہ ان کی قہر آلود نظروں کا ہی کمال تھا کہ اگلے دو منٹ کے بعد ہم کلاس میں بیٹھے اور گینک کیمسٹری کا لیکچر اٹینڈ کر رہے تھے۔

- پسندیدہ کی چھوڑیے۔ آج کل میں ثناء اللہ شاہ کی ایک نظم نظروں سے گزری تو اچھی لگی۔ لیجیے آپ بھی پڑھیے۔

"یہ تم جو حرف لکھتے ہو"

بہت سوچا محبت میں
تمہیں میں تحفہ کیسا دوں
جو تیری آنکھوں جیسا ہو
صدا آتی میرے دل سے
یہ تم جو حرف لکھتے ہو
زمانے بھر پہ بھاری ہیں
زمانے بھر سے سندر ہیں
بھگو کر آنسوؤں سے تم
اسے تحفے میں دے ڈالو
(اس عمر میں اب ایسی شاعری ہی پسند آئے گی)